گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

اگست 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

ماہ رمضان مبارک



عمیرہ احمد

کا ناول عکس اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار .... معاون: آمنہ حماد

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



جلد 39 • شمارہ 05 • اگست 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

رمضان المبارک کے مقدس مہینے کا آغاز ہو رہا ہے، یہ بڑی برکتوں اور رحمتوں والا مہینہ ہے۔ روزے کا بنیادی مقصد تقویٰ کا حصول ہے، تقویٰ کے حصول کے لیے صرف کھانے پینے سے پرہیز کافی نہیں بلکہ ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی شعوری کوشش بھی مطلوب ہے۔ روزہ رکھ کر ہم اللہ کی حلال کردہ چیزوں سے بھی اللہ کے حکم کے مطابق پرہیز کرتے ہیں تو جو کام پہلے بھی ممنوع ہیں، ان سے بچنا زیادہ ضروری ہے تاکہ مومن ان سے پرہیز کا عادی ہو جائے۔ روزہ ایسی عبادت ہے جو انسان کے روحانی اور جسمانی فائدے کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ یہ اللہ کی ایسی رحمت ہے جس کو حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی عظیم انعامات عطا فرماتا ہے۔

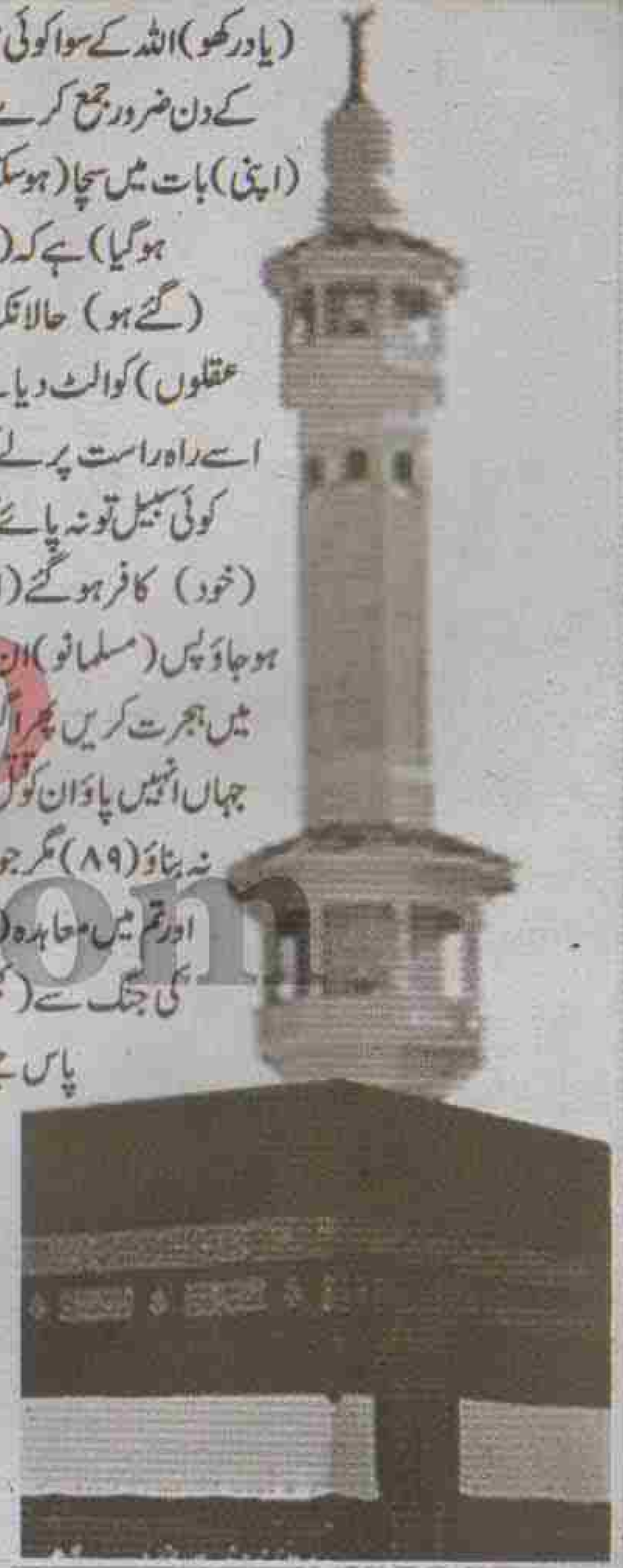
رمضان المبارک کے مہینے میں ہی پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ وقت کے الٹ پھیر نے ایک بار پھر یہ ساعتیں یکجا کر دی ہیں۔

14 اگست وہ تاریخ ساز دن جب اللہ تعالیٰ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک عظیم نعمت، ایک علیحدہ وطن سے نوازا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنہرا باب رقم ہوا اور وہ کام جو ناممکن نظر آتا تھا مسلمانوں نے اپنے عزم، حوصلے، استقامت اور اتحاد سے قائداعظم کی قیادت میں اسے ممکن کر دکھایا۔

رمضان المبارک کی خصوصی دعاؤں میں اپنے وطنِ عزیز کے لیے خصوصی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطنِ پاک کو محفوظ و مامون رکھے اور ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

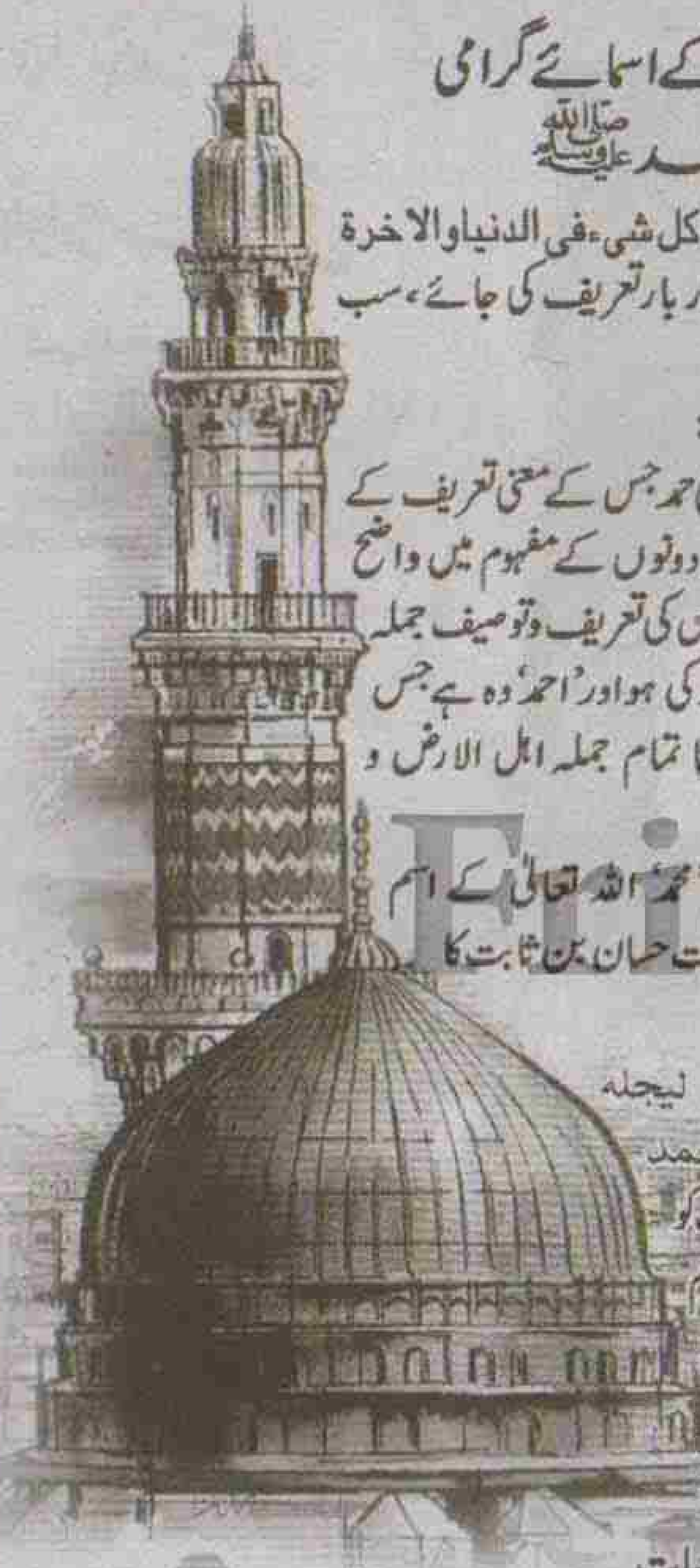
مدیرہ
انجم انصار





(یاد رکھو) اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں بے شک وہ تم سب کو قیامت کے دن ضرور جمع کرے گا اس میں کچھ شک نہیں اور اللہ سے زیادہ کون (اپنی) بات میں سچا (ہوسکتا) ہے (۸۷) پس (اے مسلمانو) تم کو (کیا ہوگیا) ہے کہ (تم) منافقوں (کے بارے) میں دو گروہ ہو (گئے ہو) حالانکہ اللہ نے ان کے اعمال کے سبب سے ان (کی عقلوں) کو الٹ دیا ہے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کیا ہے اسے راہ راست پر لے آؤ حالانکہ جسے اللہ گمراہ کرے پھر اس کے لیے کوئی سبیل تو نہ پائے گا (۸۸) وہ یہ چاہتے ہیں کہ کاش جس طرح وہ (خود) کافر ہوگئے (اسی طرح) تم بھی کافر بن جاؤ تاکہ سب یکساں ہوجاؤ پس (مسلمانو) ان میں سے دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں پھر اگر وہ اس سے اعراض کریں تو انہیں گرفتار کرو اور جہاں انہیں پاؤ ان کو قتل کرڈالو اور خبردار ان میں سے دوست اور حمایتی نہ بناؤ (۸۹) مگر جو لوگ کسی ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں جن میں اور تم میں معاہدہ (ہوچکا) ہے یا وہ تمہاری جنگ سے اور اپنی قوم کی جنگ سے (بھی) دل تنگ (اور دست بردار) ہوکر تمہارے پاس چلے آئیں (تو انہیں کسی قسم کا آزار نہ پہنچاؤ) اور اگر اللہ چاہتا تو بے شک انہیں تم پر مسلط کردیتا پھر وہ تم سے ضرور جنگ کرتے پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی کریں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کریں تو (پھر) ان لوگوں کی (تکلیف رسانی کی) اللہ نے تمہارے لیے کوئی سبیل مقرر نہیں کی (۹۰)

(سورۃ النساء آیت نمبر ۸۷ تا ۹۰)



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

سیدنا محمد ﷺ

اللھم صلی اللہ سیدنا محمد بعدد کل شیء فی الدنیا والاخرۃ

1- مفہوم: سراہے گئے جن کی بار بار تعریف کی جائے، سب سے زیادہ لائق تعریف۔

2- لفظ 'محمد' کی خصوصیت و اہمیت:

لفظ 'محمد' کا مادہ ح۔م۔د ہے یعنی حمد جس کے معنی تعریف کے ہیں اور یہی 'احمد' کا مادہ بھی ہے۔ البتہ دونوں کے مفہوم میں واضح فرق کچھ یوں ہے کہ 'محمد ﷺ' وہ ہے جس کی تعریف و توصیف جملہ اہل الارض والسما نے سب سے بڑھ کر کی ہو اور 'احمد' وہ ہے جس نے رب السموٰت والارض کی حمد و ثنا تمام جملہ اہل الارض و السموٰت سے بڑھ کر کی ہو۔

آپ ﷺ کا یہ اسم مبارک 'محمد' اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک 'محمود' سے مشتق ہے جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت کا یہ شعر ہے۔

وشق لہ من اسمہ لیجلہ
فذو العرش محمود و ھذا محمد

ترجمہ: ''اور اللہ نے ان کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے ان کا نام اپنے نام سے مشتق کیا۔ دیکھو رب العرش تو محمود ہے اور آنحضرت محمد ﷺ ہیں۔''

انوار اسماء النبی ﷺ

قیصرہ حیات

پاکیزہ بہنوں

السلام علیکم!

عکس

پاکیزہ کے لیے میرا پہلا سلسلے وار ناول اور مجموعی طور پر میری تیسری تحریر ہے۔ تقریباً چار سال بعد میں کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے کوئی ناول لکھ رہی ہوں۔ قارئین سے زیادہ میں خود ایکسائٹڈ ہوں۔ آپ کی توقعات سے واقف ہوں لیکن اب اس کی عادی ہو چکی ہوں۔

اپنے کیریئر کی ایک اسٹیج پر آ کر میں ڈائجسٹ کے لیے مزید نہ لکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن میں اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ پڑھنے والوں کے اصرار، دباؤ، تنقید اور بہت سی دوسری وجوہات نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کروں اور اس نظرِ ثانی کا نتیجہ عکس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

آئندہ آنے والے سالوں میں اگر زندگی رہی تو میں پاکیزہ کے لیے انشاءاللہ تعالیٰ ہر سال باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ڈائجسٹ کے ذریعے مزید شہرت، شناخت یا پیسے کی ضرورت ہے بلکہ صرف اس لیے کہ پاکستان کے بہت سے علاقوں میں لوگ میری تحریریں کتاب کی شکل میں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس کا ادراک مجھے پہلے نہیں تھا۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں واپسی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کا وہ قرض لوٹانا چاہتی ہوں جو انہوں نے عزت، پسندیدگی، ستائش اور نام کی صورت میں مجھے دیا۔

میرے تحریری سفر میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک وقت میں دو مکمل ناولز پر کام کر رہی ہوں۔ درِ نجات اور عکس...... ورنہ اس سے پہلے میں نے ہمیشہ ایک وقت میں ایک مکمل ناول پر کام کیا ہے۔ درِ نجات کو میں پہلے شائع کروانا چاہتی تھی لیکن پھر بالکل آخری لمحات میں، میں نے عکس کو پہلے شائع کروانے کا فیصلہ کیا۔

درِ نجات اپنے موضوعات کے اعتبار سے زیادہ complex اور hard hitting ہے۔ کہانی کا کینوس بھی بڑا ہے تو میں نے سوچا درِ نجات کی صورت میں seven course meal دینے سے پہلے آپ کو عکس کی صورت میں ایک appetizer دے دیا جائے۔

پاکیزہ کے قارئین کے لیے میرا کام ویسے بھی نسبتاً نیا ہوگا، میرے طرزِ تحریر سے زیادہ متعارف نہیں ہوں گے تو پھر یہ اور بھی بہتر تھا کہ میں آسان سے مشکل کی طرف جاؤں۔ عکس آسان ہے، درِ نجات مشکل ہے۔

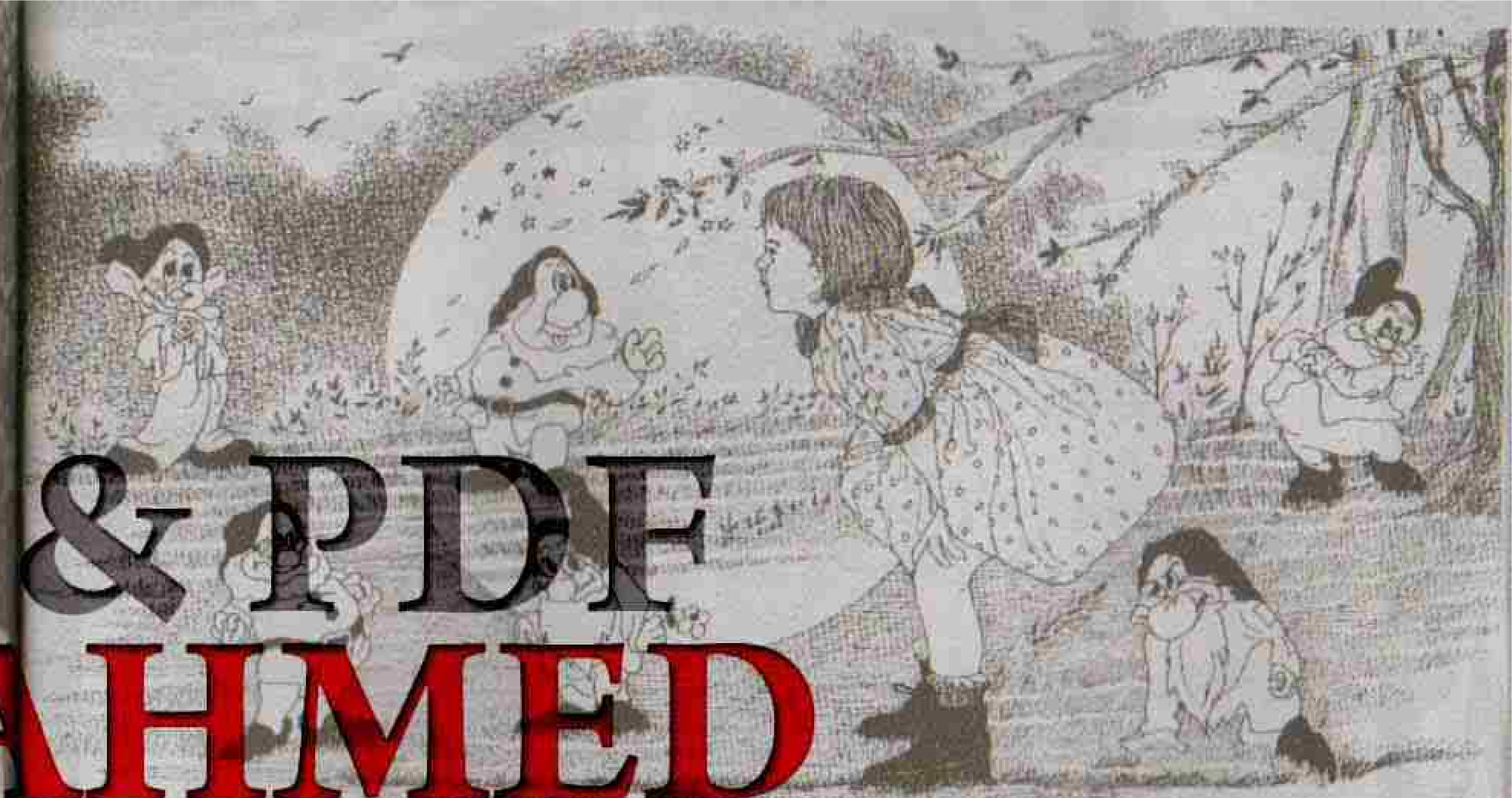
اور اب کچھ عکس کے بارے میں جو آپ انشاءاللہ تقریباً ایک سال پاکیزہ میں دیکھتے رہیں گے۔ عکس میرے مخصوص طرزِ تحریر کی کہانی نہیں ہے۔ آج تک لکھی ہوئی میری تحریروں میں سے میرا سب سے پسندیدہ کردار آپ کو عکس میں ملے گا۔ میں ان رائٹرز میں سے ہوں جنہیں اپنے تخلیق کردہ کردار متاثر نہیں کرتے لیکن یہ پہلا موقع ہے جب مجھے اپنے ایک کردار نے متاثر نہیں انسپائر کیا۔

عکس میں آپ کو اور کیا ملے گا......؟ آپ دیکھیں...... کہانی کیا ہے؟ آپ بوجھیں مقصد کیا ہے؟ آپ طے کریں۔ دیکھنا، بوجھنا، بتانا سب آپ پر چھوڑتی ہوں...... ایک پہیلی کی طرح اور میرا دعویٰ ہے آپ اس پہیلی کو نہیں بوجھ سکیں گے جو بوجھ لیں گے وہ حل نہیں کر سکیں گے...... تو آئیں عکس کے ونڈرلینڈ میں چلیں اور محبت اور تعلق کی کچھ نئی بنیادیں، نئی جہتیں کھوجیں۔

اس کائناتِ محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے

عمیرہ احمد





عکس

عمیرہ احمد

قسط 01

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی ... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے ... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہوجائیں گے ... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے ... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں ... کہیں ایسا تو نہیں ... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں ... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو ... بقول شاعر ...

کہاں کے عکس کیسے عکس اور کیا ان کی قیمت
اے میرے شیشہ گر یہ سب تماشا چل رہا ہے
یہ سب کردار اصلی ہیں اور ان کا ماجرا بھی
جو باقی ہے مگر یہ سب تماشا چل رہا ہے

وہ کھلے داخلی دروازے سے اندر جانے کے بجائے وہیں برآمدے میں ہی رک گئی تھی۔ داخلی دروازے کے دائیں طرف یہ ایک Cheval Standing Floor Mirror تھا جس نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ Oak Tree سے بنا ہوا لیکن آبنوسی رنگت کا وکٹورین اسٹائل کا ایک بہت پرانا Cheval Mirror جس کے ساتھ دونوں اطراف میں ہک تھے۔ اچھی پالش نہ ہونے کے باوجود بے حد اچھی حالت میں تھا۔ فرنیچر میں تھوڑی سی دلچسپی اور پہچان رکھنے والا بھی ایک نظر میں ہی لکڑی کی عمدگی اور اس پر بنے ہوئے ڈیزائن کی نفاست کو جانچ لیتا، وہ ایک اینٹک پیس تھا اور کم از کم شہر بانو کی نظر سے چوک نہیں سکتا تھا۔ وہ کچھ تجسس اور دلچسپی کے عالم میں فریم کے پاس آئی تھی۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس نے لکڑی پر بنے ڈیزائن کے نشیب و فراز کو جیسے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پوریں گرد آلود ہوئی تھیں۔ فریم کو یقیناً باقاعدگی سے صرف سرسری انداز میں جھاڑا جاتا تھا۔ اوول شکل کا آئینہ اب شفاف نہیں رہا تھا، اس میں ہلکے ہلکے نشان نظر آرہے تھے یقیناً دوسری طرف موجود کروم اب اپنی مدت پوری کرنے کے بعد فنا پذیر تھا لیکن اپنے وجود پر زمانے کے تغیر و تبدل کے تمام نشانات رکھنے کے باوجود وہ Cheval Mirror کسی بھی آرٹ لور کو سحر زدہ کرسکتا تھا جیسے اس وقت وہ ہو رہی تھی۔

اس نے Cheval Mirror میں اپنے عکس کو دیکھا۔ غیر محسوس طور پر سر پر لگائے گلاسز کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے ماتھے پر آئے ہوئے اپنے کچھ بالوں کو دوبارہ سن گلاسز کی مدد سے قابو کرنے کی کوشش کی تھی اور مرر کے سامنے سے ذرا سا ہٹتے ہی اس نے آئینے میں اپنے عقب میں ابھی تک ڈرائیو وے میں کھڑے اپنے عملے کے افراد سے باتیں کرتے شیر دل کو دیکھا تھا۔ وہ رہائش گاہ کے سامنے موجود لان کے حوالے سے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پی اے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ شہر بانو کے برعکس اس کے گلاسز اس کی آنکھوں پر تھے۔ سیاہ ٹراؤزر کے اوپر سفید شرٹ اور سیاہ ہی جیکٹ پہنے وہ casual ڈریس میں ہونے کے باوجود بے حد فارمل حلیے میں لگ رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتے قد کے ساتھ اپنے تیکھے نقوش اور کسرتی جسم کے ساتھ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح picture perfect لگ رہا تھا۔ ڈرائیو وے کی آرچ میں سامنے لان کے داخلی راستے میں کھڑے اس کے چہرے پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ شہر بانو کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ ایک عجیب سے استحقاق نے اسے سرشار کیا تھا۔ آئینے میں نظر آنے والا قابلِ رشک مرد اس کا تھا یا شاید وہ اس کی تھی۔ نہیں ......وہ دونوں ایک دوسرے کے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے تھے۔ وہ عکس جو کسی بھی عورت کی نظر کو بھٹکانے کا باعث بن سکتا تھا صرف اس کا تھا...... شہر بانو کا شیر دل۔

اسے یاد نہیں، وہ زندگی میں کتنی بار اسے دیکھ کر فریز ہوئی تھی۔ کتنی بار اس پر فدا ہوئی تھی۔ کتنی بار اسے اپنے آپ پر رشک آیا تھا کہ شیر دل کا نام اس کے نام کا حصہ تھا۔ آئینے میں نظر آنے والا مرد اس کے وجود کو اتنے سالوں سے اسی طرح اپنی انگلی کے گرد لپیٹے ہوئے تھا۔

شیر دل بالآخر مرکزی لان اور وہاں موجود flag pole کے بارے میں ہدایات سے فارغ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی تین سالہ مثال نے اس کی انگلی دوبارہ پکڑ لی تھی۔ شیر دل نے ذرا سا جھک کر بڑی سہولت کے ساتھ مثال کو اٹھا لیا پھر اپنے عملے کے افراد کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اس

cheval mirror کے سامنے کھڑی شہر بانو کو دیکھا۔ شہر بانو تب تک آئینے میں نظر آنے والے اس کے عکس سے نظریں ہٹا چکی تھی۔ اس نے آئینے میں شیر دل کو اندرونی دروازے کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ ذرا سا پلٹ کر وہ شیر دل کے انتظار میں رکی، ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ شیر دل اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ اس گھر میں پہلے آچکا تھا اور وہ جانتا تھا داخلی دروازے کے قریب رکھا یہ آئینہ اس کی بیوی کے قدموں کی زنجیر بننے والا تھا۔ شہر بانو وہاں نہ رکتی تو وہ حیرت سے مر جاتا۔ وہ اپنی بیوی کی پسند ناپسند سے کسی psychic کی طرح واقف تھا۔ اس حد تک کہ وہ اس گھر میں موجود ان تمام چیزوں کی لسٹ بنا کر دے سکتا تھا جن کے سامنے شہر بانو آج رکنے والی تھی......اور قیام لمبا ہوتا یا چھوٹا وہ یہ بھی بتا سکتا تھا...... نہ صرف یہ بلکہ وہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ اس گھر کی کون کون سی چیز اسے پسند نہیں آنے والی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کی تبدیلی کے انتظامات کر کے آیا تھا۔

"Isn't it beautiful" اس نے شیر دل کے قریب آتے ہی اس کے بازو پر غیر محسوس انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے اس تک اپنی ستائش پہنچائی تھی۔

"It is" شیر دل نے تائید کی۔ اس نے بھی اپنے سن گلاسز اب.... سر پر لگا لیے، وہ دونوں اب اس اسٹینڈنگ مرر کے بالکل سامنے ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ مثال کو گود میں لیے وہ ایک خوش و خرم خاندان کا عکس تھا۔ اوول مرر میں ان کا عکس گلے میں پہنے جانے والی کسی لاکٹ میں لگی تصویر کی طرح دکھ رہا تھا۔ مثال نے شیر دل کی گود سے اترنے کے لیے جدوجہد کی۔ شیر دل نے اسے جھک کر نیچے اتار دیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ٹیڈی بیئر کے ساتھ داخلی دروازے سے اندر بھاگ گئی تھی۔

"بہت پرانا لگتا ہے؟" شہر بانو اب اس مرر پر تبصرہ کر رہی تھی۔

"150 سال پرانا تو یہ گھر ہے اور یہاں موجود بہت سا فرنیچر انگریزوں کے زمانے کا ہی ہے۔ استعمال سے زیادہ ڈیکوریشن اور maintainance budget خراب کرنے کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے تب سے شاید......" شیر دل اندر جاتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔ عملے کے افراد نے ایک خوشامدی مسکراہٹ دی تھی صاحب کے اس تبصرے پر...... شیر دل اب اندر چلا گیا تھا۔ شہر بانو بھی اندر داخل ہو گئی۔ داخلی دروازے کو ان کے لیے کھول کر پکڑے ہوئے ملازم نے جیسے سکون کی سانس لی تھی۔ وہ دروازہ پکڑے پچھلے پندرہ منٹ میں وہاں اکڑ گیا تھا۔

وہ ایک راہداری نما کمان کی شکل کا برآمدہ تھا جس میں وہ داخل ہوئے تھے۔ وہ راہداری دونوں اطراف سے آگے گھر کے ان کمروں تک جاتی تھی جن کے دروازے فی الحال ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ پوری راہداری میں قدِ آدم کھڑکیاں تھیں جن کے اوپر پڑی ہوئی آرائشی چقیں اس وقت اٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں اطراف میں مختلف جگہوں پر کرسیاں، تپائیاں اور دیوان پڑے ہوئے تھے۔ وہ راہداری اس ٹیپیکل انگلش آرکیٹکچر کی ایک شاندار مثال تھا جو انگریزوں نے برصغیر میں یہاں کے موسمی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ اس راہداری کی قدِ آدم کھڑکیوں سے برصغیر کی مون سون اور یورپ کے سن باتھ دونوں سے لطف اندوز ہوا جا سکتا تھا۔

دیواروں پر اب اکثر جگہوں پر سیلن نظر آ رہی تھی، باہر کھڑکیوں اور دیواروں پر چڑھی بیلیں اس کی بنیادی وجہ تھی شاید۔

شہر بانو نے وہاں کھڑے کھڑے ایک ہی نظر میں اس پوری راہداری کا جائزہ لے لیا تھا۔ شہر دل اب داخلی دروازے کے بالکل سامنے اندر میں ہال میں کھلنے والے دروازے کی طرف جا رہا تھا جس کے دونوں پٹ پہلے ہی کھلے تھے اور اس ہال میں دور مثال مٹر گشت کرتی نظر آ رہی تھی۔ اس ہال نما کمرے کے آدھے حصے میں ڈائننگ ایریا تھا اور باقی کا آدھا حصہ سٹنگ ایریا کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

شیر دل نے ٹھیک کہا تھا وہاں اندر واقعی بہت سے ایسے فرنیچر آئٹمز تھے جو استعمال کرنے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر بانو اب مکمل طور پر awe میں تھی۔ وہ جیسے کسی اینٹک گیلری میں آ گئی تھی۔

''کیا فرنیچر ہے!'' وہ داد دیے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ اب ایک ایک چیز کے پاس جا کر جیسے اسے چھو کر اسے اپنا خراج پیش کر رہی تھی۔

چھت کے درمیان میں ایک فانوس بھی لٹکا ہوا تھا اور سٹنگ ایریا کا فرش کارپٹ اور rugs سے covered تھا۔ وہاں معمولی اضافوں کے باوجود سب کچھ اسی طرح رکھنے کی کوشش کی گئی تھی جیسے وہ کسی زمانے میں ہوتا ہو گا...... آتش دان تھا جہاں اب گیس ہیٹر نظر آ رہا تھا۔ بڑے بڑے روشن دان جو کبھی کھلے رہتے ہوں گے اب بند تھے اور ایک بہت بھاری بھرکم اسپلٹ یونٹ نے ان کے فرائض اپنے ذمے لے لیے تھے سب سے آکورڈ چیز اس ہال کمرے کا ٹائل فلور تھا جو اس کمرے میں داخل ہوتے ہی شہر بانو کی نظر میں آ گیا تھا اور جسے تبدیل کروانے کے لیے شیر دل کے عملے کا ایک آدمی ایک کیٹلاگ لیے وہاں کھڑا تھا۔ ہال کے بالکل سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بے حد کشادہ سیڑھی اوپر والی منزل پر جا رہی تھی۔

''I hate the floor'' شہر بانو نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

''And I have tha alteenative'' شیر دل نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''کیٹلاگ ہے ہی لے کے پاس اس میں سے ابھی ٹائل سلیکٹ کر لیتے ہیں...... وہ کچن ہے۔'' شیر دل نے اس سے کہتے کہتے دائیں طرف کمرے کے آخری کونے میں موجود ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چلتے کچن میں آ گئے تھے جہاں کام کرنے والا عملہ اب بے حد مستعد کھڑا تھا۔

''اور وہ دروازہ کچن گارڈن اور سرونٹ کوارٹر تک جاتا ہے۔'' شیر دل اسے مزید بتا رہا تھا۔ وہ دونوں اب ساتھ ساتھ عملے کو کچن کے حوالے سے ہدایات بھی دے رہے تھے۔

ڈی سی آفیسر کے طور پر شیر دل کی وہ پہلی پوسٹنگ تھی...... اس صوبے کے قابل ترین نوجوان آفیسرز میں وہ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ایک بے حد ممتاز مقام رکھتا تھا۔

شہر بانو ابھی تک کچن کا جائزہ لے رہی تھی جو نئے اور پرانے طرز تعمیر کا ایک funny display تھا وہ اس گھر کا واحد حصہ تھا جہاں ضرورت تخلیقی ذوق پر حاوی نظر آ رہی تھی۔ بڑے بے ڈھنگے انداز میں کچن اور pantry میں کیبنٹس اور ریکس کا اضافہ کیا گیا تھا اور مناسب صفائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کیبنٹس اور ریکس کے ساتھ دیواروں اور فرش کا حلیہ بھی خراب تھا۔ بڑے بڑے روشن دان وہاں بھی تھے اور کھانا پکانے والی جگہ

پر ایک بے حد شاندار چمنی بھی...... لیکن شہر بانو کو یقین تھا کہ وہ چمنی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر نہ سہی کافی حد تک بلاکڈ ہو گی۔ مکڑی کے جالوں، گرد و غبار اور شاید پرندوں وغیرہ کے گھونسلوں کی وجہ سے کبھی جو چمنی کے عقب میں دیواروں پر چڑھی بیلوں اور سبزے کی بہتات کی وجہ سے اگر روشن دانوں اور چمنی تک پہنچ گئے ہوں تو یہ ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ چمنی میں چڑیوں کے نہیں چمگادڑوں کے ٹھکانے تھے جن کا سامنا اسے بعد میں ہونے والا تھا۔

چمنی ہی کے حصے میں چولہا رکھنے کی جگہ سے کچھ اوپر دیوار میں ایک ایگزاسٹ فین لگایا گیا تھا جس کی باہر والی جالی چکنائی سے اٹی ہوئی تھی اور دھوئیں سے سیاہ تھی۔ نیچے موجود کوکنگ رینج بہت پرانا تو نہیں تھا لیکن کثرت استعمال اور ناقص صفائی سے وہ بھی اس وقت کم سے کم سو سال پرانا لگ رہا تھا۔ سنک کے پاس ایک بڑا واٹر فلٹر لگا ہوا تھا اور وہ اندر اور باہر سے جتنا گندا لگ رہا تھا اگر کوئی دیکھنے والا فلٹر کا نہیں بلکہ نلکے کا پانی پینے پر اصرار کرتا تو یہ سمجھداری سمجھی جاتی۔ ایسی ہی کچھ حالت پاس موجود سنک کی تھی۔

کچن میں جو تھوڑی بہت صفائی فی الحال موجود تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ وہاں پچھلے کئی دنوں سے کچھ نہیں پک رہا تھا۔ کم از کم اس کے علاوہ شیر دل کو اور کوئی وجہ نظر نہیں آئی تھی اگر اس کے وزٹ کو anticipate کرتے ہوئے کچھ صاف کرنے کی کوشش کی گئی تھی تو وہ بھی اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایسے متوقع اور یقینی وزٹ پر سرکاری عملے کی لیپا پوتی کی اس سے کئی بہتر کوششیں دیکھی تھیں...... ملامت اور ڈانٹ پھٹکار کا فی الحال کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ پروگرام بعد میں بھی منعقد کیا جا سکتا تھا فی الحال ضروری تھا کہ کچن میں جو تبدیلیاں مطلوب تھیں، ان کے بارے میں ہدایات دی جائیں سو شیر دل وہی کرتا رہا اور شہر بانو خاموشی سے کچن کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ہدایات کی صرف یہ پہلی قسط تھی۔ ایسی کئی اقساط آگے چل کر بھی ادا کرنی تھیں اسے اور شیر دل کو...... کیونکہ وہ گھر بلاشبہ شاندار تھا لیکن فرنیچر کے علاوہ وہاں مرمت کے کافی ایشوز تھے۔

''مجھے یہ تو نہیں پتا کہ شہر کی ایڈمنسٹریشن کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ اس شہر میں ہیپاٹائٹس سی کا وائرس پھیلا تو اس کی وجہ سے ڈی سی ہاؤس میں اس کچن میں پکا ہوا کھانا کھا کر جانے والے گیسٹ ہوں گے۔'' شہر بانو نے کچن سے نکلتے ہوئے اپنے عقب میں شیر دل کو کہتے سنا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ وہ شیر دل کے ان ٹنگ ان چیکس ریمارکس کی عادی تھی۔

''ماسٹر بیڈروم کہاں ہے؟'' واپس ہال میں آتے ہوئے اس نے شیر دل سے پوچھا۔

''اوپر......'' اس نے سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ شہر بانو حیران ہوئی وہ پہلا سرکاری گھر تھا جس کا ماسٹر بیڈروم اوپر تھا۔

''نیچے کیا بیڈروم ہی نہیں ہیں؟'' اس نے شیر دل سے پوچھا۔

''تین بیڈروم ہیں نیچے لیکن ماسٹر بیڈروم اوپر ہے۔'' وہ ایک بار پھر مثال کو گود میں لیے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ماسٹر بیڈروم ایک وسیع و عریض کمرا تھا لیکن شہر بانو کو اس کی حالت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ واضح طور پر وہ

بہت عرصے سے زیرِ استعمال نہیں تھا۔ فرش، دیواریں، کھڑکیاں، دروازے ہر چیز ابتر حالت میں تھی۔

''یہ کوئی استعمال نہیں کر رہا تھا؟'' شہر بانو نے جیسے کچھ حیرانی سے کمرے میں گھومتے ہوئے شیر دل سے پوچھا۔ کمرے میں برائے نام فرنیچر تھا اور وہ بھی خاصا خستہ حالت میں۔

''نہیں، برہان صاحب صرف نیچے کا فلور ہی استعمال کر رہے تھے...... وہیں کا ایک بیڈ روم ماسٹر بیڈ روم کے طور پر ان کے استعمال میں تھا۔'' شیر دل نے اسے بتایا۔

''یہ ماسٹر بیڈ روم تو بہت عرصے سے کوئی بھی ڈی سی صاحب استعمال نہیں کر رہے...... بند ہی رہتا ہے یہ...... سب لوگ نیچے ہی رہتے رہے ہیں۔'' پی اے نے شیر دل کی بات میں اضافہ کیا۔

''نیچے والے کمرے کیا زیادہ اچھے ہیں......؟'' شہر بانو نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہاں سے وہ آس پاس پھیلے وسیع و عریض لان اور لان سے دور سڑک تک دیکھ سکتی تھی۔ ویوز بردست تھا۔

''نہیں میڈم، وہ زیادہ اچھے تو نہیں ہیں لیکن شروع سے وہی استعمال ہوتے آرہے ہیں۔ وہاں جاری سہولیات ہیں۔ اس کمرے کے باتھ روم میں بھی ابھی پرانے fixtures ہی ہیں...... پھر چھت بھی کبھی کبھار ٹپکنے لگتی ہے اگر زیادہ بارش ہو جائے۔'' شہر بانو اور شیر دل نے پی اے کی بات پر بے اختیار سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ چھت کی حالت واقعی کافی خراب تھی اور وہ کبھی کبھار نہیں یقیناً باقاعدگی سے ٹپکتی تھی اور ایک جگہ سے نہیں بلکہ دو تین جگہ سے۔

''اور بھی کچھ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے یہ کمرا استعمال نہیں ہوتا۔'' پی اے نے بات جاری رکھتے ہوئے آخری جملہ کچھ ہچکچا کر کہا۔ شیر دل نے چونک کر اسے دیکھا

''اور کیا وجوہات ہیں؟'' پی اے چند لمحے جیسے کچھ تامل کرتا رہا...... پھر اس نے کہا۔

''اس کمرے میں کچھ اثرات ہیں۔'' شیر دل اور شہر بانو بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''کیسے اثرات......؟'' شیر دل نے ماتھے پر چند بلوں کے ساتھ کہا۔ پی اے نے سر ہلایا۔

''آپ کا مطلب ہے جن بھوت؟'' اس نے پی اے کے جواب سے پہلے ہی کہا۔ پی اے نے سر ہلایا۔ شیر دل نے اور شہر بانو نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

''مجھے تو پہلے نہیں بتایا تم نے یہ؟'' شیر دل نے کچھ تجسس کے عالم میں کہا۔

''میں نے سوچا آپ کو پتا ہی ہوگا۔'' پی اے نے کہا شہر بانو اب جیسے از سرِ نو اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

''مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے...... اور کیا بیک گراؤنڈ ہے ان جن صاحبان کا...... تنگ کرتے ہیں یا صرف رہائش پزیر ہیں......؟'' شیر دل بھی اب اس کمرے کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

''جن نہیں ہیں وہ......'' پی اے کچھ ہچکچایا...... شیر دل اور شہر بانو نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ ''وہ بونے ہیں۔'' پی اے نے بات مکمل کی۔

''بونے......؟'' شہر بانو نے شیر دل کو دیکھا۔

''Dwarfs'' اس نے جواب دیا اور ہنسا۔

''انٹرسٹنگ!'' وہ جیسے اس انکشاف سے لطف اندوز ہوا تھا۔

''تو بونے ہیں اس کمرے میں۔'' اب وہ مسکراتی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پی اے زیادہ سنجیدہ ہوا، اس کی ہنسی پر اسے لگا شیر دل کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

''کتنے بونے صاحبان ہیں یہاں......؟'' شیر دل نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''یہ مجھے تو نہیں پتا...... کتنے بونے ہیں یہاں؟'' پی اے نے وہاں کھڑے گھر کے ایک ملازم سے پوچھا۔

''ٹھیک سے تو نہیں پتا لیکن کہتے ہیں چار پانچ ہیں۔'' اس ملازم نے اس اچانک آنے والے سوال پر کچھ گڑبڑا کر جواب دیا۔

''اور کب سے ہیں یہ یہاں......؟'' شیر دل نے اب براہِ راست اس ملازم سے سوال جواب شروع کر دیے۔

''یہ بھی ٹھیک سے نہیں پتا سر جی...... کہتے ہیں ہمیشہ سے ہیں۔'' اختر، شیر دل کے براہِ راست سوال سے کچھ اور گڑبڑایا تھا۔

''ہمیشہ سے کب سے؟ جب سے گھر بنا ہے؟'' شیر دل نے بے ساختہ مسکرا کر شہر بانو کو دیکھا، وہ نہیں مسکرائی وہ کچھ متوحش تھی وہ وہمی نہیں تھی لیکن وہ بہر حال ان چیزوں پر یقین رکھتی تھی۔

''جن بھوتوں کا تو میں نے سنا ہے لیکن یہ بونوں کے بارے میں میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ تمہارا کوئی ایکسپیرینس یا انفارمیشن ہے؟'' شہر بانو نے شیر دل کے سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ وہ جانتی تھی وہ سوال نہیں تھا وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ اسے ہورر اسٹوریز پڑھنے کا شوق تھا اور خاص طور پر supernatural چیزوں کے حوالے سے۔

''تنگ کرتے ہیں؟'' شیر دل نے دوبارہ اختر سے پوچھا۔

''جی کبھی کبھی......''

''مثلاً کیا کرتے ہیں؟'' شیر دل نے مزید دلچسپی لی۔

''چیزیں چھپا دیتے ہیں...... آوازیں دیتے ہیں...... اسی طرح کے کام کرتے ہیں......'' اختر کچھ ہچکچا رہا تھا اس کمرے میں کھڑے ہو کر بونوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ جیسے کچھ پریشان تھا۔

''آوازیں دیتے ہیں؟ اچھا......'' شیر دل کو مزید تجسس ہوا۔ ''کسی نے دیکھا ہے انہیں......؟''

''بہت دفعہ۔'' اختر نے بے ساختہ کہا۔

''کس نے؟'' شیر دل سنجیدہ ہوا۔

''گھر میں جو ملازم ہیں انہوں نے دیکھے ہیں کئی بار۔''

''بس اس کمرے میں رہتے ہیں......؟'' شیر دل اب جیسے تفتیش کرنے کے موڈ میں تھا۔

''نہیں، صرف اس کمرے تک نہیں رہتے۔ گھر میں گھومتے پھرتے ہیں خاص طور پر کچن میں۔'' شیر دل، اختر کی سنجیدگی سے کہی بات پر بے اختیار ہنسا۔

''اچھا، کچن میں بھی گھومتے پھرتے ہیں۔''
اس کمرے کے بعد سب سے زیادہ کچن میں ہی اثر ہے ان کا۔'' اختر نے سنجیدگی سے بتایا۔ شیر دل بے حد معنی خیز انداز میں شہر بانو کو دیکھ کر مسکرایا پھر اس نے اختر سے کہا۔

''تو اس کمرے کو صرف بونوں کے رہنے کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے......؟'' اختر چند لمحوں کے لیے ہچکچایا پھر اس نے کہا۔

''اس کمرے میں کچھ اور بھی مسئلہ ہے۔'' اس نے بالآخر کہا۔

''اچھا ابھی کچھ اور باقی ہے...... فرمائیں اور کیا مسئلہ ہے اس کمرے کا۔'' شیر دل نے ایک گہری سانس لی۔ اسے ان تمام باتوں میں سے کسی ایک بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن فی الحال وہ ان ملازمین کے ساتھ بحث کے موڈ میں نہیں تھا خاص طور پر شہر بانو کے سامنے۔

''وہ جی...... وہ...... انگریزوں کے زمانے میں کسی ڈپٹی کمشنر کو اس کی بیوی نے قتل کیا تھا یہاں......'' شہر بانو کو جیسے کرنٹ لگا.... شیر دل اپنے سوال پر اب پچھتایا.... تجسس یقیناً ایک انتہائی مضر چیز ثابت ہوئی تھی اس کے لیے اب اگر شہر بانو اس گھر میں رہنے سے انکار کر دیتی تو یہ بالکل سمجھداری کی بات سمجھی جاتی۔

''اس کمرے میں قتل کیا تھا......؟'' شیر دل نے اب سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اس کمرے میں نہیں اوپر چھت سے گرایا تھا اس نے اپنے شوہر کو۔'' شیر دل نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''چلو، کم از کم اس کمرے میں تو کچھ نہیں کیا اس نے۔'' شیر دل نے جیسے شہر بانو کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کا جملہ اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔

''اس کمرے میں اس نے خودکشی کی تھی۔'' اختر نے باقی بات بتائی، شیر دل نے شہر بانو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اسے جو کچھ بتا رہا تھا اس کے بعد اس کمرے کو بے حد پسند کرنے کے باوجود شیر دل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں رہائش اختیار کرنے کا اس کا خواب صرف خواب ہی رہنے والا تھا شہر بانو اب یہ saga سننے کے بعد اگر اس گھر میں رہائش اختیار کرنے پر تیار ہو جاتی تو یہ بھی بہت بڑی فیور ہوتی اس کے لیے، وہ کمرا بھی اب تک اس سے پہلے وہاں آنے والے کسی بھی ڈی سی او نے کیوں استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اب وہ جان گیا تھا۔

''اور قتل کیوں کیا تھا، اب یہ بھی بتا دیں اختر صاحب؟'' شیر دل نے کچھ استہزائیہ انداز میں کہا۔ وہ ہفتہ پہلے اس گھر کا ایک سرسری جائزہ لینے کے لیے یہاں ہو کر گیا تھا اور یہ ماسٹر بیڈروم اس نے تب بھی دیکھا تھا جب کسی نے اتنی لمبی چوڑی تفصیلات بتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اس افسر کا کسی عورت کے ساتھ چکر تھا...... اس کی بیوی نے دونوں کو دیکھ لیا تھا پھر اس کے بعد ہی اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا۔'' اختر نے سنجیدگی سے کیا

''اس کہانی سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اگر کوئی چکر ہو تو کم از کم بیوی کے ہاتھوں پکڑے نہیں جانا چاہیے۔ برا افسر تھا جو پکڑا گیا...... اچھا افسر ہوتا تو کبھی پکڑا نہ جاتا...... یقیناً وہ اس سزا کا مستحق تھا۔'' شیر دل

نے بے حد سنجیدگی سے اس بار انگریزی میں تبصرہ کیا تھا جو صرف شہر بانو سن اور سمجھ سکی لیکن وہ بالکل محظوظ نہیں ہوئی تھی۔

''اس عورت کا کیا ہوا؟'' شیر دل نے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے خودکشی کر لی۔'' اختر پیچھے آتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں اس عورت کا پوچھ رہا ہوں جس کے ساتھ اس نے شوہر کو پکڑا تھا۔'' شیر دل نے کہا۔

''پتا نہیں سر اس کا تو مجھے پتا نہیں۔'' اختر گڑبڑایا۔ ''مجھے بس اتنی ہی کہانی آتی ہے۔''

''نہیں پتا تو پتا کر کے بتانا مجھے۔''

''شیر دل!'' ساتھ آتی شہر بانو نے جیسے اسے ٹوکا تھا۔ وہ جانتی تھی شیر دل کو کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا اور وہ اسے گوسپ کے سوا کچھ نہیں سمجھ رہا۔ شیر دل نے مسکرا کر اس کو دیکھا اور کہا۔

"Myths and fabrication" شہر بانو نے کہا۔

"Whatever but that 's what they believe"

''ذرا چھت پر بھی لے جاؤ...... دیکھیں ڈی سی صاحب کہاں سے گرائے گئے تھے۔'' شیر دل نے شہر بانو کی بات کا جواب دینے کے بجائے عملے سے کہا۔ عملے کے لوگوں میں یک دم افراتفری کے آثار پیدا ہوئے، چھت کے دروازے کی چابی ان کے پاس نہیں تھی۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی مسٹر اور مسز ڈی سی او چھت پر جانے کی خواہش کا اظہار کریں گے یا دوسرے لفظوں میں اس کی ہمت کر پائیں گے۔ یہاں مسز ڈی سی او کو تو چھت دیکھنے کا کوئی اشتیاق نہیں تھا لیکن ڈی سی او صاحب اگر چھت دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے تو اس کی وجہ جائے وقوع کے نظارے کی خواہش سے زیادہ چھت کے معائنے کی خواہش تھی اگر اوپر والی منزل کی چھت پچھلے کئی سالوں سے اس لیے ٹپک رہی تھی کیونکہ وہاں کوئی رہائش پذیر نہیں تھا تو 150 سال پرانی چھت کی یقیناً مناسب مرمت بھی نہیں کی جا رہی ہوگی اور زیادہ مخدوش ہو جانے پر وہ heavy چھت پورے مون سون میں زمین بوس بھی ہو سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے تک گھر میں چھت کی چابی کی تلاش کے لیے بھگدڑ مچی رہی اور جب عملے کو یقین ہو گیا کہ شیر دل کا چھت دیکھے بغیر ٹلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا تو بالآخر چابی برآمد ہو گئی۔ شیر دل اس دوران بڑے اطمینان سے دو کرسیاں منگوا کر شہر بانو کے ساتھ ماسٹر بیڈروم میں بیٹھا اپنے پی اے کے ساتھ ٹل کرنا ٹلز کی کیٹلاگ دیکھتا رہا، شہر بانو بری طرح بیزار بیٹھی رہی لیکن اس نے شیر دل کو وہاں سے چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا شیر دل وہاں سے جانے والا تھا بھی نہیں۔ شادی کے شروع کے دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیر دل اپنے پروفیشنل معاملات میں اس کی رائے کو نہ تو اہمیت دیتا تھا اور نہ ہی پسند کرتا تھا۔ شہر بانو نے کبھی اس کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی وہ زندگی میں کبھی کوئی ایسا کام کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی جو شیر دل کو ناپسند ہوتا۔ وہ اس سے ڈرتی نہیں تھی، وہ صرف پاگل پن کی حد تک اس کے عشق میں مبتلا تھی۔

عملے کے افراد نے چابی کی تلاش کے دوران چند بار شیر دل کو باقی گھر دکھانے کے لیے آمادہ کرنے کی

کوشش کی تھی۔

"باقی گھر چھت کے بعد۔" شیر دل کا جواب دوٹوک تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک بار وہ اسے اوپر والی منزل سے نیچے لے گئے تو پھر وہ نیچے اس کا اتنا وقت ضائع کرائیں گے کہ وہ یاد رہنے کے باوجود اوپر نہیں آپائے گا۔ اپنی سرکاری ملازمت کے دوران وہ ماتحت عملے کے سارے ہتھکنڈوں اور حربوں سے واقف ہو چکا تھا۔

جس چابی کی تلاش میں آدھا گھنٹا لگا تھا چھت کا تالا اس سے نہیں کھلا تھا۔ وہ زنگ آلود ہونے کے باعث توڑ کر کھولا گیا اور چھت پر پہلا قدم رکھتے ہی شیر دل کو پتا چل گیا تھا کہ عملہ چھت کو اس سے چھپانے کی کوشش میں کیوں مصروف رہا تھا۔ وہ چھت نہیں تھی جڑی بوٹیوں، جھاڑیوں، گھاس پھونس کا ایک جزیرہ نما جنگل تھا سردیوں کے موسم کے باوجود چھت پر کائی کی تہیں تھیں کئی جگہوں پر وہ کائی جیسے دلدل جیسی شکل اختیار کر گئی تھی اور کائی سے بھری ہوئی چھت پر جگہ جگہ مختلف جھاڑیوں نما پودے اگے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح وہاں اگ آئے تھے اس کا جواب سائنس دے سکتی تھی یا وہ سرکاری عملہ جن کے تعاون سے وہ نباتاتی گارڈن وہاں معرضِ وجود میں آیا تھا۔

شیر دل دو قدم سے آگے نہیں بڑھا۔ وہ اپنے جوتوں کا ستیاناس نہیں مار سکتا تھا اور اسے یقین تھا کہ کائی اور گھاس پھونس کے اس جزیرے میں ہر طرح کے حشرات الارض بھی ہوں گے اگر سانپ وغیرہ پائے جاتے تو بھی اسے حیرت نہیں ہوتی۔

"اگلی بار جب میں اس گھر میں آؤں گا تو سب سے پہلے چھت پر آؤں گا۔" اس کے اعلان میں کیا تنبیہہ تھی اس کا ماتحت عملہ جانتا تھا۔

"ماسٹر بیڈروم میں استعمال کروں گا اور چھت اب لاک نہیں ہوگی۔" وہ یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ شہر بانو اس سے پہلے ہی نیچے اتر رہی تھی اور اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا جملہ سن لیا تھا۔ وہ کسی صورت اس بیڈروم میں رہنے کو تیار نہیں تھی۔ وہاں بونے ہوتے نہ ہوتے لیکن یہ دوسرا قصہ اس کا دل اٹھانے کے لیے کافی تھا۔

پی اے نے ٹھیک کہا تھا نیچے والے بیڈرومز بے حد اچھی حالت میں تھے۔ وہاں تمام جدید سہولیات میسر تھیں اور شہر بانو نے بھی وہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اس نے فی الحال شیر دل سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔

گھر سے باہر نکلتے ہوئے شہر بانو اتنی خوش نہیں تھی جتنی وہ اندر جاتے ہوئے ہوئی تھی۔ بلاشبہ وہ گھر بہت شاندار طرزِ تعمیر کا حامل تھا اور آرکیٹیکچر شہر بانو کا میجر رہا تھا۔ وہ آرکیٹیکچر نہ بھی پڑھتی تب بھی اسے جنون کی حد تک اس سبجیکٹ میں دلچسپی تھی خاص طور پر راج کے زمانے میں بنائی جانے والی برصغیر کی پرانی عمارتوں میں۔

"بابا میرا ٹیڈی....." گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مثال نے یک دم شیر دل سے کہا وہ چونکا۔

"ٹیڈی کہاں چھوڑ دیا تم نے؟" اس نے مثال سے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔" جواب آیا تھا۔ عملے کے چند ارکان اندر دوڑے گئے تھے اور پندرہ منٹ ہر جگہ تلاش

کے باوجود وہ ٹیڈی کہیں نہیں ملا تھا۔

"Leave it miso ... baba will get you another tedy" شہر بانو نے بالآخر اس تلاش سے کچھ بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ مثال بڑی آسانی سے راضی ہوگئی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے شیر دل نے مثال کو بہلاتے ہوئے کہا۔ "Miso is a good girl" شہر بانو نے مسکرا کر مثال کو دیکھا جو شیر دل کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ "Yes Miso is a very good girl" کوئی ضد نہیں کرتی اب۔" شہر بانو نے کہا۔

"Baba I think I know who took my toy" مثال نے ان کے جملوں کے جواب میں یک دم بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"who?" شیر دل نے پوچھا۔

"There was a boy there, he was asking for my tedy. he wanted to play with it"

"I didn 't see any boy there" تم نے کہاں دیکھا؟" شیر دل نے کچھ حیران ہو کر کہا۔

"In the kitchen" مثال نے کہا۔

"When?" شیر دل حیران ہوا۔

"When I went in to that small room next to the kitchen" مثال نے ہاتھ کے اشارے سے لوکیشن سمجھانے کی کوشش کی شہر بانو سمجھ گئی وہ pantry کا ذکر کر رہی تھی۔ یقیناً وہ وہیں ٹیڈی بھول آئی تھی۔

"شاید کسی سرونٹ کا کوئی بچہ ہوگا۔" شہر بانو نے شیر دل سے کہا۔

"سرونٹ کے بیوی بچے کہاں سے آگئے، مشکل سے ملازموں کو ہی اکاموڈیٹ کیا ہوتا ہے۔ دیکھوں گا میں۔" شیر دل نے شہر بانو کو جواب دیا۔

"He was very ugly" مثال اب بھی بول رہی تھی۔

"who?" شیر دل پھر چونکا۔

"That boy" مثال نے سنجیدگی سے کہا۔

"No, that's not nice" شہر بانو نے اسے ٹوکا۔

"Mummy he was really ugly" مثال نے جیسے احتجاج کیا۔ "And very Small" مثال نے اضافہ کیا۔

"How small?" شیر دل نے پوچھا۔

"Only this much" مثال نے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے جیسے اس لڑکے کی جسامت بتائی۔ وہ تقریباً ایک فٹ کا سائز بتا رہی تھی۔ شہر بانو ہنس دی۔

"تمہاری بیٹی اور اس کی Fairy tales۔" شہر بانو نے شیر دل پر طنز کیا۔ مثال کہانیاں سنانے کی

عادی تھی اور شیر دل اس کی کہانیاں شوق سے سنتا تھا۔ شیر دل مسکرایا۔

"And then he disappeared" شیر دل نے مثال کے اگلے جملے پر دھیان دینے کے بجائے شہر بانو سے کہا۔

"تمہیں گھر کیسا لگا ہے؟"

"میرا خیال ہے ریسٹ ہاؤس پہنچ کر بات کرتے ہیں۔" شہر بانو نے جیسے شیر دل کو ڈرائیور کی موجودگی کا احساس دلایا۔ شیر دل کو اسی جواب کی توقع تھی...... یعنی شہر بانو کو اعتراضات تھے شیر دل نے بے اختیار گہری سانس لی۔

☆☆☆

کاؤنٹر پر پڑا شیشے کا گلاس بہت آہستگی سے کاؤنٹر پر سرک رہا تھا۔ سبزی والی ٹوکری میں سے ٹماٹر اٹھاتے ہوئے وہ ٹھٹکی تھی۔ شیشے کے اس گلاس میں پانی پی کر تھوڑی دیر پہلے اسی نے ہی اسے کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ گلاس ابھی بھی آدھا پانی سے بھرا ہوا تھا اور کاؤنٹر پر حرکت کرنے سے وہ پانی مسلسل ہل رہا تھا۔ خیر دین آٹا گوندھتے ہوئے ابھی بھی اسے قصہ سنانے میں مشغول تھا۔

"تو پھر صاحب نے مجھے کہا خیر دین میں نے تم سے اچھا خانساماں آج تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں آٹھ شہروں میں پوسٹ رہا ہوں...... لیکن جیسی دال تم بناتے ہو میں نے آج تک کہیں اور نہیں کھائی...... اگر پورے پاکستان میں بیسٹ دال پکانے کا مقابلہ ہو جائے تو تم کو پہلا انعام ملے گا۔ تمہاری دال کے سامنے کسی کی دال نہیں گلے گی۔" وہ قصہ سناتے ہوئے آٹے کی پرات پر مکمل طور پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔ اس نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ چڑیا نہ تو اس کی طرف متوجہ تھی نہ ہی اس کی بات سن رہی تھی۔

وہ اچنبھے کے عالم میں بس اس گلاس کو دیکھ رہی تھی جو کاؤنٹر پر خود ہی حرکت کر رہا تھا...... یا شاید چل رہا تھا۔ اس کے ننھے ذہن نے اس کی حرکت کو نام دینے کی کوشش کی۔ اس دن اس کی ٹیچر نے اسکول میں یہی سکھایا تھا ہر ایکشن کے لیے درست لفظ کا استعمال کرنے کی کوشش...... ہر حرکت کا ایک نام بھی ہوتا ہے۔

"The glass is moving" اس کے ننھے ذہن نے اس حرکت کرتے ہوئے گلاس پر پہلی نظر ڈالتے ہوئے بے اختیار سوچا تھا اور پھر وہ اس موومنٹ کے لیے لفظ کی تلاش میں مشغول ہو گئی۔

"The glass is walking" اپنے محدود علم اور ذخیرہ الفاظ کا استعمال اس نے گلاس کی حرکت کو نام دینے کے لیے کیا اور اس کے دماغ نے جیسے اسے ریڈ سگنل دیا۔

"واک تو زندہ چیزیں کرتی ہیں۔" اس وقت پہلی بار اس کا ذہن گلاس کی حرکت کو نام دینے کی جدوجہد سے ہٹ کر اس بات پر اٹکا کہ ایک بے جان چیز "واک" بھی کیسے کر رہی تھی۔ وہ اب بے جان اور جان دار چیزوں کی خصوصیات کو Skim کر رہی تھی۔ چند سیکنڈز میں اس کے ذہن نے Skinming اور screening کے بعد گلاس کو بے جان کی کیٹگری میں ہی ڈالا...... اور تب اس نے اپنے ذہن کو جیسے اس اچنبھے کا شکار ہونے کی اجازت دی جس کا شکار وہ اس وقت تھی۔

"گلاس تو بے جان ہے پھر یہ حرکت کیسے کر رہا ہے؟" یہ سوال تھا جو اس وقت اسے کنفیوز کر رہا تھا اور کنفیوز کرنے سے زیادہ اسے متجسس کر رہا تھا۔ "کیا کوئی ایسی حالت ہوتی ہے جس میں بے جان گلاس بھی حرکت کر سکتا ہے......؟" اس کا ذہن اب جیسے کوئی نئی دریافت کرنا چاہ رہا تھا...... اور وہاں کھڑے اس پُراسرار انداز میں حرکت کرنے والے گلاس اور اس کے اندر تھرکتے پانی کو دیکھتے ہوئے چڑیا کو خوف یا دہشت نام کی کوئی چیز محسوس نہیں ہوئی تھی...... محسوس ہونا تو دور کی بات تھی اس نے خوف نامی عنصر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی بڑا اچانک ایک گلاس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھ لیتا تو یا تو چیخیں مارتے ہوئے اس کچن سے بھاگ جاتا یا پھر پورے گھر کو وہاں اکٹھا کر لیتا مگر کوئی بھی اس کی طرح وہاں کھڑے اپنے آج کے سبق کو اس گلاس پر اپلائی کرنے کی کوشش نہ کر رہا ہوتا۔

"صاحب نے جب کمشنر صاحب کو کھانے پر بلایا تھا تب بھی انہوں نے خاص طور پر مجھ سے وہ دال پکوائی۔ کمشنر صاحب کو اتنی پسند آئی کہ وہ پچاس روپے انعام دے کر گئے مجھے، ان کی جو بیگم صاحبہ تھیں انہوں نے تو باقاعدہ ترکیب لکھوائی مجھ سے۔" خیر دین اب بھی مگن انداز میں آٹا گوندھتے ہوئے دال نامہ سنا رہا تھا۔ "کہہ رہی تھیں کہ کسی رسالے میں بھی بھیجیں گی وہ اس دال کی ترکیب کو...... میں نے بھی کہا بیگم صاحبہ جہاں مرضی چھپوا لیں جو ذائقہ خیر دین کے ہاتھ کا ہے وہ خیر دین کی پکی ہوئی دال میں ہی ملے گا اور......"

"نانا کوئی گلاس چل سکتا ہے کیا خود ہی؟" چڑیا نے ایک دم خیر دین کو ٹوکا، وہ اب اپنے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کترتے ہوئے بے حد الجھے انداز میں گلاس پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ یوں جیسے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"ہیں......!" خیر دین آٹا گوندھتے گوندھتے گڑبڑایا۔ اس نے چڑیا کو دیکھا اس کو لگا اس نے سننے میں کوئی غلطی کی تھی۔

"کیا پوچھ رہی تھیں تم؟" اس نے چڑیا کی نظروں کا تعاقب کیے بغیر صرف ایک نظر اسے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا کوئی گلاس چل سکتا ہے؟" چڑیا نے اسی سنجیدگی کے ساتھ گلاس پر نظریں جمائے سوال دہرا دیا۔ خیر دین بے اختیار ہنسا یوں جیسے وہ چڑیا کے سوال سے بے حد محظوظ ہوا ہو۔

"لو بھلا، گلاس کیسے چل سکتا ہے؟ گلاس کوئی زندہ تھوڑی ہوتا ہے۔" وہ دوبارہ آٹا گوندھنے لگا۔

"ہو سکتا ہے کوئی گلاس زندہ ہوتا ہو۔" اس بار خیر دین اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسا تھا لیکن آٹا گوندھتا رہا۔

"نہیں بیٹا، کوئی بھی گلاس زندہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی چل سکتا ہے۔" اس نے بڑی محبت سے چڑیا کے سوال کا جواب دیا وہ سارا دن یہی ایک کام کرتا تھا...... صبح سے لے کر رات تک چڑیا کے سوالوں کا جواب دیتا رہتا تھا اور یہ اس کی زندگی کا پسندیدہ ترین کام تھا اس سے وہ کئی گنا زیادہ شوق سے اس کے سوالوں کا جواب دیتا تھا جتنے شوق سے وہ اپنی مشہورِ زمانہ دال بناتا تھا۔

وہ اس کی اکلوتی نواسی تھی...... اس کی اکلوتی بیٹی کی اکلوتی اولاد حلیمہ کے دوسرے شوہر سے زندہ بچ جانے والی واحد اولاد حلیمہ اور خیر دین کی متاعِ حیات۔

پنجاب کا ایک پسماندہ گاؤں خیر دین کا آبائی علاقہ تھا اور وہ اس علاقے سے دس جماعتیں پڑھنے والا تو

پہلا لڑکا نہیں تھا لیکن سرکاری ملازمت میں آنے والا پہلا آدمی ضرور تھا اور وہ سرکاری ملازمت بھی ڈپٹی کمشنر کے گھر کا مالی..... تقرر نامہ ملتے ہی گاؤں میں خیر دین کے گھر کا اسٹیٹس ہی بدل گیا تھا۔ وہ ذات کا لوہار تھا اور گاؤں کا کمی کمین اور سارا بچپن اور نوعمری اس نے گاؤں کے کمی کمین کی حیثیت سے چوہدری، نمبردار، پٹوری اور اونچی ذات اور زمینوں والوں کی رعایا کے طور پر ان کی جی حضوریوں ہی میں گزاری تھی' گاؤں میں تھا تے دار نہیں تھا ورنہ ان کے آقاؤں میں ایک اور اضافہ ہو جاتا اور ویسی زندگی اس نے اپنے ماں باپ اور ددھیال ننھیال کے لوگوں کو گزارتے دیکھی تھی۔ ان کے گھر کا راشن فصلوں کی کٹائی سے ملنے والے دانوں سے نکلتا تھا اور اس گاؤں میں ان کی زمین بس ایک کنال کا وہ احاطہ تھا جس کے ایک کونے میں اس کے باپ نے لوہے کے اوزار بنانے اور مرمت کرنے کی بھٹی لگا رکھی تھی اور دوسرے کونے میں ماں نے دانے بھوننے کی اور تیسرے کونے میں ایک گدھے، دو بھینسوں، چار بکریوں پچیس مرغیوں، تین کتوں، چار بلیوں، آٹھ بطخوں اور خرگوشوں کے تین جوڑوں کا ایک خاندان آباد کیا گیا تھا اور احاطے کے چوتھے کونے میں چار کمروں، برآمدے اور دالان پر مشتمل ان کا گھر 21 افراد کے زیرِ رہائش تھا جن میں خیر دین کے دس بہن بھائیوں کے علاوہ دادا دادی اور کچھ ددھیالی رشتے دار بھی شامل تھے اور انیس افراد کے اس کنبے کو رزق فراہم کرنے کی مستقل ذمے داری صرف خیر دین کے ماں باپ پر تھی۔

ان انیس افراد میں خیر دین واحد خواندہ تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور خیر دین کے ماں باپ کی دوسری اولاد سات سال بعد ہوئی تھی تو وہ سات سال اپنے محدود وسائل اور غربت کے باوجود خیر دین نے بادشاہ کی طرح گزارے تھے۔ اس کے ماں باپ کو اسے پڑھانے کا شوق گاؤں میں انگریزوں اور ان کے ساتھ آنے والے سوٹ بوٹ میں ملبوس ان ہی کی طرح گٹ پٹ کرتے والے ہندوستانیوں، کالے انگریزوں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر ہوا تھا۔

''میں نے تو اپنے خیر دین کو پڑھا لکھا کر افسر بنانا ہے۔'' خیر دین ابھی دو سال کا تھا جب اس کی ماں نے ایک دن ڈپٹی کمشنر کے دورے کے بعد خیر دین کے باپ کے سامنے اعلان کیا تھا۔

''یہ تیری میری طرح بھٹی میں نہیں جھونکے گا اپنی زندگی... افسر بنے گا، جیپ میں آیا کرے گا..... اس کے ساتھ بندوقوں والے سنتری ہوں گے اور جو بھی اس سے ملنے آئے گا وہ پہلے کئی کئی گھنٹے انتظار کرے گا پھر لائن میں لگے گا پھر میرے بیٹے کو ملے گا۔'' خیر دین کا باپ حقے کی نے اپنے منہ میں دبائے بیوی کے خیالی پلاؤ سن سن کر ہنستا رہا۔ ان کے گاؤں کے پاس سے نہر گزاری جارہی تھی اور اس کی تعمیر و توسیع کے سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی سرکاری افسر اپنے چھتے کے ساتھ وہاں آن موجود ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ان دوروں کے عادی ہو گئے تھے۔ انگریز کا زمانہ تھا اس لیے افسروں کی بڑی تعداد انگریزوں ہی کی تھی۔ ہندوستانی صرف ان کے ماتحت کے طور پر دم ہلاتے ان کے ساتھ چلتے پھرتے رہتے صرف ایک بار ایک ہندوستانی افسر وہاں آیا تھا اور گاؤں میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس ہندوستانی افسر کے پاس ہاجرہ بی بی بھی پہنچی تھی اور واپس آتے ہوئے دو سال کے خیر دین کو اٹھائے وہ طے کر چکی تھی کہ خیر دین نتھو لوہار کی بھٹی نہیں سنبھالے گا بلکہ وہ دفتر میں کام کرے گا۔ گدھے اور ریڑھے پر سفر کرتے اپنی زندگی نہیں گزارے گا بلکہ اس ہندوستانی افسر کی شاندار جیپ میں بیٹھ کر کہیں بھی آیا جایا کرے گا۔

سات سال تک نتھو لوہار اور ہاجرہ بی بی یہ خواب پالتے رہے ایک ایک ٹکا بچا کر خیر دین کو تعلیم دلوانے کی کوشش کرتے رہے پھر ساتویں سال دوسرے بچے اور اس کے بعد ہر سال ایک بچے کی پیدائش نے ہاجرہ اور نتھو کے ذہن سے اسٹیٹس تبدیل کرنے کے بھوت کو نکال کر بھوک کے جن کو ان کے پیٹ میں قید کر دیا تھا لیکن خیر دین تب تک بگڑ چکا تھا..... ماں باپ کے دھکے، گالیاں، گھونسے کھانے کے باوجود وہ بستہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن دس دس میل دور پیدل اسکول جانے کے لیے تیار تھا۔

ملازمت کی تلاش اس نے دفتر میں شروع کی تھی اور یقیناً اسے مل جاتی لیکن ڈپٹی کمشنر کے گھر میں مالی کی نوکری کے لیے اس نے دفتر میں کلرکی چھوڑ دی تھی۔ یہ اس کی ماں کا خواب تھا اور وہ جیسے اپنی ماں کے خواب کی تعبیر کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر انگریزی زبان اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنتی تو وہ مالی کے بجائے اس گھر کا صاحب بننے کی کوشش بھی کرتا لیکن انگریز نے برصغیر کے عوام کو پاور اور اتھارٹی سے دور رکھنے کے لیے انگریزی زبان کی باڑ رعایا اور حاکم کے درمیان لگائی تھی۔ کسی زمین پر نہیں لگائی تھی، ذہن میں لگا دی تھی یہ جیسے پول والٹ کا پول تھا بلندی تک پہنچنے کا واحد ذریعہ۔

اور خیر دین کے ساتھ وہی ہوا تھا جو ہو سکتا تھا..... ڈپٹی کمشنر کے گھر ہیڈ مالی کے ساتھ کام کا آغاز کرنے میں اس کی دس جماعتوں سے زیادہ اس کی گاؤں میں کھیتی باڑی کا تجربہ کام آیا تھا۔ وہ اس ضلع کا پہلا اور واحد فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس مالی تھا اور چند مہینوں میں اس نے اپنی محنت اور ذہانت سے صاحب کا اعتماد جیت لیا تھا۔ مالی کا کام کرتے کرتے وہ صاحب کے کچن میں پارٹ ٹائم خانساماں کے فرائض بھی انجام دینے لگا..... شروع میں اس نے بیرا گیری کی اور خانساماں کے معاون کے طور پر کام کرتا رہا لیکن پھر ایک وقت آیا کہ جس دن خانساماں چھٹی پر ہوتا اور خیر دین کھانا بنا کر ٹیبل سجاتا..... کھانے کی میز کی شکل ہی کچھ اور ہوتی، کھانے کے ذائقے کی تو خیر بات ہی الگ تھی..... صاحب نے اس کو پھر آؤٹ آف داوے پرموشن دینے میں دیر نہیں کی تھی۔

خیر دین گھر کے باہر سے گھر کے اندر آ گیا تھا..... وہ گاؤں میں فخر یہ سب کو بتاتا تھا کہ وہ سارا دن ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں گزارتا ہے..... اتنا وقت جتنا صاحب بھی نہیں گزارتا..... چند اور مہینوں میں خیر دین نے جیسے ڈپٹی کمشنر ہاؤس کا حلیہ بدل کر رکھ دیا۔ وہ صاحب اور بیگم صاحبہ کا رائٹ ہینڈ مین تھا جس پر اب وہ اندھا اعتماد کرتے تھے..... خیر دین اب خانساماں نہیں بٹلر تھا..... وہ انگریزی زبان جو وہ تعلیم حاصل کرنے کے دوران کہیں سے نہیں سیکھ سکا تھا وہ اس نے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر اور اس کی میم صاحب سے سیکھی تھی اور دو سال کے دوران وہ انگریزی اس لہجے میں بولنے لگا تھا جس میں صرف لندن کے west end میں رہنے والے بولتے۔ وہ کوئنگ لرز تھا اور اپنی اس کوالٹی کی وجہ سے اپنے صاحب کا چہیتا تھا کیونکہ یہ خصوصیت ہندوستانیوں میں بہت کم پائی جاتی تھی۔

گاؤں میں اب خیر دین کے گھر کے باہر اس کی نیم پلیٹ تھی جس پر خیر دین کے نام کے نیچے اس کی designation اور اس کی مختصری designation کے نیچے اس کے صاحب کا نام اور صاحب کی designation کی تفصیلات مع صاحب کے سرکاری گھر اور سرکاری دفتر کے موجود تھیں اور اس نیم

پلیٹ نے خیر دین کے خاندان کو کمی کمین نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ اب انگریز کا ملازم تھا۔'' اسے گاؤں کے ہر اونچی ذات کے چوہدری، برہمن، بنیے، پٹواری کے سامنے جھکنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

وہ اس گاؤں کا پہلا اور خاص طور پر اپنی برادری کا پہلا رول ماڈل تھا۔ بدقسمتی سے اور روایتی طور پر اس کے اپنے بہن بھائیوں میں سے کوئی اور ایک بھی اس رول ماڈل سے انسپائر ہو کر اس کے نقشِ قدم پر چلنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ ان کے بڑھا نکنے کو بڑے بھائی کا اسٹیٹس کافی تھا۔ اس کے چھ کے چھ بھائی پہلی دوسری جماعت سے ہی اسکول چھوڑ آئے تھے اور بہنوں کو تو خیر اس زمانے میں تعلیم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خیر دین کے بھائیوں کے لیے یہ بہت کافی تھا کہ بڑا بھائی کچھ بن گیا تھا اور وہ اس کے فخر کو اپنے سینے پر میڈل کی طرح لگا کر پھرتے رہتے تھے۔ خیر دین اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ گھر ہی بھیجتا تھا اور اس آمدنی نے اس کے گھر کی حالت تو بہتر کرنا شروع کر دی لیکن خود اس کے خاندان میں سے بہت سوں نے کمانا چھوڑ دیا۔ خیر دین کو بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں باپ کی بھیٹوں پر نہ بیٹھنے کے باوجود بھی اسے اپنی زندگی کو محنت کی بھٹی میں جھونکنا ہی تھا۔

سترہ سال کی عمر میں صاحبِ روزگار ہوتے ہی اس کی شادی ہو گئی تھی۔ خیر دین کو اسی مالی نے اپنا داماد بنا لیا تھا جس کے ساتھ خیر دین نے کمشنر کے گھر میں نوکری شروع کی تھی۔ اس کا سسرالی گاؤں اس کے شہر سے قریب تھا اور طور طریقوں کے اعتبار سے اس کے اپنے گاؤں سے زیادہ بہتر حالت میں تھا۔ اس کی بیوی اختری بی بی بھی کئی حوالوں سے اس کے لیے بے حد خوش قسمتی اور ترقی کا باعث بنی تھی۔ شہر میں آتے جاتے رہنے کی وجہ سے پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود اختری کو اوڑھنے پہننے کا سلیقہ تھا اور وہ اور خیر دین آگے بڑھنے کے لیے ایک جیسا passion رکھتے تھے۔ ان کی صرف ایک بیٹی ہوتی تھی حلیمہ اور خیر دین نے اپنے خاندان کے دباؤ کے باوجود مزید اولاد نہ ہونے پر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس نے حلیمہ کو دسویں تک تعلیم دی..... خیر دین کی طرح وہ بھی اپنی برادری میں دس پاس کرنے والی پہلی لڑکی تھی اور پھر خیر دین نے اس کی شادی اپنے خاندان سے آنے والے تمام رشتوں کو چھوڑ کر ایک سرکاری دفتر کے اردلی سے کی تھی۔ چھ ماہ میں وہ سرکاری اردلی طاعون کی وبا کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا اور تب خیر دین کے ہی ایک اور اچھے صاحب نے اپنی کوشش سے حلیمہ کی دوسری شادی اپنے ڈرائیور سے کروائی تھی۔ خیر دین کو اپنی طرح اپنی بیٹی کی قسمت پر بھی رشک آتا تھا۔ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کے ذاتی ڈرائیور کی بیوی تھی اور اس کا شوہر شادی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اسے بھی اپنے سرکاری کوارٹر میں لے آیا تھا۔

چڑیا کی پیدائش ایک ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے کوارٹر میں ہوئی تھی جہاں اس کا باپ ڈرائیور اور اس کی ماں ڈپٹی کمشنر کے بچوں کی آیا تھی۔ شادی کے چار سالوں میں چڑیا کے بعد حلیمہ کے ہاں وقفے وقفے سے دو مرتبہ اولادوں کی ولادت ہوئی اور دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔ شادی کے چوتھے سال اس کا شوہر نہر میں نہاتے ہوئے ڈوب گیا..... حلیمہ کا گھر دوسری بار اجڑ گیا تھا۔ دو بیٹوں کی موت نے جو زخم لگائے تھے شوہر کی موت نے انہیں انمٹ کر دیا تھا لیکن بہرحال حلیمہ کا شوہر کوئی بہت آئیڈیل شوہر نہیں تھا اس کے رزق کا وسیلہ اور سائبان اس کی وفات کے فوراً بعد اس ڈپٹی کمشنر کی بیرون ملک ڈیپوٹیشن آ گئی تھی۔ حلیمہ باپ کے کوارٹر میں نہیں رہ سکتی تھی۔ شاید صاحب اور ان کی بیوی اسے رہنے کی اجازت دے ہی دیتے لیکن اب وہ

روزہ کس چیز سے کھولنا مستحب ہے

حضرت سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''جب کوئی روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ خشک کھجور سے روزہ کھولے اگر (کھجور) نہ ملے تو پانی سے روزہ کھول لے کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔'' (ترمذی)

مرسلہ: ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس

اعتکاف کی حالت میں

سنن ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ''معتکف کے لیے سنت ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے اور نہ کسی جنازے پر حاضر ہو اور نہ اپنی عورت کے قریب جائے اور کسی حاجت کے لیے اپنی جگہ سے باہر نہ نکلے مگر جس کے لیے نکلنا بے حد ضروری ہو جیسا کہ کھانا پینا یا قضائے حاجات کے لیے جانا۔ اگر معتکف ایسے کاموں کے لیے نکلا اور مسجد سے خارج ہی وضو کر کے واپس آ گیا تو اس کے اعتکاف میں کوئی خلل نہ ہوگا۔''

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

سرکاری رہائش گاہ کسی اور کے زیر استعمال آ گئی تھی۔ حلیمہ، چڑیا کو لے کر مجبوراً گاؤں چلی گئی۔ چڑیا اب خیر دین اور حلیمہ کی زندگی کا محور تھی اور خیر دین کے لیے اس سے الگ رہنا بے حد مشکل تھا۔ نیا صاحب اور اس کی بیوی نوکروں سے بہت فاصلہ رکھتے تھے اور خیر دین کسی بھی طرح اپنے سرکاری کوارٹر میں حلیمہ اور چڑیا کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

تبھی خیر دین اور حلیمہ کی قسمت کے ستارے ایک بار پھر گردش سے باہر آئے۔ خیر دین نے کسی زمانے میں ایک ڈپٹی کمشنر کے ساتھ کام کیا تھا جو بعد میں دوسرے صوبے میں چلا گیا تھا لیکن اسی دوران وہ دوبارہ پوسٹ ہو کر اسی ڈویژن میں آ گیا اور اس نے وہاں پوسٹ ہوتے ہی خیر دین کی اپنی سرکاری رہائش میں ٹرانسفر کروالی تھی نہ صرف یہ بلکہ ان میاں بیوی نے حلیمہ کو بھی ایک بار پھر بچوں کی آیا کے طور پر رکھ لیا تھا۔

وہ تین سال چڑیا کی زندگی کے سب سے اہم سال ثابت ہوئے تھے۔ چڑیا نے اپنی ابتدائی تعلیم ماں اور نانا سے حاصل کی تھی۔ وہ خیر دین کی طرح بے حد ذہین اور کوئک لرنر تھی۔ اپنی عمر کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس کا کونسنٹریشن اسپین بہت زیادہ تھا۔ وہ ایک کام کو شروع سے آخر تک ایک جیسے انہماک اور لگن سے کرتی تھی۔

گاؤں میں حلیمہ اسے تختی لکھوایا کرتی تھی اور تختی پر الف سے یے تک لکھے کسی حرف میں فرق نہیں ہوتا تھا۔ کہیں لکھنے والے کی اکتاہٹ، تھکاوٹ یا عدم دلچسپی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ہاتھ کی لکھائی بعد میں خیر دین کی لکھائی کی طرح ہوتی گئی تھی۔ الف بے خیر دین کا چیلنج نہیں تھا۔ خیر دین کا چیلنج abc تھا اور چڑیا کے لیے وہ دونوں تفریح تھے۔ وہ ماں سے جوڑ توڑ سیکھتی اور نانا کے آنے پر ان سے اسپیلنگ..... اس کا ذہن جیسے ایک اسفنج تھا جو سب کچھ چوس رہا تھا اور اپنے اندر اسٹور کرتا جا رہا تھا۔ ساری زندگی چڑیا کا ذہن اسفنج کی طرح

سے ہی کام کرتا رہا تھا۔ صرف علم نہیں تھا جو وہ چوس کر اپنے اندر رکھتی تھی...... اپنے خیالات، مشاہدات، تکلیف، خوشی...... اور بہت کچھ وہ اپنے اندر ہی سمیٹے رکھنے کی عادی تھی۔

وہ ساڑھے تین سال کی عمر میں حلیمہ کے ساتھ گاؤں کے اسکول گئی تھی اور وہاں جا کر حلیمہ کو پتا چلا کہ گاؤں کا وہ پرائمری اسکول چڑیا کے ایک ہاتھ کی مار تھا۔ وہاں کوئی بچہ نہ علم میں چڑیا کے سامنے ٹھہر سکتا تھا نہ اپنی تمیز میں۔

وہ اسکول میں آنے والی واحد بچی تھی جو پورے یونیفارم میں آتی تھی اور وہ بھی صاف ستھرے...... اور وہ تقریباً ایسا ہی صاف ستھرا یونیفارم لے کر جاتی اگر کئی بار اسے اسکول کے صحن میں درخت کے کچے کھلے میدان میں زمین پر بیٹھ کر پڑھنا پڑتا۔ چھٹی کے وقت تک بھی اس کی چھوٹی سی چٹیا اور سر پر لگی ہیئر پنز یوں ہوتے جیسے اس نے ابھی کنگھی کر کے بال بنائے ہوں، اس کی قمیص کی فرنٹ پاکٹ میں ایک رومال ہوتا تھا جس سے چڑیا وقتاً فوقتاً اپنا پسینہ صاف کرتی رہتی یا فلو ہو جانے پر چھینکنے پر ناک سے بہنے والا پانی...... وہ واحد چیز تھی جو وہ دانستاً گندہ کرتی ہوگی۔ شروع شروع میں اسکول میں اس کا وہ رومال استانیوں کے لیے مذاق اور تفریح کا باعث بنا تھا۔ وہ اسکول جہاں سب کچھ ہاتھوں، آستینوں، دوپٹوں اور قمیص کے دامن سے صاف کرنے کا رواج تھا وہاں ساڑھے تین سال کی ایک بچی جس کی عمر داخلے سے بھی کم تھی بلو پھولوں والے ایک سفید رومال کو اتنے طریقے اور سلیقے سے کھولتی استعمال کرتی اور پھر تہ کر کے رکھتی کہ استانیوں کے لیے یہ جیسے ہنسی کا سامان ہوتا۔ چڑیا کی سنجیدگی اور سلیقے پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، وہ استانیوں کے جملوں پر سرخ ہوتی مسکراتی، شرماتی لیکن رومال کو اسی طرح استعمال کرتی اور رکھتی جیسے خیر دین نے اسے سکھایا تھا۔

اس کے بستے میں موجود نوٹ بکس اور کتابیں اگر کبھی خراب ہوئی ہوں گی تو استانیوں کے ہاتھوں سے ہوئی ہوں گی ورنہ چڑیا خود انہیں ایک خزانے کی طرح سنبھال کر طریقے اور احتیاط سے رکھتی تھی۔ کوئی اس کا بستہ کھول کر دیکھتا تو نوٹ بکس اور کتابوں کی ترتیب دیکھ کر بھی حیران رہ جاتا۔ اس کے بستے میں ہر چیز اس کی پراپر جگہ پر تھی اور ہمیشہ پراپر جگہ پر ہی رہتی تھی۔ چڑیا اگر پچاس دفعہ پینسل نکالتی تو ہر بار اسے واپس رکھتے ہوئے جیومیٹری باکس میں ہی رکھتی۔ اسی ترتیب سے جس ترتیب میں اس کے جیومیٹری باکس میں چیزیں تھیں۔

چھ ماہ چڑیا اس اسکول جاتی رہی اور چھ ماہ اس کی استانیوں کو اسے کچھ پڑھانا نہیں پڑا وہ جیسے ایک ritual تھی جو پوری ہو رہی تھی۔ چھ ماہ بعد حلیمہ اور چڑیا دوبارہ نئے شہر میں خیر دین کے پاس آ گئے تھے اور یہاں جیسے چڑیا کا ایک نیا جنم ہوا تھا۔

ڈپٹی کمشنر کی بیوی ڈاکٹر فرح ایک بے حد رحم دل عورت تھی۔ حلیمہ اس کے تین بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی اور حلیمہ کی وجہ سے چڑیا بھی دن میں کئی بار ماں کے پیچھے گھر میں جاتی۔ ڈاکٹر فرح کو چڑیا اپنی عادتوں اور ذہانت کی وجہ سے بے حد اچھی لگتی تھی۔ ایک گورنمنٹ کے سرکاری اسکول سے ایک انگلش میڈیم اسکول تک چڑیا کو لے جانے والی وہی تھیں اور اس انگلش میڈیم اسکول کے سلیبس کو چڑیا کے لیے آسان بنانے والی بھی وہی تھیں جو اکثر اوقات اپنے بچوں کو پڑھاتے ہوئے چڑیا کو بھی پاس بٹھا لیتی تھیں۔

چڑیا اردو میڈیم نصاب سے انگلش میڈیم نصاب میں جتنی آسانی اور سہولت سے ایڈجسٹ ہوئی تھی اس نے ڈاکٹر فرح کو حیرانی سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ چڑیا gifted تھی اور اس کا اظہار سب سے پہلے انہوں نے ہی خیر دین اور حلیمہ سے کیا تھا۔ چڑیا پر انہیں محنت نہیں صرف کچھ توجہ دینی پڑی تھی اور اس توجہ کا ثمر چڑیا نے

ایک کے بعد ایک کلاس میں ٹاپ کر کے دیا تھا۔

مناسب سے نقش و نگار اور بے حد سیاہ گہری چمکتی آنکھوں اور سانولی رنگت والی چڑیا ایک چڑیا ہی کی طرح دبلی پتلی لیکن پھرتیلی تھی۔ اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اور اس کی بے حد ملائم میٹھی سریلی آواز اس کی دو امتیازی خصوصیات تھیں۔ جو اگر نہ ہوتیں تو چڑیا کو بچوں کے ہجوم میں پہچاننا مشکل ہوتا...... لیکن وہ عجیب طریقے سے نوٹس ہوتی تھی۔

ڈاکٹر فرح کے بچوں کو ہفتے میں ایک بار میوزک ٹیچر موسیقی سکھانے آتے تھے اور وہ سارا وقت چڑیا کو سرگم سکھاتے رہتے۔ چڑیا کوئل کی طرح گاتی تھی اور فرح اور اس کا شوہر عابد مسعود اگر گھر پر ہوتا تو چڑیا کے گیت سننے کے لیے خود بھی آ کر اپنے بچوں کے پاس بیٹھ جاتا۔

"کیا بنو گی تم چڑیا بڑی ہو کر؟" ڈاکٹر فرح کو اس سے گپ شپ لگانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اکثر اس سے بھی بات چیت کرتی رہتی تھی۔

"میں ڈاکٹر بنوں گی۔" چڑیا بے حد اعتماد سے اسے بتاتی۔

"پھر کیا کرو گی؟" وہ اسے مسکراتے ہوئے مزید کریدتی۔

"پھر میں علاج کروں گی۔" کھٹاک سے جواب آتا۔

"کس کا علاج کرو گی؟"

"جو بیمار ہوگا۔"

"اور اگر کوئی بیمار نہ ہوا تو؟" فرح اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس سے کہتی۔

"پھر ریسٹ کروں گی۔" بلاتوقف جواب آتا۔

"لیکن ڈاکٹر تو ریسٹ نہیں کرتے۔"

"پھر آپ کیوں کرتی ہیں۔" ڈی سی کی بیوی بے اختیار ہنستی، وہ لاجواب ہو جاتی اور یہ اکثر ہوتا تھا۔ اس بچی کی زبان بے حد صاف تھی اعتماد بلا کا تھا۔ لب و لہجہ بے حد شستہ اور آواز میٹھی۔

"حلیمہ تمہاری بیٹی بڑی ترقی کرے گی۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ اسے بہت پڑھانا۔" وہ ہر بار چڑیا سے ایسے کسی مباحثے کے بعد کہتی۔ حلیمہ کا سیروں خون بڑھتا یہ سن سن کر باپ بیٹی چڑیا کی تعریفیں اگلے کئی دن

ایک دوسرے کو دُہرا کر سناتے اور ہر بار یوں سنتے اور سناتے جیسے پہلی بار ہو۔

بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کا خواب حلیمہ نے ڈی سی کی اس بیوی کو دیکھ دیکھ کر ہی کیا تھا چڑیا کی جگہ اس کا بیٹا ہوتا تو وہ اسے ڈپٹی کمشنر بنانے کا خواب دیکھتی جیسے اس کی دادی نے خیر دین کے بارے میں دیکھا تھا مگر چڑیا لڑکی تھی اور وہ لیڈی ڈاکٹر ہی بن جاتی تو بھی بہت بڑی بات ہوتی۔ وہ ان کے گاؤں اور برادری کی پہلی ڈاکٹر ہوتی...... جیسے خیر دین پہلا سرکاری ملازم...... حلیمہ دسویں جماعت پاس کرنے والی پہلی لڑکی...... اور چڑیا......

☆☆☆

خیر دین نے چڑیا کی بات پر چونک کر کاؤنٹر پر دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔ گلاس ابھی بھی اسی طرح اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا...... خیر دین نے بے اختیار آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ چڑیا نے الجھے انداز میں خیر دین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نانا اگر یہ گلاس زندہ نہیں ہے تو پھر یہ گلاس کیوں چل رہا ہے؟''

''بیٹا آیت الکرسی پڑھو۔'' خیر دین نے جواباً اسے کہا۔ چڑیا کچھ حیران ہوئی لیکن پھر اس نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ چند منٹوں بعد گلاس کی حرکت رک گئی خیر دین اطمینان سے دوبارہ آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گیا یوں جیسے چند لمحے پہلے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

''اب صاحب نے کہا ہے کہ مونگ کی بھنی ہوئی دال اور......'' اس نے دوبارہ قصہ شروع کیا۔ چڑیا نے اسے ٹوکا۔

''نانا یہ گلاس کیوں چل رہا تھا؟'' اگر خیر دین کی یہ کوشش تھی کہ چڑیا کا دھیان اس گلاس کی طرف سے ہٹ جائے تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ ٹماٹر چھوڑ کر خیر دین کے پاس آ گئی تھی۔ یہ جیسے اس بات کا اعلان تھا کہ اسے دال کی فتوحات سے زیادہ اس چلتے ہوئے گلاس میں زیادہ دلچسپی تھی۔ خیر دین نے گہری سانس لی۔

''یہ جو دنیا ہے نا بیٹا اس میں ہمارے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں رہتی ہیں۔'' خیر دین نے اسے سمجھانا شروع کیا۔

''اور کون سی چیزیں......؟'' چڑیا نے ٹوکا۔

''کچھ ایسی چیزیں جو نظر نہیں آتیں۔'' خیر دین نے کہا۔

''جیسے ہوا، حرارت۔'' چڑیا نے بے ساختہ جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے خیر دین لاجواب ہوا۔

''اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں...... جیسے جن بھوت، پریاں اور بونے وغیرہ......'' خیر دین نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ جن بھوت، پریوں پر نہیں اٹکی تھی بونوں کے لفظ پر اٹک گئی تھی۔ جن بھوتوں اور پریوں سے تو وہ ماں اور نانا کی سنائی ہوئی کہانیوں کے ذریعے پہلے ہی متعارف تھی لیکن بونوں کا لفظ اس کے لیے نیا تھا۔

''یہ بونے کیا ہوتے ہیں؟'' اس نے کچھ الجھ کر خیر دین سے پوچھا۔

''یہ ہماری طرح بہت چھوٹے چھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔''

''کتنے چھوٹے؟'' خیر دین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا۔

''اتنے چھوٹے۔'' چڑیا کی آنکھیں اور ہونٹ اکٹھے پھیلے تھے۔

''سچی میں نانا......؟'' تجسس، اشتیاق اور ایک عجیب سی خوشی کے ساتھ اس نے خیر دین سے پوچھا۔

''جیسے snow white dwarfs کے دوست تھے۔'' برق رفتاری سے اس کے ذہن نے اسے ایک illustrated اسٹوری بک کی یاد دلائی۔ خیر دین کو سنو وائٹ کا پتا تھا نہ اس کے دوست سیون ڈارف کا...... لیکن اس نے سر ہلا دیا تھا۔ چڑیا کا دل جیسے بلیوں اچھلا تھا۔

''نانا یہاں ڈارفس ہیں کیا؟'' اس نے بے حد جوش سے خیر دین سے پوچھا۔

''بیٹا آہستہ، اتنی اونچی آواز سے ان کا نام نہیں لو، وہ ناراض ہو جائیں گے۔'' خیر دین نے اسے ٹوکا۔

''نانا آپ مجھے دکھا سکتے ہیں، وہ کہاں ہیں؟'' اس بار چڑیا نے خیر دین کے ساتھ چپک کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔ اس کے ذہن میں اس فیری ٹیل کی رنگین illustration گھوم رہی تھیں۔ خوب صورت ٹوپیوں اور لباس میں ملبوس کیوٹ، موٹے اور شرارتی ہنس مکھ بونے جو سنو وائٹ کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے اور سنو وائٹ کے سو جانے پر غم سے بے حال ہو گئے تھے۔

''نہیں، میں نہیں دکھا سکتا لیکن جب بھی تمہیں گھر میں کوئی عجیب چیز ہوتی نظر آئے تو تم بس کلمہ پڑھنا، الحمد شریف پڑھنا، قل ھو اللہ پڑھنا، آیت الکرسی پڑھنا...... اور ڈرنا نہیں......'' خیر دین اسے سمجھا رہا تھا۔

وہ کئی سالوں سے اس گھر کے بارے میں بہت کچھ سنتا آ رہا تھا اور وہاں کام کرنے کے دوران اس نے بہت سارے عجیب و غریب واقعات ہوتے دیکھے تھے۔ وہ شروع میں خوفزدہ ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا خوف ختم ہوتا گیا۔ وہ سب کچھ جیسے معمول کی بات تھی اس کے لیے بلکہ گھر میں کام کرنے والے دوسرے نوکروں کے لیے بھی...... گھر میں موجود ان بونوں نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

''لیکن میں یہ سب کیوں پڑھوں؟'' چڑیا الجھی۔

''تا کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں وہ...... ابھی تم نے دیکھا گلاس چلنا بند ہو گیا۔'' خیر دین نے اسے رسانیت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے کچھ مایوسی سے اس ساکت گلاس کو دیکھا وہ خیر دین کو بتا نہیں سکی کہ گلاس کی حرکت بند ہو جانے پر وہ مایوس ہوئی تھی مطمئن نہیں، وہ اب ہر قیمت پر ان بونوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔



سنووائٹ کے ساتھیوں جیسے نٹ کھٹ تیز وطرار اور کیوٹ ڈارف۔

اپنی زندگی کے چھٹے سال میں یہ اس گھر میں ہونے والا پہلا غیر معمولی واقعہ تھا جو چڑیا نے دیکھا۔ اگر اس سے پہلے اس نے کچھ دیکھا تھا تو اس کا ذہن اسے مافوق الفطرت سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ اب خیر دین کی وجہ سے اس گھر کے اندر باقاعدگی سے آرہی تھی اور ڈی سی کی بیوی کی نرم مزاجی اور رحم دلی کی وجہ سے گھر کے ان حصوں میں بھی آجا رہی تھی جہاں عام طور پر نوکر یا نوکروں کے اہل خانہ میں سے کبھی کوئی نہیں جاتا تھا۔ اس سرکاری رہائش گاہ میں ویسے بھی حلیمہ اور چڑیا کسی نوکر کے واحد اہلِ خانہ تھے جنہیں رہائش کی اجازت دی گئی تھی ورنہ ان کے علاوہ وہاں موجود تمام نوکر اپنی بیوی کو ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔

وہ چلنے والا گلاس اور وہ بونے چڑیا کے ذہن پر سوار ہو گئے تھے۔ اگلے دن اسکول جا کر اس نے ریڈنگ روم میں پڑی اسٹوری بکس میں سے سنووائٹ کی اسٹوری بک دوبارہ نکال لی تھی۔ کتاب کے صفحات پر ڈارفس کی illustration اسے مکمل طور پر مسحور کیے رہیں۔ پورا دن وہ ڈارف اس کے سر پر ناچتے رہے وہ جیسے سنووائٹ بنی ہوئی تھی۔

وہ چڑیا کی زندگی کا جیسے ایک نیا باب تھا۔ وہ گھر پہلے اس کے لیے گھومنے پھرنے کی جگہ تھا اب ایک دریافت گاہ تھا۔ وہ ان ڈارف سے دوستی کرنا چاہتی تھی ویسی دوستی جیسی سنووائٹ نے کی تھی اور وہ اس فرینڈ شپ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ بالکل سنووائٹ کی طرح جو ان بونوں کے لیے کھانا بناتی، ان کے کپڑے دھوتی، ان کا گھر صاف کرتی۔

خیر دین نے اسے یہ نہیں کہا تھا کہ گھر میں سات بونے ہیں کیونکہ گھر میں کتنے بونے تھے یہ مکمل یقین کے ساتھ کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن چڑیا نے خود ہی اپنے ذہن میں ان بونوں کی تعداد متعین کر لی تھی...... وہ بھی سات تھے...... اور اس نے ان کے نام بھی رکھ لیے تھے...... انہیں دیکھے بغیر صرف اسٹوری بک کی illustrations کو دیکھ دیکھ کر اس کے ذہن میں سات بونوں کی شکلیں اور حلیے بیٹھ گئے تھے۔

سب سے بڑا بونا بہت موٹا تھا اور اس کی اس کے پیروں جتنی داڑھی تھی اس کا نام ٹوکو تھا، دوسرا بونا بہت ہی پتلا اور بے حد چالاک لگتا تھا اس کی آنکھیں بٹن کی طرح گھومتی رہتی تھیں اس کا نام کٹو تھا، تیسرا بونا جوکر جیسی گول اور موٹی ناک والا تھا جو ہر وقت چھینکتا رہتا تھا اس کا نام ٹنٹو تھا، چوتھا بونا گنجا تھا اور اس کا موٹا سا پیٹ تھا وہ دونوں پاؤں پورے کھول کر بہ مشکل چلتا تھا۔ اس کا نام ٹوفو تھا، پانچواں بونا عینک لگائے رہتا تھا اور پھر بھی چیزوں سے ٹکراتا پھرتا تھا اس کا نام منغا تھا، چھٹا بونا لمبے لمبے بالوں والا تھا اور چلتے ہوئے بے مقصد ہانپتا تھا، اس کا نام کنغا تھا اور ساتواں بونا سب سے چھوٹا اور سب سے شرارتی تھا اس کا نام ڈیڈو تھا اور ڈیڈو چڑیا کا فیورٹ بونا بھی تھا۔

چڑیا کی زندگی میں یک دم جیسے بہت سارے رنگ بھر دیے تھے ان سات تصوراتی بونوں نے...... جو اس گھر میں کہیں رہتے تھے لیکن کہاں رہتے تھے یہ کوئی یقینی طور پر نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کسی کو یہ اشتیاق تھا کہ ان کا حدودِ اربعہ دریافت کرے ماسوائے چڑیا کہ جو اس گھر کے ہر کونے کھدرے میں اب ٹوکو، کٹو، کنغا، منغا، ٹنٹو، ٹوفو اور ڈیڈو کو ڈھونڈتی رہتی تھی۔

اسکول سے واپسی کے بعد وہ ہمیشہ اس وقت خیر دین اور حلیمہ کے پاس ضرور جا کر کچھ وقت گزارتی تھی جب وہ گھر میں کچن کا کام کرتے یا ڈاکٹر فرح کے بچوں کو سنبھال رہے ہوتے تھے لیکن اب وہ بے مقصد ایک چکر گھر میں ان بونوں کی تلاش میں ضرور لگاتی تھی۔ یہ اس کا وہ راز تھا جس کے بارے میں خیر دین اور حلیمہ نہیں جانتے تھے۔

چڑیا نے دوبارہ ان بونوں سے متعلقہ کوئی چیز چند مہینوں بعد ایک دن لنچ کے لیے ڈائننگ ٹیبل ارینج کرتے دیکھی تھی۔ ٹیبل کے سینٹر میں ایک vase میں کچھ پھول شاخوں سمیت رکھے ہوئے تھے۔ چڑیا ہمیشہ خیر دین کی ٹیبل سیٹ کرنے میں مدد کرتی تھی اور اس وقت بھی وہ ٹیبل پر میٹس رکھنے میں مصروف تھی جب اس نے ان پھولوں میں سے ایک کی پتیاں نیچے گرتے ہوئے دیکھی تھیں، وہ ٹھٹک گئی، پتیاں یوں نیچے گر رہی تھیں جیسے کوئی انہیں نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا۔ چڑیا کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی..... اس نے ایک نظر خیر دین کو دیکھا، وہ اپنے کام میں مصروف تھا اس کا دھیان پھولوں کی طرف نہیں تھا۔ چڑیا نے اس دن خیر دین کی توجہ ان گرتی پتیوں کی طرف نہیں کرائی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سب کچھ پہلے کی طرح رک جائے اس کے آیت الکرسی پڑھنے پر..... وہ کن انکھیوں سے گرتی پتیوں کو دیکھتے ہوئے ٹیبل پر کانٹے چھریاں لگاتی رہی۔

ایک کے بعد ایک پھول کی پتیاں گرتی گئی تھیں چند منٹوں میں ٹیبل کے درمیان..... ایک vase میں صرف پتوں والی کچھ ڈنڈیاں پڑی تھیں، ان کی تمام پتیاں vase کے ارد گرد ایک سرکل کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں۔ خیر دین نے اپنے دوسرے چکر میں وہ پتیاں اور پھولوں کی خالی ڈنڈیاں نوٹس کرلی تھیں۔ وہ ٹھٹکا تھا۔

"یہ تم نے کیا ہے چڑیا؟" اسے یقین نہیں تھا کہ چڑیا ایسا کام کرسکتی ہے لیکن اس نے پھر بھی پوچھا۔ چڑیا خیر دین کے سوال پر چونکی پھر اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نانا..... میں نے تو کچھ نہیں کیا، یہ خود بخود گر گئیں۔" خیر دین اس کی بات پر ایک دم پھر کچھ گھبرائے انداز میں اسی طرح لاحول اور آیت الکرسی پڑھنے لگا چڑیا نے بے اختیار گہری سانس لی۔ نانا اب پھر ان بونوں کو بھگا رہا تھا۔ وہ آج بھی ان کو نہیں دیکھ سکتی تھی وہ بری طرح مایوس ہوئی تھی۔

اور پھر اکثر ایسی بہت ساری چیزیں وہ دیکھنے لگی تھی جس پر دوسرے آیت الکرسی پڑھتے اور چڑیا دعا کرتی...... کہ وہ کسی نہ کسی طرح کوئی بونا دیکھ لے۔

گھر کا ایک صرف اوپر والا حصہ تھا جہاں چڑیا کبھی نہیں گئی تھی اور جہاں جانے کا اسے بے حد اشتیاق تھا۔ ایک آدھ بار وہ اوپر گھوم پھر کر آئی تھی مگر اوپر کے سارے کمرے بند تھے اور چھت بھی...... اور اوپر والے حصے میں ایک عجیب سی خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ اسے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس کے لیے وہ دوبارہ اوپر والی منزل پر جاتی۔

اس ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں یہ چڑیا کی زندگی تھی۔ اسکول جانا...... اور اسکول کے بعد ڈاکٹر فرح کے پاس پڑھنا...... اس کے بچوں کو کھلانا...... خیر دین کے ساتھ کچن میں چھوٹے موٹے کام کرنا...... کچن گارڈن میں لگی سبزیوں کی دیکھ بھال کرنا...... اور گھر میں بونوں کی تلاش کرنا...... ٹوکو، کٹو، مٹا، کٹا، شنٹو، ڈیڈو، ٹوفو سے خود ہی باتیں کرتے رہنا وہ اس کے ساتھ اس کے کچن گارڈن کی سبزیاں اتارتے تھے، پچھلے لان میں لگے آم کے درخت پر جھولا جھولتے اور اسے جھلاتے تھے۔ اس کے ساتھ جامن اور لوکاٹ اور انگور توڑ کر کھاتے تھے اور



اسے پتا نہیں کن کن دنیاؤں کے قصے سناتے تھے...... یا پھر آپس میں جھگڑا کرتے رہتے تھے...... اس کے ساتھ شرارتیں کرتے تھے، اس کی پونی کھینچ لیتے...... جوتا لے کر بھاگ جاتے...... اس کی کتابیں چھپا دیتے...... اس کے کھلونوں سے کھیلتے...... اس کی قمیص کھینچتے...... اس کی جرابیں پہن لیتے، وہ ہنستی کبھی غصہ کرتی کبھی ڈانٹتی کبھی ان کی پٹائی کر دیتی۔

چڑیا کو گھر میں بونے نظر نہیں آتے تھے لیکن اس نے اپنے تصوراتی سات بونوں کو اس گھر میں جگہ دے دی تھی، وہ ان بونوں کی سنو وائٹ تھی اور وہ اس کے loyal friends جو اس پر جان دیتے تھے...... اور یہ وہ راز تھا جو صرف چڑیا کو پتا تھا۔ خیر دین اور حلیمہ کو بھی نہیں۔

خیر دین اور حلیمہ اسے کئی بار اکیلے میں کھیلتے، پڑھتے، کام کرتے اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھتے تھے...... یہ ایک نئی عادت تھی جو چڑیا میں آئی تھی لیکن انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ بچے اس عمر میں یہی سب کرتے تھے...... کنفا، منفا، شنشو، ٹوفو، ڈیڈو، کٹو، ٹوکو کے نام بھی انہوں نے کئی بار سنے تھے۔ وہ یہی سمجھے تھے کہ یہ چڑیا مختلف چیزوں کے لیے یہ نام استعمال کرتی ہے۔ کسی بونے تک ان کا ذہن بھی نہیں گیا تھا لیکن چڑیا اب بہت خوش رہنے لگی تھی ان دونوں نے صرف یہ نوٹس کیا تھا۔

انہی دنوں ڈاکٹر فرح کے شوہر کی پوسٹنگ آگئی تھی۔ یہ خیر دین اور حلیمہ کے لیے پریشانی کی چیز تھی۔ اس بار وہ کوشش کے باوجود خیر دین اور حلیمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ البتہ انہوں نے آنے والے ڈپٹی کمشنر سے بات کر کے خیر دین کو حلیمہ اور چڑیا کو سرکاری کوارٹر میں ساتھ رکھنے کی اجازت لے لی تھی نہ صرف یہ بلکہ ڈاکٹر فرح نے اس نئے ڈپٹی کمشنر کی بیوی سے حلیمہ کو اپنی بچی کی آیا کے طور پر رکھنے کے لیے بھی بات کی، وہ حلیمہ کے لیے ایک مستقل آمدنی کا سلسلہ برقرار رکھ کر جانا چاہتی تھی تاکہ حلیمہ کو چڑیا کے تعلیمی اخراجات کے لیے دقت نہ ہو۔ نیا ڈپٹی کمشنر اس کے شوہر کا بیچ میٹ تھا اور اس حوالے سے ڈاکٹر فرح اس کی بیوی کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

''آپ لوگ فکر نہ کریں...... وہ دنوں میاں بیوی بہت اچھے ہیں، بہت اچھے خاندان کے ہیں دونوں اور نوکروں اور عملے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' ڈاکٹر فرح نے جانے سے پہلے خیر دین اور حلیمہ کو تسلی دی تھی۔

''میں نے ان سے چڑیا کی تعلیم کے حوالے سے بھی بات کی ہے...... آیا کے طور پر حلیمہ کو تو شاید وہ نہ رکھیں کیونکہ ان کی ابھی ایک ہی بیٹی ہے اور وہ بھی چھوٹی ہے لیکن ڈی سی کی بیوی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ چڑیا کی تعلیم کا خیال رکھیں گے۔ تعلیم کے اخراجات اٹھانے پڑے تو وہ بھی اٹھا لیں گے لیکن چڑیا کی اسکول فیس تو میں ہی بھجواتی رہوں گی۔۔ اس لیے اس کے بارے میں تو آپ پریشان نہ ہوں۔''

چڑیا نے اس گھر میں بونے تو نہیں دیکھے تھے لیکن خیر دین اور حلیمہ کو ڈاکٹر فرح کی شکل میں ایک پری ضرور ملی تھی۔ جس کے چلے جانے پر خیر دین اور حلیمہ ہی نہیں چڑیا بھی بے حد رنجیدہ تھی۔

ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں نیا ڈپٹی کمشنر اپنی بیوی اور تین سالہ بیٹی کے ساتھ آنے والا تھا...... اور چڑیا اپنی زندگی کا پہلا حقیقی، بدصورت اور خوفناک بونا دیکھنے والی تھی۔

باقی آئندہ



بس ایک لمحہ

عائشہ خان

''حادیہ یار اب آ بھی جاؤ۔'' چند ہی لمحوں میں رمیض کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

''آپ بھی نا رمیض...... پانچ منٹ کہے تھے میں نے...... اور ابھی ایک منٹ بھی نہیں ہوا......'' اس نے موبائل اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''تو میں کیا کروں حادی ڈیئر...... مجھے تو لگ رہا ہے ایک سال گزر گیا ہے مجھے تمہارا انتظار کرتے ہوئے۔''

اس کے اس قدر مبالغے پر حادیہ نے پلٹ کر مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

وہ چہرے پر انتہائی مسکینیت طاری کیے اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔

حادیہ جو آج ہی اپنی ساری جیولری پر بننے والی زکوٰۃ کا حساب لگالینا چاہتی تھی، رمیض کے جلد آجانے کی وجہ سے اس کا سارا پروگرام چوپٹ ہوگیا تھا۔ رسیدیں اور پین ڈائری کے اندر رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اتنی مرتبہ کہا ہے کہ جلدی آنا ہو تو فون کردیا کریں مگر نہیں جی......''

''لوگ دیر سے آنے پر بیویوں کو بتاتے ہیں' میں جلدی آنے پر بھی بتایا کروں۔''

''لوگ آپ کی طرح دیوانے بھی تو نہیں ہوتے نا......'' اس نے بے حد محبوبیت سے شوہر کو دیکھا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے...... سچ مچ دیوانہ کردیا ہے تم نے، اِدھر مہمان نکلے اُدھر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ سب مذاق کرنے لگے اور پتا ہے مما کیا کہہ رہی تھیں۔'' وہ شوخی سے اسے دیکھتا ہوا شریر سے انداز میں ہنسا تھا۔

وہ خاموش رہی، جانتی تھی انہوں نے کچھ الٹا سیدھا ہی کہا ہوگا...... وہ رمیض کی ضد پر اسے بیاہ تو لائی تھیں مگر اُن کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے ہمیشہ ناگواری ہی دیکھی تھی۔

''ویسے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں مما......'' اس نے جیسے اسے چڑایا تھا اور وہ جو ایسی باتوں کو عام طور پر اگنور کردیا کرتی تھی' اسے صبح کی ان کی باتیں یاد آگئی تھیں اور وہ چڑ بھی گئی۔

''اب بتا بھی دیں کہ کیا کہہ رہی تھیں آپ کی مما جانی اور میری تائی جی......'' اس نے تائی کو خاصا لمبا کرتے ہوئے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

''حادیہ کی بچی! میری اتنی ماڈ اور کیوٹ سی مما کی ساری شخصیت صفر کر کے رکھ دیتی ہو تم، تائی جی کہہ کر...... ویسے وہ صرف یہ کہہ رہی تھیں کہ جانے کون سا جادو ہے اس لڑکی کے پاس کہ تمہیں شادی کے بعد سوائے اس کے کچھ نظر ہی نہیں آتا...... اور ان کی اس بات سے میں سو فیصد متفق ہوں...... واقعی مجھے آگے پیچھے دائیں بائیں' دور نزدیک ہر طرف صرف تم ہی تم نظر آتی ہو۔'' شرارت سے اسے دیکھتا وہ اس کی جانب بڑھا تھا لیکن تبھی اس کے سیل کی بیپ بجنے لگی۔ وہ فون سننے لگا اور حادیہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''مما! آپ نے کیا صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے؟'' اس کے جلدی اٹھ جانے پر ان کے ناراضی کے اظہار نے رمیض کا موڈ خراب کردیا تھا۔ بات تھی بھی موڈ خراب کرنے والی کہ یہ سب باتیں وہ اس کے نکلتے نکلتے بھی اسے سنا چکی تھیں پھر دوبارہ فون کر کے وہی راگ الاپنے کی کیا ضرورت تھی...... اس نے بہ مشکل خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔

''تمہاری حادیہ بیگم آج اپنے زیورات کی تفصیل مجھ سے دریافت فرمارہی تھیں، اگر زبان میں ہلنے کی سکت ہو تو پوچھ لینا اس کی کیا ضرورت آن پڑی ہے اسے؟'' انہوں نے بے حد جلے بھنے لہجے میں کہا۔

''مما! حادیہ زکوٰۃ کا حساب کررہی تھی اسی سلسلے میں پوچھا ہوگا......''

''یہ تو وہ کہہ رہی تھی نا!''

''مما! حادیہ غلط بات نہیں کرتی۔'' بے اختیار ہی اس نے کہا اور پھر کہہ کر پچھتایا...... اب مما کے لمبے چوڑے لیکچر سے بچنا مشکل تھا لیکن حیرت انگیز طور پر دوسری طرف خاموشی رہی تھی۔

''حادیہ غلط بات نہیں کرتی لیکن تم تو کرتے ہو اور وہ بھی اپنے ماں باپ سے۔'' چند لمحوں کے سکوت کے بعد انہوں نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''اب میں نے کون سی غلط بیانی کردی ہے مما......؟'' بے بسی سے کہتے ہوئے وہ ایک نئی فردِ جرم سننے کے لیے تیار ہوگیا۔

''تم کہہ رہے تھے کہ گاڑی لینے کے بعد تمہارے پاس بینک میں صرف چند ہزار ہیں...... تو پھر یہ تمہاری حادیہ بیگم کہاں سے اتنی زکوٰۃ نکال رہی ہیں؟'' انہوں نے بے حد کاٹ دار لہجے میں کہا اور رمیض کو ان کے انداز پر خاصا افسوس ہوا۔ حادیہ کتنی محبت کرتی ہے مما سے اور مما۔

''مما میں نے آپ سے سو فیصد سچ کہا، آپ اچھی طرح جانتی ہیں، میں ابھی قطعاً نئی گاڑی نہیں لینا چاہتا تھا لیکن آپ کی ضد تھی کہ میں ثمرہ کی منگنی سے پہلے گاڑی چینج کرلوں...... اب واقعی میرے پاس چند ہزار ہی ہیں جس سے میں ثمرہ اور اس کے فیانسی کے لیے گفٹ لوں گا...... حادیہ اپنی جیولری سے ہی کوئی سیٹ بیچ کر زکوٰۃ دینے کا کہہ رہی تھی۔ میں نے کافی کہا کہ وہ دو ماہ تک شعیب گاڑی کے بقایا پیسے دے گا تو زکوٰۃ دے دیں گے مگر اس کا خیال ہے کہ اللہ کے احکامات کی بروقت تعمیل ہی اس کی سچی اطاعت ہے۔'' رمیض نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے پوری بات بتائی۔

''بھئی صاف بات ہے...... میں تو یہ قطعاً نہیں مان سکتی' ایک عمر گزاری ہے میں نے بھی...... کبھی کسی کو زیور بیچ کر زکوٰۃ دیتے نہیں دیکھا...... لیکن تمہیں کون سمجھا سکتا ہے؟ تمہیں تو صرف وہی کچھ نظر آتا ہے جو وہ تمہیں دکھاتی ہے۔'' وہ کہہ رہی تھیں اور رمیض جو ابھی کچھ دیر قبل بے حد خوشگوار موڈ میں تھا بجھ کر رہ گیا۔

جانے کیا وجہ تھی جب سے اس کی شادی ہوئی، مما کو اس سے بے حد شکایتیں رہنے لگی تھیں...... وہ جتنا ان کی ناراضی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا اسی قدر وہ اس سے ناراض رہتی تھیں...... ایک دن یہی بات جب اس نے پاپا سے کہی تو وہ خوش دلی سے ہنس دیے تھے۔

''یہ ایک تمہارا مسئلہ نہیں ہے برخوردار...... اکثر نوجوانوں کا مسئلہ ہے...... اس لیے میری جان...... اس کو ذہن پر طاری مت کرو...... آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' لیکن رمیض کو قریب قریب کچھ ٹھیک ہوتا نظر نہیں آرہا تھا اس لیے اس نے پاپا کو ہمنوا بنا کر گارڈن ٹاؤن والے گھر کی انیکسی کرایے داروں سے خالی کروالی تھی اور یہاں سے آفس کے بہت دور ہونے کا بہانہ کر کے وہاں شفٹ ہوگیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ حادیہ وہاں رہ کر کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی اور اسے اس کی خوشی بے حد عزیز تھی...... وہ رمیض کے سگے چچا کی بیٹی تھی مگر دونوں گھرانوں کے رہن سہن میں مشرق اور مغرب کا فرق تھا۔

اس کے چچا دیکھنے میں پاپا کے بھائی لگتے تھے نہ ہی ان کے بچے ان سب کے کزنز...... چچا انیسویں گریڈ کے ایک آفیسر تھے بے حد شریف النفس اور ایماندار...... صوم وصلوٰۃ کے پابند اور رزقِ حلال پر فخر کرنے والے...... ویسی ہی چچی ناہید تھیں اور ظاہر ہے بچے بھی والدین کے رنگ میں ہی رنگے ہوئے تھے۔

جب ایک دن پاپا نے کھانے کی میز پر دبے لفظوں میں حاویہ کے ساتھ اس کے رشتے کی بات کی تو وہ تو بدکا ہی تھا مما بھی بری طرح سیخ پا ہو گئی تھیں۔

''بھائی کی محبت ایسی ہی جوش مار رہی تھی تو بیٹے کو ایم بی اے کروانے کے بجائے کسی مدرسے سے قرآن حفظ کروا کر مولوی بنایا ہوتا......'' وہ چمچ پلیٹ میں پٹختی انتہائی کاٹ دار لہجے میں بولی تھیں اور اس کے خیال میں بالکل صحیح کہہ رہی تھیں۔

''احمد بھائی کی چار بیٹیاں ہیں تو بیہ...... میں نے سوچا کہ......''

''چار بیٹیاں ہیں تو...... کیا ہم نے کہا تھا پیدا کریں چار بیٹیاں۔'' انہوں نے تیزی سے ان کی بات کاٹی تھی یا تو پاپا کی بات انہیں انتہائی بری لگی تھی یا پھر وہ پہلے ہی سے خراب موڈ میں تھیں کیونکہ عام طور پر اس قدر تلخ وہ ہوتی نہیں تھیں۔

''مما ٹھیک کہہ رہی ہیں پاپا...... آپ خود سوچیں کہ ہمارے گھر میں احمد چچا کی کوئی بیٹی کیسے ایڈ جسٹ ہو سکتی ہے۔'' حجاب اور عبایا میں ملبوس احمد چچا کی بیٹیوں کو تصور میں لاتے ہی رمیض نے فوراً احتیاطی کارروائی کے طور پر باپ تک اپنی رائے پہنچائی تھی اور مما کے چہرے پر ایک دم اطمینان پھیل گیا تھا اور وہ سکون سے کھانا کھانے لگی تھیں۔

''پاپا آج آپ بینک نہیں جائیں گے؟'' رمیض نے اٹھتے ہوئے باپ کے چہرے پر پھیلی رنجیدگی کو محسوس کیا تھا اور یونہی بات برائے بات پوچھ لیا تھا۔

''نہیں......'' انہوں نے آہستگی سے کہا تھا اور رول کیے ہوئے اخبار کو کھولتے ہوئے اس پر نگاہیں جمادیں۔ انہیں رنجیدہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے رمیض کو تاسف ہوا تھا پھر سر جھٹکتے ہوئے وہ آفس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

چند ہی دنوں بعد مما نے اس سے حور کے بارے میں رائے لی تھی۔ حور اُن کی فرسٹ کزن کی بیٹی تھی وہ صرف نام ہی کی نہیں بلکہ حقیقتاً حور تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مما کی پسند کو او کے کر دیا تھا لیکن پھر اسی شام...... صرف چند گھنٹوں بعد اس کے دل کی دنیا بدل چکی تھی اسے ادراک ہو چکا تھا کہ درحقیقت حور کیا ہوتی ہے۔

ہوا یوں تھا کہ آفس سے واپسی پر اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ گاڑی کو ورکشاپ پر دیتا وہ اسٹاپ پر آ گیا تھا۔ رکشے یا ٹیکسی کے بجائے اس نے ڈائیو سے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وسط اپریل کے آخری دن تھے لیکن گرمی مئی جون کی سی محسوس ہو رہی تھی اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا اور ڈائیو آ گئی تھی۔ یہ تو وہ جانتا تھا ہر دس پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد ڈائیو آتی ہے......

یہ اے سی گاڑی خاص واپڈا ٹاؤن سوسائٹی والوں کے لیے ہی چلائی گئی تھی اور اس میں تقریباً تمام پسینجر اسی سوسائٹی یا اس سے ملحقہ ایک دو سوسائٹیز کے ہوتے ہیں...... یہ معلومات اسے اس کی ایک کزن نے دی تھیں جو گھر میں ایک گاڑی ہونے کی وجہ سے اسی ڈائیو پر آفس جاتی تھی اور واپسی پر اسٹاپ سے اسے جو بھی گھر میں ہوتا لے لیتا تھا۔

وہ لوگ ابھی چند ماہ قبل ہی یہاں شفٹ ہوئے تھے اور رمیض پہلی مرتبہ اس ڈائیو میں بیٹھا تھا۔ اے سی کی خنکی نے اس کے موڈ کو خوشگوار کر دیا...... اس نے دلچسپی سے اِدھر اُدھر دیکھا تھا سب لوگ اس کو ملنے والی معلومات کے مطابق تعلیم یافتہ اور خوش پوش نظر آ رہے تھے۔

اس کی سیٹ خواتین کے حصے کو علیحدہ کرتی جالی کے عین پیچھے تھی۔ مٹے مٹے سے میک اپ اور جدید تراش خراش کے ملبوسات میں تھکی تھکی سی لڑکیاں انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جاب سے واپس آ رہی تھیں...... پٹر پٹر بولتی...... اور کھلکھلا کر بے فکری سے ہنستی اسٹوڈنٹس نے سب کو اپنی جانب متوجہ کیا ہوا تھا...... دو تین عمر رسیدہ خواتین سر سیٹ سے ٹیک لگائے سو رہی تھیں۔

رمیض نے اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد واک مین کوٹ کی جیب سے نکالا تھا اور ہیڈ فون کانوں میں لگانے کو ہی تھا جب ایک بے ہودہ سا فقرہ اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ اس نے ناگواری سے ساتھ والی سیٹ کی جانب دیکھا تھا۔

بیہودہ والے حلیے میں دو سرخ و سپید لڑکے جو ہاتھوں میں موبائل تھامے سامنے کھڑی لڑکی کو ڈسکس کر رہے تھے۔ بے اختیار ان کی نگاہوں کے تعاقب میں رمیض کی نگاہ بھی گئی تھی۔

بلو اینڈ بلو کنٹراسٹ فٹنگ والی سلیولیس شرٹ اور کیپری پہنے وہ لڑکی یقیناً بے حد خوب صورت ہوگی، یہ اس کی پشت دیکھ کر ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سہارے کے لیے اوپر لگے ہینڈل کو تھاما ہوا تھا۔ ان لڑکوں کی ہوس بھری نگاہیں جس طرح اس کی سرخ و سپید گداز بازو سے ہوتی ہوئی اسے پورا کھوجنے کے لیے بیتاب تھیں، انہیں دیکھتے ہوئے رمیض کو اس لڑکی پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا دھیان ان لڑکوں کی بے ہودہ گفتگو اور اس لڑکی کی طرف سے نہیں ہٹا سکا تھا۔

اس کا اپنا تعلق ایک ماڈ فیملی سے تھا جہاں تقریباً سبھی لڑکیاں ایسے ہی ملبوسات میں نظر آتی تھیں...... لیکن پہلی مرتبہ وہ یہ دیکھ اور سن رہا تھا کہ ایسا لباس پہن کر پبلک پلیس پر نکلنے والی لڑکیوں کے ایک ایک عضو کو گندی ذہنیت کے مالک لوگ کس نگاہ سے دیکھتے اور کیسے کیسے ڈسکس کرتے ہیں۔ ان کی حد سے بڑھتی بے ہودہ گوئی رمیض کے دماغ میں جوار بھاٹا پیدا کرنے لگی تو اس نے دھیان اِدھر اُدھر ہٹانے کی کوشش کی تھی اور سیٹ کی بیک سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

ابوبکر چوک پر اترتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ لیڈیز ڈیپارٹمنٹ کی طرف اٹھی تھی اور پھر چند لمحوں کے لیے اٹھی رہ گئی تھی۔

وہ لڑکی...... جس کے بارے میں سارا راستہ ان آوارہ لڑکوں کی گفتگو سنتے ہوئے اس کا خون کھولتا رہا تھا...... کوئی اور نہیں اس کی کزن حور تھی...... جسے مما نے اس کے لیے پسند کیا تھا اور مما کی پسند کو او کے کرتے ہوئے جسے اس نے واقعی حور کو قرار دیا تھا۔

ایک عجیب سی کڑواہٹ رمیض کو اپنے منہ میں گھلتی محسوس ہوئی...... اس سے پہلے کہ اس کی نگاہ رمیض پر پڑتی اور وہ اس سے ہائے ہیلو کرتی اس نے جلدی سے رخ موڑ کر قدم آگے بڑھائے تھے۔

تبھی اس کی نگاہ احمد چچا پر پڑی تھی۔

اپنی سفید کلٹس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے وہ ڈائیو کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا تھا کہ چپکے سے نگاہ بچا کر نکل جائے لیکن قدم جیسے بے اختیار ہی ان کی جانب بڑھ گئے تھے اور کیسے نہ بڑھتے...... کاتب تقدیر نے جو منزلیں انسان کے لیے لکھ دی ہوتی ہیں ان کی طرف جانے والی راہوں پر بھی وہ خود لے کر جاتا ہے۔

''السلام علیکم ابو!'' چچا سے ملتے ہوئے مترنم سی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا تھا اور چند لمحوں کے

لیے اس کی نگاہیں اس چہرے پر جم کر رہ گئیں تھیں...... سیاہ عبایا میں جسم کو چھپائے...... وائٹ اور پنک اسکارف سے سر کو اچھی طرح لپیٹے سوئی سوئی سی آنکھوں والا چہرہ ہرگز نظر انداز کر دینے والا نہیں تھا۔

''یہ حادیہ ہے رمیض...... کیا پہچانے نہیں؟''

اس کی محویت پر احمد چچا نے کہا اور وہ خجل سا ہو کر رہ گیا تھا۔

''السلام علیکم رمیض بھائی...... کیسے ہیں آپ؟ تایا جی، تائی جی ثمرہ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں نا......؟ کسی دن لے کر آئیں نا انہیں۔'' وہ سر اٹھائے بے حد شائستہ اور پُراعتماد لہجے میں اس سے مخاطب تھی اور وہ بہ مشکل اپنی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پائے نگاہوں کو اس چہرے سے ہٹا رہا تھا۔

تبھی حور کی تیز آواز بالکل اس کے قریب سے ابھری تھی۔

''ہائے رمیض...... کیسے ہو...... اور گاڑی کدھر ہے...... آجاؤ بڑی گرمی ہے۔'' احمد چچا کو سلام کیے بغیر گاڑی کا شیشہ نیچے کیے وہ ایک ہی سانس میں اس سے مخاطب تھی...... رمیض کو برا تو بے حد لگا تھا لیکن ناگواری پر قابو پا کر اس نے مسکراتے ہوئے تھینک یو کہہ کر اسے ٹال دیا تھا اور ان کچھ سوئی، کچھ جاگتی آنکھوں کو ایک بار پھر دیکھنے کی بے اختیارانہ سی خواہش نے اسے احمد چچا کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا...... کوشش کے باوجود وہ ان آنکھوں کو تو دوبارہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ ہاتھ میں تھامی کتاب کو گھٹنوں پر رکھے وہ یوں اس پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی کہ محسوس ہوتا تھا کہ اب پوری کتاب ختم کر کے ہی نگاہیں اٹھائے گی لیکن گھر کے سامنے اترتے ہوئے وہ دل و دماغ کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ ایک فیصلہ ضرور کر چکا تھا۔

وہ فیصلہ...... جو اگر آج وہ گاڑی میں آتا تو شاید کبھی نہ کر پاتا...... لیکن یہ تو رمیض کا خیال تھا ورنہ فیصلے تو سارے اوپر سے ہی آتے ہیں اور جس کی طرف سے آتے ہیں وہ انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسباب کا محتاج نہیں۔

''مما آپ نے بات تو نہیں کی حنا آنٹی سے......؟'' گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا تھا اور مما اس کی بے تابی پر ہنس دی تھیں۔

''نہیں...... آج شام جانے کا پروگرام ہے۔''

''تھینک گاڈ!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا اور وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

''مما...... آپ شام کو حنا آنٹی کی طرف نہیں احمد چچا کی طرف جانے کا پروگرام بنائیں...... کیونکہ میں حور سے نہیں حادیہ سے شادی کروں گا۔'' دو ٹوک انداز میں کہتا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

پھر بہت دن گھر میں اِک شور اور ہنگامہ برپا رہا تھا مما کسی طرح بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کسی دقیانوسی خاندان میں کرنا نہیں چاہتی تھیں، وہ بار بار پاپا کو موردِ الزام ٹھہراتی تھیں کہ جنہوں نے یہ خیال رمیض کے دل میں پیدا کیا تھا۔

جب وہ کسی طرح مانتی نظر نہیں آئیں تو ایک دن رمیض نے انتہائی سنجیدگی سے انہیں مخاطب کیا تھا۔

''مما آخر آپ کو کس وجہ سے حادیہ پسند نہیں ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ ثمرہ اور حور کی طرح ماڈ نہیں ہے؟''

''ہونہہ...... ثمرہ اور حور...... دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا...... جو تم اس لڑکی کو ثمرہ اور حور کے مقابلے پر لا رہے ہو......'' انہوں نے انتہائی تلخی سے کہا تھا۔

"مماوہ کسی طرح بھی ان سے کم نہیں ہے...... نہ خاندان میں نہ اسٹیٹس میں اور نہ ہی تعلیم میں...... پھر آپ کو کس بات پر اعتراض ہے......؟" وہ بھی آخر زچ ہو گیا تھا۔

"جو بھی ہو...... لیکن اپنی اکلوتی بہو کے روپ میں وہ مجھے ہرگز قبول نہیں ہے۔ حور جیسی حسین و جمیل اور تعلیم یافتہ لڑکی کو چھوڑ کر میں حادیہ کو لے آؤں...... ناممکن......" مما کو بھی جیسے حادیہ سے چڑ ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے......" رمیض نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں سوات کے کسی کیمپ سے آپ کے لیے بہو لے آؤں...... جو حسین و جمیل بالکل ویسی ہو جیسی آپ چاہتی ہیں...... اور رہے اس طرح جیسے میں چاہتا ہوں...... آپ کا خرچ بھی کچھ نہیں ہوگا اور میری شادی خانہ آبادی بھی ہو جائے گی...... اور کسی بے سہارا کی دعائیں ہمیشہ کے لیے وہ الگ۔" اچانک ذہن میں پیدا ہونے والے اس زبردست خیال کو اس نے کچھ ایسے سنجیدہ، ٹھنڈے لہجے اور سرسراتی آواز میں مما تک پہنچایا تھا کہ وہ حق دق سی بیٹھی رہ گئی تھیں...... جبکہ وہ آرام سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دروازے میں بت بنی ثمرہ کو ہٹاتا...... امجد اسلام امجد کی خواب اور خدشے گنگناتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مما حسب توقع اس کی بات سے ایسی خوف زدہ ہوئی تھیں کہ اگلے ہی دن پاپا کے ساتھ احمد چچا کے گھر جا پہنچی تھیں اور پھر ایک ایک کر کے سارے مراحل طے ہو گئے تھے اور حادیہ احمد علی، حادیہ رمیض بن کر اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔

وہ جتنی خوب صورت تھی اس سے کہیں زیادہ خوب سیرت تھی...... رمیض کو تو گویا دنیا میں ہی جنت مل گئی تھی...... مختلف ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے کبھی کبھی کوئی مشکل ضرور پیدا ہو جاتی تھی لیکن ایک دوسرے سے محبت جلد ہی اس مشکل کو آسان کر دیتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ جو درپیش تھا اور کئی ماہ گزرنے پر بھی حل نہیں ہوا تھا وہ یہی تھا کہ مما ابھی تک حادیہ کو دل سے قبول نہیں کر پائی تھیں۔ انہیں اکثر اس سے اور اس کے ساتھ رمیض سے بھی کوئی نہ کوئی شکایت ہی رہتی تھی اس وقت بھی ایسی ہی صورت حال تھی۔

"پتا نہیں مما کب حادیہ کو دل سے قبول کر پائیں گی؟ اور کر پائیں گی بھی یا نہیں......؟" اس نے بوجھل ہوتے دل سے سوچا تھا۔

یہی بات کچھ دیر بعد جب اس نے حادیہ سے کہی تو اس نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کمال ہے رمیض! آپ اتنی جلدی مایوس ہو گئے، ابھی ہماری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے...... میں ہرگز بھی ہمت ہارنے والی نہیں ہوں...... انشاء اللہ ایک دن مما میری محبت اور خلوص کے سامنے ہار جائیں گی...... جیت ہمیشہ محبت کی ہوتی ہے، نفرت کی نہیں...... یہ آپ یقین رکھیں۔" اس کے یقین بھرے لہجے سے رمیض کے دل کا بوجھل پن کم ہوتا جا رہا تھا۔

"انسان کے جذبوں میں سچائی ہو، اسے اللہ پر کامل بھروسا ہو اور کبھی ہمت نہ ہارے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ہرا نہیں سکتی...... ہمارا کام ہے مما سے محبت کرنا، ان کی ہر بات صبر اور تحمل سے برداشت کرنا، پھر وہ دن دور نہیں جب وہ اپنی ساری نفرت اور بیزاری بھول جائیں گی اور دلوں کو بدلنے میں

بھی بس ایک لمحہ ہی لگتا ہے۔" رمیض کو دلچسپی سے تکتا دیکھ کر اس نے مزید اس کی ہمت جیسی بندھائی تھی اور اس کے پُرعزم لہجے نے رمیض کو جیسے بالکل پُرسکون کر دیا تھا۔

☆☆☆

رمضان المبارک کا چاند نظر آ گیا تھا...... وہ دونوں کھڑے دعا مانگ رہے تھے جب منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ رمیض کی طرف مڑی تھی۔

"رمیض کیوں نہ ہم رمضان المبارک مما پپا کی طرف گزاریں۔" وہ بے حد پُرجوش تھی۔

"مگر ہم لوگ تو صرف چند ایک روزے رکھتے ہیں حادیہ...... اب کے تو گرمی بھی ہے اور مما کو چند ماہ سے بلڈ پریشر بھی ہے...... مجھے نہیں لگتا کہ وہ روزے رکھیں گی۔" رمیض نے کہا تھا اور اس کا سارا جوش ماند پڑ گیا تھا...... حیران و پریشان سی وہ رمیض کو دیکھ رہی تھی۔

اس کا بجھا بجھا اور پریشان چہرہ رمیض کو الجھن میں ڈال رہا تھا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہ لوگ روزے نہیں رکھتے تو اس میں حادیہ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی...... اور جب یہی بات اس نے حادیہ سے کی تھی تو وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی...... دھیمی سی آواز میں قدرے رک رک کر اپنی پریشانی کے بارے میں بتانے لگی تھی...... شادی کے بعد رمیض میں کافی تبدیلیاں آئی تھیں...... وہ جو صرف جمعہ کی نماز پڑھا کرتا تھا اب پابندی سے تو نہیں مگر کئی نمازیں پڑھنے لگا تھا لیکن دن میں ایک دو نمازیں پڑھ لینا اور بات تھی اور روزہ رکھنا اور...... پھر اس کو پورے احترام کے ساتھ گزارنا...... تراویح پڑھنا، حادیہ کا نہیں خیال تھا کہ وہ یہ سب کر سکتا تھا اور اگر وہ یہ سب نہیں کرتا...... تو وہ

عادت

جج صاحب دانت نکلوانے کے لیے ڈینٹسٹ کی کرسی پر بیٹھنے گئے تو جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔ فوراً ڈینٹسٹ سے مخاطب ہوئے۔ "حلف اٹھاؤ کہ تم دانت...... اور صرف دانت نکالو گے...... دانت کے سوا کچھ نہیں نکالو گے......"

☆☆☆

ڈینٹسٹ کی کار میں کچھ خرابی ہو گئی۔ آس پاس کوئی مکینک نہیں تھا۔ خود ہی پلاس لے کر ایک نٹ کھولنے کے لیے جھکے اور ساتھ ہی بڑبڑائے۔ "دیکھو بھئی...... گھبرانا نہیں...... تھوڑی سی تکلیف تو ہو گی......"

خود......؟ اور اس کے آگے جو سوالیہ نشان تھا اسی نے اسے پریشان کیا تھا۔

اس کی توقع کے برعکس رمیض سکون سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"میری خواہش ہے رمیض کہ رمضان المبارک میں ہم اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کو دیں، ہر وقت اسے خوش رکھنے کی کوشش کریں اور اس بابرکت مہینے کو یوں گزاریں جیسا کہ اس کا ہم پر حق ہے۔" اس نے بات ختم کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا تھا۔

"بالکل ایسے ہی گزاریں گے جیسے ہماری بیگم چاہتی ہیں۔" اس نے فوراً ہاتھ بڑھایا تھا۔

"جیسے اللہ چاہتا ہے......" حادیہ نے تصحیح کرنا چاہی تھی لیکن پھر خاموش رہی تھی۔

رمیض نے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن وہ جانتی تھی اس پر عمل اتنا آسان نہیں تھا...... اس لیے رات بڑی دیر تک دعائیں کرتی رہی تھی اور صبح اس وقت وہ حیران رہ گئی...... جب پہلی آواز پر ہی رمیض جاگ گیا تھا۔ اللہ کی اس خصوصی مہربانی پر حادیہ کی آنکھیں بے اختیار نم ہو گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے اپنے خالق کا شکر ادا کرے جو قدم قدم پر اسے بے

تحاشا نواز رہا ہے۔

''رمیض کتنا اچھا ہوتا اگر مما، پپا ثمرہ کی منگنی رمضان کے بعد کرتے۔'' سیٹ کی بیک پر سر ٹکاتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی تھی۔

''کیوں......؟'' رمیض نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''مکس گیدرنگ میں جس طرح کے ملبوسات اور حلیے میں خواتین اور لڑکیاں نظر آ رہی تھیں...... مجھے تو دیکھ دیکھ کر شرم آ رہی تھی...... زیادہ نہیں تو کم از کم اس ایک مہینے میں تو انسان کوشش کرے کہ اللہ کے احکامات کی کم سے کم خلاف ورزی کرے۔'' دھیمی سی آواز میں کہتی وہ جیسے کسی گہرے ملال میں تھی۔ رمیض نے اس کے دلکش چہرے پر پیار بھری نظر ڈالی تھی۔

مما کے ضد پر اڑ جانے کی وجہ سے کہ ثمرہ کی منگنی پر حادیہ عبایا نہیں پہنے گی...... اس نے اسکارف کے نیچے دوپٹا لیا ہوا تھا۔ حور اور اس کی کزن اس کا مذاق اڑاتی رہی تھیں لیکن وہ مطمئن تھی اور دل میں اس پاک ذات کی شکرگزار تھی جس نے رمیض کو اس کا ہمنوا بنا دیا تھا۔

''یہ حور تمہیں کیا کہہ رہی تھی......؟'' اچانک ہی رمیض کو یاد آیا تھا۔

''بس یونہی...... اپنی عادت سے مجبور ہے......'' اس نے...... بے پروائی سے کہا تھا، تبھی رمیض کے موبائل کی بپ بجی تھی۔

''مما کا فون ہے...... تیار ہو جاؤ کوئی شکایت سننے کے لیے۔'' رمیض نے مسکراتے ہوئے سیل اٹھایا تھا۔

''جلدی سنیں نا!'' حادیہ اسے سوچ میں پڑے دیکھ کر بولی۔

''السلام علیکم مما!''

''جی ٹھیک ہے......'' اس نے خاصی بے دلی سے کہتے ہوئے گاڑی واپس ٹرن کی۔

''کیا ہوا......؟'' حادیہ جو شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی، فکرمند ہوئی تھی۔

''پپا کے دوست سراج صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے...... پپا ان کے پاس شیخ زید جا رہے ہیں۔ مما نے کہا ہے کہ انہیں اور ثمرہ کو میں پک کرلوں......'' رمیض نے کہا...... اور اسپیڈ بڑھا دی۔

جونہی اس نے گاڑی شیخ زید اسپتال کے قریب روکی، مما اور ثمرہ پپا کی گاڑی سے اتر آئیں...

اور پپا نے گاڑی گیٹ کی طرف بڑھا دی۔

مما اور ثمرہ ابھی گاڑی میں بیٹھ ہی رہی تھیں جب ایک موٹر سائیکل ان کے قریب آ کر رکی تھی اور چشم زدن میں اس پر سے اترنے والے دو سیاہ پوش رمیض کو دونوں طرف سے گھیر کر اس کی کنپٹی سے ریوالور لگا چکے تھے۔

''اس کی کھوپڑی کی ضرورت ہے تو تینوں سارا زیور اتار کر اس میں ڈال دو۔'' ایک نے سیاہ بیگ گاڑی میں پھینکتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارتی آواز میں کہا۔ رمیض کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر اتر کر پورے وجود کو سن کر گئی۔

وہ تینوں تھر تھر کانپتے وجود کے ساتھ بہ مشکل جلدی جلدی زیور اتارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''میرے پانچ گننے تک سب کچھ اتر جانا چاہیے ورنہ اس کھوپڑی کو اڑانے میں مجھے دیر نہیں لگے گی۔'' اس نے رمیض کی کنپٹی پر ریوالور کا دباؤ بڑھایا تھا۔

''خد...... ا...... کک...... کے...... واسطے ہم...... سب کچھ دے رہے ہیں۔'' مما کی جان پر بن گئی تھی۔ ان کا بیٹا...... ان کی جان...... ان کا بس نہیں چل رہا تھا کیسے پلک جھپکتے میں سب کچھ اتار پھینکیں۔

''جلدی کرو لڑکی......'' ایک نے حادیہ کے سر پر پسٹل مارتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں کہا تھا اور وہ جو پہلے ہی بہ مشکل خود کو سنبھالے ہوئے تھی لہراتی ہوئی سیٹ پر جا پڑی تھی۔

''چل بے...... تو اتار اس کی چوڑیاں......'' وہ رمیض کی کنپٹی پر ریوالور کی نال سے زور ڈالتے ہوئے...... تیز آواز میں گالی دیتے ہوئے بولا......

اور عین اسی وقت پولیس موبائل جانے کس طرف سے نمودار ہوئی اور عین ان کے عقب میں آ رکی......

اور وہ دونوں چھلاوے کی طرح اچھل کر موٹر سائیکل پر بیٹھے اور اگلے ہی لمحے موٹر سائیکل دھواں اڑاتی کہیں کی کہیں جا رہی تھی۔

مما لپک کر رمیض کی طرف آئی تھیں اور دیوانہ وار اسے چومنے لگی تھیں۔

''مما...... ! حادیہ......'' بے قرار لہجے میں رمیض کے منہ سے نکلا تھا اور مما جیسے چونک اٹھی تھیں۔

''کیا ہم آپ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں......؟'' پولیس یونیفارم میں ملبوس وہ سنجیدہ سا پولیس آفیسر انتہائی شائستگی سے ان سے پوچھ رہا تھا پھر اس کی نظر گاڑی کے بیک ویو مرر میں اڑسے بیگ پر پڑی تھی اور اس نے اسے اتار لیا تھا۔

تب تک حادیہ نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں، رمیض اطمینان کا سانس لیتے ہوئے گاڑی سے اتر کر انسپکٹر سے ہاتھ ملانے لگا۔

''آپ نے آج گھر سے نکلتے ہوئے ضرور کوئی ایسی نیکی کی تھی رمیض صاحب جو اللہ تعالیٰ نے یوں آپ کو محفوظ رکھا، آپ جانتے ہیں اس وقت یہ پولیس موبائل گشت پر نہیں ہے، مجھے اچانک بیٹھے بیٹھے کوئی کام یاد آ گیا...... میری گاڑی خراب تھی تو ڈرائیور مجھے چھوڑنے جا رہا تھا...... بلکہ مجھے تو سو فیصد یہ لگ رہا ہے کہ اللہ نے مجھے بطورِ خاص آپ کی خاطر یہاں پہنچایا ہے اور یہ دیکھیں۔'' اس نے بیگ اس کے سامنے کیا۔

''اس کا اسٹیپ آئینے میں پھنس جانے کی وجہ سے آپ کا سامان بھی ہاتھ میں پکڑے ہونے کے باوجود انہیں چھوڑنا پڑا۔'' وہ کہہ رہا تھا اور مما ایک ٹک حادیہ کو دیکھے جا رہی تھیں...... اس کی خوشی سے چمکتی آنکھوں اور تمتماتے چہرے پر انہیں بے اختیار ہی پیار آنے لگا تھا۔

وہی تو تھی، انہیں آج اس مصیبت سے بچانے والی...... اس کا ایک عمل جو اللہ کو یقیناً بے حد پسند آیا تھا جس وقت دوپہر کو انہوں نے رمیض کو فون کیا تھا تو اس نے بتایا تھا ''ہم مارکیٹ میں ہیں...... حادیہ کا سیٹ سیل کر کے زکوٰۃ ادا کر دیں گے...... پھر ثمرہ اور ادریس کے لیے کوئی گفٹ لیں گے...... جتنی بھی جلدی کریں ہمیں آتے آتے شام ہو جائے گی مما۔''

انہیں قطعاً اس بات کا یقین نہیں آیا تھا لیکن...... اب کیا اب بھی وہ یقین نہ کرتیں......؟

''او کے رمیض صاحب ! اجازت......'' ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے انسپکٹر نے کہا۔ رمیض گرمجوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد پلٹا اور ہونقوں کی طرح منہ کھولے ٹکر ٹکر گاڑی کی طرف دیکھنے لگا...... جہاں مما حادیہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے اسے پیار کر رہی تھیں۔



ناولٹ

میں چاند سی

میمونہ خورشید

آخری حصہ



''ارسہ کے متعلق یہ سب جان کر بہت افسوس ہوا آنٹی..... آپ لوگوں نے تو بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' فرحان نے شکوہ کیا۔

''بس بیٹا... ایک دم ہی سب کچھ ہو گیا کسی کو کیا بتاتے، اوسان ہی نہیں رہے تھے ہمارے تو۔'' نعیمہ بیگم یہ کہہ کر پھپک پھپک کر رونے لگیں تو فرحان افسوس سے سر ہلانے لگا۔

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ، بہت بڑا سانحہ ہے یہ

آپ لوگوں کے لیے اور ارسہ کو دیکھ کر تو میں دنگ ہی رہ گیا۔ روگ ہی لگا لیا ہے اس نے تو خود کو...... لگ ہی نہیں رہا یہ وہی ارسہ ہے جو کھلکھلاتی پھرتی تھی۔“

”بس بیٹا کچھ مت پوچھو...... ایک تو طلاق کا دکھ...... دوسرے کوکھ اجڑ جانے کا صدمہ ارسہ کو تو لے ہی بیٹھا ہے ڈیڑھ برس میں بیاہی بھی گئی اور اجڑ بھی گئی۔ اللہ کسی دشمن کی بھی ایسی قسمت خراب نہ کرے جیسی میری ارسہ کی قسمت خراب نکلی......“ یہ کہہ کر نعیمہ بیگم نے پھر رونا شروع کر دیا۔

”ایسا مت کہیں آنٹی کہ ارسہ کی قسمت خراب تھی۔ اسی لیے اس کے ساتھ ایسا ہوا ہے بلکہ خدا کا شکر ادا کریں کہ وہ اس بدقسمتی سے جلد ہی باہر نکل آئی۔ اگر زیادہ وقت گزر جانے کے بعد ایسا ہوتا تو زندگی بھر کے پچھتاوے رہ جاتے۔ اچھا ہوا ان لوگوں کی حقیقت جلد ہی پتا چل گئی اور پھر ابھی تو ارسہ جوان ہے کیوں اپنی زندگی کو روگ لگا رہی ہے۔ شادی ہو گئی تو بچے بھی ہو جائیں گے۔“ نعیمہ بیگم کی آنکھوں میں چمک سی کوندی پھر وہ فرحان کو لجاجت سے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”تم آئے ہو تو اسے سمجھا کر جانا، فضول دل کو روگ لگا کر اپنا وقت برباد نہ کرے۔ اپنے اردگرد زندگی کو محسوس کرے، گھومے پھرے، لوگوں سے ملے، آئے جائے تاکہ اس کے دل سے بیکار کے خیالات اور پچھتاوے ختم ہوں۔“

”آپ فکر نہ کریں آنٹی...... میں جب تک یہاں ہوں ارسہ کو پھر سے ویسی ہی ارسہ بنا دوں گا جیسی وہ پہلے تھی۔“ نعیمہ بیگم کو ڈھارس ہوئی۔

”اچھا یہ بتاؤ...... آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں وہی آوارہ گردی......“ وہ بے ہنگم سا قہقہہ لگا کر بولا تو نعیمہ بیگم تعجب سے بولیں۔

”کیوں، کیا شادی وادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے بس بہت ہو لی آوارہ گردی، اب تو شادی کر ہی لو۔“ اس سوال پر فرحان تھوڑا سا گھبرایا پھر اعتماد سے بولا۔

”ارے آنٹی، آج کل کی لڑکیاں اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر بھروسا کر لیا جائے گھر بسانا کوئی معمولی کھیل نہیں ہے۔“

”لو بھلا...... تم نے یہ کیسی بات کی۔ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں کسی اچھے گھرانے میں شادی کرو گے تو گھر والی بھی بھروسے کی مل ہی جائے گی۔“

”واہ آنٹی...... کیا خوب کہی مگر ایک بات بتائیں، کیا گھرانوں کا بھی آج کل بھروسا رہ گیا ہے...... آخر ارسہ کو آپ نے اونچے رئیس خاندان میں بیاہا تھا، سنا ہے کہ وہاں سات نسلوں میں بھی کسی نے طلاق نہیں دی لیکن ارسہ کو دے دی۔“ نعیمہ بیگم چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں پھر پچھتاوے سے بولیں۔

”ہاں بیٹا...... کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔ ان کا کیا گیا میری ہی کم عمر بچی کو داغ لگ گیا۔“

”ارے چھوڑیں آنٹی...... یہ داغ تو ارسہ کی خوب صورتی اور گنوں کے آگے دکھائی بھی نہیں دے گا۔ بس آپ اس کے لیے کوئی اچھا سا بر تلاش کریں۔“

”کہاں تلاش کروں؟ میری تو راتوں کی نیندیں ہی اڑ گئی ہیں۔ بھائی علیحدہ فکر مند ہیں، کتنا چاؤ تھا دلاور علی کو ارسہ کو اونچے گھر میں بیاہنے کا۔ کہتا تھا کہ میری بہن شہزادیوں جیسی لگتی ہے۔ کسی بڑے گھرانے میں اس کا بیاہ کروں گا مگر دیکھو اس سے اچھا تو ارسہ غریب گھر میں بیاہی جاتی کم سے کم وہ لوگ اس کی قدر تو کرتے۔ انہوں نے تو کبھی ارسہ کی قدر ہی نہیں کی، دن رات میری بچی پہ نکتہ چینی رہتی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے اس گھر کی عورتیں بھی ارسہ کے حسن سے جلتی تھیں تبھی تو اس کے پہننے اوڑھنے کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا، نظر لگ گئی میری بچی کو تو۔“

”فکر نہ کریں آپ آنٹی...... اللہ تعالیٰ نے ارسہ کے لیے اس سے بھی اچھا بر لکھا ہو گا تبھی تو آپ لوگوں کی جلد ہی جان چھوٹ گئی ان سے......“ نعیمہ بیگم اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

”بالکل انجان لوگوں میں رشتے داری کرنا تو آسان ہے پر نبھانا مشکل ہے۔“

”ہاں بیٹا...... صحیح کہہ رہے ہو...... اب تو ہم ارسہ کی شادی دیکھے بھالے لوگوں میں کریں گے، ایسے گھر میں جس کا ماحول بھی ہماری طرح ڈھیلا ڈھالا ہو...... دقیانوسی پن نہیں ہو اس گھر میں اور لڑکا بھی ارسہ کا ہم مزاج ہو۔“

”تو پھر آنٹی آپ کو ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں...... مجھ سے زیادہ ارسہ کا ہم مزاج آپ کو پوری دنیا میں نہیں مل سکتا۔“ یہ فرحان نے کیا کہہ دیا مارے خوشی کے نعیمہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو فرحان؟“ وہ بے ساختہ بولیں، فرحان قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”ارے، آپ تو سچ ہی سمجھ بیٹھیں...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ فرحان کا یہ کہنا تھا کہ نعیمہ بیگم کا دل زور سے ٹوٹا۔

”میں کہاں ارسہ کے قابل...... ارسہ کے لیے تو آپ ارسہ جیسا خوب صورت، دلربا سا لڑکا دیکھیے گا۔ ارسہ کہاں مجھے خاطر میں لائے گی۔“ نعیمہ بیگم کو پھر ڈھارس بندھی۔

”پگلے، ظاہری خوب صورتی میں رکھا بھی کیا ہے اور پھر کس چیز کی کمی ہے تجھ میں اور سب سے بڑھ کر تم ایک دوسرے کے ہم مزاج ہو اگر تم اس معاملے میں سنجیدہ ہو تو میں ارسہ سے بات کروں؟“ نعیمہ بیگم یکدم ہی واری سیاں نظر آنے لگیں۔ فرحان کچھ گڑبڑایا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

”اصل میں آنٹی، ارسہ میری دل لگانے والی عادت سے اچھی طرح واقف ہے...... مجھے پتا ہے وہ مجھے اسی بنا پر ریجیکٹ کر دے گی۔“

”پگلے جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ جوانی میں کون ایسے شوق نہیں پالتا...... جب گھر والیاں آ جاتی ہیں تو ساری دل لگی بھی گھر والی سے ہو جاتی ہے۔“

”اچھا آنٹی!“ فرحان بے فکر ہو کر ہنسا۔ ”بڑا گہرا تجربہ لگتا ہے آپ کا اگر ایسا ہے تو آپ ارسہ کی رائے لے کر دیکھ لیں لیکن ابھی نہیں، پہلے میں ارسہ کو زندگی کی طرف لے آؤں اسے ویسا ہی بنا دوں تب آپ اس تک میرا پیغام پہنچا دیجیے گا۔“ نعیمہ بیگم نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔

”بہت ہی بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے تم نے میرے سینے پر سے، میری خواہش ہے کہ ارسہ، سالار سے پہلے ہی بیاہی جائے، اس کا گھر سالار سے پہلے بس جائے تاکہ انہیں احساس ہو کہ میری بیٹی کی قدر و منزلت طلاق سے کم نہیں ہوئی ہے، وہ اب بھی پہلے کی طرح نایاب ہے۔“

”ارے ہاں...... میں تو بتانا ہی بھول گیا، ابو آئے ہوئے ہیں میرے ساتھ وہ اپنی خالہ کی طرف ہیں ہم لوگ اُدھر ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

''کوئی ضرورت نہیں ہے، کہیں بھی ٹھہرنے کی، یہ تمہارا اپنا گھر ہے ابھی انہیں فون کرو اور ادھر ہی آنے کا کہو...... لو بھلا یہ کیا بات ہوئی ہمیشہ تو تم ہماری طرف ہی ٹھہرتے تھے۔''

''تب میں اکیلا ہوتا تھا اب ابو بھی ساتھ ہیں پھر سوگواری کا ماحول ہے آپ کے گھر میں، اچھا نہیں لگتا بن بلائے مہمانوں کی طرح نازل ہو جائیں۔''

''ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ اس گھر سے سوگواریت ختم ہو جائے تم یہاں ٹھہرو گے تو خود بخود اداسی یہاں سے بھاگ جائے گی۔'' دلاور علی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو فرحان خوش ہو گیا۔ دلاور علی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے فرحان کچھ کمزور سے ہو گئے ہو یا مجھے لگ رہا ہے؟'' اس بات پر فرحان کچھ نروس سا ہوا پھر منہ اور گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس دیا۔

''وہ کیا ہے دلاور بھائی آپ نے ڈیڑھ برس کے بعد دیکھا ہے ناں...... اس لیے آپ کو ایسا لگا ہو گا ویسے میں بالکل فٹ ہوں البتہ میں نے اپنا تھوڑا سا وزن کم کیا ہے بہت زیادہ موٹا ہو گیا تھا میں۔''

''یہ بتاؤ...... پینے پلانے کی طرف زیادہ راغب تو نہیں ہو رہے ہو، چہرہ کچھ زرد سا لگ رہا ہے تمہارا۔''

''ارے نہیں دلاور بھائی، آپ تو پیچھے ہی پڑ گئے اور آپ قسم لے لیں، میں نے تو بالکل ہی چھوڑ دی ہے شوقیہ بھی کبھی کبھار۔''

''بڑی بات ہے۔'' دلاور حیرانی سے ہنسا۔

''بہرحال خوشی کی بات ہے۔'' نعیمہ بیگم چہک کر بولیں۔

''آپ یقین کریں آنٹی اب تو میں نے لڑکیوں سے بھی دوستیاں کم کر دی ہیں۔ ابو کے ساتھ بزنس میں لگا ہوا ہوں۔''

''یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔'' دلاور نے نعیمہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر خود ہی ہنس دیا۔

☆☆☆

''خدا کے واسطے اپنی اصل حالت میں واپس آ جاؤ تھک گیا ہوں میں تمہاری یہ روتی بسورتی شکل دیکھ کر...... کس چیز کا غم منا رہی ہو یار تم؟'' ارسہ کیا بتاتی اسے طلاق کا دکھ ہرگز نہیں ہے لیکن اپنی کوکھ کو اس نے خود اجاڑا ہے صرف اس خوف سے کہیں سالار رشتہ پھر استوار نہ کر لے اور اب اسے یہ ملال مارے ڈال رہا تھا کہ اس نے اپنا بچہ کیوں ضائع کیا۔ ماں بننے کا احساس اس کے لیے کتنا دل پذیر تھا۔ وہ چند ہفتوں میں خود کو کتنا بدلا بدلا محسوس کر رہی تھی۔ دن رات آنے والے بچے کے خیال میں مگن رہتی تھی اور پھر اچانک کیسی آفت ٹوٹی کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس نے مانگ تو اجاڑی تھی گود بھی اجاڑ لی۔ کتنی مشکل سے اس نے یہ خوشی دیکھی تھی...... کیا وہ پھر کبھی ماں نہیں بن پائے گی۔ یہ خیال اسے ہر پل بے چین رکھنے لگا تھا۔ جس سے اس کی نیندیں ہی نہیں بھوک بھی اڑ گئی تھی۔ سب بہن بھائی، بہنوئی، دوست احباب اس کی دلجوئی کے لیے دن رات آ رہے تھے۔ سب سالار کو اور اس کے گھر والوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا جہیز بھی جوں کا توں اٹھ کر آ گیا تھا، ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ اپنے کمرے میں چھوڑ کر آئی تھی۔ کسی بھی چیز کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا ان لوگوں نے، نہ صرف اس کے مطالبے پر تحریری طلاق بھیج دی تھی بلکہ جہیز بھی اٹھوا دیا تھا۔ سب اس سے اس سانحے پر افسوس کرتے تھے لیکن وہ خاموش رہتی کسی سے بھی اس نے

اس احساس کو شیئر نہیں کیا تھا کہ وہ ماں بننے سے رہ گئی اور یہ قلق اسے مارے ڈالتا ہے کہ اس نے آزادی کی خاطر اپنے بچے کو بھی مار دیا۔ کیسی ماں ہے وہ...... اسے گم صم پا کر فرحان کہنے لگا۔

''دیکھو ارسہ...... میں جانتا ہوں یہ غم تمہارے لیے دُہرا ہے مگر تمہیں خود کو سنبھالنا ہو گا، اپنی نئی زندگی شروع کر دو یار...... کچھ نہیں ملے گا دنیا کی نظروں میں مظلوم بن کر...... جو ہوا اسے بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ اچھی اور نئی زندگی کا آغاز کرو...... کس چیز کا غم منا رہی ہو تم؟ تمہیں پتا ہے اس کی دوسری شادی کی تیاری ہو رہی ہے، لڑکی بھی سلیکٹ ہو گئی ہے اس کے لیے اور تم ہو کہ عدت کا ڈراما کر کے بیٹھی ہو۔ عدت تو تمہاری اسی وقت ختم ہو گئی تھی جس وقت تمہارا بچہ ضائع ہوا تھا۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے؟'' ارسہ بری طرح چونکی تھی۔

''جناب اسی شہر میں رہ رہا ہے وہ، کہو تو اس کی ہونے والی بیگم کی تصویر بھی لا دوں تمہیں...... پھر تمہیں یقین آ جائے گا۔'' فرحان نے خوامخواہ کی بڑ کی ماری۔

''سالار نے اتنی جلدی دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا۔'' ارسہ کو گہرا دھچکا لگا تھا۔

''ہاں...... تو اس کے لیے کون سا مشکل تھا شادی کرنا۔'' فرحان نے اسے اکسایا۔ ''وہ تمہاری طرح بے وقوف تھوڑی تھا اس نے تو سب کچھ پلاننگ کے تحت کیا ہو گا۔''

''پلاننگ کے تحت......'' ارسہ دل ہی دل میں ہنسی۔

''اس نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا کہ میں اس کے ساتھ ایسا کروں گی...... لیکن یہ عجیب بات ہے یا تو وہ طلاق ہی نہیں دے رہا تھا اور جب اسے پتا چلا کہ اس کا بچہ ہی ضائع ہو گیا ہے تو نہ صرف اس نے طلاق دے دی بلکہ دوسری عورت بھی منتخب کر لی۔ اس کا مطلب ہے اسے مجھ سے محبت تھی ہی نہیں۔ امی سچ کہتی تھیں وہ ایک ڈرپوک، بزدل اور فرسودہ خیالات میں جکڑا ہوا انسان تھا۔ میں اس کے ساتھ واقعی زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ اس کے ساتھ چل کر میں خوامخواہ اپنی زندگی کو برباد کر رہی تھی اور اب وہ شادی کر رہا ہے میری بے وفائی کا کچھ دن بھی غم نہیں منایا اس نے یعنی اسے کوئی غم نہیں میں نہیں تو کوئی اور...... تو پھر میں کس چیز کا غم منا رہی ہوں۔ سب سمجھا رہے ہیں مجھے...... میں ہی بیوقوف ہوں مجھے بھی زندگی کی خوشیوں میں واپس لوٹ جانا چاہیے۔ بچے کے ختم ہو جانے کا ملال تو بے معنی ہے اگر بچہ رہتا تو میری آزادی اور خواہشات میں رکاوٹ بنتا...... اسے تو پھر بھی فرق نہیں پڑتا اور زندگی میری ادھوری ہو جاتی مگر اب میری زندگی میں کوئی ادھورا پن نہیں...... میں اپنی زندگی بھرپور گزاروں گی...... میں پھر سے ویسی ہی ارسہ بن جاؤں گی جیسی میں پہلے تھی۔''

☆☆☆

''بس کرو فرحان...... میں واقعی تھک گئی ہوں۔'' تیز انگلش میوزک کی وجہ سے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا، فرحان نے اس کا ہاتھ ہی نہیں چھوڑا...... تب وہ ہنستے ہوئے بے حال سے انداز میں فرحان کے بالکل قریب ہو کر چلائی۔

''میں تھک گئی ہوں...... کچھ دیر ریلیکس کرنا چاہتی ہوں۔''

''بس، اتنا سا اسٹیمنا رہ گیا ہے تمہارا...... کہاں... گئی وہ ارسہ...... جو گھنٹوں میرے ساتھ تھرکتی رہتی تھی۔'' فرحان نے اسے بازوؤں کے

حلقے میں لے لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانسیں غیر ہموار تھیں۔

”تمہارا تو دل بہت تیز دھڑک رہا ہے، آر یو او کے۔“ وہ یکدم بے چین سا ہوا اور اسے لے کر ایک سائڈ پر بیٹھ گیا۔

”اوہ......“ اس نے گہری سانس لی اور پیشانی پر سے پسینہ پونچھا پھر اپنی سانس ہموار کرتے ہوئے بولی۔

”عادت نہیں رہی ناں اس لیے......“ فرحان اسے بغور دیکھنے لگا پھر اپنی طرف متوجہ پا کر ارسہ نے فرحان کی طرف دیکھا تو فرحان ہنس دیا۔

”میں کچھ منگواتا ہوں تمہارے لیے۔“ اس نے ویٹر کو آرڈر دیا پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”کیسا لگ رہا ہے میرے ساتھ یہاں آنا؟“

”بہت اچھا......“ وہ ہنس کر بولی۔ ”آج بہت دنوں کے بعد میں اس طرح کسی جگہ گھومنے پھرنے نکلی ہوں۔ شادی کے بعد تو میری زندگی بالکل ہی بدل گئی تھی۔ خشک اور اجاڑ سی...... میں تو خود حیران ہوں میں نے اتنے عرصے کس طرح ان لوگوں کے ساتھ گزارہ کرلیا۔“ وہ جیسے خود کا مذاق اڑا رہی ہو۔ فرحان ہنس دیا۔

”چھوڑو ان فضول باتوں کو...... بھول جاؤ سب۔“

”ہوں...... وقت لگے گا۔ گہرا دکھ دیا ہے اس نے مجھے...... تم جانتے ہو اس نے مجھے طلاق کس بات پر دی تھی۔ اس نے مجھے تمہارے ساتھ ڈانس کرتے دیکھ لیا تھا۔ رابعہ کی مہندی میں۔“

”مگر وہ تو تھا ہی نہیں اس فنکشن میں؟“ فرحان ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولا۔

”ہاں، وہ نہیں تھا مگر میرے بے وقوف بھانجے نے اسے ریکارڈنگ دکھادی۔“ پھر ارسہ نے فرحان کو ساری بات بتائی۔

”کیا ضرورت تھی اسے یہ سب کچھ کرنے کی۔ تم نے پوچھا نہیں اس سے۔“ فرحان کو عجیب سا لگا۔

”پوچھنا کیا تھا، اچھی خاصی لڑائی ہوگئی تھی ساجدہ باجی اور باسط بھائی سے مگر دیکھو ناں ان لوگوں کا بھی کیا قصور...... ہمارے یہاں تو یہ سب کچھ عام سا ہے مگر اس نے تو بات کا بتنگڑ ہی بنالیا اور نوبت طلاق تک آگئی۔“

”جاہل تھا وہ شخص...... اسے تمیز ہی نہیں تھی کہ تم جیسی آرٹ ذہن رکھنے والی لڑکی کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ اس جاہل کو تو صرف باورچن چاہیے تھی۔ ایسے شخص کو کیا پتا زندگی کی رنگینیاں کس چیز میں پنہاں ہیں، سچ پوچھو ناں، وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔ تم آرٹسٹک ذہن کی لڑکی ہو۔ وہ بنیاد پرست شخص تھا۔ تم لوگ زیادہ دیر ساتھ چل ہی نہیں سکتے تھے اور اچھا ہوا تمہارا بچہ بھی دنیا میں آنے سے پہلے چل بسا۔“ ارسہ کیا بتاتی...... وہ تو اس کی ماں نے اور اس نے خود ختم کرایا تھا۔ اسے گم صم پا کر فرحان نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا پھر کہنے لگا۔

”ہم ہمیشہ سے اچھے دوست رہے ہیں، کیا یہ دوستی کسی اور رشتے میں قائم ہو سکتی ہے؟“

ارسہ چونکی۔

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ایک الوہی چمک ارسہ کے چہرے پر آ کر گزر گئی، کچھ دیر تک دونوں طرف خاموشی رہی، اتنی دیر میں ارسہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ شکوے سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ خیال تمہیں پہلے کیوں نہیں آیا...... کیا ہم پہلے اچھے دوست نہیں تھے۔“ فرحان ابھی کچھ سوچ کر جواب دیتا کہ ارسہ خود ہی بولی۔

”گویا اب تم مجھ پر ترس کھا کر مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ ہے ناں...... اگر ایسا ہے تو میں تمہارا احسان نہیں لوں گی۔“ وہ اوپرے دل سے کہہ رہی تھی۔ من تو اس کا کھل اٹھا تھا۔

”اب تم نے کہہ لیا تو میری بھی سن لو۔ خواہش تو میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والوں کی بھی تھی لیکن تمہارے گھر والوں خصوصاً تمہارے بڑے بھائی کا ٹارگٹ کچھ اور تھا۔ اس کی سوچ کے آگے ہماری حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ تو تمہیں امیر، مالدار گھر میں بیاہنے کا خواہ تھا۔“ اس کی بات پر ارسہ کلس گئی اور برملا فرحان کے سامنے بولی۔

”اس میں دلاور بھائی کے مفادات تھے، وہ چاہتے تھے کہ میں کسی ایسے گھر میں بیاہی جاؤں کہ میری معاشی حیثیت سب بہن بھائیوں کے لیے مورل سپورٹ بنے لیکن چند دن میں ہی انہیں پتا چل گیا کہ سالار اور اس کے گھر والے روپیہ تو کیا کسی کو بخار بھی دینے پر آمادہ ہونے والوں میں سے نہیں تھے۔ تبھی تو وہ جلد ہی اپنے فیصلے پر پچھتانے لگے تھے۔“

”یہ تو سراسر انہوں نے اپنے لیے ہی سوچا، تمہارے لیے تو کچھ نہیں سوچا۔“ فرحان نے اس کے ساتھ ہمدردی کی...... ارسہ چپ رہی پھر کہنے لگی۔

”اب میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کروں گی۔“ فرحان نے یکدم ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

”تو گویا تم مجھے ریجیکٹ کرنے والی ہو؟“ ارسہ اس کی حرکت پر کھلکھلا کر ہنس دی۔

☆☆☆

”یہ تو ہمارے لیے بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ آپ کی ایسی سوچ ہے اگر یہ رشتہ ہم پہلے جوڑ لیتے تو آج ہمارے گھر والوں کے تعلق میں اور بھی مضبوطی آجاتی۔“ دلاور علی نے فرحان کے والد صاحب کو کہا۔ جو فرحان کا باقاعدہ رشتہ مانگ رہے تھے۔ اس رشتے پر ارسہ کے سارے گھر والے مسرور اور متفق تھے...... خود ارسہ بھی دل ہی دل میں خود پر نازاں تھی۔

”بس اگر آپ لوگوں کو یہ رشتہ منظور ہے تو منگنی آج ہی کیے لیتے ہیں اور شادی کی تاریخ بھی جلد ہی طے کرلیتے ہیں۔ ضرورت بھی کیا ہے اتنا وقت نکالنے کی۔“ گھر میں بیٹھے بٹھائے کتنا اچھا رشتہ آگیا تھا واقعی فرحان سے بہتر اور کون ارسہ کا جیون ساتھی ہوسکتا تھا ارسہ کے بہن بھائیوں میں ہی منگنی کی رسم ادا ہوگئی۔ دونوں طرف سے انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوگیا۔

”ابھی منگنی تو سادگی سے ہوگئی ہے مگر شادی دھوم دھام سے ہوگی پورے باجے گاجے اور شور شرابے کے ساتھ۔“ سب ہی خوش ہو کر بولے تو کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا بلکہ دلاور کہنے لگا۔

”ہماری یہی ایک خواہش ہے کہ ارسہ کی شادی دھوم دھام سے ہو تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ ارسہ بدقسمت نہیں ہے۔“ دلاور کی بات پر الیاس صاحب اور بھی خوش ہوئے ...اور آناً فاناً شادی کا دن بھی متعین کرلیا گیا۔

اور جب فرحان کی منگنی اور شادی کی خبر الیاس صاحب نے فیصل آباد جا کر مہران کو سنائی تو مہران کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”یہ کیسے ہوسکتا ہے ابو؟“

”یہ ہو رہا ہے۔“ الیاس صاحب ڈھٹائی سے بولے۔ ”اور تم اپنا منہ بند رکھو گے......اور عنبر سے بھی

کہو گے کہ اپنا منہ بند رکھے۔"

"مگر آپ لوگ جانتے بوجھتے کسی کی زندگی کیسے خراب کر سکتے ہیں فرحان کچھ عرصے سے ایچ آئی وی پازیٹو ہے۔"

"میں جانتا ہوں، تمہیں بار بار دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ ایچ آئی وی پازیٹو ہے تو کیا اسے موت سے پہلے ماردیں، اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، زندگی کی خوشیوں پر کوئی حق نہیں ہے اس کا۔" مہران چپ سا ہو گیا۔

"ذرا خود سوچو مہران! اس نے ساری زندگی عیاشیوں میں صرف کی ہے اب تنہائی اور اکیلا پن اسے کاٹتا نہیں ہوگا، وقت سے پہلے مرجائے گا وہ اگر ہم نے اس کے بارے میں نہیں سوچا تو...... خوش ہے وہ اس رشتے پر...... شادی کرنا چاہتا ہے وہ ارسہ سے، زندگی پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہم سب کا ہے۔" باپ کے دلائل پر مہران نے گہری سانس کھینچی۔ الیاس صاحب کتنی سفاکی اور بے رحمی کا ثبوت دے رہے تھے۔

"اگر وہ عیاش نہ ہوتا تو اسے یہ مرض بھی نہ لگتا......"

"اب ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے...... ٹھیک اور اس کا پراپر علاج ہو رہا ہے۔"

"مگر وہ علاج سے ٹھیک تو نہیں ہو جائے گا۔" مہران نے بات کاٹی۔

"مگر وہ کنٹرول میں تو رہے گا ناں...... اب جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے اسے اس کے حال پر چھوڑنا وقت سے پہلے موت کے منہ میں دھکیلنا ہے اور میں اسے لمحہ بہ لمحہ مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ جتنی بھی اس کی زندگی ہے، میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں اب تم اس بات کو منہ پر نہیں لاؤ گے اور بھائی کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوگے، سمجھے!" مہران نے اثبات میں گردن ہلادی۔

☆☆☆

ارسہ کان سے فون لگائے مزے سے بستر میں لیٹی تھی اور فرحان اس کے کانوں میں اپنی محبت کی شیرینی انڈیل رہا تھا۔

"جب سے تمہارے پاس سے آیا ہوں۔ ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ نہ جانے کیسے گزرے گا یہ ہفتہ۔" وہ بے چینی سے کہہ رہا تھا اور ارسہ کے من میں گدگدی ہو رہی تھی۔

"کتنا خوب صورت پریڈ ہوتا ہے منگنی کا...... یہ مجھے تم سے منسوب ہو کر پتا چلا ہے کہ اس رشتے میں بھی کتنا چارم ہے۔" وہ اس کی شیریں باتوں میں الجھ رہی تھی۔

"اچھا......" فرحان ہنسا۔ "مگر خدا کے واسطے اس چارم کو زیادہ پسند نہیں کر لینا کہیں میری شادی ہی التوا میں پڑ جائے۔" ارسہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بڑی جلدی ہو رہی ہے جناب کو۔"

"ہاں...... بہت جلدی...... میرا بس چلتا تو میں تمہیں ساتھ ہی لے آتا مگر...... ابو کی خواہش تھی کہ شادی باقاعدہ طریقے سے ہوگی اس لیے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔"

"اور تمہاری کوئی خواہش نہیں تھی؟" ارسہ نے چھیڑا۔

"میری بھی یہی خواہش ہے کہ ساری رسمیں ہوں لیکن یار ان میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔" وہ بے چینی سے بولا تو ارسہ کو اپنا آپ نایاب اور معتبر لگا۔ کتنا چاہتا تھا فرحان اسے، اتنی چاہت تو اس نے کبھی سالار میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ ہر وقت گھر والوں سے ڈرا سہا رہتا تھا سالار جبکہ فرحان کو شروع سے کسی کی پروا ہی نہیں تھی اور اسے ایسے ہی مرد اچھے لگتے تھے۔ نڈر اور اپنی من مانی کرنے والے۔

"اچھا سنو...... تمہارے شادی کے جوڑے کی شاپنگ کرنی ہے۔ بولو، کس رنگ کا لوں اور ہاں ولیمے کا بھی بتا دینا؟" فرحان اس سے پوچھ رہا تھا۔

"تم اپنی پسند سے لے لو ناں...... آخر تمہاری پسند بری تو نہیں ہے۔"

"بات یہ نہیں ہے۔" فرحان نے کہا۔ "شادی کا دن ہر ایک کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اور اس کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ جب دولہا، دلہن کو اپنی من پسند شاپنگ کا موقع ملے کچھ تو سوچا ہوگا تم نے کپڑوں کے بارے میں، جیولری کے بارے میں آخر یہ تمہاری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔" فرحان کی باتیں کس قدر اس کے مزاج کی عکاسی کر رہی تھیں وہ گھائل ہی ہو گئی اور کہے بنا نہ رہ سکی۔

"کاش، کاش فرحان...... تم مجھے پہلے ہی اس بندھن میں باندھ لیتے تو میں اپنی زندگی کے بہترین دن یوں ضائع ہونے کا غم تو نہ کرتی۔" فرحان ہنس دیا۔

"اب تم ایسی باتیں کرو گی تو میں ابھی اڑ کر آجاؤں گا۔"

"ہاں...... تو پھر آجاؤ ناں...... اکٹھے ہی شاپنگ کر لیتے ہیں آخر تم بھی تو اپنے لیے شادی اور ولیمے کا جوڑا لو گے۔"

"ہاں...... ابھی تک تو میں نے بھی کچھ خریداری نہیں کی...... چلو ٹھیک ہے میں کل تک تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔"

☆☆☆

"جہیز کا سارا سامان ویسے کا ویسا ہی ہے...... میرا تو خیال تھا کہ وہ لوگ اشتعال میں سامان توڑ پھوڑ دیں گے یا کم کر دیں گے مگر انہیں تو جیسے غصہ ہی نہیں آیا...... جیولری بھی تمہاری جوں کی توں ہے بس میک اپ وغیرہ کی اور کپڑوں کی کچھ خریداری کرنی ہے، وہ تمہیں فرحان کرا دے گا۔"

"کیوں...... فرحان کیوں کرا دے گا؟ مجھے جو خریدنا ہوگا میں اپنے لیے خود خریدوں گی۔ فرحان کو جو اپنی طرف سے لینا ہوگا وہ لے لے گا۔"

"دیکھو ارسہ، دلاور نے انکار کر دیا ہے وہ کہہ رہا ہے ایک روپے کی بھی نئی خریداری نہیں کرے گا۔ ہر چیز تو ہے تمہارے پاس...... تم کیوں ضد کر رہی ہو...... لے لے گا فرحان تمہارے لیے۔ تم نے ہی تو استعمال کرنا ہے اور پھر ویسے بھی اتنے بڑے پیمانے پر دوبارہ برات کے کھانے اور اسے ٹھہرانے کی ذمے داری چھوٹی نہیں ہے۔ دلاور کا اچھا خاصا خرچہ ہو جائے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ...... ابھی تو دلاور بھائی کے پاس میرے وہ پانچ لاکھ روپے بھی ہیں جو میں نے حق مہر میں وصول کیے تھے۔"

"وہ روپے تمہاری پہلی شادی کے قرض میں اتر گئے۔" نعیمہ بیگم نے کہا تو ارسہ حیرانی سے ماں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"تو اس کا مطلب ہے اب بھی دلاور بھائی کسی سے قرض لے کر میری شادی پر کھانے کا انتظام کریں گے۔" وہ جل کر بولی۔

"ہاں...... اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم میانہ روی سے چلو اور دیکھو...... اب دوبارہ ان پانچ لاکھ روپوں کا ذکر مت کرنا۔ دلاور نے سن لیا تو بہت ناراض ہوگا۔ پہلے ہی بھائیوں، بھائیوں میں کاروباری کھینچا تانی چل رہی ہے۔ سعد اور معیز نے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا ہے۔ دلاور پہلے ہی بہت

پریشان ہے۔ بس میں تو یہ شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے مجھے دلاور جیسا بیٹا دیا ہے جو میرے برے بھلے وقت میں کام آرہا ہے۔ ڈھائی سے تین لاکھ روپے کا خرچ ہے اب بھی تمہاری شادی کے کھانے اور ہوٹل میں قیام کا۔" ارسہ چپ ہو گئی کیا بحث کرتی جب ماں ہی ہتھیار ڈال چکی تھی۔

"تمہاری شادی کے بعد...... گھر کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ خدا سے دعا کروں گی، میری بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد اور خوش رہیں اور کبھی پلٹ کر نہ آئیں۔" یہ کہہ کر نعیمہ بیگم اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ ارسہ نے مزید بحث اور جرح کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

☆☆☆

فرحان فیصل آباد سے آیا تو ارسہ کو شاپنگ کے لیے لے کر نکل پڑا۔ فرحان نے دو دن تک ارسہ کو جی بھر کر شاپنگ کرائی...... لیکن ارسہ نے شادی کا جوڑا نہیں خریدا اور نہ ہی فرحان کو خود اس کا جوڑا خریدنے دیا۔

"خیر ہے محترمہ...... پورا شہر گھوم لیا اور تمہیں کہیں اپنے لیے شادی کا جوڑا ہی پسند نہیں آیا؟"

"بے فکر رہو...... کسی خاص جگہ سے ہی شادی کا جوڑا خریدوں گی تاکہ جہاں سے خریدوں، بیچنے والوں کو بھی یاد رہے کہ نئی زندگی کا آغاز کس طرح کیا جاتا ہے۔"

"کیا...... مطلب؟" فرحان نہیں سمجھا۔

"ایسا کرو...... کینٹ سائڈ پر چلتے ہیں۔" پھر ارسہ، فرحان کو سالار کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں لے گئی۔ اس کی بیس منٹ برائیڈل کی آرائش سے مزین تھی۔

اس نے وہاں سے برائیڈل ڈریس ایک منٹ میں چوائس کر کے خرید لیا۔ پھر وہ فرحان سے کہنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے یہ سالار اور اس کے بھائیوں کا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے، میں یہاں تمہیں اس لیے لائی تھی کہ جس وقت ہم اپنی شادی کے ڈریس خریدیں...... سالار ہمارے سامنے ہو...... لیکن وہ تو کہیں نظر نہیں آرہا۔" وہ مایوسی سے بولی تو فرحان ہنس دیا۔

"یہ بھی کوئی بہت بڑی بات ہے۔ یہاں دیکھو...... پورے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں کیمرے نصب ہیں۔ کسی ایک فلور میں کوئی تو اسے مانیٹر کر رہا ہوگا۔" فرحان نے یہ کہا...... اور پھر یکدم برہم ہو کر ساتھ سے گزرتے شخص سے اونچا اونچا بولنے لگا۔ سیلز مین اور گارڈ دوڑ کر آئے تو فرحان نے انہیں بھی برا بھلا کہا اور ملازم کو تھپڑ مار دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو فرحان؟" ارسہ بے چین ہو گئی اور فرحان کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔ تبھی تھرڈ فلور پر سالار کو اطلاع ملی کہ بیس منٹ میں کسٹمرز کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس نے کمپیوٹر میں دیکھا کوئی شخص تیز تیز بول رہا تھا۔ سالار کو وہ جانا پہچانا لگا اور پھر جیسے سالار کی نگاہیں اسکرین پر سے ہٹنا بھول گئیں۔ برہنہ بازو میں لمبی قمیص اور کھلے پائنچوں کی شلوار پہنے بغیر دوپٹے کے بال کھولے ہوئے ارسہ اس کے ساتھ چمٹ کر کھڑی تھی۔ محراب لفٹ کے نزدیک پہنچا نیچے جانے کے لیے تو سالار نے آواز دے لی۔

"پلیز بھائی جان! آپ میں سے کوئی نیچے نہیں جائے گا۔" محراب نے سالار کی طرف دیکھا پھر اس کی اسکرین پر نگاہ پڑی تو وہ دنگ رہ گیا۔

"ہم لوگ اپنی شادی کے ڈریس لینے کے لیے آئے تھے لیکن ہمیں کیا معلوم تھا یہاں کے ملازم کس قدر ال منیرڈ اور چیپ ہیں۔" یہ ارسہ تھی۔ "نہیں لینی فرحان ہم نے یہاں سے کوئی چیز...... چلیں آپ یہاں سے۔"

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اونر کو بلائیں آپ لوگ۔"

"سر کچھ بتائیں تو سہی ہوا کیا ہے؟" گارڈ مؤدبانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں کہنا ہم لوگوں نے...... چلیں فرحان...... یہاں سے چلتے ہیں۔" اور دوسرے ہی پل وہ لوگ باہر نکل گئے۔ سڑک پر تیز موٹر سائیکل چلاتے ہوئے فرحان اور ارسہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔

"مجھے پتا تھا کہ وہ سامنے نہیں آئے گا لیکن اس کے پاس میسج تو پہنچ گیا نا...... اسے چاہیے کہ وہ یہ ریکارڈنگ یادگار بنا کر رکھ لے۔" وہ باہم ہنستے ہوئے بہت دور گم ہو گئے تھے۔

الباب اور محراب نے غصے اور نفرت سے یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر الباب، سالار کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"کہاں مر گئی تمہاری غیرت...... اول دن سے ذلیل کرتے آرہے ہو تم ہمیں...... آج تک ہم لوگوں کو یہ پتا نہیں چل سکا کہ سچائی کیا ہے...... آخر وہ تم سے طلاق لینے پر کیوں مصر تھی۔ کچھ نہیں بتایا تم نے ہمیں اور بالآخر...... وہ خود ہی منظرِ عام پر آ گئی تو پتا چلا۔ تم پر طلاق کی تہمت کی۔"

سالار کی گردن جھک گئی تھی۔ نگاہیں فرش سے اٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔ دونوں بڑے بھائیوں کی آنکھوں میں غم و غصہ تھا جبکہ سالار کے لب باہم اس طرح پیوست ہو گئے تھے جیسے کبھی نہ کھلیں گے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ دوسرے ہی پل وہ وہاں سے نکل کر باہر چلا گیا۔

"بہت ہی بزدل نکلا تمہارا سابقہ شوہر...... کم از کم اسے سامنے تو آنا چاہیے تھا۔" فرحان گھر کے سامنے موٹر بائیک روک کر بولا تو ارسہ تحقیر و تنفر سے بولی۔

"وہ اتنا ہی بزدل ہے اور اس بزدلی کو غیرت سمجھتا ہے...... خیر میرا تو مقصد پورا ہو گیا۔ تمہیں ساتھ دیکھ کر ہی وہ مجھ سے بدظن ہوا تھا اب اسے یہ خیال ہی تکلیف پہنچاتا رہے گا کہ میں تمہارے ساتھ ہی گھر بسانے جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر ارسہ، فرحان کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور دونوں ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

یہ اتفاق تھا یا تقدیر کے قرطاس پر یونہی لکھا تھا۔ جس روز فرحان کا نکاح ارسہ سے ہوا...... اسی روز نائمہ، سالار کی زندگی میں داخل ہوئی۔ سالار کی شادی سادگی اور وقار سے اختتام پذیر ہوئی تھی جبکہ ارسہ اور فرحان کی شادی میں ہر قسم کی رسم اور دھوم دھام شامل تھی۔

ارسہ اپنی زندگی پر جس قدر بھی ناز کرتی تھوڑا تھا۔ فرحان نے اس کی پسند کے مطابق سب کچھ کیا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ شادی کا بندھن کہتے کسے ہیں...... وہ فرحان کے بیڈ روم میں دلہن کے روپ میں آراستہ و پیراستہ بیٹھی تھی اور فرحان اسے اپنی محبت کا یقین اور اپنی وابستگی کا احساس دلا رہا تھا...... جس پر وہ نازاں و فرحاں تھی۔

نائمہ واجبی سی شکل صورت کی لڑکی تھی۔ وہ سالار کے پہلو میں کھڑی ہو کر بھی نہیں جچ رہی تھی لیکن...... وہ اس کی شریکِ حیات بن گئی تھی، اس

کے لیے معتبر تھی۔ سالار نے اس سے محبت کے دعوے نہیں کیے...... اس کی سج دھج کو نہیں دیکھا۔ وہ تو اپنی گھٹن کو آج لفظوں میں نکال دینا چاہتا تھا۔ اس ساری گھٹن کو جو کئی دن سے اسے حبس زدہ کیے ہوئے تھی۔

''میں ارسہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ شاید وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی...... جب وہ میری زندگی میں آئی تو مجھے لگا۔ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی ہوگی لیکن...... ایسا نہیں ہوا اور وہ مجھے دھوکا دے کر...... بہتان لگا کر...... مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔ وہ ایک علیحدہ ہی ماحول کی پروردہ تھی۔ میں چاہ کر بھی اسے اس ماحول میں نہ ڈھال سکا۔ بعض اوقات میں اس کی بے پروائی پر چشم پوشی اختیار کرلیا کرتا جس پر گھر والے مجھ سے نالاں ہو جاتے...... بعض اوقات وہ مجھے اس قدر غصہ دلاتی کہ گھر والوں کے سمجھانے پر بھی مجھے سمجھ نہیں آتا تھا اور میرا دل کرتا کہ میں اسے جان سے ماردوں لیکن اسے احساس ہی نہیں ہوتا تھا میری باتوں کا۔ حالانکہ وہ گھر والوں کی رضامندی اور پسند سے اس گھر میں آئی تھی لیکن رفتہ رفتہ میرے لیے طعنہ بن گئی کیونکہ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں۔ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں اس کی محبت میں پاگل ہوگیا تھا تبھی اس کے عیبوں پر پردے ڈالنے لگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا جو کچھ میں ارسہ کے گھر میں دیکھتا ہوں اس کا تذکرہ اپنے گھر میں اپنے بہن بھائیوں میں بیٹھ کر کروں...... مجھے اس سے محبت ہی نہیں تھی، اس کی عزت بھی عزیز تھی...... مگر نہ جانے وہ کیسی لڑکی تھی وہ میرے سمجھانے پر میرا مذاق اڑاتی تھی۔ شادی کی پہلی رات جب میں نے اسے کہا۔ ارسہ آہستہ ہنسو تو وہ برا مان گئی۔ مجھے تبھی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ کبھی میرا کہا نہیں مانے گی۔ میرے کہنے کے مطابق اپنی زندگی میں تبدیلی نہیں لائے گی اگر میں ایسا سمجھ بھی لیتا تو کیا ہماری زندگی اچھی گزرتی...... وہ اسی طرح اپنی من مانی کرتی تھی۔ البتہ کچھ عرصے کے بعد اس میں یہ بات آگئی تھی کہ وہ میرا کہا مان لیا کرتی لیکن اپنے گھر جا کر وہی حرکتیں کرتی جن سے مجھے شکایت تھی۔ میں نے کبھی یہ بات گھر میں ظاہر نہیں کی۔ ایک طرح سے وہ بھی میری شخصیت میں تبدیلیوں کی خواہاں تھی۔ وہ کہتی تھی...... اگر میں اسے شریعت پر پابند کرنا چاہتا ہوں تو پہلے خود شرعی احکام کو اپناؤں...... اکثر وہ میرا مذاق اڑاتی اور کہتی کہ مجھے داڑھی رکھ لینی چاہیے...... میں اس کی باتوں سے کنفیوز ہو جاتا لیکن...... میں آج سوچتا ہوں میں کنفیوز کیوں ہوتا تھا۔ اس لیے کہ...... میں خود ادھورا مسلمان تھا۔

''ہاں...... میں نماز کا پابند نہیں تھا۔ یہ بھی سچ ہے...... میرے چہرے پر شرعی داڑھی نہیں تھی تو کیا ان دو باتوں کے نہ ہونے سے ایک مسلمان مرد ادھورا مسلمان ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا اس بات کو...... ہاں...... مگر میں اتنا جانتا ہوں...... میں نے آج تک کسی غیر عورت کو دلچسپی سے نہیں دیکھا۔ بری نگاہ نہیں ڈالی کسی پر...... کسی غیر محرم عورت کے ساتھ ہنسنا بولنا گوارا نہیں کیا۔ ہمیشہ رشتوں کا احترام کیا۔ یہ ہماری تربیت اور خون کا حصہ تھا کہ ہم عورت کو بہت معتبر دیکھنا چاہتے ہیں لیکن جب میں نے ارسہ کو ایک بالکل اجنبی شخص کے ساتھ ناچتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا۔ میری غیرت تو یہ کہتی تھی کہ میں اسے...... سب کے سامنے طلاق دے دوں لیکن میرا آنے والا بچہ میری بزدلی بن گیا اور اس وقت میں مصلحتاً خاموش ہوگیا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔

''تمہیں پتا ہے اس بات کا ذکر میں نے گھر آ کر کسی سے نہیں کیا...... گھر والے مجھ سے پوچھتے رہے اور یہاں تک کہ بات بڑھتے بڑھتے سب کے درمیان میں پہنچ گئی...... مگر میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے ارسہ کا کون سا فعل دیکھا تھا سب کچھ ختم ہو گیا اور گھر والے مجھے لعن طعن کرتے رہے۔ جب ارسہ نے قرآن پاک اٹھا کر کہا کہ میں اسے طلاق دے چکا ہوں تب میں ششدر ہی رہ گیا۔ ہر کوشش اور بھاگ دوڑ کے باوجود میں کوئی ثبوت نہ نکلوا سکا...... اور جب میں ہر کوشش میں ناکام ہوگیا تب میں نے ہار مان لی۔ ارسہ سے نہیں...... اس رب سے...... نہ جانے میرا اللہ مجھے کون سی بھلائی دینے والا تھا اور پھر میں نے اپنے اس فیصلے کو اللہ کے حوالے کردیا لیکن کیسی بات ہے یہ...... اس نے اپنے راز خود ہی فاش کردیے۔ چند روز قبل وہ میرے اسٹور پر آئی۔ اسی شخص کے ساتھ...... میں جو ذرا سی بات پر غصے میں آجاتا تھا مجھے اسے دیکھ کر غصہ ہی نہیں آیا۔ آخر وہ میری لگتی ہی کیا تھی جو میں غصہ یا غیرت دکھاتا۔ الباب بھائی مجھ سے بہت نالاں ہوئے۔ ان کا شروع سے خیال تھا کہ اندر خانے بات کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ ان کا قیاس بالکل درست تھا لیکن میں نے ارسہ پر کوئی کیچڑ نہیں اچھالی۔ جب میں نے اپنا معاملہ اللہ کو سونپ دیا تو اللہ ہی میرا بہترین بدلہ لینے والا......'' یہ کہہ کر سالار نے گہری سانس لی۔ پھر گم صم بیٹھی نائمہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''سب لوگوں کی طرح تمہارے دل میں بھی خدشات ہوں گے۔ سوالات ہوں گے۔ تم شاید یقین نہ کرو...... مگر میرا دل یہ کہتا ہے کہ اس نے میرا بچہ بھی خود مارا ہوگا۔ صرف آزادی کی خاطر۔'' یہ کہتے ہوئے سالار کے چہرے پر کس قدر کرب تھا۔ نائمہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اس وقت وہ بالکل ٹوٹا ہوا تھا۔ اسے پُراعتماد اور مخلص ساتھی کی ضرورت تھی جو اسے نائمہ کی صورت میں مل گئی تھی۔

☆☆☆

''ارسہ اور فرحان ہنی مون سے لوٹ آئے ہیں...... اب مجھے بتادو کہ میں نے اپنے بچے لے کر کہاں رہنا ہے؟'' عنبر نے مہران سے سوال کیا تو مہران سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا۔

''کچھ دن اور صبر کرلو...... پھر ابو...... ارسہ اور فرحان کو علیحدہ کردیں گے۔''

''وہ تو اب بھی علیحدہ ہیں۔ کون سا ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن ارسہ تو سارے گھر میں دندناتی پھرتی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ کچن میں گھس جاتی ہے اب مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ آپ میرا کچن علیحدہ کروائیں یا پھر اس کے پورشن میں کچن بنوادیں۔ کیوں آتی ہے وہ ادھر؟'' عنبر نے جھرجھری لے کر کہا تو مہران کہنے لگا۔

''دیکھو...... وہم مت کرو...... جس طرح تم سمجھ رہی ہو یہ بیماری اس طرح نہیں پھیلتی۔''

''تو کس طرح پھیلتی ہے...... وہ ہمارے ساتھ کھائے پیے۔ بچوں کو لے۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں صاف صاف بتا رہی ہوں یا تو اس کا ادھر آنا جانا ختم کرائیں ورنہ میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔'' عنبر نے دھمکی دی۔

''تم ایسا نہیں کروگی۔'' مہران غصے میں آگیا۔ ''اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔''

''کیا کروگے تم؟'' عنبر ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"تمہارے جیسا بے وقوف شخص میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ جسے اپنے بچوں کی زندگی کا احساس نہیں۔ میں جارہی ہوں اپنی امی کے گھر...... جب تم اس کا بندوبست کرلو تب آکر مجھے لے جانا۔" عنبر نے غرا کر کہا اور اپنے بچے لے کر اندر کمرے میں چلی گئی اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ مہران اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آگیا۔

"دیکھو عنبر! اس طرح تماشا مت دکھاؤ...... تمہیں پتا ہے میرے لیے بھی یہ سب کچھ بالکل غیر ارادی اور اچانک ہے اب تم کچھ موقع دو گی تو کچھ پلاننگ کرسکوں گا۔"

"تم پلاننگ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر تم میرا یا اپنے بچوں کا بھلا سوچتے تو اسی دن اس گھر سے نکل جاتے جس دن تمہارے بھائی کو یہ مرض ہوا تھا۔"

"تو میرے بھائی سے تمہیں کیا تکلیف پہنچی۔ وہ تو خود بہ خود الگ تھلگ رہنے لگا تھا ساری فیملی سے۔" مہران جھڑک کر بولا۔

"ہاں بھئی...... اس نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی فیملی بنالی۔" عنبر چڑ کر بولی۔ اس اثنا میں وہ اپنے بچوں کے کپڑے بیگوں میں بھر چکی تھی۔

"دیکھو عنبر...... تم اس طرح نہیں جاسکتیں، گھر کا سارا انظام درہم برہم ہوجائے گا۔"

"اب نہیں ہوگا۔ اب اس گھر میں دوسری بہو آچکی ہے۔ آخر اسے بھی تو موقع ملنا چاہیے گھرداری کرنے کا۔" عنبر نے سکون سے کہا۔ مہران اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"دیکھو مہران میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں ابھی...... تمہارا سارا پول کھول دوں گی۔" مہران برق رفتاری سے سامنے سے ہٹ گیا۔ عنبر تینوں بچوں کو لے کر گھر سے چلی گئی۔

☆☆☆

"عنبر بھابی کے جانے سے گھر بالکل ہی سونا ہوگیا ہے۔ آخر وہ میکے میں اور کتنے دن رکیں گی؟" ارسہ نے فرحان سے پوچھا تو فرحان کہنے لگا۔

"وہ لڑ جھگڑ کر گئی ہے، پتا نہیں کتنے دن تک رکے...... علیحدہ گھر کا مطالبہ ہے اس کا...... جب مہران مان جائے گا وہ آجائے گی۔"

"کیوں...... وہ علیحدہ کیوں ہونا چاہتی ہیں؟" ارسہ کو حیرانی ہوئی۔ "فیملی ہی کتنی بڑی ہے ہمیشہ ساتھ رہا جاسکتا ہے۔ اچھی خاصی تو گنجائش ہے اس گھر میں۔"

"اسے تم پسند نہیں ہو۔" فرحان نے جھوٹ بولا۔

"عجیب بات ہے۔" ارسہ دل ہی دل میں حیران ہوئی۔ پھر کہے بنا نہ رہ سکی۔ "میں نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جیسی عنبر بھابی ہیں بالکل الگ تھلگ رہتی ہیں۔ اپنے بچوں کو بھی کمرے میں بند کرکے رکھتی ہیں۔ میں تو حیران ہوتی ہوں وہ اس طرح کیسے رہ لیتی ہیں۔"

"تم اس کے علاوہ کوئی اور ذکر نہیں کرسکتیں؟" فرحان چڑ گیا۔ "کیا بہت یاد آرہی ہے اس کی؟"

"ایسا نہیں ہے فرحان...... میں پہلے بھی تم سے کہنا چاہتی تھی...... عنبر بھابی اپنے بچوں کو پیار کرنے نہیں دیتیں...... خود بھی کھنچی کھنچی رہتی ہیں اور بچوں کو بھی مجھ سے دور رکھتی ہیں حالانکہ ان کا چھوٹا بیٹا مجھے بہت پیارا لگتا ہے اکثر میرا دل کرتا ہے اسے گود میں لے کر بہت سارا پیار کروں لیکن جیسے ہی میں اسے گود میں اٹھاتی تھی بھابی اسے لے کر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ اب تم بتا رہے ہو کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں۔ ویسے اس ناپسندیدگی کی کوئی وجہ تو ہوگی؟" وہ دلچسپی سے فرحان کے قریب ہوگئی تو فرحان غصے میں آگیا۔

"تم ایسا کرو اس سے خود پوچھ لینا۔" وہ یکدم اتنی تلخی سے بولا کہ ارسہ حیران رہ گئی۔

"فرحان...... کیا ہوگیا ہے آپ کو؟"

"تم سوچو کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے، ایک انسان تمہیں مسلسل اگنور کررہا ہے تم سے بات نہیں کرنا چاہتا وہ اپنے بچوں کو تمہارے کمرے میں بھی آنے نہیں دیتی...... اتنی نفرت کرتی ہے تم سے...... اور تم ہو کہ مسلسل اسے اہمیت دے کر اس کا ذکر ہی کیے جارہی ہو...... زہر لگتی ہے وہ عورت مجھے...... ہر وقت مہران کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے...... ابو کے خلاف کان بھرتی رہتی ہے۔ مہران ہی تو ہمیں کما کر نہیں کھلا رہا...... جو کچھ بھی ہے سب کچھ ابو کا ہے مگر اسے تو جیسے گمان ہے کہ اس کے شوہر کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں ہم لوگ...... تمہارے آنے سے خرچہ بڑھ گیا ہے، اسی وجہ سے تم اس کی نظروں میں کھٹکتی ہو...... ابو اس کے بچوں کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے۔ اس لیے وہ بچوں کو کمرے میں بند کرکے ابو کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ بلیک میل کرتی ہے ہمیں اور تم سمجھ ہی نہیں رہیں کہ اس کی کیا نیچر ہے کیا نفسیات ہے" ارسہ کو حیرانی ہوئی۔

"بھاڑ میں جائے وہ" ارسہ چیخ کر بولی۔ "بڑی اتراتی ہے اپنے بچوں پر اللہ تعالیٰ ہمیں بھی بچے دے دے گا۔ ابو کی...... تنہائی دور ہوجائے گی۔" فرحان اس کی بات پر نظریں چرا گیا اور کچھ نہیں بولا۔

"مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں فرحان...... میں دن رات دعا کرتی ہوں میں جلدی سے پھر سے ماں بن جاؤں مکمل ماں۔" وہ گہری حسرت سے بولی تو فرحان تب بھی چپ رہا۔

"تمہیں بھی تو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ تم کچھ نہیں کہتے اس بارے میں؟" وہ فرحان کو گم صم پاکر چھیڑنے لگی۔

"ہوجائیں گے ارسہ بچے بھی...... ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" وہ چڑچڑے سے انداز میں بولا تو ارسہ ایک بار پھر حیران رہ گئی۔

"بہرحال، میں نہیں چاہتا کہ میرے بہت جلد بچے ہوں...... بچے ہونے کے بعد...... زندگی کی ساری رنگینی ختم ہوجاتی ہے۔" پھر اس نے یکدم اپنا لہجہ بدل لیا اور ارسہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ابھی تم ایسے ہی بہت حسین لگتی ہو...... بچوں کے بعد یکدم بے ڈول سی ہوجاؤ گی جس طرح اکثر عورتیں ہوجاتی ہیں اور پھر مجھے اتنا وقت بھی نہیں دے سکوگی جس طرح اب دیتی ہو...... پھر تمہاری ساری توجہ اور چاہت کا مرکز بچے ہی ہوں گے۔ اس لیے میں دعا کروں گا کہ تم کبھی ماں نہ بنو۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کتنی سفاکی تھی۔ ارسہ نے بے ساختہ اپنے منہ سے نکلتی تکلیف دہ چیخ کو ہتھیلی رکھ کر روکا اور شکوے سے بولی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں فرحان؟" اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" وہ اسی کیفیت میں تھا۔ "فی الحال اپنے دل میں ماں بننے کی خواہش کو پنپنے نہ دینا کیونکہ مجھے اولاد کی خواہش نہیں ہے۔" وہ بے رحمی سے کہہ کر باہر چلا گیا اور کتنے پل کیا کئی گھنٹے تک ارسہ کے دماغ میں فرحان کی بات گونجتی رہی۔

☆☆☆

"انسان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ایسے کیسے فرحان اولاد

ہونے سے روک سکتا ہے...... میرے اندر ماں بننے کی کتنی خواہش ہے۔ یہ تڑپ کوئی نہیں جان سکتا۔ شاید یہ تڑپ اس ملال میں پنہاں ہے جسے میں نے کھو دیا۔ میں فرحان کو مناؤں گی۔ فرحان میری ہر بات مانتا ہے اور یہ بھی مان جائے گا، میں ماں بننا چاہتی ہوں۔ اپنے وجود کے ٹکڑے کو گود میں کھلانا چاہتی ہوں۔" اس نے حسرت سے اپنے خالی ہاتھ دیکھے اور دل میں عزم کیا۔ کسی طرح سے بھی وہ فرحان کو اس چیز پر راضی کرے گی لیکن عجیب بات تھی وقت کے ساتھ ساتھ اس پر یہ انکشاف ہونے لگا فرحان یہ موضوع پسند ہی نہیں کرتا۔ وہ جتنی زیادہ بچے کی خواہش دل میں رکھتی تھی فرحان اتنا ہی بچوں سے چڑتا تھا۔ وہ بہت زیادہ سوچنے کے بعد بھی کھوج نہیں پائی۔ فرحان میں یہ تبدیلی اب آئی ہے یا وہ شروع سے ہی ایسا تھا۔

یونہی زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے کہ ارسہ کو اپنے اندر کچھ تبدیلیوں کا احساس ہونے لگا۔ اسے ہمہ وقت متلی کی سی کیفیت رہنے لگی تھی۔ پھر ایسا ہوا اسے قے آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی موشن بھی لگ جاتے اسے جس روز پہلی مرتبہ قے آئی، وہ خوشی سے ناچنے کو تھی۔ خدا نے اس کی سن لی تھی۔ اس نے دل میں مصمم ارادہ کیا تھا کہ فرحان سے جس قدر ہوگا اس بات کو چھپائے گی۔

"ایک بچہ ہو جائے، بے شک اس کے بعد وہ جتنا زیادہ کہے گا میں وقفہ کروں گی لیکن ابھی نہیں۔" وقت گزر رہا تھا اس کی طبیعت میں نڈھالی سی آتی جا رہی تھی۔ بسا اوقات اس کا گلا بھی خراب رہنے لگا تھا، گلے کی خرابی کی وجہ سے اسے ٹمپریچر ہو گیا اور بڑھتے بڑھتے زیادہ بڑھ گیا۔

فرحان کو اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی پھر اس نے دل میں سوچا۔ "ایک روز ارسہ کے ساتھ یہ سب تو ہونا ہی تھا۔" اس کی خود غرضی اپنی جگہ مگر اسے ارسہ کا خیال بھی تو رکھنا تھا۔

"تمہاری طبیعت مجھے لگتا ہے ٹھیک نہیں ہے۔ چلو میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہیں بخار ہے۔" وہ ارسہ کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے ارسہ کا گلا وغیرہ چیک کر کے اسے بخار اور گلے کی دوا دے دی جس سے ارسہ کو دو تین روز کے بعد کچھ افاقہ محسوس ہوا لیکن اس کی قے بند نہ ہوئی۔

"تمہیں قے کب سے آ رہی ہے؟" وہ تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ ارسہ نے بات گول مول گھما دی۔ وہ ایک بار ماں بنی تھی اور اسے اسی طرح قے آتی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرحان کو وقت سے پہلے پتا چل جائے اور وہ اس بچے کو ضائع کرانے کے بارے میں منصوبے بنانے لگے۔ اس لیے اس نے فرحان کو مطمئن کرنا چاہا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے متلی اسے اچانک ہوئی تھی۔

ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس کا گلا پھر خراب ہو گیا اور اسے پھر ٹمپریچر ہو گیا۔ فرحان نے اس بارے میں الیاس صاحب کو بتایا۔ فرحان کی ساری میڈیسن الیاس صاحب کے کمرے میں ہی رکھی تھیں اور وہ روز وہیں جا کر میڈیسن لیتا تھا۔

"مجھے لگتا ہے ارسہ پر بھی بیماری حملہ آور ہو گئی ہے، مجھے سمجھ نہیں آتا کہ وہ مجھے اپنی کیفیت صحیح طرح کیوں نہیں بتاتی۔ اب بھی میں اسے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس چلے تو اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اسے تیز بخار ہو رہا ہے، میں سوچ رہا ہوں کہ اسے اپنی میڈیسن میں سے ڈوز دے دوں کیونکہ مجھے یقین ہے وہ بیماری میں مبتلا ہو چکی ہے۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم...... بغیر ٹیسٹ کے تم اسے کوئی میڈیسن نہیں دو گے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ...... میں اس کا ٹیسٹ کراؤں گا تو اس پر پول کھل جائے گا کہ وہ میری وجہ سے....!"

"کیسے کھلے گا پول...... اول تو تم اس لیبارٹری سے ٹیسٹ نہیں کراؤ گے جہاں سے تمہارے ٹیسٹ ہوئے تھے۔ نہ ہی اس ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ گے اسے جس کے زیر علاج تم ہو۔ ایک بات یاد رکھنا فرحان...... تم اس پر کبھی بھی ظاہر مت کرنا کہ وہ تمہاری وجہ سے...... اس مرض میں مبتلا ہوئی ہے...... ہاں جب مرض ظاہر ہو جائے تو تم اپنا بھی مرض ظاہر کر دینا مگر رکھنا اسی پر...... کہ اسے ہی یہ مرض تھا...... اس طرح تمہارے معاملات زیادہ نہیں بگڑیں گے۔ کچھ دن پریشانی ہوگی پھر سب کچھ معمول پر آ جائے گا۔" الیاس صاحب بیٹے کو آہستہ آہستہ سمجھا رہے تھے جو فرحان کو اچھی طرح سے سمجھ میں آ گیا کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر بولا۔

"اچھا...... وہ مہران والے معاملے کا کیا بنا؟"

"عنبر...... بضد ہے علیحدہ گھر لینے پر...... مہران سے کہا ہے میں نے گھر دیکھ لے اور اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا تھا...... تم اپنے گھر میں آباد رہنا...... وہ اپنے گھر میں آباد رہیں گے۔"

"اور آپ......؟"

"میں دونوں طرف رہ لوں گا...... ویسے فرحان...... بچوں کے بغیر مجھے یہ گھر کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ ممکن ہے میں مہران کی طرف ہی چلا جاؤں۔ بہرحال تم فکر مت کرنا...... میں ادھر بھی آتا رہوں گا۔ تمہیں بالکل اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتا۔ پہلے ارسہ کے ٹیسٹ ویسٹ کرا لو۔ اس کا معاملہ کلیئر ہو جائے پھر کچھ پلاننگ کر لیں گے۔ ویسے بھی تم اکیلے تھوڑی ہو...... اب تو ارسہ بھی ہے تمہارے ساتھ۔" الیاس صاحب بیٹے کو حوصلہ دے رہے تھے جیسے پل پل مرتے انسان کو زندگی کی اچھی امید کا دھوکا دیا جاتا ہے۔

"وہ تو خود اس مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔" فرحان کی آواز دھنسی ہوئی تھی۔

"تو کیا ہوا؟" الیاس صاحب نے بیٹے کے کندھے پر تھپکی دی۔ "بہت سے لوگ ہیں جو اس مرض میں سالہا سال جیتے ہیں، ریگولر میڈیسن اور چیک اپ سے۔"

"ارسہ کو بچوں کی بہت خواہش ہے۔" وہ ہارنے کے سے انداز میں بولا۔ الیاس صاحب نے کرب سے گہری سانس لی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں فرحان اگر تم اس طرح ٹوٹ جاؤ گے تو کس طرح معاملات کا سامنا کرو گے۔ بہت سے لوگ بالکل نارمل بھی ہوتے ہیں اور تاحیات بے اولاد رہتے ہیں تمہیں کس چیز کا قلق ہے۔ اس کی کسی خواہش کو خود پر حاوی کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور بے فکر رہو اس پر جیسے ہی یہ راز افشا ہوگا وہ ساری خواہش بھول جائے گی۔" الیاس صاحب کی خود غرضی عروج پر تھی جو فرحان کے لیے ڈھارس کا سبب بن رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ارسہ کو چیک اپ کے لیے پھر اسی ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس کی ساری کیفیت بتائی۔ ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ کچھ ٹیسٹ بھی لکھ دیے جو بے حد ضروری تھے۔

"کیا ضرورت ہے ان ٹیسٹوں کی؟" وہ گھر آ کر کہنے لگی۔ "میں نے نہیں کرانے کوئی ٹیسٹ

ویسٹ۔'' وہ بے پروائی سے بولی تو فرحان چڑ گیا۔
''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ تم اپنا علاج کرانے سے کیوں کترا رہی ہو، کیوں اس قدر ضد میں آ رہی ہو۔ یہ تمہارا بار بار بخار ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارے سامنے ڈاکٹر نے کہا تھا نا؟'' ارسہ نے اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔
''تمہیں میرا اتنا ہی خیال ہے نا تو مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلو...... کیونکہ میں جانتی ہوں مجھے کون سا مسئلہ ہے۔'' فرحان نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا پھر سر پکڑ لیا...... تو گویا اسے کوئی خوش فہمی ہے پھر اس کی خواہش پر اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور ارسہ کے شک کی تردید کرتے ہوئے بولی۔
''نہیں مسز فرحان...... فی الحال تو آپ کو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بہرحال آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور ذرا کچھ یہ ٹیسٹ کرا لیں۔ ان رپورٹس کے بعد میں آپ کا پراپر علاج کر سکوں گی۔''
جہاں ارسہ سخت مایوسی کی حالت میں گھر میں آئی تھی وہاں فرحان کو اطمینان تھا۔ اس کے بعد فرحان نے اس کے ٹیسٹ کرا لیے۔ وہ ٹیسٹ رپورٹس دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر تشویش میں مبتلا ہو گئی اور ارسہ کے دو ٹیسٹ اور لکھ دیے۔ اگلی بار جب وہ لوگ ٹیسٹ رپورٹس لے کر گئے تو فرحان ذہنی طور پر تیار تھا جبکہ ارسہ الجھن میں مبتلا تھی کہ اسے اچانک کیا ہو گیا ہے جو وہ ہر وقت بیمار رہنے لگی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے حیرانی سے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر ان سے چند سوالات کیے۔
''کتنا عرصہ ہوا ہے آپ لوگوں کی شادی کو؟''
''تقریباً چار ماہ۔'' فرحان نے جواب دیا۔ لیڈی ڈاکٹر کے چہرے پر کرب بھی تھا اور سختی بھی۔
''میرا خیال ہے مسٹر فرحان آپ بھی یہ ٹیسٹ کرا لیں۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکتی ہوں۔'' وہ رکھائی سے بولی تو فرحان کہنے لگا۔
''کیا مطلب ہے ڈاکٹر صاحبہ آپ کا...... جو بات ہے آپ مجھے صاف صاف بتائیں۔'' پھر وہ خود ہی کہنے لگا۔ ''ویسے بھی یہ میری بیوی کی دوسری شادی ہے۔ ڈیڑھ برس یہ کسی اور شخص کے ساتھ زندگی گزار کر آئی ہے۔'' اس کے یہ کہنے سے لیڈی ڈاکٹر کے چہرے کی کرختگی خود بہ خود زائل ہو گئی۔
''اچھا...... یہ بات تو آپ لوگوں نے مجھے بتائی ہی نہیں۔'' پھر لیڈی ڈاکٹر ارسہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔
''دیکھیں محترمہ، میں جو بات آپ کو بتانے جا رہی ہوں یہ یقیناً آپ کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن ہو گی لیکن آپ گھبرائیں مت...... ہر بیماری کا علاج ہے۔''
''کیا...... مطلب...... آپ کیا کہنا چاہتی ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟'' لیڈی ڈاکٹر نے پہلے فرحان کی طرف دیکھا پر ارسہ کی طرف۔
''آپ کو ایچ آئی وی پازیٹو ہے۔''
''کیا؟'' ارسہ کے سر پر دھماکا ہوا۔ قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
''مگر...... یہ کیسے......؟'' اس نے بے چین ہو کر فرحان کی طرف دیکھا جو سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔
''فرحان صاحب، آپ کو بھی اپنا چیک اپ کرانا ہو گا۔ آپ اپنی بیگم کا علاج کرائیں بہت سے اسپیشلسٹ ہیں اس مرض کے۔ پراپر علاج سے یہ مرض کنٹرول میں رہ سکتا ہے۔ بہرحال یہ تکلیف دہ تو ہے...... مگر اللہ کی رضا...... ہاں، آپ یہ بھول جائیں

کہ آپ کبھی ماں بن سکیں گی۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ اس خیال کو ہی دل سے نکال دیں۔ کیونکہ ایک ایسی زندگی کو وجود میں لانا جو پہلے سے ہی اپاہج ہو...... اذیت ناک ہے اور کچھ نہیں...... بہتر گائیڈ آپ کو آپ کا معالج کر دے گا۔ آپ ان ڈاکٹروں میں سے کسی ایک سے مل لیں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے ایک پرچہ فرحان کی طرف بڑھایا۔ ارسہ سکتے کی سی حالت میں بیٹھی تھی۔

''ویسے فرحان صاحب اب تو گورنمنٹ نے لازمی بنا دیے ہیں۔ نکاح نامے پر...... ہیپاٹائٹس اور ایچ آئی وی ٹیسٹ لازمی ہو گئے ہیں۔ کیا آپ دونوں نے اپنے ٹیسٹ نہیں کرائے تھے؟'' فرحان خود پر مکمل کنٹرول کر چکا تھا۔ ارسہ کی طرف عجیب سی نگاہ سے دیکھ کر بولا۔

''ہمارے یہاں ابھی ان باتوں پر اتنی سنجیدگی سے کام شروع نہیں ہوا...... اگر واقعی گورنمنٹ اتنا سخت قانون بنا چکی تھی تو میری زندگی یوں تباہ نہ ہوتی۔'' ارسہ کی آنکھیں مزید حیرانی سے پھٹ گئیں۔

''شاید عدالتوں میں جو لوگ شادیاں کرتے ہیں ان کے لیے تحفظ ہے ان قوانین میں۔ ہمارے یہاں تو قاضی سے لے کر گواہان ان خانوں کو کراس سے پُر کر دیتے ہیں۔'' وہ کتنے اعتماد سے کہہ رہا تھا۔ ارسہ کے پیر بے جان ہونے لگے۔

''نہیں فرحان...... مجھے...... یہ مرض نہیں تھا۔'' وہ چیخ کر کہنا چاہتی تھی پر اس کی آواز ہی نہ نکل سکی۔ گھر میں وہ کسی لاش کی طرح داخل ہوئی تھی۔ سارے راستے وہ اپنی یادداشت کو کھنگالتی آئی تھی اگر سالار کو یہ مرض ہوتا تو اس کی پرگیننسی کے وقت ڈاکٹرز نے بہت سارے ٹیسٹ کرائے تھے۔ کچھ بھی نہیں تھا اسے۔ کہیں جب وہ اپنا بچہ ضائع کرانے گئی تھی اس دوران...... کسی انجکشن سے...... مگر...... تبھی اس کی تو طبیعت کبھی اس طرح خراب ہی نہیں ہوئی جس طرح اب ہوئی ہے۔

''کہیں فرحان...... ہاں فرحان بھی تو...... کیوں گھر والوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس کی بھابی کا میرے ساتھ رویہ ایسا کیوں تھا۔ عنبر...... اس گھر سے کہیں اسی لیے علیحدہ تو نہیں ہوئی......'' ساری کڑیاں ملنے لگیں...... اس کے اندر آگ سی بھر گئی...... فرحان ادویات لے کر گھر میں داخل ہوا تو اس نے فرحان کو دیکھا۔

''دیکھو...... میرا ضبط...... اتنی ہولناک بیماری کا سن کر بھی تم سے دور نہیں بھاگا اور تمہارے علاج کے لیے کوشاں ہوں مگر...... مجھے یہ بتاؤ تمہارے شوہر کو کیا کوئی ایسا ویسا مسئلہ تھا...... یا تمہارا بچہ جب ضائع ہوا تھا تمہیں...... خون وغیرہ لگا تھا۔'' وہ کتنا پُرسکون تھا اور معمول سے سوالات کر رہا تھا۔ ارسہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا کوئی مرد...... اتنا صابر و شاکر ہو سکتا ہے۔ کیا...... فرحان...... نے میرے کے ساتھ ایسا جان بوجھ کر کیا ہے؟''

''مجھے اب اپنے بھی ٹیسٹ کرانا ہوں گے...... خدانخواستہ اگر مجھے بھی یہ مرض ہو گیا ہو گا تو......''

''مجھے بچے نہیں چاہئیں۔ بھول جاؤ اس خواہش کو۔'' فرحان کا سفاکانہ لہجہ اسے یاد آیا جو اس نے کچھ دن پہلے کہا تھا۔

''یہ مرض تمہیں ہی تھا۔'' وہ بپھر کر بولی۔

''کیا؟'' فرحان چونک گیا۔ ''دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ ایک تو میں تمہارا ساتھ دے رہا ہوں آگے سے تم مجھے ہی۔''

''ہاں...... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تمہیں یہ مرض تھا اور تم سے ہی مجھے یہ مرض لگا ہے۔''

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔" فرحان غصے سے بولا۔ "میں آج ہی اپنے ٹیسٹ کرالیتا ہوں اگر مجھے یہ بیماری نہ ہوئی تو تم کیا کروگی؟"

"یہ بات تو طے ہے کہ ہم دونوں اس مرض میں مبتلا ہیں مگر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ پہلے کون مبتلا تھا اور کس کی وجہ سے دوسرے کو یہ مرض لگا۔" وہ خونخوار سے لہجے میں بولی تو الیاس صاحب کی آواز عقب سے آئی۔

"میں یہ فیصلہ کروں گا کہ میرے بیٹے کو یہ مرض نہیں تھا۔ تم ہی اس بیماری میں مبتلا آئی تھیں اور تم نے ہی میرے بیٹے کے یہ مرض لگادیا ہے۔" وہ بے رحمی سے کہہ رہے تھے۔ ارسہ کے ہونٹ مارے خوف اور بے بسی کے باہم پیوست ہوگئے۔

"اور فرحان...... تم...... تم کیا اس کے مجنوں ہو جو اس کی اتنی بکواس سن رہے ہو۔ پہلے تو تم نے اس کی طلاق کے داغ کو اپنایا پھر اس کی بیماری کا ذمّہ بھی اپنے سر لے رہے ہو...... تمہیں تو جان سے مار دینا چاہیے مجھے...... میرے نوجوان بیٹے کو اس عذاب میں مبتلا کردیا تم نے...... اور اب ہم ہی پر غرا رہی ہو......" الیاس صاحب قہر برسا رہے تھے۔

"اس کے گھر والوں کو فون کرو...... اور کہو لے کر جائیں اسے۔" ارسہ گنگ رہ گئی۔ الیاس صاحب غصے میں بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر لے گئے اور ارسہ دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر چلا چلا کر رونے لگی۔

☆☆☆

کتنے دن تک وہ یونہی سر پٹختی رہی، روتی رہی...... اپنی بے گناہی کا اعلان کرتی رہی...... پر فرحان اور اس کے باپ کے یہ الفاظ اسے آرے کی طرح کاٹ رہے تھے کہ وہی اس مرض میں مبتلا تھی۔ فرحان کئی روز تک اس کے کمرے میں نہ آیا...... وہ اسے اچھی طرح سے احساس دلانا چاہتا تھا کہ اصل میں وہی مجرم ہے۔ وہی بیمار ہے، آخر وہ کیسے خود کو سچا ثابت کرتی۔ کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ یکدم زندگی کتنی ہولناک ہوگئی تھی۔ فرحان اور اس کے باپ کی ہٹ دھرمی اپنی جگہ پر... اس کی بے بسی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اپنے گھر والوں کو فون کرے اور اپنے اوپر ٹوٹ جانے والی قیامت کے بارے میں بتائے۔ خاص طور پر اس کی ماں جو اس کی سب سے بڑی غمگسار تھی اور پھر وہ ماں کے موبائل پر فون کرتی رہی۔ ان کا فون ہی اٹینڈ نہ ہوا۔ وہ اور بھی بے چین ہوگئی اس کا سینہ غم سے پھٹ رہا تھا لیکن اس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں سے کسی کو بھی فون کرسکتی تھی مگر اس کا دل ہی نہ چاہا کہ کسی بہن بھائی سے رابطہ کرے اور اپنے اوپر گزر جانے والی قیامت کا بتائے، وہ دن رات اس ہی ادھیڑ بُن میں تھی کہ اچانک ساجدہ کا فون آگیا۔ ساجدہ پہلے سے ہی پریشان سی تھی پھر بھی اس کا حال احوال لینے لگی۔

"کیسی ہو ارسہ تم......؟" ارسہ کا دل تو غم سے پھٹ رہا تھا گلوگیر لہجے میں بولی۔

"مجھے تو آپ سب لوگ اس طرح بھول گئے جیسے میں کبھی آپ لوگوں کے درمیان تھی ہی نہیں۔" اس نے شکوہ کیا تو ساجدہ مایوسی سے بولی۔

"بس کیا کریں ارسہ...... یہاں تمہاری شادی کے بعد پے در پے ایسے حادثے ہوئے کہ ہمیں کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہا۔"

"خیریت تو ہے ساجدہ باجی! میں کچھ روز سے امی کو فون کر رہی ہوں، وہ فون ہی اٹینڈ نہیں کر رہی ہیں؟" وہ بے چین ہوگئی۔

"ہاں...... وہ رابعہ کے میاں کا کچھ دن قبل سنگین ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ دن رات ہم لوگ اسی پریشانی میں رہے اور آج صبح شاہد کا انتقال ہوگیا۔"

"کیا؟" خوف و دہشت سے اس کا منہ اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ادھر ساجدہ بھی رو رہی تھی۔

"ابھی سال بھی نہیں ہوا تھا اس کی شادی کو...... اور...... وہ بیوہ ہوگئی۔ اچانک ہنستی بستی گرہستی ختم ہوگئی۔" ساجدہ رو رو کر بتا رہی تھی۔

"رابعہ...... رابعہ...... کیسی ہے؟" ارسہ نے اپنے غم کو پس پشت دھکیلتے ہوئے رابعہ کا پوچھا۔

"رابعہ کیسی ہوگی...... بچہ ہوا...... وہ بھی مرگیا اور شوہر بھی اچانک لقمۂ اجل بن گیا۔ پتھر کی بن گئی ہے وہ۔" ارسہ سے اور برداشت نہ ہوا اور اس کی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔

"تم خود کو سنبھالو ارسہ...... امی کی حالت صحیح نہیں ہے۔ جب سے انہیں شاہد کی موت کا پتا چلا تھا وہ بے ہوش ہوگئی تھیں، اب بھی وہ اسپتال میں ہیں اور ہوش میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹرز ان کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں ہیں۔ تم ایسا کرو...... فرحان کے ساتھ فوراً آجاؤ۔ نہ جانے پھر زندگی موقع دے یا نہ دے۔" ساجدہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھی پر اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ساجدہ کی آواز بہت دور ہوتی جارہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جارہا تھا۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو فرحان اور ڈاکٹر باہم آپس میں باتیں کررہے تھے "ان کا بلڈ پریشر بہت لو ہو رہا ہے۔ انہیں کھلائیں پلائیں۔ ٹھیک ہوجائیں گی یہ۔ بہر حال ڈپریشن اور لو بلڈ پریشر کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھیں، یہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ انجکشن لگا دیے ہیں میں نے۔ انہیں کچھ کھلا پلا کر یہ ادویات دے دیں۔" فرحان ڈاکٹر کو چھوڑ کر جب کمرے میں آیا تو متواتر اس کے آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"میں نے تمہاری ساری گفتگو سن لی ہے ارسہ...... اب اگر تمہیں سفر کے قابل خود کو کرنا ہے تو اپنی صحت کا خود خیال رکھنا ہوگا۔" ارسہ نے تکلیف سے اس کی طرف دیکھا۔ فرحان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

"جھوٹے، دغاباز...... تم نے جانتے بوجھتے میری زندگی تباہ کردی۔ مالِ غنیمت سمجھ کر استعمال کیا مجھے اور اب بھی مجھ سے ہمدردی کر رہے ہو...... نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی۔" لفظ اس کے حلق سے باہر ہی نہ آسکے البتہ اس کی آنکھوں میں نفرت اور کرب کہرام مچا رہا تھا۔

"میں تمہارے لیے گرم دودھ اور سلائس لے کر آرہا ہوں۔ اس کے بعد تم یہ دوا پی لینا۔" فرحان نے اس سے نظریں چرائیں اور باہر نکل گیا۔

دوا کے بعد اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تھی۔ فرحان اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"دیکھو ارسہ...... اس طرح کر کے تم میری زندگی کو مزید دشوار بنا رہی ہو...... میں اب بھی تمہارا ساتھ نبھانے کو تیار ہوں۔"

"کیوں...... کیوں ہے...... تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی......؟" اس کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں۔ جسے فرحان نے دانستہ نظر انداز کردیا۔

"میرے اس کمپرومائز کو تم اپنی بقا سمجھنا۔ کسی بھی شخص کو یہ پتا چلے گا کہ تم اس مرض میں مبتلا ہو تو وہ تم سے تعلق ہی توڑ ڈالے گا اور پھر اندھیروں میں دھکیلی جاؤ گی۔ تمہاری بقا اسی میں ہے کہ تم اس راز کو اپنے اندر ہی رکھنا۔"

"تو گویا تم اپنی زندگی سے سمجھوتا کرچکے ہو...... اور مجھے بھی سمجھوتا کرنا سکھا رہے ہو۔" اس نے تڑخ کر کہا تو فرحان بگڑ گیا اور جھنجلا کر بولا۔

"ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ نہیں رہنا

چاہتیں..... نہ رہو...... مگر...... میں...... اپنی ذات پر کوئی الزام برداشت نہیں کروں گا۔‘‘

’’تو گویا تمہیں یقین ہے کہ میں ہی اس مرض میں مبتلا تمہارے پاس آئی تھی؟‘‘

’’ہاں...... تم ہی اس مرض میں مبتلا تھیں اور تمہاری وجہ سے ہی میں اس مرض میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ چار ماہ ہو گئے ہیں ہمارے ازدواجی تعلق کو...... اچھی طرح سے رچ بس گیا ہو گا یہ مرض میرے اندر بھی۔‘‘ وہ ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ ارسہ نے گہری سانس لی اور اپنے غم کو اپنے اندر دھکیلا۔

’’بڑا ظرف ہے تمہارا...... کہ نہ صرف تم نے مجھے بلکہ میری بیماری کو بھی قبول کر لیا۔‘‘ وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔

’’اب تم مجھے بتا دو اگر تمہیں ملتان چلنا ہے تو میں ٹکٹ کا بندوبست کر لیتا ہوں۔‘‘ فرحان نے اپنی خدمات پیش کیں۔ کس قدر نفرت ہو رہی تھی اسے اس شخص سے پھر بھی مجبور تھی اس کے ساتھ رہنے پر۔

’’کس قدر خود غرضی کا ثبوت دیا ہے تم نے فرحان، تم نے صرف اپنے مفاد اور خواہش کی خاطر میری زندگی تباہ کر ڈالی۔ یاد رکھنا...... میں مر جاؤں گی مگر اب لوٹ کر تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔ نہیں بنوں گی تمہاری کسی خواہش کی تسکین کا سبب۔‘‘ وہ دل ہی دل میں کرلاتے ہوئے جانے کی تیاری کرنے لگی۔ ’’مرنا ہی ہے ناں تو تنہا مر جاؤں گی مگر تمہاری سسکتی تڑپتی تنہائی کا سہارا نہیں بنوں گی۔ تمہارا ساتھ تو کیا...... تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی میں۔‘‘

وہ اسی ارادے سے اس کے گھر سے نکلی تھی اور جب لمبا سفر طے کر کے اس نے اپنے میکے کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور پاؤں زمین نے جکڑ لیے۔ اس کی ماں کا جنازہ صحن کے بیچوں بیچ رکھا تھا۔ اس کی بہنیں آہ و بکا کر رہی تھیں۔ وہ تو خود غموں سے لبریز تھی۔ ایک اور غم کا پہاڑ قیامت بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ اپنا غم کس مہربان سینے میں انڈیلے گی...... کون اسے چھتنار دے گا۔ ماں دنیا سے چل بسی تھی۔ وہ دوڑ کر ماں کے جنازے کے قریب آئی۔ اس کی چیخیں زمین آسمان دہلا رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

’’نعیمہ بیگم کو بیٹیوں کا غم لے ڈوبا۔ پہلے ایک بیٹی کو طلاق ہو گئی اور اب دوسری نو بیاہتا ہی بیوہ ہو گئی۔‘‘

’’چلو...... بے چاری نے طلاق یافتہ کو تو بیاہ ہی دیا تھا۔ اب اس بے چاری کا کون پرسانِ حال ہو گا۔ نہ بچہ رہا نہ شوہر...... نعیمہ کی یہی دونوں لڑکیاں اچھے گھروں میں بیاہی گئی تھیں باقی بیچاری بڑی تو غربت کی چکی میں پس رہی ہیں۔ سنا ہے ساجدہ کے میاں نے بھی دوسری شادی کر لی۔‘‘ وہ رابعہ کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی اور عورتوں کی باتیں، قیاس آرائیاں اس کی سماعتوں میں سیسہ انڈیل رہی تھیں۔

’’یہی تو ہے وہ طلاق یافتہ...... مگر سنا ہے اب بھی اچھے ہی گھر میں بیاہی گئی ہے...... اللہ کرے اس بچی کا بھی اچھا نصیب کھل جائے۔‘‘

’’پتا نہیں کیا بات تھی۔ پہلے جس گھر میں بیاہی گئی تھی وہ لوگ بھی بہت شریف تھے۔ نہ جانے نباہ کیوں نہ ہوا...... اب تو سنا ہے صحیح بس رہی ہے۔ شادی کے بعد پہلی بار ہی میکے آئی ہے۔‘‘

’’ہائے...... ہائے...... بے چاری نعیمہ...... جان سے بھی دکھیا تھی اور بیٹیوں کا غم بھی دیکھ گئی۔‘‘ دن بھر ایسا ہی سلسلہ چلتا رہا۔ لگتا تھا لوگ دکھ بانٹنے نہیں، تماشا دیکھنے آ رہے ہیں۔ رابعہ کی آنکھیں تو جیسے پتھرا گئی تھیں۔ نہ اپنے غم پر بہانے کے لیے اس

کے پاس آنسو تھے اور نہ ہی بین کے دو لفظ۔ وہ مجسم خاموش تھی۔ ارسہ اس کے پاس سے ہو کر آئی تو اور بھی نڈھال اور غم سے لبریز ہو گئی۔

☆☆☆

فرحان قل کے بعد چلا گیا تھا۔ ماں کے قل کے بعد وہ سب بہن بھائی ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ سب نعیمہ بیگم کا ذکر کر رہے تھے لیکن وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھی سسک رہی تھی دلاور جو اسے تین دن سے بری طرح روتا بلکتا دیکھ رہا تھا اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ تڑپ کر بھائی کے سینے سے لگ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سب کو اسے سنبھالنا نہایت مشکل ہو گیا۔ یہ وقت ہی ایسا تھا سب ایک دوسرے کو حوصلہ دے رہے تھے۔ ارسہ کے لیے ہر حوصلہ بے معنی تھا۔ کیسا غم و الم کا سلسلہ شروع ہوا تھا جس نے سب کچھ ہی تہس نہس کر دیا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ارسہ ماں کے کمرے میں تنہا رہ گئی۔ ماں کی یادیں اور اپنی بیماری کا دھچکا اسے ہر وقت نمناک رکھتا۔ یونہی وقت گزرتا رہا اور چہلم بھی ہو گیا۔

چہلم پر فرحان نہیں آیا تھا دلاور نے اس بات کو بہت محسوس کیا کہ وہ سوئم کے بعد سے دوبارہ آ کر نہ جھانکا اور اب بھی نہیں آیا۔ زندگی میں کبھی اس نے اس گھر کے خوشی غم میں ساتھ نہیں چھوڑا تھا لیکن اب داماد بننے کے بعد وہ اچانک کس طرح بدل گیا۔ دلاور نے جب ارسہ سے پوچھا تو ارسہ پھٹ پڑی۔

’’اب فرحان کبھی نہیں آئے گا بھائی جان!‘‘

’’کیوں؟‘‘ دلاور کا لہجہ تند ہی نہیں حقیر بھی تھا۔ ’’یہ شادی تمہاری پسند سے ہوئی تھی ارسہ! تم...... یہ کیا کہہ رہی ہو؟‘‘

’’ہاں...... میری پسند سے ہوئی تھی مگر مجھے کیا پتا تھا کہ مجھ پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ آپ لوگوں نے جلد بازی میں دیکھا ہی نہیں فرحان ایچ آئی وی پازیٹو ہے۔ اور مجھے اس اندھے کنویں میں دھکیل دیا۔‘‘ اس نے رو رو کر دہائی دیتے ہوئے کہا۔

’’یہ تم کیا کہہ رہی ہو ارسہ؟‘‘ دلاور کو جیسے یقین ہی نہ آیا۔

’’میں آپ کو کیا بتاؤں...... مجھے بھی اس مرض نے اپنے شکنجے میں نگل لیا ہے۔‘‘ وہ غم سے دُہری ہو رہی تھی۔ دلاور کو یکدم کرنٹ لگا اور وہ کئی لمحے ارسہ کو ایسے دیکھتا رہا جیسے اچانک کوئی خوفناک سانپ پھن اٹھائے اس کے سامنے آ بیٹھا ہو۔ گویا اس نے ذرا سی بھی آنکھ جھپکی تو وہ سانپ اسے نگل لے گا۔ ارسہ رو رہی تھی اور دلاور ششدر بیٹھا تھا۔

اس وقت تو اس نے کچھ نہ کہا۔ تسلی کے دو بول نہ بولے پر شام کو کہنے لگا۔

’’ایسا کرو ارسہ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔‘‘

’’کیا؟‘‘ ارسہ گنگ ہی تو رہ گئی۔

’’ہاں ارسہ...... تمہارا اپنے گھر جانا ہی ٹھیک ہے۔ تم فوراً اپنا علاج شروع کراؤ...... فرحان تمہارا زیادہ بہتر خیال رکھ سکے گا۔ میں نے فرحان کو فون کر دیا ہے، وہ آ کر تمہیں لے جائے گا۔‘‘

ارسہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو اس سے کئی قدم دور ہٹ کر کھڑا تھا۔

’’ارسہ...... برا نہ ماننا...... ہمارے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں...... پہلے ہی ہم تو غموں سے نڈھال ہیں...... یہ بیماری ایک سے دوسرے کو لگتی ہے۔ دیکھو میری بات کا برا نہ ماننا اور پھر یہاں کون تمہاری دیکھ بھال کر سکے گا۔ یہ تو سب قسمت کا لکھا ہوتا ہے۔ ہم نے تو تمہاری بہتر قسمت کے لیے ہی تمہارا بھلا چاہا تھا۔ بظاہر تو فرحان میں کوئی نقص نظر نہیں آتا تھا۔ خدا نے اس بھید کو پوشیدہ رکھا۔ اس

میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اب تمہیں اپنی بدبختی سے سمجھوتا کر لینا چاہیے۔" ارسہ کے آنسو اب حلق میں گر رہے تھے۔

"تم اپنا علاج کراؤ گی تو بہتر ہو جاؤ گی۔ ابھی یہاں کسی کو کچھ نہیں پتا۔ رفتہ رفتہ پتا چل گیا تو کوئی تمہارے پاس آکر بھی نہیں پھٹکے گا۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔" دلاور کے چہرے پر کتنی اجنبیت تھی۔ ارسہ کی ساری خوش فہمی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔



"میرے پروردگار مجھے معاف کر دے۔ میں نے تیرے کلام پاک کا...... اس کی حرمت کا مذاق اڑایا تھا۔ جھوٹ بولا تھا میں نے...... بہتان لگایا تھا اپنے شوہر پر۔ گواہ بنایا تھا تیری کتاب کو...... بے شک اس میں تیری کتاب نہیں تھی۔ مگر دھوکا تو دیا تھا...... اس کتاب کا نام لے کر قسم اٹھائی تھی۔ میرے پروردگار مجھے معاف کر دے۔ میں نے جھوٹی قسم اٹھائی تھی...... تیری پاک کتاب سے کھیل کھیلا تھا۔ آج یہی کھیل عذاب کی صورت میری زندگی پر مسلط ہو گیا۔ فرحان کے ساتھ میں رہنا نہیں چاہتی مگر رہنے پر مجبور ہوں۔ وہ مجھے مرض لگا کر بھی مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔ میرے اللہ مجھے معاف کر دے، مجھے موت دے دے۔ میرے پردے ڈھانپ لے۔ میرے گناہوں کو خطاؤں کو معاف کر دے۔ میں سالار سے ملنا چاہتی تھی اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی...... مگر وہ مجھے نہیں ملا۔ میں اس کے اسٹور پر بھی گئی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ وہ جدہ میں سیٹل ہو گیا ہے۔ وہ اتنی دور چلا گیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھے پھر کبھی نہیں ملے گا...... مجھے سالار معاف کر دے گا تو میرا اللہ بھی معاف کر دے گا۔" وہ اسی آس اور امید پر دن رات پاگلوں کی طرح سالار کا فون نمبر ملاتی تھی کہ شاید اس کا فون ہی اٹینڈ ہو جائے اور وہ اپنے کیے گئے جرم کی، بددیانتی کی اور بہتان کی معافی مانگ لے۔ اگر معاف کرنا خدا نے اس کے لیے لکھا ہوتا تو وہ سالار سے ضرور مل پاتی۔

سالار تو اس سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اسے کیا پتا تھا اللہ جب کسی کو پیار کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اس کا بخت کتنا بلند ہو جاتا ہے۔ یہ صلہ سالار کے صبر کا تھا۔ سالار، نائمہ کے ہمراہ جدہ میں سیٹل ہو گیا تھا۔ یہاں اس نے احرام کی شاپ کھولی تھی۔ وہ اپنی زندگی اور جیون ساتھی سے بہت مطمئن اور خوش تھا۔

نائمہ قرآن پاک کی نہ صرف حافظہ تھی بلکہ ترجمہ و تفسیر سے بھی سند یافتہ تھی۔ تب ہی وہ فراغت کے وقت میں خواتین کو ترجمہ و تفسیر کی تعلیم دیتی تھی۔ وہ سورۂ نور کا ترجمہ پڑھ رہی تھی۔ سالار گھر میں داخل ہوا تو اس کی تلاوت کی آواز سن کر اس کے قریب ہی جوتے اتار کر بیٹھ گیا۔

"ناپاک عورتیں، ناپاک مردوں کے لیے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہیں۔" (سورۂ نور، آیت 26) بے شک اللہ کی بزرگی اور بڑائی کا کوئی ثانی نہیں۔ سالار کا سر جھک گیا اور آنکھیں اس رحمان کی تعریف میں اشک بار ہونے لگیں۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔

"جب کوئی کام تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے تو شکر ادا کرو...... کہ اللہ نے تمہاری مرضی کو اتنی اہمیت دی اور اگر تمہاری مرضی کے خلاف ہو تو اور زیادہ شکر ادا کرو...... کہ اب وہ اللہ جل شانہ کی مرضی سے ہو گا جو ہماری مرضی سے بہتر اور بہت افضل ہے۔"



رزق

رابعہ نیازی

کچھ جلنے کی ناگوار بو سارے میں پھیل رہی تھی۔ بلال نے سر اٹھا کر یہاں وہاں دیکھا پھر تیزی سے اخبار میز پر پٹخا اور کچن کی سمت دوڑا مگر آدھا دودھ ابل کر چولھے پر گر گیا تھا۔ اس نے جلدی سے چولھا بند کیا اور ناگواری سے ثمینہ کو آوازیں دینے لگا۔ آن کی آن میں وہ بھی وہاں موجود تھی۔ سامنے کا منظر واقعی باعث شرمندگی تھا۔ اس نے چور نظروں سے بلال کا جائزہ لیا اور پھر جلتا ہوا دودھ صاف

کرنے لگی۔

”کہاں تھیں تم؟“ بلال نے غصے سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”احمد کے کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ ابھی تو دودھ رکھا تھا میں نے چولھے پر...... یہی تو حیرت ہے کہ اتنی جلدی گرم ہو کر ابل بھی گیا۔“ ثمینہ نے اپنی غلطی کا اثر زائل کرنے کے لیے اپنا لہجہ نارمل رکھا۔

”جب چولھا تیز کر کے آپ اپنی مصروفیات میں گم ہو جائیں گی تو پھر یہی ہونا تھا ناں۔“

”میں اپنی مصروفیات میں گم نہیں تھی۔ آپ کے لاڈلے نے اودھم مچا رکھا تھا اسی کے کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔“ وہ جو بڑبڑاتا ہوا واپس مڑ رہا تھا اس کے تلخ لہجے پر فوراً واپس مڑا۔

”ثمینہ ہر بات میں بحث کرنا کیا تمہاری عادت ہے؟ اگر تم سے غلطی ہوئی ہے تو اپنی غلطی تسلیم کرو۔ احمد کے کپڑے تبدیل کرنا اتنا ضروری نہیں تھے کہ تم دس پندرہ منٹ بعد نہیں کر سکتی تھیں اور جب میں فارغ بیٹھا تھا تو تم مجھے بھی کہہ سکتی تھیں۔“

”آپ کو میری ذمے داریوں کی کیا پروا۔ میری ساری دن کی محنت کیوں نظر نہیں آتی آپ کو...... بس جب دل چاہا طنز کے تیر چلا دیے۔ صبح سے لے کر اب تک ہزاروں کام آپ کی مرضی اور منشا کے مطابق ہوئے اور درست بھی ہوئے۔ وہ تو آپ کو نظر نہیں آئے کہ آپ داد دینے چلے آتے مگر ایک ذرا سی بھول چوک کیا ہو گئی آپ پہنچ گئے باتیں سنانے۔“ ثمینہ نے ہاتھ میں پکڑا کپڑا جس سے وہ چولھا صاف کر رہی تھی سلیب پر پٹخ دیا اور اب باقاعدہ اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

”اور جو بھول مجھ سے ہوئی وہ بھی آپ ہی کے گھر کے کام کرتے ہوئے ہی ہوئی، میں کوئی سولہ سنگار نہیں کر رہی تھی۔“ بلال نے ایک پل کو اس کے ملگجے لباس پر نظر دوڑائی جو اس نے پچھلے دو روز سے پہن رکھا تھا پھر صبح سے ہر کام میں جتی ثمینہ کے آنسو اسے اپنے لہجے پر شرمندہ کر گئے۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم کچھ نہیں کرتی ہو۔“ بلال کا لہجہ اب نرم پڑ گیا تھا۔ ”میرا مطلب تھا کہ تم تھوڑا دھیان دو گی تو اس طرح کا زیاں نہیں ہوگا۔ اگر تم پر کام کا بوجھ زیادہ ہے تو میں بانٹ لیتا ہوں مگر تم کہو تو۔“

”ایک ذرا سے دودھ ابل جانے پہ تو آپ نے اتنی سنا دیں۔ اللہ نہ کرے اگر بڑا نقصان ہو جاتا مجھ سے تو آپ میری جان ہی لے لیتے۔“ وہ نروٹھے پن سے کیبنٹ کھولے اب فضول کی اٹھا پٹخ کر رہی تھی۔ بلال کو اس کے انداز پر ہنسی آنے لگی۔

”میں نے نقصان کی بات کب کی، میں تم سے اس لیے خفا ہوتا ہوں کہ رزق کا زیاں نہ ہو۔ بات اتنے سے دودھ ابل جانے کی نہیں ہے جو چند روپوں کا ہے۔ بات اس دودھ کے ناقابلِ استعمال ہونے کی ہے جو رب نے ہم انسانوں کے استعمال کے لیے بنایا تھا۔ اچھا اب بس بھی کرو، اب ناراض تو مت ہو۔“ بلال نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہاں میری طرف دیکھو۔“

”مولانا صاحب آپ کا لیکچر میں ایسے سن رہی ہوں آپ یہی بہت جانیں۔“ ثمینہ نے چبا چبا کر کہا تو بلال قہقہہ لگا کر ہنس دیا مگر ساتھ ہی ننھے احمد کے رونے کی آواز پر دونوں چونکے تھے۔

”اوہ .... میں تو اسے آدھے پہنے کپڑوں میں یونہی چھوڑ آئی تھی۔“ ثمینہ کہتے ہوئے تیزی سے اندر بھاگی تو بلال سر پیٹ کر رہ گیا۔

”یا خدا، میری بیوی کو تھوڑا سا احساسِ ذمے داری بخش دے۔“ پھر سر ہلاتا ہوا وہ واپس لاؤنج میں آ گیا۔

☆☆☆

صفائی کا کام ختم کرتے ہی وہ کچن میں آئی تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ اس نے چولھے پر ہانڈی چڑھائی اور مسالا بھون کر سبزی ڈال دی۔ ساتھ ساتھ کچن کے کیبنٹ صاف کیے۔ تھوڑا سا پانی ڈال کر آنچ ہلکی کی۔ لاؤنج میں آ کر ٹی وی لگا لیا۔ رات کے وہ ڈرامے جو بلال کے نیوز چینل لگانے کی وجہ سے اکثر اوقات وہ دیکھ نہیں پاتی تھی اس وقت دوبارہ آتے تھے۔ اس نے اپنی پسند کا چینل سیٹ کیا اور دونوں پاؤں فرصت سے صوفے پر رکھ لیے۔ احمد کو سوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو رہا تھا اس لیے اب وہ تسلی سے ٹی وی دیکھ سکتی تھی۔ ٹی وی میں اس قدر منہمک ہو کر اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا اور جب کچن سے ہانڈی جلنے کی بو اور دھواں اس کے دماغ تک کو جھنجوڑنے لگے تو وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے اندر گئی مگر سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ اس نے تھوڑی سبزی اوپر سے اتارنے کی کوشش کی مگر سارا مسالا نیچے لگ چکا تھا۔ بے بسی سے گھڑی کی جانب دیکھا۔ یہ وقت دوبارہ سے کھانا بنانے کا نہیں تھا۔ ثمینہ کی رہی سہی جان تب نکلی جب گیٹ پر کال بیل ہوئی...... یقیناً بلال آفس سے لنچ بریک کے لیے آ گیا تھا۔

”لگتا ہے ایک بری گھڑی کے بعد دوسری کو ضرور آنا ہوتا ہے۔“ وہ منہ میں بڑبڑاتے ہوئے گیٹ کھولنے گئی تو حسبِ توقع بلال سامنے ہی کھڑا تھا۔

”ہائے سوئٹ ہارٹ، کیا ہو رہا تھا؟“ وہ بائیک ایک جانب لگا کر خوش دلی سے مسکرایا تو ثمینہ کے پھیکے چہرے پر بہ مشکل مسکراہٹ در آئی تھی۔

”آج آپ جلدی آ گئے؟“ وہ بلال کے ساتھ لگی اندر آئی تھی۔

”ہاں، آج لنچ بریک میں سوچا گھر سے ہو آؤں۔ آج کام ہی اتنا تھا کہ سارا دن ایک چائے کا کپ تک نہیں پی سکا۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گر گیا۔ ”اور ابھی شام تک کام ختم ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا تو سوچا گھر جا کر کچھ کھا لوں کیونکہ بے تحاشا بھوک کے احساس نے تھکاوٹ کو مزید سوا کر دیا ہے...... احمد سو گیا کیا؟“ ثمینہ کو واپس مڑتا دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

”ہاں...... کافی دیر سے سو رہا ہے۔ اب تو اس کے اٹھنے کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھو لو، میں آپ کے لیے چائے اور کباب لاتی ہوں گرما گرم۔“

”ارے بابا، اس وقت چائے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ اب تو روٹی ہی ڈال دو میرے لیے۔“ وہ کہتا ہوا اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا اور وہ جو کھانے کے نام سے کترا رہی تھی اب تھوک نگل کر رہ گئی۔

”کیا بنایا ہے آج؟“ اس نے کہتے ہوئے ہانڈی کا ڈھکن اٹھایا اور اگلا منظر بلال کا دماغ گھمانے کے لیے کافی تھا اور ثمینہ کی سانس خشک کرنے کے لیے۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ جلی ہوئی ناگوار بو اس کی ناک سے ٹکرائی تو وہ غراتے ہوئے اس کی جانب مڑا۔

”بلال وہ...... وہ میں صفائی کر رہی تھی تو سالن جل گیا۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے بہ مشکل یہی الفاظ بیان کیے۔

”ثمینہ تم انسان ہو یا کیا ہو...... تمہیں دکھ درد

نہیں ہوتا اتنے رزق کے ضائع ہونے پر۔ میں تو عاجز آ گیا ہوں تمہاری بے پروائی سے۔"

"بلال میرا قصور نہیں ہے، میں تو صفائی کر رہی تھی کہ......"

"قصور تمہارا نہیں میرا ہے...... صرف میرا۔" اس نے تیزی سے ثمینہ کی بات کاٹی۔ "میں پاگلوں کی طرح سارا دن دو دو نوکریاں کرتا ہوں تاکہ تم لوگوں کو کسی کمی کا احساس نہ ہو اور ایک تم ہو کہ ہر چیز کو بڑی بے دردی سے استعمال کرتی ہو۔ چلو استعمال تو تمہارا حق بنتا ہے مگر ضائع کرنا کسی بھی انسان کا حق نہیں ہے۔"

"اگر آپ دو دو نوکریاں کرتے ہیں تو ہم پر احسان نہیں کرتے۔ آپ کا فرض بنتا ہے۔ آپ جتا کیوں رہے ہیں؟" ثمینہ کو بلال کا سخت لہجہ اور الفاظ بری طرح چبھے تھے۔

"جاہل عورت، میں جتا نہیں رہا، میں تمہیں احساس دلا رہا ہوں۔ عجیب عورت ہو تم بجائے غلطی ماننے کے یا غیر ذمے دارانہ رویے پر شرمندہ ہونے کے تم الٹا مجھ پر چلا رہی ہو۔" بلال کے چہرے پر ناگواری پھیلی تھی۔

"میں آملیٹ بنا دیتی ہوں بس دو منٹ صبر کریں۔" ثمینہ کا لہجہ بھی کھردرا ہو گیا تھا۔

"مجھے نہیں کھانا کچھ بھی خود بنالو اپنے لیے۔" بلال پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا وہ بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"اب بات کو اتنا بڑھا کیوں رہے ہیں۔ ہو جاتی ہے انسان سے غلطی...... مجھ سے بھی ہو گئی۔ کھانا اور بنائے دیتی ہوں۔"

"ثمینہ بیگم تم ایک کھانا جلا کر دوسرا بنانے کی تیاری میں ہو، لوگوں کے گھر میں ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولا تھا۔ "سوچو اگر میری جیب اتنی اجازت ہی نہیں دیتی کہ تم دوبارہ سے کچھ بنا سکو تو کیا کرتیں......؟ کبھی اس طرح سے بھی سوچ لیا کرو اور عبرت پکڑا کرو اپنے اردگرد کے لوگوں سے۔" وہ جس قدر خوش دلی سے گھر آیا تھا اتنا ہی دل برداشتہ ہو کر واپس لوٹ گیا تھا۔

ثمینہ کی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر پانی بھر آیا۔ اسے اپنی سخت کلامی پر شرمندگی بھی ہوئی کہ اپنی غلطی ہونے کے باوجود اس نے بلال کو غصہ دلایا مگر اب تو وہ بھوکا واپس جا چکا تھا۔ اس نے ایک قہر آلود نظر ٹی وی سیٹ پر ڈالی جو اصل فساد کی جڑ تھی اور اندر احمد کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

جب اس کی آنکھ کھلی تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ اتوار کے دن وہ اسی طرح خوب دل لگا کر سوتی کیونکہ بلال کو آفس نہیں جانا ہوتا تھا۔ اس نے ساتھ کی خالی جگہ پا کر حیرت سے یہاں وہاں دیکھا بلال تو ابھی تک مزے سے سو رہا تھا مگر احمد درمیان سے غائب تھا۔ وہ پریشانی سے دوپٹا گھسیٹتی باہر کو بھاگی تو احمد لاؤنج میں ٹیلی فون سیٹ نیچے گرائے کھیل رہا تھا۔ اسے اپنی بے خبر نیند پر افسوس ہوا مگر احمد کسی بھی نقصان سے محفوظ اس کے سامنے موجود تھا تو ثمینہ نے سکون کی سانس لی۔ اسے گود میں اٹھا کر چٹا چٹ چوما اور ٹیلی فون کو اسٹینڈ پر واپس رکھ دیا۔ پاؤں پاؤں چلتا بھاگتا احمد اب اسے خوب ہی ستانے لگا تھا۔ اس نے اسے بے بی کاٹ میں ڈالا اور خود کچن میں احمد کا ناشتا بنانے چل دی مگر کچن میں ایک اور جھٹکا اس کے لیے تیار تھا۔ رات کی بریانی وہ چولھے پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ اس پتیلے کا ڈھکن اتار کر اندر جھانکا

توگرمی کی شدت سے بریانی خراب ہوگئی تھی۔ اسے ڈھیر سارے چاول ضائع ہونے کا افسوس تو ہوا مگر وہ بلال کے جاگنے سے پہلے ان کو ٹھکانے لگانا چاہتی تھی۔ رات اس کی بریانی بنی بھی تو بہت لذیذ تھی۔ بلال نے خوب دل سے داد دی تھی مگر سونے سے پہلے بچی ہوئی بریانی فریج میں رکھنا جانے کیسے بھول گئی وہ...... اور رات بھر حبس زدہ کچن میں ڈھکی ہوئی بریانی واضح طور پر ذائقہ تبدیل کر گئی تھی۔ اس نے سارے چاول کچن کی ٹوکری میں ڈالے کہ ان کو کھانا تو رسک ہی تھا۔ پیٹ خراب ہونے کے ڈر سے کوڑا کرکٹ والی ٹوکری میں ڈال کر اس نے پتیلا فارغ کر کے دھونے رکھ دیا۔ ابھی اس نے احمد کو ناشتا کروایا ہی تھا کہ بلال بھی اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔

''ارے بیگم آج تو خوب ہی سولیا ہم نے...... اب بھوک نے ستایا تو اٹھ کر تمہارے پاس چلا آیا ورنہ ابھی بھی اٹھنے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔''

''آپ کیا لیں گے ناشتے میں؟'' ثمینہ نے احمد کا منہ صاف کیا اور مسکراتے ہوئے بلال سے استفسار کیا جو گیلے بال تولیے سے رگڑ رہا تھا۔

''آج تو خستہ سا پراٹھا اور آملیٹ چاہیے مجھے۔ تسلی سے ایک بھرپور ناشتا کرنا ہے میں نے، چاہے دن میں کچھ بھی کھانے کو دل نہ چاہے۔'' بلال نے احمد کے گال چوم کر نیچے اتارا تو وہ بھاگتا شور مچاتا صحن میں نکل گیا۔ ثمینہ پھرتی سے ناشتا بنانے لگی جبکہ بلال کپڑا اٹھا کر شیلف صاف کرنے لگا۔

''کیا کر رہے ہیں بلال، چھوڑیں یہ سب...... میں کرلوں گی سب کچھ صاف۔'' اس نے پراٹھا توے پر ڈالتے ہوئے اسے منع کیا مگر بلال کی مددگار فطرت... ہمیشہ کی طرح بیدار ہوگئی تھی...... بلال کے پاس جو بھی وقت فالتو ہوتا وہ ثمینہ کی ہر ممکن مدد کرواتا۔ اب بھی شیلف پر پڑے رات میں کھائے پھلوں کے چھلکے اور ناشتے کی باقیات سمیٹ ڈالے۔

''یار میری ایک ہی تو چھٹی ہوتی ہے۔ اگر تم سارا دن کام میں لگی رہو گی تو ہمیں ایک دوسرے کے لیے وقت کہاں ملے گا۔'' وہ سارے چھلکے جمع کیے ٹوکری تک آیا مگر اندر پڑی بریانی اسے سلگا گئی۔ اس نے مڑ کر ثمینہ کو دیکھا جو اس کے آخری جملے پر میٹھی سی مسکراہٹ لیے کام میں مصروف تھی۔ اس نے چھلکے ٹوکری میں ڈالے اور خاموشی سے ہاتھ دھو کر ناشتے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ وہ آج کا دن کسی جھگڑے کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اندر کہیں پھانس سی باقی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ ثمینہ نے ٹی وی بند کیا اور گیٹ تک آئی، شام کے سرمئی اندھیرے پر پھیلا رہے تھے۔ اس نے گیٹ نیم وا کر کے باہر جھانکا تو کوڑا کرکٹ اٹھانے والے دو تین چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ریڑھی سنبھالے منتظر کھڑے تھے۔

''ارے بچو! بھلا یہ کون سا وقت ہوتا ہے آنے کا، دن بھر کیوں نہیں آتے؟''

''باجی کام ہوتا ہے سارے دن میں بھی، اب واپس جاتے جاتے سوچا آپ کی طرف سے بھی ہوتے جائیں۔'' ایک تقریباً آٹھ نو سالہ بچہ اندر آ کر اس کی تمام ٹوکریاں خالی کرنے لگا جبکہ دونوں بچے اس سے بھی چھوٹے تھے۔ اسے ہمیشہ ہی ان معصوم بچوں کا گند میں ہاتھ مارنا بہت دکھی کرتا تھا۔ اس نے ساری ٹوکریاں لا کر صحن میں رکھیں تو وہ اپنے بورے میں الٹنے لگا۔ ان کے جانے کے بعد وہ گیٹ بند کرنے

.... آئی تو گیٹ کے باہر کھڑا وہ بچہ اپنے گندے بورے میں سے صبح کے خراب چاول مٹھی میں بھر کر کھا رہا تھا۔ ثمینہ نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کے گندے ہاتھ اور میلے ناخن دیکھے اور پھر ہر گھر سے جمع کیا ہوا گند سے بھرپور غلیظ وہ تھیلا جس میں اس نے کچن کی ٹوکری خالی کی تھی۔

''ارے بچے، یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے بہ مشکل اسے کہتے ہوئے روکنا چاہا مگر وہ ڈر کر سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔

''یہاں آؤ...... اگر کھانا کھانا ہے تو میں تمہیں دیتی ہوں، پلیز یہ خراب کھانا مت کھاؤ بیٹا، ارے سنو تو اگر بھوک لگی ہے تو......'' ثمینہ اسے پکارتی رہ گئی مگر وہ بھاگتا ہوا اپنے باقی دونوں بھائیوں کے قریب جا رکا جو اس سے کافی دور کھڑے تھے مگر اگلے ہی پل وہ مزید حیرت زدہ ہوئی جب باقی دونوں بچے بھی اسی گندے تھیلے پر جھپٹ پڑے۔

تین معصوم بچے پیٹ بھرنے کے لیے جس درندگی سے گند میں سے چاولوں کے دانے چن رہے تھے اسے اندر تک ہلا کر رکھ گئے۔ خوف کا شدید احساس اس کے اندر سرایت کر گیا۔ لڑتے جھگڑتے وہ بچے انسان کم اور جانور زیادہ معلوم ہو رہے تھے۔ ثمینہ سے مزید وہ منظر دیکھا نہیں گیا اور وہ دروازہ بند کر کے گیٹ کے سہارے ہی کھڑی ہوگئی۔ رزق کی قدر کا جو در آج وا ہوا تھا اس کے دل کے اندر، وہ بلال کی تین سالہ محنت پر بھی ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے فضا میں گونجتی اذان کی آواز سنی اور معافی طلب نظریں نیلگوں آسمان پر پھیل گئیں۔



شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

قسط 5

شیریں حیدر

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنفِ نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہئیے تھا- تخلیق کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی- عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں- بد قسمتی سے بہت سی ایسی صورتِ حال بھی آجاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پس پشت ڈال دیتا ہے- غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چٹکیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے-

آئیں دیکھتے ہیں کہ مرد و زن کے اس تعلق میں کون کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے

اماں اب اسے لاکھ سمجھاتیں مگر جو کیڑا اس کے دماغ میں اس کے ساتھیوں نے گھسیڑ دیا تھا، اسے اماں کی کوئی بات نہیں نکال سکتی تھی۔ اسے کبھی بھی ان میں کسی کے ساتھ اس طرح کی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی، جس طرح کی کشش بہن بھائیوں میں ہوتی ہے۔ پھر وہ یہ بھی سوچنا شروع ہو گیا تھا کہ ان سب کی شکلیں ایک دوسرے سے جدا جدا کیوں تھیں، کسی کے بال سیدھے تھے اور کسی کے گھنگرالے۔ کسی کا رنگ سفید تھا تو کسی کا گندمی اور نیلم کا رنگ تو ان سب میں جدا تھا، سانولا سا۔

ہونے کو تو بہن بھائیوں کی شکلوں میں بھی فرق ہوتا ہے، کوئی ماں کی شکل لیتا ہے تو کوئی باپ کی۔ کوئی ننھیال پر چلا جاتا ہے تو کوئی ددھیال پر...... مگر اتنی بھی کیا رنگا رنگی کہ سات بہنوں اور ایک بھائی میں کسی کی شکل بھی آپس میں نہ ملتی ہو۔ اسے علم تھا کہ وہ اماں سے اس موضوع پر جتنی بھی بحث کرتا، جیت ہی نہیں سکتا تھا، اماں کے پاس اپنے حق میں دلائل ہر طرح کے موجود ہوتے تھے اور کچھ نہیں تو وہ غصے میں آ کر اسے ڈپٹ دیتیں تو اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

ان ساتوں کے بارے میں اس کا شک اپنی جگہ مگر ایک بات کا اسے یقین تھا کہ اس کی اماں اس کی اپنی اماں تھی، اس کی گود میں پناہ ملتی تو وہ خود کو دنیا کی ہر مشکل سے محفوظ پاتا تھا۔ کبھی کبھار یہ بھی سوچتا کہ جانے اماں گھر کا خرچہ کس طرح چلا رہی تھیں۔ ان کا کہنا تو یہی تھا کہ ان کی زمینوں کی آمدن تھی مگر اسے کبھی بھی یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ زمینیں کہاں تھیں اور کتنی تھیں، ان کو کون سنبھالتا تھا اور اس کا حساب کتاب کون رکھتا تھا۔ جب بھی اس نے اماں سے اس کی تفصیل جاننا چاہی، وہ یہی کہتیں کہ اسے اس سے کیا، جب وہ اس قابل ہو گا تو وہ اسے زمین دیکھنے کو ضرور بھیجیں گی۔

اس کی سوچیں اپنی جگہ مگر اس کی اماں کے ذہن میں بھی یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ اب انہیں یہاں سے کہیں اور چلے جانا چاہیے، اس سے قبل کہ کوئی دُلی کے ذہن میں کوئی اور خناس بھر دے، انہیں تو اپنے بیٹے سے بڑی امیدیں تھیں، بڑھاپے کا سہارا تو ان کے پاس سات بیٹیوں کی شکل میں موجود تھا مگر ان کی خانۂ خدا جانے کی خواہش کو سوائے دُلی کے اور کوئی پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی جوانی بھی جیسی تیسی گزری اور اب وہ اپنے پاس موجود خزانے کو بھی جس طرح سنبھالے ہوئے تھیں مگر یہ خواہش تو دل میں پنپتی تھی کہ مولا ایک دفعہ اپنے گھر کی زیارت ضرور کروا دے۔

☆☆☆

''وہ...... یہ، دکان کیوں بند ہے آج؟'' اس نے ساتھ والے دکان دار سے پوچھا۔

''گیا ہو گا شاکر شہر، ہر تین چار ماہ کے بعد جاتا ہی ہے وہ تو۔'' کپڑے کی دکان والے نے بے پروائی سے کہا تو وہ خاموشی سے مڑ گئی۔

''کتنے دنوں میں لوٹ آتے ہیں شہر سے؟'' اس نے واپس جا کر سوال کیا۔

''دو ایک دن میں آ جائے گا، کیا کوئی زیور بننے کو دے رکھا ہے تم نے بیٹا؟'' اس نے جواب دے کر سوال کیا۔

''ہاں!'' وہ چونکی، جانے وہ کن خیالوں میں تھی کہ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اس کی بے چینی اس کے

چہرے سے مترشح تھی۔ ''مگر کوئی بات نہیں، میں انتظار کر لوں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے گھر کی طرف چلی۔

''کہاں رہ گئی تھی تو۔'' معراج کی کڑک دار آواز آئی۔ ''میں تو اب پریشان ہی ہو گئی تھی، حویلی سے دو بار بلاوا آ چکا ہے اور ویسے بھی گاؤں کے حالات کچھ اچھے نہیں، یوں گھر سے تنہا نکلتی ہو تو میں تمہارے لوٹنے تک پریشان رہتی ہوں۔''

''کیا ہوا ہے گاؤں کے حالات کو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جو بات میں نے پوچھی ہے، وہ بتا تو۔'' معراج نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں شاکر کی ہٹی تک گئی تھی، آج مجھے تیلی بنا کر دینی تھی اس نے۔'' اس نے کہا۔

''اتنے سویرے تجھے تیلی کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''اس کے بعد حویلی بھی تو جانا تھا۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''میں نے پوچھا ہے کہ گاؤں کے حالات کو کیا ہوا ہے؟''

''چوہدری نور علی کے گرگے اپنے اور آس پاس کے دیہات میں چھاپے مار رہے ہیں تاکہ علم ہو سکے کہ ان کی پوتی کو کون اٹھا کر لے گیا ہے۔''

''انہیں اس کی کیا ضرورت پڑ گئی، وہ تو شکر کریں کہ جو کام انہیں رقم خرچ کر کے کروانا پڑتا، وہ خود بخود ہو گیا!'' اس نے ماں سے آنکھیں چرا کر کہا۔

''یوں ہی اول فول نہ بکا کر زرتاج تو۔ اور تو اور وہ ہمارے گھر بھی دیکھنے کو آئے تھے کہ کہیں ہم نے ہی تو۔'' معراج نے بتایا۔ ''گاؤں کے ہر گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔''

''پھر تو اس نے اچھا ہی کیا۔'' اس نے زیر لب کہا مگر معراج کے کان بھی تیز تھے۔

''کیا کہا تو نے؟'' سراج نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ گاؤں کے لوگوں کو ان کی پوتی کو اغوا کر کے کیا لینا دینا ہے!'' اس نے فوراً بات بدلی۔ بسا اوقات تو اس کو خود بھی حیرت ہوتی کہ کیسے اس کے منہ سے بات کو سنبھالنے والا جملہ خود ہی نکل جاتا تھا۔

''اس درد کو ہم تو سمجھتے ہیں نا زرتاج۔ تجھے تو معلوم ہے کہ جس کی بیٹی گم ہو جائے، اس پر کیا بیتتی ہے۔'' معراج کے لہجے میں آنسوؤں کی کھنک تھی۔

''اب اس بات کو لے کر پریشان نہ ہوں، مل جائے گی ان کی بیٹی اگر ملنا ہو گی تو۔'' زرتاج نے بات کا رخ فوراً بدلا۔

''دیا لو کی بیٹی بھی ابھی تک نہیں ملی۔'' معراج نے اسے بتایا۔

''وہ تو اچھی لڑکی نہیں تھی اماں، وہ اپنی مرضی سے بی بی جی کے بیٹے کے ساتھ گئی ہے۔ اس کو واپس آنا ہو گا تو خود ہی آ جائے گی، ڈھونڈے سے ملنے والی وہ نہیں۔'' زرتاج نے کہا۔

''تجھے کس نے بتائی ہیں یہ باتیں؟'' معراج حیران تھی۔

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

”عائشہ نے۔“ اس نے مختصراً کہا۔

”اور آج کی خبر یہ ہے کہ ہندوؤں نے پنچایت بلائی تھی، جس میں انہوں نے چوہدری مراد علی کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور پھر چوہدری نور علی نے فیصلہ سنایا۔“ زرتاج خاموشی سے ماں کا منہ دیکھ رہی تھی، اسے یہ بات جاننے کا اشتیاق ہو رہا تھا کہ کیا فیصلہ ہوا۔ ”پہلے تو دیالو کا اصرار تھا کہ کلثوم کا رشتہ اس کے بیٹے کو دیا جائے، اس بات کی مخالفت چوہدری مراد علی نے کی، ممکن ہے کہ نور علی مان جاتا مگر پوری پنچایت اس بات پر اڑ گئی کہ کلثوم کو کسی ہندو سے نہیں بیاہا جائے گا مگر جسے بھی دیا کے باپ اور چچا نامزد کر دیں۔“

”پھر۔“ معراج سانس لینے کو رکی تو زرتاج کا تجسس اسے بولنے پر مجبور کر گیا۔

”بس پھر دیالو نے کہا کہ اس کا نکاح ان کے نوکر گھوٹو کے ساتھ کر دیا جائے۔“ معراج نے کہا تو زرتاج کی چیخ نکل گئی۔

”گھوٹو......!“ نام تو جانے اس کا کیا تھا مگر ہندوؤں کے گھروں میں ان کے کام کاج کرتا اور بھنگ گھوٹ گھوٹ کر پینے کے باعث اس کا نام گھوٹو پڑ گیا۔ چالیس کے اریب قریب اس کی عمر ہو گی، اسے اس گاؤں میں بھلا کون رشتہ دیتا جو اس کی شادی ہوتی۔ نہ اس کے آگے کا پتا تھا نہ پیچھے کا، بہت سال پہلے اس کی ماں جانے کہاں سے اسے گود میں لے کر آئی تھی اور تب سے پہلے وہ خود اور اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہندوؤں کے گھروں میں ہی کام کرتے اور وہیں پڑے رہتے۔

نشے کی عادت نے اس کی جسمانی ساخت کو بھی بگاڑ دیا تھا، رنگت جل کر سیاہ ہو گئی تھی اور کوئی اور لڑکی تو کیا، اس کی ماں بھی زندہ ہوتی تو ایک کے بعد دوسری نظر اس پر ڈالنا گوارا نہ کرتی۔

”تو کیا بی بی جی نے اس فیصلے کو مان لیا ہے؟“ زرتاج نے سوال کیا۔

”جب کسی بات کا فیصلہ پنچایت کرتی ہے تو وہ ماننا پڑتا ہے، اگرچہ ان کے گھر میں ماتم کا سا سماں ہے، کلثوم کل کی بچی ہے اور وہ مردود۔“ معراج کو بھی غصہ تھا۔

”کوئی کچھ نہیں کر سکتا اماں...... اس فیصلے کے خلاف کوئی تو احتجاج کر سکتا ہو گا؟“ زرتاج نے ماں سے سوال کیا۔

”کون کرے گا کچھ، گاؤں کے لوگوں نے بی بی جی کے پاس بچیوں کو بھیجنا چھوڑ دیا ہے، جب ان کی اپنی اولاد نے ان کے سفید چونڈے کا خیال نہیں کیا تو کسی اور کو ان کے ساتھ کیا ہمدردی ہو گی؟“ معراج کے لہجے میں دکھ تھا۔

”تو اس طرح کیا دیا واپس آ جائے گی؟“ زرتاج نے پوچھا۔

”دیا تو وہ گیا وقت ہے جو شاید کبھی لوٹ کر نہ آئے، ہاں مگر کلثوم کی زندگی میں اپنی سہیلی اور اپنے بھائی کے ہاتھوں گھلنے والا زہر کبھی ختم نہ ہو گا۔ جانے کب تک وہ مر مر کر جیے گی، میں تو کہتی ہوں ہم لوگوں کے ہاں بیٹیوں کو جنم لینا ہی نہیں چاہیے۔“ معراج پھر جذباتی ہو رہی تھی۔

”اماں آپ نے بتایا تھا کہ حویلی سے بلاوا آیا تھا۔“ زرتاج نے انہیں یاد دلایا۔

”ہاں، چل اٹھ اب تیاری کر۔“

☆☆☆

اچانک ہی اس بچی نے رونا شروع کر دیا اور شاکر سے اسے چپ کرانا محال ہو گیا۔ ”یہ تو مجھے پھنسائے گی!“ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اسی وقت نکلنے کا ارادہ کیا، اپنی انگلی کو تھوڑا سا شہد لگا کر انگلی اس کے منہ میں دی تو وہ چسر چسر اسے چوسنے لگی اور خاموش بھی ہو گئی تھی۔ اس نے تھوڑا سا دودھ ہلکا گرم کیا اور اس میں روئی ڈبو ڈبو کر اس کے حلق میں ٹپکانے لگا۔

جیسے ہی وہ پُرسکون ہو کر سوئی، اس نے اپنا سارا سونا سمیٹا، کچھ اور ضروری سامان اور اپنا کپڑا لتا لیا اور بچی کو اسی طرح لپیٹ لپاٹ لیا جیسے کہ وہ پہلے تھی۔ سامان اس نے اتنا ہی اٹھایا تھا، جتنا کہ اٹھا کر وہ چل سکتا تھا۔ اس نے اس برساتی نالے کی طرف کا رخ کیا تھا، جہاں سے عموماً لوگ نہیں جاتے تھے اور سواری ملنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ کافی فاصلہ اس نے راتوں رات ہی طے کر لیا تھا۔

زرتاج تو اس بچی کو امانت کی طرح اس کے حوالے کر گئی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کتنی بڑی مصیبت مول ...لی تھی۔ اس بات کی کسی کو بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ ان کے ٹکڑے کروا کر اپنے کتوں کے آگے ڈال دیتے۔ ان کی سفاکی کے اس نے چرچے سن رکھے تھے اور وہ کبھی بھی ان کا شکار نہیں بننا چاہتا تھا۔

پیدل چل کر وہ وہاں پہنچا جہاں سے اسے نور کے تڑکے تانگہ مل سکتا تھا۔ وہ رکا، بچی ذرا سا کسمسائی تھی، اس نے اس کا لنگوٹ بدلا اور اپنے ساتھ لایا ہوا دودھ اسے پلایا، اس دفعہ اس نے ہلکی سی مقدار اپنی کھانسی کی دوا کی شامل کر لی تھی، جو اسے حکیم صاحب نے دی تھی اور اس کو پینے سے اسے ہلکی سی غنودگی آ جاتی تھی۔ دوبارہ بچی کو بھی کسی قیمتی سامان کی طرح سمیٹا اور جا کر اس تانگے میں بیٹھ گیا جس میں اور سواریاں بھی بیٹھی تھیں۔ وہ اپنا سامان سمیٹ کر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گیا، بچی اس کی چادر میں اس کی گود میں ہی تھی اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سو رہی تھی، اس نے سکون کی سانس لی۔

تانگہ رکتے ہی اس نے کرایہ ادا کیا اور اڈے سے شہر جانے والی لاری پر سوار ہو گیا۔ کنڈیکٹر نے اس سے کہا کہ وہ اس کا سامان لاری کی چھت پر رکھ دیتا ہے مگر اس نے انکار کر دیا اور اسی طرح سامان اپنی گود میں رکھ لیا جیسے کہ اس نے تانگے میں رکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے جانے کیا خیال آیا کہ اس نے کنڈیکٹر کو بلایا اور اپنے ساتھ والی خالی سیٹ کی ٹکٹ بھی خرید لی۔ یعنی اب اس کے ساتھ والی سیٹ خالی رہتی۔

لاری کھچا کھچ بھر چکی تھی اور اس کا ڈرائیور اپنی نشست پر آ بیٹھا تھا اور مسلسل ہارن بجا کر لوگوں کو مطلع کر رہا تھا کہ وہ روانگی کے لیے تیار ہے۔ لاری کے روانہ ہوتے ہی کنڈیکٹر نے زور سے ہاتھ لاری کے بیرونی دروازے پر مارا اور چلا کر بولا۔ ”روک کے۔“ لاری روانہ ہونے کے چند ہی سیکنڈ کے بعد رک گئی تھی۔ ایک جوان سی عورت سوار ہوئی، اس کی سانس پھول رہی تھی اور اس کی وجہ سب کو نمایاں نظر آ رہی تھی۔ وہ حاملہ تھی اور اس کا وقت بھی قریب ہی نظر آ رہا تھا۔ لاری کو پکڑنے کی کوشش میں وہ غالباً تیز تیز قدموں سے چلتی آئی تھی، اسی لیے ہانپ رہی تھی، اس کے بیٹھنے کو کوئی نشست بھی خالی نہ تھی اس لیے وہ چھت پر لگے ڈنڈے کے ساتھ لٹکتے ہوئے بیلٹ نما پٹے کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ لاری پھر روانہ ہو گئی اور وہ اس کی ہر ہر حرکت کے ساتھ جھٹکے کھا رہی تھی۔

"اگر یہ نشست خالی ہے تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟" اس نے بے چارگی سے شاکر سے پوچھا، وہ قدرے حیران ہوا کہ ایک عورت ہو کر وہ ایک مرد مسافر کے ساتھ بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ اس نے سمٹ کر اسے بیٹھنے کو جگہ دی اور اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے اس نشست کے لیے کنڈیکٹر کو خوامخواہ ادائیگی کی تھی۔ کنڈیکٹر نے تو جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔

"باؤ جی، یہ رہے آپ کے بقایا پیسے۔"

"کس بات کے پیسے؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"آپ نے اس نشست کے لیے ادائیگی کی تھی، اب چونکہ یہ نشست آپ کے قبضے میں نہیں ہے تو میں ان باجی سے اس کا کرایہ وصول کر لیتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، کرایہ تو میں دے چکا ہوں!" اس کے منہ سے اچانک پھسلا۔ کنڈیکٹر احسان مندی سے اسے دیکھتا ہوا واپس مڑ گیا۔

"میں آپ کی بہت ممنون ہوں!" اس نے شاکر کی طرف دیکھ کر کہا، شاکر کو اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنو واضح نظر آ رہے تھے۔

"کوئی بات نہیں، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے!" اس نے کہا اور منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

"آپ نے مجھے شرمندگی سے بچا لیا ہے۔" اس نے ہولے سے کہا۔ "میرے پاس کرایہ دینے کے لیے بھی رقم نہیں تھی، اگر کنڈیکٹر مجھ سے مانگ لیتا تو میں بھری بس میں سب کے سامنے شرمندہ ہو جاتی، کیا آپ یقین کریں گے کہ میں اس لاری کی طرف چلتے ہوئے آ رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ کاش کوئی فرشتہ اس گاڑی میں ہو جو مجھے اس شرمندگی سے بچا لے اور دیکھ لیں اللہ نے کیسے میری سن لی!"

شاکر کو اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ شہر کی کوئی لڑکی تھی اور یہ کہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی اور خاصی باتونی بھی۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر شرمندہ ہوا کہ وہ اسے فرشتہ کہہ رہی تھی۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے لاری روکی تا کہ سارے مسافر اتر کر حوائج وغیرہ سے فارغ ہو جائیں اور کچھ کھا پی بھی لیں۔ مسافر ایک ایک کر کے اتر رہے تھے، جب ذرا سی حرکت اور شور سے بچی کے آرام میں مداخلت ہوئی اور اگلے ہی لمحے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی، شاکر اس صورت حال پر پریشان سا ہو گیا تھا، اسے مجبوراً چادر ہٹانا پڑی تا کہ بچی کی سانس نہ بند ہو جائے۔

"ارے...... کتنی پیاری بچی ہے...... کس کی ہے؟" اس عورت نے سوال کیا تو وہ ہڑبڑا گیا۔

"وہ...... یہ میری ہے!" اسے اور کچھ نہ سوجھا۔

"یہ تو بہت چھوٹی ہے، اس کی ماں کہاں ہے۔" اس نے بچی کو شاکر کے ہاتھوں سے لے لیا۔ "آپ اس کو اکیلے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟"

"اس کی ماں...... ہاں وہ اس کی پیدائش کے دوران مر گئی، میں اسے شہر لے کر جا رہا ہوں۔" وہ ٹھیک ٹھاک بوکھلا گیا تھا۔

"تو آپ اسے شہر کس کے پاس لے کر جا رہے ہیں؟" اس نے شاکر کا دھواں دھواں چہرہ دیکھے بغیر کہا

تھا۔

"معلوم نہیں۔" شاکر نے کہا۔

"کیا مطلب معلوم نہیں؟" اس نے مڑ کر حیرت سے شاکر کو دیکھا۔

"گاؤں میں میرا اور کوئی نہیں، میں اسے کہاں سنبھال سکتا ہوں، اسی لیے میں اسے شہر لے کر جا رہا تھا کہ شاید وہاں اس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی عورت مل جائے۔" شاکر نے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کتنے ہی جھوٹ بول ڈالے تھے، گھر سے نکلنے سے لے کر ابھی تک اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ شہر پہنچ کر اس بچی کا کیا کرے گا۔

"آپ ہو آئیں باہر سے، کچھ کھا پی لیں اور میرے لیے بھی کچھ لے آئیں، بچی مجھے دے جائیں میں اس کو تب تک سنبھالتی ہوں۔" اس نے اس طرح اسے احکامات جاری کیے کہ شاکر کو ان کی تعمیل کیے بغیر چارا نہ تھا۔ اپنا سارا سونا اور زیورات اس نے اپنی شلوار کے اندر بنی پوشیدہ جیب میں رکھے تھے، باقی سامان میں سوائے کپڑوں کے کچھ نہ تھا، اس لیے وہ بے فکری سے بچی اس کے حوالے کر کے لاری سے اتر گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد، وہ ایک لفافے میں پکوڑے اور اپنے پاس موجود دوا والی خالی بوتل میں بچی کے لیے دودھ لے کر لوٹا اور بس میں سوار ہوا، اپنی نشست کی طرف بڑھا، نشست خالی تھی، جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ عورت گود میں اس کی بچی کو لیے بیٹھی تھی، جو اس کے پاس زرتاج کی امانت تھی اور اس کے لیے وہ اس کو جواب دہ تھا، اس کا دماغ نشست کو خالی دیکھ کر بھک سے اڑ گیا۔

"میں زرتاج کو کیا جواب دوں گا؟" اس نے سوچا۔ "میں نے ایک انجان عورت پر بھروسا کیسے کر لیا، اس نے مجھے فرشتہ کہہ دیا اور میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا۔"

☆☆☆

"تھک گیا ہے میرا جانی؟" سلیم نے زمین پر ٹانگیں پسار کر بیٹھتے ہوئے سہیل کے کندھے دبائے۔

"ٹانگیں دبا اپنے جانی کی!" افضال ہنسا۔ "اتنا نازک مزاج ہے تو یار، لڑکیوں سے بھی گیا گزرا ہے تو!"

"مجھے عادت ہی نہیں چلنے کی۔" سہیل نے جمائی لے کر کہا۔

"جانتے ہیں تیرے شاہانہ انداز بھی، بات تو تب تھی نا کہ تو گاڑی لے آتا، ہم یہاں آزادی سے گھومتے پھرتے اور اپنی مرضی سے جہاں جی چاہتا آتے اور جب جی چاہتا، لوٹ جاتے۔" سلیم بات کرتے کرتے رکا، اپنے ہاتھوں کا چھجا سا بنا کر دیکھا اور چلایا۔ "لڑکیاں!"

"کہاں ہیں؟" سہیل جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"دیکھا...... لڑکیوں کو دیکھ کر تو یہ قبر سے اٹھ کر بھی آ جائے گا!" افضال نے اس پر طنز کیا۔

"واقعی لڑکیاں ہیں۔" سلیم نے دور دیکھتے ہوئے کہا۔ "تین چار ہیں۔"

"ہمیں صرف تین کی ضرورت ہے۔" افضال نے مذاق میں کہا تھا مگر سہیل تو اٹھ کر واقعی اسی طرف چل پڑا تھا۔

''باؤلے ہوئے ہو گیا، یہاں اس ویران سے علاقے میں تم کس طرح لڑکیوں سے فلرٹ کرو گے، مذاق اپنی جگہ مگر تم گاؤں کے لوگوں کے ہاتھوں پٹ جاؤ گے۔'' سلیم نے اسے پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔

''بھگتو اب تم ہی اسے۔'' افضال وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا، سایہ اچھا تھا اسے دھوپ میں سہیل کے ساتھ جانا گوارا نہ ہوا اور پھر اسے شہر کی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں، گاؤں سے اس کا تعلق تھا اور اسے گاؤں کی لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس نے تو اپنی اماں سے صاف کہہ رکھا تھا کہ اس کا بیاہ کبھی بھی گاؤں میں کرنے کا نہ سوچے۔

سلیم سہیل کا ساتھ دینے کو اس کے ہمراہ روانہ ہو چکا تھا، اس کو ہلکی ہلکی نیند آ رہی تھی اور اسے یہ بھی علم تھا کہ سہیل اب ذرا اپنا چھیڑ چھاڑ کا منظر لمبا ہی کر کے آئے گا، ایک یہی شغل اسے پسند تھا اس کے لیے جگہ اور وقت کی کوئی قید نہ تھی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے وہاں پہنچے تو انہیں اندازہ ہوا کہ وہ جگہ گاؤں سے کافی ہٹ کر تھی۔ سات آٹھ برس سے لے کر گیارہ بارہ سال تک کی چار لڑکیوں کا گروہ تھا، جن میں سے دو لڑکیوں نے چھوٹے بچے اٹھا رکھے تھے۔ انہیں وہاں دیکھ کر انہوں نے اپنا کھیل روک دیا۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اجنبی لوگ تھے، اپنے گاؤں کے لوگوں کو وہ پہچانتی تھیں۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' سہیل نے پوچھا، اس کی نظریں گیارہ بارہ سالہ اس لڑکی پر جمی تھیں جس کی اٹھان ان سب میں اچھی تھی۔ جواب میں خاموشی تھی، ان لڑکیوں کی ماؤں نے ان کو تربیت ہی یہی دی تھی کہ اجنبیوں سے کلام نہ کریں۔

''واپس چلتے ہیں، یہ تمہارے مطلب کا مال نہیں۔'' سلیم نے اسے چونکایا۔

''سارے مال مطلب کے ہی ہوتے ہیں۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اسی لڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، وہ لڑکی ذرا سا سمٹ کر پرے ہو گئی۔

''دیکھا کیا ادا ہے گریز کی...... ان لڑکیوں کو ساری ادائیں آتی ہیں!'' اس نے اس لڑکی کے گال کو چھوا تو اسے خطرے کا احساس ہوا، وہ پیچھے ہٹ گئی اور لال چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اسی نے ہمت کر کے سوال کیا اور ساتھ ہی اپنی علاقائی زبان میں کچھ بولی، اس کے اس انداز میں تحکم تھا۔ وہ اپنے گروہ میں عمر میں سب سے بڑی لڑکی تھی۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ سب کی سب بھاگ گئیں، اس طرح کہ جس طرح ہرنیاں قلانچیں بھرتی ہیں۔

''دفعہ کرو ان کو، چلو واپس چلتے ہیں۔'' سلیم نے اس کا لال چہرہ دیکھ کر کہا۔

''میں دیکھ لیتا ہوں ان سب کو۔'' اس کی حالت اس بھیڑیے جیسی ہو رہی تھی، جس کے منہ سے کسی نے شکار چھین لیا ہو۔ سلیم کے روکتے روکتے بھی وہ ان کے پیچھے بھاگا تھا، جو اس سے پہلے چند قدم چل کر بھی ہانپ رہا تھا، اس کی وحشی جبلت اسے ان معصوم بچیوں کے تعاقب میں بھگائے لے جا رہی تھی، بڑی لڑکیاں تو جانے ساری کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ وہ بھی جنہوں نے بچے اٹھا رکھے تھے، اس کا ہیجان عروج پر پہنچ چکا تھا، اس کی وحشت کا نشانہ بننے کو ایک سات سالہ معصوم سی بچی، اس کے قابو میں آ گئی تھی۔ سلیم اسے روکتا ہی رہ گیا مگر اس

پر حیوانیت سوار تھی۔

☆☆☆

"مجھ سے بڑھ کر تو جینا ہی مردم شناس نکلی۔" اس نے ہی دل میں سوچا" میں نے دنیا کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھا اور وہ جسے میں بے وقوف سمجھتی تھی اس نے مجھے پہلے سے ہی اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ کیا دنیا میں یہی ملتا ہے کسی پر اعتبار کا نتیجہ۔" جاوید بھائی، جنہیں وہ اپنے بھائیوں جیسا سمجھتی تھی اور ان کی اور سائرہ کی محبت میں وہ اتنی دور سے ان کو ملنے چلی آئی تھی۔ پہلے چند دن تو یوں گزرے کہ اسے وقت کی رفتار کا علم ہی نہیں ہوا تھا۔ سائرہ باجی کی طبیعت ناسازسی رہتی تھی اور رات دیر تک انہی کے کمرے میں محفل جمتی، جاوید بھائی اور بچے خوب رونق لگاتے۔

اسے آئے ہوئے پانچواں روز تھا، جب جاوید بھائی نے اپنی شرافت کا چولا اتارا۔ وہ ان کے اس بدلتے بہروپ پر حیران تھی۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے جاوید بھائی، میں وہی ہوں جسے آپ اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔"

"کسی کو کچھ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ اس کی طرف بڑھتے ہی چلے آ رہے تھے۔ "تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری باجی اب مستقل مریضہ ہے اور میرے حقوق ادا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔"

"تو آپ دوسری شادی کر لیں۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"وہ تو کروں گا ہی تم سے، اسی لیے تو تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"شرم آنی چاہیے آپ کو جاوید بھائی!" اس کی آواز بھرا گئی، مان ٹوٹے تو اسی طرح ہوتا ہے۔

"بند کرو یہ بک بک جاوید بھائی والی...... اور سیدھے سیدھے میرا مطالبہ پورا کرو!" انہوں نے اسے حکم دیا۔

"آپ یہاں سے نکل جائیں ورنہ میں چیخ چیخ کر آپ کے بیوی بچے ہی نہیں بلکہ سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی!" اس نے اس ان کو خبردار کیا۔

"بکواس نہ کرو۔" انہوں نے اس کو اس کی چٹیا سے پکڑ لیا۔ "ایک لفظ بھی بولا تو میں سب کو بتا دوں گا کہ تو نے مجھے خود بلایا ہے۔ کون یقین کرے گا تیری بات پر، سب کو علم ہے کہ تو ہی ایسی ہو سکتی ہے، سائرہ بھی نہیں مانے گی تیری بات۔" انہوں نے اس کو جھٹکا دے کر چھوڑا۔ "اگر کوئی شک ہے تو چیخ اور بلا سب کو۔"

وہ دہل گئی، اندر تک دہل گئی۔ جاوید نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا، اس نے زور لگا کر خود کو چھڑوایا، اسے علم تھا کہ وہ ان سے بچ نہیں سکتی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جاوید بھائی۔" اس نے التجا کی۔ "مجھے چھوڑ دیں پلیز۔" اور کیا چاہیے ہوتا ہے ایک مرد کو، اپنے سامنے گھگیاتی ہوئی ایک عورت۔

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔" انہوں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ "اور اپنی طبیعت ذرا جلدی ٹھیک کرو!" انہوں نے ایسے حکم دیا جیسے اپنی طبیعت کو ٹھیک کرنا اس کے اختیار میں ہو۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا مگر پھر بھی وہ کئی گستاخیاں کر گئے، اس کے سامنے عمر بھر ایک مینار کی طرح استادہ رہنے والے اس کے

بھائیوں جیسے جاوید بھائی اپنی حرکتوں سے اس کے سامنے ذلت کی انتہاؤں تک گر گئے تھے۔ اس کے کمرے سے وہ نکلے تو وہ غسل خانے میں گھس گئی اور اپنے سارے جسم سے ان کے ناپاک لمس کی غلاظت کو اتارنے کی ناکام کوشش کرنے لگی کیونکہ یہ غلاظت اس کی روح تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا اعتبار ٹوٹا تھا، اس نے دھوکا کھایا تھا۔ وہاں سے جہاں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اگلے ہی روز جونہی وہ عفریت گھر سے نکلا، اس نے سائرہ سے اجازت لی اور واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ سائرہ اسے بار بار روکتی رہی مگر اسے اپنی عزت بچانا مقصود تھی۔

"اچھا پھر کل چلی جانا، تمہارے بھائی صاحب تمہیں خود اسٹیشن پر چھوڑ کر آئیں گے، یوں تمہیں جانے دیا تو وہ مجھ پر ناراض ہوں گے کہ میں نے تمہیں روکا نہیں۔" مریم نے سائرہ کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"سائرہ باجی۔ مجھے جانے دیں، آج ہی جانے دیں۔ میں جو کچھ آج بچا پائی ہوں، جانے کل نہ بچا سکوں۔ آپ کا گھر بھی برباد ہو جائے گا اور میں تو کہیں کی نہ رہوں گی!" مریم نے بالآخر اسے اشارتاً سمجھایا مگر سائرہ بچی نہ تھی۔ اسے گلے لگا کر رخصت کیا، اس سے بار بار معافی طلب کی ایک ایسے جرم کی جو اس نے کیا بھی نہ تھا۔

ریل میں بیٹھی وہ بار بار گزرے چند دنوں کے واقعات کو دہرا کر خود سے شرمسار تھی کہ اس کی بہنوں جیسی سائرہ کا اب اس سے رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ دنیا کے کسی خطے میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی ہے۔ جب اسے ضرورت پڑے گی تو وہ اس کو پکارے گی، وہ سب ختم ہوا۔

آنکھوں میں بار بار پانی اتر آتا تھا، اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ آنسو رشتوں کے دیے ہوئے تھے، کسی پچھتاوے یا احساسِ زیاں کے نہ تھے۔ ریل گاڑی کافی دیر سے کھڑی تھی، شاید کوئی خرابی ہو گئی تھی یا پھر سگنل بند تھا۔ کوئی انتہائی گم نام چھوٹا سا اسٹیشن تھا، وہ اتری اور اس ایک کمرے کی انتظار گاہ کی طرف بڑھی جس کا نہ کوئی دروازہ تھا نہ کھڑکی۔ اسے غسل خانے جانا تھا، وضو کرنا تھا اور اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کرنا تھے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے ذہن سے صدمہ کم ہو گیا تھا۔

غسل خانے کی حالت کافی خستہ تھی، اس نے دروازہ بند کیا تو اسے زمین پر ایک گٹھڑی سی پڑی نظر آئی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اسے علم ہوا کہ وہ گٹھڑی نہیں بلکہ کوئی بچہ تھا، اس نے اسے چھو کر دیکھا، بچہ یا تو بے ہوش تھا یا پھر مر چکا تھا۔ اس نے اس کے سینے پر سر رکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ زندہ تھا پھر اس نے دیکھا تو وہ لڑکی تھی۔

"شاید کسی کے گھر میں زیادہ بیٹیاں ہو گئی ہوں گی اس لیے۔" اس نے سوچا۔ اس بچی کو اٹھائے ہوئے وہ باہر نکلی تو دور دور تک کوئی نہ تھا، گاڑی کی بلند سیٹی بتا رہی تھی کہ گاڑی روانہ ہونے والی ہے، اس کا سامان اس میں نہ ہوتا تو وہ واپس نہ جاتی، پہلے معلوم کرتی کہ وہ بچی تھی کس کی۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اس نے اس اسٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

اس کے ڈبے میں باقی لوگوں میں سے کوئی سو رہا تھا، کوئی اخبار پڑھ رہا تھا، اس نے بچی کو اپنی چادر کی اوٹ میں کر لیا تھا۔ گاڑی چل پڑی تھی، اس نے بے ہوش بچی کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ بچی کا دل دھڑک

رہا تھا مگر اس کے وجود میں اور کوئی حرکت نہ تھی۔ وہ زیرِ لب اس کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ اپنے شہر پہنچ کر گاڑی رکی تو اس نے اپنا مختصر سا سامان اور بچی کو اٹھایا اور کسی ڈاکٹر کو ڈھونڈنے چل دی۔

☆☆☆

گاڑی سے اتر کر وہ رفع حاجت کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہی تھی، گاڑی کے درجنوں مسافر اتر کر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، وہ کوئی ویران گوشہ تلاش کرنے لگی، اس کوشش میں وہ ریل گاڑی سے کافی دور آ گئی تھی، واپسی پر وہ تیز تیز قدموں سے ریل کی طرف جاتے جاتے اس گول سی پوٹلی نما کسی چیز کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی، اس کا ایک اندازہ تھا جو قریب جا کر درست ثابت ہوا۔ وہ بچہ ہی تھا۔

"کم بختیں، پیدا کر لیتی ہیں اور پھر چھوڑ دیتی ہیں یوں ان غریبوں کو کتے بلیوں کے کھانے کے لیے!" اس نے سب سے پہلے پڑتال کی اور مسکرائی۔ "اری بدبختو، کوئی ہم سے پوچھے قدر ان معصوم روحوں کی!" اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ لڑکی تھی، اگر لڑکا ہوتا تو شاید نہیں۔ یقیناً وہ اس کو وہیں چھوڑ کر آگے کو نکلتی۔ اس کی مرضی کا مال تھا، لڑکا تو اس کے پاس تھا، جسے اس نے خود جنا تھا۔

کسی مجبوری کے تحت نہیں اور نہ ہی ناجائز اولاد بلکہ کسی پر اپنا دل ہار بیٹھی اور اپنی ماں کے کہنے کے باوجود اس سے نکاح کر لیا۔ وہ تو سمجھ بیٹھی تھی کہ جسے وہ دل دے بیٹھی ہے وہ بھی اس سے اسی طرح پیار کرتا ہوگا مگر وہ دنیا والوں کے ڈر سے اسے اس کا مقام تو نہیں دے سکا اور ایک دفعہ گیا تو کبھی لوٹ کر نہ آیا تھا اور نہ ہی کبھی بیٹے کا مطالبہ کیا اور باقاعدگی سے دلی کا خرچہ بھی اسے پہنچ جاتا تھا۔ کافی عرصے تک اسے جب خرچہ نہیں ملا تو اس نے کسی کو بھیج کر معلوم کروایا تو علم ہوا کہ وہ اب اس دنیا میں نہ تھا، اس روز وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی گرہستن تھی اور بیوہ ہو گئی تھی۔ اس صدمے نے دوبارہ اسے اپنے پیشے کی طرف مائل کر دیا، اب تک تو اسے امید تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی لوٹ کر آئے گا مگر اس کی موت کی خبر نے اس کی امید کے سارے تاگے توڑ دیے تھے۔

اپنے پیشے ہی کے سلسلے میں اسے پشاور جانا پڑا تھا تو اپنے بچوں کو وہ اپنی ہمسائی کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ اپنے "کام" کے سلسلوں کو وہ اپنے بیٹے کی نظر سے خاص طور پر اوجھل رکھنا چاہتی تھی، گئی تو پشاور مال دیکھنے تھی مگر وہ مال نہ ملا اور اب۔

"واہ مولا، تو نے دینا ہو تو بن مانگے اور بن مول بھی دے دیتا ہے۔" واپس اپنے ڈبے میں جاتی تو لوگوں کے سوالوں کا کیا جواب دیتی۔ اس لیے وہ ایک دوسرے ڈبے میں جا کر سوار ہو گئی! بچی کو ہولے ہولے تھپکا اور کچھ ریل چلی تو اس کے ہلکورے سے وہ جلد ہی سو گئی۔ اب اسے یہ فکر تھی کہ کہیں بچی بھوک سے بلبلا اٹھی تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اس نے کسی کو رقم پکڑائی کہ ایک بوتل میں دودھ لا کر دے دے۔ تھوڑی دیر میں دودھ کی بوتل آ گئی۔

"تو کیا تم گھر سے بچی کی بوتل لے کر نہیں چلی تھیں؟" ایک بڑی بی نے پوچھا جو کافی دیر سے اسے دیکھ رہی تھیں، انہیں اس عورت کے ڈھب نرالے نظر آئے تھے، دیکھنے میں تو وہ بڑی اماں کو پچاس کے پیٹے میں لگ رہی تھی اور گود میں چند ماہ کی بچی۔

"جی، وہ میری اماں کا انتقال ہو گیا ہے، جونہی خبر ملی تو گھر سے نکل پڑی۔" وہ ایک شاطر عورت تھی، پروں پر پانی کیسے پڑنے دیتی۔

"تو اماں کے انتقال پر کیا اس طرح کے کپڑے پہن کر جا رہی ہو تم؟" بڑی اماں تو چیکو ہی ہو گئی تھیں۔

"دراصل میں اپنی نند کی شادی کے لیے تیار ہوئی تھی۔" اس نے فوراً جواب گھڑا۔

"تو شوہر کہاں ہے تمہارا؟" اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ بڑی اماں کا گلا مروڑ دے مگر کئی لوگ ان کی گفتگو کی طرف متوجہ تھے۔

"ان کی بہن کی شادی تھی بڑی اماں! کیا اسے چھوڑ کر آ جاتے؟" اس نے زچ ہو کر کہا تو بڑی اماں بھی منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔ اس نے شکر کی سانس لی۔

دودھ پی کر بچی نے جب دودھ پلانے والی کو دیکھا تو اسے نہ پہچانا اور وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگی۔ "اماں! تائی... بائی..." روتے روتے وہ عجیب و غریب آوازیں نکال رہی تھی۔ وہ تو اسے چند ماہ کی بچی سمجھے بیٹھی تھی اور وہ بچی اس کی توقع سے زیادہ باتیں کر رہی تھی۔ کافی کوشش کی مگر بچی چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

غصے میں آ کر اس نے دہاڑ کر اسے چپ ہونے کو کہا تو بچی سہم گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ "دیکھتی نہیں ہے کہ میری ماں مری ہے۔ تیری ماں تو زندہ ہے تو کیوں یوں رو رو کر مجھے زچ کر رہی ہے؟" وہ مکاری سے مصنوعی آنسو بہانے لگی۔

"کیوں معصوم بچی کو ڈانٹ رہی ہو۔ لاؤ اِدھر، مجھے دو میں اس کو دم کر دوں، اس کے پیٹ میں درد ہوگا، جانے کس طرح کا دودھ تھا جو تم نے اس کو پلا دیا۔ اتنی سی بچی کو دودھ میں پانی ملا کر دینا چاہیے۔" انہی بڑی اماں نے اس سے بچی لی اور اس کو دم کرنے لگیں۔

"کتنے ماہ کی ہے؟" اس پر پھونک مار کر انہوں نے اسے اس کے حوالے کیا، بچی خاموش ہو گئی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے بچی کو تھام لیا۔ "جی نو ماہ کی ہے۔" اس نے اندازے سے کہا۔

"ماشاء اللہ یا تیں تو بہت کرتی ہے، عموماً اتنی باتیں سال ڈیڑھ کا بچہ کرتا ہے۔" انہوں نے کہا تو یہ خاموش رہی کہ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

"بھاگو!" اس کا کہنا تھا کہ اس سمیت سب بھاگ پڑیں۔ کوئی کسی سمت اور کوئی کسی سمت۔ زرتاج اور روحی اس طرف بھاگی تھیں جہاں سے ریل گاڑی گزرتی تھی، اپنے کندھوں پر اٹھائی ہوئی بچیاں انہیں بوجھ لگنے لگیں، انہیں یقین تھا کہ اسٹیشن کی طرف ان کا سامنا کسی نہ کسی سے ہوگا مگر وہاں پہنچ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں ہو کا عالم تھا۔ وہ انتظار گاہ کی طرف بھاگی، وہاں بھی اندر کوئی نہ تھا، اس وقت مسئلہ اپنی جان بچانے کا تھا کہ ان کے پیچھے بھیڑیے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

انتظار گاہ کے غسل خانے میں پہنچی تو اس کے ہاتھوں سے بچی چھوٹ کر گر گئی، وہ سمجھی کہ وہ ابھی گلا پھاڑ پھاڑ کر روئے گی اور اے اماں، تائی کہہ کر پکارے گی مگر وہ گری اور اس کے حلق سے کوئی بھی آواز بلند نہیں

ہوئی۔ زرتاج کا بدن لرزنے لگا، وہ خوفزدہ ہوگئی تھی، بھاگی کہ باہر نکل کر روحی کو دیکھے کہ وہ کہاں تھی مگر روحی تو اس کی مخالف سمت میں بھاگی تھی۔ دیر تک اسے ڈھونڈنے اور پھر نہ پانے پر وہ مایوس ہو کر وہ ایک ٹیلے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی کہ شاید اسے ڈھونڈتا ہوا کوئی اِدھر نہ آنکلے۔

روحی نے تھک کر اسے جھاڑیوں کے ننھے سے سائے میں لپیٹ لپاٹ کر رکھا اور خود زرتاج کی تلاش میں نکلی۔ جلد ہی اسے زرتاج ایک ٹیلے کے پیچھے چھپی ہو... سسکیاں لیتی ہوئی نظر آئی۔

''قمر باجی کہاں ہیں؟'' زرتاج نے روحی سے پوچھا تھا۔

''وہ اور ماہ تاج اس طرف بھاگی تھیں۔'' روحی نے مخالف سمت اشارہ کیا۔

''چلو ان کو ڈھونڈتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ماہ تاج تو اتنا نہیں بھاگ سکتی، کہیں تھک کر بیٹھی ہوگی۔''

جانے کتنا ہی وقت گزر گیا، دور سے انہیں ریل گاڑی بھی نظر آئی مگر وہ اس طرف نہیں جا رہی تھیں کہ انہیں قمر اور ماہ تاج کو ڈھونڈنا تھا اور انہیں ان لوگوں سے بھی خطرہ تھا جن کے ڈر سے وہ بھاگی تھیں۔ قمر اپنی جان اور عزت بچا کر بھاگی تھی اور جلد ہی اسے ایک محفوظ ٹھکانا مل گیا تھا۔ وہ وہاں چھپی ہانپ رہی تھی، اپنی عمر کی وجہ سے صرف اسے ہی اندازہ تھا کہ ان کے عزائم کیا تھے۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور اسے یہ اندازہ کرنا بھی دشوار لگ رہا تھا کہ گاؤں کس طرف ہے۔

''شاید اسی وجہ سے ہماری مائیں ہمیں اس طرف آنے کو منع کرتی ہیں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ یہاں جنات کا ٹھکانا ہے مگر اصل میں اس جگہ میں کوئی نہ کوئی ایسا بھید ہے کہ کوئی اس طرف نہیں آتا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ بھاگتے وقت ماہ تاج نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا مگر وہ اس کی رفتار کا کہاں مقابلہ کر سکتی تھی، اسی لیے اس نے اسے اپنی مخالف سمت بھاگنے کو کہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ماہ تاج تو ایک ننھی سی بچی ہے۔ اصل خطرہ تو اس کی عزت کو تھا۔ اسے اس شہری کی نظروں میں اپنے لیے جو بھوک نظر آئی تھی اور اس کی جبلت کو محسوس ہوگئی تھی اسی لیے اس نے سب کو بھاگنے کو کہا تھا۔

خود ایک محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ کر جب اس نے اردگرد نظر دوڑائی کہ باقیوں کو دیکھے تو دور سے اسے وہ منظر نظر آیا جسے دیکھ کر چشمِ فلک بھی شرمندہ تھی۔ ''ماہ تاج!'' اس کے حلق میں کئی سسکیاں دم توڑ گئیں۔ اس کی آواز نکلتی تو اسے بھی ڈھونڈ لیا جاتا۔ زور سے اسے چکر آیا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے گرتی چلی گئی، وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی اور بے ہوش ہوگئی تھی۔

جتنی دیر میں زرتاج اور روحی اسے ڈھونڈتی ہوئی پہنچیں اور اسے تھپتھپا تھپتھپا کر ہوش میں لائی تھیں تو سارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ قائم علی کے گھر کا سکون، خوشی...... اس کی بیٹیاں...... اس کی پھولوں جیسی بیٹیاں پتی پتی ہو کر بکھر چکی تھیں۔

☆☆☆

''پاگل ہوئی ہو کیا یا کتے لگ گئے ہیں تمہارے پیچھے؟'' معراج نے ہانپتی کانپتی اور لرزتی ہوئی تینوں لڑکیوں کو یوں آتے دیکھا تو برس پڑیں۔ ''اور چھوٹیاں کہاں ہیں۔ کہاں تھیں تم لوگ، اتنی دیر سے میں آ کی بیٹھی ہوں اور تم شہزادیوں کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔'' وہ غور سے ان لڑکیوں کے لٹھے جیسے سفید چہرے دیکھنے لگیں۔ ''بول کیوں نہیں رہی ہو تم لوگ؟''

ان کا اتنا کہنا تھا کہ وہ تینوں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

''کیا ہوا ہے تم لوگوں کو، کہاں گئی تھیں کھیلنے؟'' زینت نے ان سے پوچھا، اسے شک ہوا کہ وہ ٹیلے کی طرف گئی ہوں گی اور کچھ ایسا ویسا دیکھ لیا ہوگا۔ ''کہیں ٹیلے کی طرف تو نہیں۔'' روحی کا ہلتا ہوا سر دیکھ کر وہ خاموش ہوگئی۔

''کئی بار منع کیا ہے تم لوگوں کو کہ اس طرف مت جایا کرو مگر تم لوگ کسی کی بات اپنے پلے باندھو تو تب نا!'' معراج نے غصے سے کہا، زرتاج اسی طرح چیختی چلاتی ماں سے لپٹ گئی۔

''بہنوں کو کیا وہیں چھوڑ آئی ہو؟'' معراج نے پوچھا تو زرتاج نے اثبات میں سر ہلایا۔

''چلو چل کر انہیں لے کر آتے ہیں۔'' اس نے چارپائی پر رکھی چادر اٹھا کر اوڑھی جو اس نے واپس آ کر اتار کر رکھی تھی، زرتاج سسکنے لگی۔

''وہ ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔''

''کون؟'' معراج کا دل کسی انجانے خدشے سے دھڑکا تھا۔

''جنہوں نے ماہ تاج کو۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''کس نے کہا ہے کچھ میری ماہ تاج کو اور نین تارا اور حسن آرا کہاں ہیں؟'' اس نے ان سے پھر پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس کا کہنا تھا کہ زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے گال پر لال نشان چھوڑتا گیا۔

''کس کو پتا ہوگا پھر؟'' کہتے ہوئے وہ باہر کو لپکی، زینت بھی اس کے ساتھ نکلی اور ساری لڑکیوں کو بھی ساتھ آنے کو کہا اور وہاں پہنچ کر اپنے جگر کے ٹکڑے کا حشر دیکھ کر معراج تو پاگل ہی ہوگئی، ایک کے ساتھ تو جو ہوا وہ ناقابلِ دید منظر تھا مگر جن دو کو ان بچیوں نے اپنی دانست میں چھپایا تھا وہ بھی وہاں نہ تھیں۔ شاید انہیں کتے یا جنگلی جانور وغیرہ کھا گئے تھے کچھ لوگوں کا یہی خیال تھا مگر کہیں خون کی بوند تک نہ تھی کہ اس بات کی تصدیق ہو سکتی۔

سینہ کوبی کرتی اور بین کر کر کے روتی ہوئی، قائم علی کی بیوی کو لوگوں نے یوں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ تو ان کی لڑکیوں کو بھی اچھی اچھی باتیں سکھاتی اور بہ آوازِ بلند رونے سے منع کرتی تھی مگر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس پر وہ جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔ کسی کو شہر بھجوا کر قائم علی کو شہر سے فوراً بلوا لیا گیا تھا، جس کے لیے اس الم ناک منظر کے ساتھ ساتھ سکتے کی حالت میں زرتاج اور صدمے کی وجہ سے موت کے منہ میں جاتی اس کی بیوی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شہر سے اس کے ساس اور سسر بھی آئے تھے۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر ان کا کلیجا کٹ رہا تھا۔

قائم علی نے ماہ تاج کی تکفین و تدفین کے انتظامات کی ذمے داری اپنے منشی کے حوالے کی اور خود فوراً مقدمہ درج کروانے کو دوڑا۔ کم از کم جن دو بچیوں کا کچھ پتا نہیں چل پا رہا تھا، ان کی کوئی خبر ملتی تو معراج موت کے منہ سے نکل آتی۔

☆☆☆

''یہ ٹھیک تو ہو جائے گی ڈاکٹر صاحب؟'' اس نے شاید دسویں بار یہ سوال کیا تھا۔

''اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے مگر کچھ وقت لگے گا...... مگر یہ گری کیسے؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''کم از کم ابھی یہ آٹھ گھنٹے یا اس سے کچھ زائد وقت سے بے ہوش ہے۔''

''میری بہن کی بیٹی ہے، وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے ہاتھوں سے ریل میں چھوٹ کر گر گئی تھی، یہاں تک پہنچتے اتنا وقت لگ گیا۔'' اس نے کہانی بنائی جو اس نے راستے میں سوچی تھی۔

''مجھے تو کچھ عجیب سا معاملہ لگ رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے کہا تو اس نے چند نوٹ نکال کر میز پر رکھے۔

''اسے بچا لیں ڈاکٹر صاحب، یہ میری بہن کی نشانی ہے!'' اس نے ڈاکٹر کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا، ڈاکٹر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر رقم اپنی جیب میں منتقل کی تھی، پیسے میں ہر دور میں بڑی طاقت رہی ہے۔

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں، نام کیا ہے بچی کا؟'' ڈاکٹر کا لہجہ فوراً بدل گیا تھا۔

''گڑیا۔'' وہ فوراً بولی۔

''گڑیا تو کوئی نام نہ ہوا؟'' ڈاکٹر لکھتے لکھتے رکا۔

''جی گڑیا تو ہم اس کو پیار سے کہتے ہیں۔ اس کا نام ستارہ ہے!'' جانے کیسے اس کے ذہن میں جلدی سے یہ نام آیا تھا۔ شاید اس کی اپنی بیٹی ہوتی تو اس کا نام بھی وہ ستارہ ہی رکھتی۔ اسے یہ نام ہمیشہ سے پسند تھا مگر پچھلے چند گھنٹوں میں واقعات اس طرح اچانک رونما ہوئے تھے کہ وہ دماغی طور پر پریشان تھی اور اس کے ذہن میں کئی گھنٹوں تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ اسے اس بچی کو کسی نام سے پکارنا ہے۔

☆☆☆

''یہ کون ہے اماں؟'' ولی نے حیرت سے ماں سے پوچھا تھا۔

''تیری بہن ہے اور کون ہوگی؟'' اس نے کہا۔

''یہ کہاں سے آئی ہے؟'' عجیب سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

''اسپتال سے اور کہاں سے بھلا؟'' اس نے اسے ساتھ لگا لیا۔

''کہاں سے ملی یہ لال لال گالوں اور نیلی آنکھوں والی؟'' پڑوسن نے اس سے پوچھا تو اس نے فوراً اسے ڈانٹ دیا کہ وہ بیٹے کے سامنے ایسی بات نہ کرے۔

''اس کا نام کیا ہے اماں؟'' ولی نے پھر سوال کیا۔ وہ ولی کی طرف دیکھ کر الجھ سی گئی، اسے تو راستے میں یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ ولی اس کا نام بھی پوچھ سکتا ہے۔ یہ تو اسے علم تھا کہ اسے مال لانا ہے اور ولی کو ہمیشہ کی طرح یہی بتانا ہے کہ وہ اس کی بہن تھی۔ اس سمیت اس کی سات بہنیں ہو گئی تھیں۔

''فیروزہ۔'' اپنی پڑوسن کے لال گالوں اور نیلی آنکھوں والی کہنے سے ہی اسے یہ نام سوجھا تھا۔

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ؟'' پڑوسن نے پھر تجسس سے پوچھا تو اس نے ولی کو باہر کھیلنے کے لیے بھیجا اور پڑوسن کو ایک نئی کہانی بیان کر دی۔

''پشاور میں کچھ بچیوں کی کھیپ آئی تھی، میرے علاوہ بھی اور لوگ تھے مگر سب بچیوں کی عمر دیکھ کر بدک گئے مگر میں تو اتنا لمبا سفر کر کے گئی تھی، یوں خالی ہاتھ کیسے نامراد لوٹ آتی۔ اس لیے اس معصوم کو سینے سے لگا کر لے آئی۔''

''اتنی لڑکیاں کیا کرو گی آپا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جب اپنی نہیں ہے تو پھر بڑھاپے کا کچھ سامان تو کرنا ہی ہوگا۔''

''اتنی ننھی سی جان کو پالو گی کیسے؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہم کون ہیں پالنے والے... پالنے والی ذات تو اس کی ہے اور پھر ہیں نا اس کی بڑی چھ بہنیں، دیکھنا سب مل کر اس کی کیسی تربیت کریں گی!'' اس نے پڑوسن کے دل پر گزرنے والی محرومی کی کیفیت سے بے خبر رہ کر کہا۔ ''یہ تو میرے پاس سب سے زیادہ اچھا مال ہوگا۔''

''شکل سے ہی پٹھانی لگتی ہے۔'' پڑوسن نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''اچھا اب زیادہ رالیں ٹپکانے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی اس بات کا زیادہ تذکرہ کرنے کی!'' اس نے اس کی طرف جھک کر کہا۔ ''دیکھ ہمیں ایک دوسرے کے کاروباری رازوں کا خیال تو رکھنا چاہیے نا!''

پڑوسن خاموش ہو گئی، وہ اس کی ممنون احسان تو تھی کہ اسے خود اتنا تجربہ نہ تھا اور وہ اپنے مال کی پہچان اور اپنی بچیوں کی تربیت کے سارے گر اس سے سیکھتی تھی۔

یوں حسن آرا، ستارہ اور نین تارہ فیروزہ بن کر نئی جگہ پر پہنچ چکی تھیں، ان دونوں کی زندگیوں کے نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پولیس، کھوجی اور نمبردار سب اپنی اپنی جگہ سرگرم تھے، جگہ جگہ منادی کرا دی گئی تھی مگر ان دونوں بچیوں کا کوئی سراغ نہیں ملنا تھا نہ ملا۔ انہیں یہی شک تھا کہ وہ بچیاں ارد گرد کے دیہات میں ہی کہیں ہوں گی، کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا کہ وہ وہاں سے سیکڑوں میل دور بھی جا سکتی تھیں۔

کوئی سراغ ان شہری بابوؤں کا بھی نہ ملا تھا کہ کون تھے، کہاں سے آئے اور کہاں چلے گئے۔ ان کے کھرے وغیرہ لوگوں کی آمد و رفت کے باعث ضائع ہو گئے تھے۔ ایسا گھناؤنا جرم کر کے جانے وہ زمین میں چلے گئے تھے یا انہیں آسمان نگل گیا تھا۔ قلعۂ روہتاس اس کے بالکل مخالف سمت میں تھا ورنہ پولیس والے یہ شک کرتے کہ اس روز وہاں پکنک پر آنے والے لوگوں میں سے کوئی بھول بھٹک کر ادھر آ نکلا ہوگا۔

اور وہ جو اپنے جرم پر شرمندہ بھی نہ تھے، واپسی کی راہ پر ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار مار کر ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔

''بات سن!'' افضال کو بتانے کی ضرورت نہیں۔'' سہیل نے اسے کہا تھا، وہ تو خود بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ بات ان دونوں کے درمیان راز ہی رہے ورنہ افضال تو سن کر خوب ہنستا کہ ان دونوں کے قابو صرف وہی آئی تھی۔ سات آٹھ سال کی بچی۔

واپس پہنچ کر انہوں نے گہری نیند میں سے افضال کو جگایا۔ ''کیا ہوا، مل گئیں تم لوگوں کو لڑکیاں؟'' افضال نے جمائی لی۔

''لڑکیاں کب تھیں... ہرنیاں تھیں۔'' سلیم نے کہا، اس نے ان کو تشبیہ تو بڑی ٹھیک دی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ کمزوری کی وجہ سے تم لوگوں کو لڑکیوں اور جانوروں میں کوئی فرق نظر نہیں آیا!'' اس



نے گھڑی میں وقت دیکھا۔"اب کیا ارادہ ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ واپس چلتے ہیں!" سہیل جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

"چلو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا، اب کی بار سہیل کی رفتار اتنی تیز تھی کہ افضال کو حیرت ہو رہی تھی، سلیم تو اس کی تیز رفتاری کا سبب جانتا تھا۔

"کیا بات ہے سہیل، تو کیوں اتنا تیز تیز بھاگ رہا ہے؟" افضال ہنسا۔ "کہیں کوئی مستی تو نہیں کر کے آیا کہ بھاگنے کی جلدی ہے۔" سہیل نے اس کے سوال کا جواب دینا تو کجا مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کہیں افضال اس کی چوری اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی وجہ سے نہ پکڑ لے۔

جلد ہی انہیں اپنی بس آتی نظر آئی جو کہ قلعۂ روہتاس کی سمت جا رہی تھی، وہ اس میں سوار ہوئے اور اپنے گروپ کے باقی لوگوں سے جا ملے جو کہ اس وقت واپسی کے لیے تیار تھے اور بس کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ انہیں بس میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا، ان کا گروپ کالج میں باقی سب سے الگ تھلگ ہی تھا۔ بس روانہ ہوئی تو سہیل سو گیا۔ سلیم کے اندر بے چینی سی بھری ہوئی تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنے گھناؤنے کام میں سہیل کے ساتھ شامل ہوا تھا۔

اس کے اپنے گھر میں چھوٹی بہنیں تھیں۔"کوئی ان کے ساتھ ایسا کرے تو۔" اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ "جانے وہ زندہ بھی ہوگی کہ نہیں۔" جو حشر انہوں نے کیا تھا، اس کے بعد... سلیم کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہنے لگے، جنہیں دوسروں کی نظر سے چھپانے کے لیے اس نے اپنا چہرہ کھڑکی سے ٹکا دیا اور ان آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔

بس میں باقی لوگ گا نے گا رہے تھے، لطف اندوز ہو رہے تھے، سہ پہر کے بعد شام کا وقت ہونے لگا تھا اور بس تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی جبکہ سلیم کا دل پیچھے ہی پیچھے کی طرف کھنچ رہا تھا۔

☆☆☆

"میرا اس میں کیا قصور ہے اماں؟" اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو اپنی اوڑھنی سے پونچھا۔

"سارا قصور تو میرا ہے میری بیٹی جو میں نے اس کو جنم دیا، اسے پاک باز سمجھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کی عادتیں اچھی نہیں اور میں سمجھتی تھی کہ حافظ کرم اللہ کا اور میرا بیٹا بدکردار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے تو بٹا لگا دیا ہے، اپنے باپ کے نام پر، میرے نام پر۔ میری تربیت پر۔" وہ اسے ساتھ لگا کر سسکیوں سے رونے لگیں، ان کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کو لے کر گاؤں سے کہیں بھاگ جاتیں۔ پنچایت کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتیں مگر ان کے گھر پر کڑا پہرہ تھا، کوئی راہِ فرار نہ تھی۔

"میں مر جاؤں اماں تو اس سے کہیں بہتر ہے۔" اس نے ان سے لپٹ کر کہا۔

"میں بے بس ہو گئی میری بیٹی مگر تو کبھی معاف نہ کرنا۔ مجھے بھی معاف نہ کرنا اور عباس کو بھی نہیں۔ ہم تمہارے مجرم ہیں۔ اس نے تمہاری زندگی... برباد کر دی۔ دنیا کی کوئی ماں اولاد کے لیے بددعا نہیں کرتی مگر میرے دل سے اب اس کے لیے بددعائیں ہی نکل رہی ہیں۔ اس نے کہیں کا نہیں چھوڑا، نہ تجھے، نہ مجھے۔ اللہ کرے وہ کہیں بھی سکون نہ پائے۔" ایک ماں کے جلتے ہوئے دل سے بددعائیں نکل رہی تھیں۔

اس ماں کی بدنصیبی پر کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کی ایک اولاد کی وجہ سے اس کی دوسری اولاد کے نصیب میں جو تاریکی لکھی گئی تھی اس نے ان کے پتھر جیسے کلیجے کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اتنا تو وہ بیوہ ہونے پر نہیں روئی تھیں جتنا وہ کلثوم کے لیے اس فیصلے پر روئی تھیں۔ ان کی معصوم اور نازک سی بیٹی کے لیے۔

''جا دیالو، تجھے اللہ کہیں سکون نہ دے، تو نے میری بیٹی پر ظلم کیا۔'' اسے بددعا دیتے دیتے وہ خاموش ہو گئیں، یک دم انہیں خیال آیا تھا کہ اگر وہ دیالو کو بددعائیں دے رہی ہیں تو دیالو بھی تو ان کے بیٹے کی وجہ سے انہیں بددعائیں دے رہا ہوگا۔ انہیں چپ لگ گئی تو کلثوم کو تشویش ہوئی، اس نے ماں کو دودھ گرم کر کے پینے کے لیے دیا۔

انہوں نے جانماز بچھائی اور اس پر کھڑی ہو گئیں، دودھ جوں کا توں رکھا تھا۔ کلثوم انہیں دیر تک مصلے پر کھڑا دیکھتی رہی، وہ مسلسل نوافل پڑھ رہی تھیں، انہوں نے خود اس سے کہا تھا کہ وہ انہیں کبھی معاف نہ کرے۔ تھی تو وہ کم عمر مگر اسے علم تھا کہ اس کی ماں کس عذاب سے گزر رہی تھی، اس کی نیک نامی کو ان کا اپنا بیٹا دھبا لگا گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو جانتی تھی، انہوں نے کبھی اس کو پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا، بے شک وہ اس پر سختی کرتی تھیں مگر اسے احساس تھا کہ وہ سختی بے جا نہ تھی۔

اگر وہ اس پر سختی نہ کرتیں تو وہ بھی دیا کی طرح ہو جاتی، دن کو ہی چوری چھپے کاجل آئی تھی اور اس کے گلے لگ کر ڈھیروں ڈھیر آنسو بہا ڈالے تھے۔ اماں اس تمام وقت میں خاموش بیٹھی رہی تھیں۔ کاجل نے بتایا تھا کہ دیا کی ماں کو بیٹی کے کرتوتوں کا علم تھا اور اس نے اپنی ماں کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے بات اس کے باپ تک پہنچائی تو وہ کنویں میں کود کر خودکشی کر لے گی۔

''کاش وہ کنویں میں کود جاتی!'' کلثوم نے کہا تھا۔ ''مجھے تو عمر بھر کے لیے یوں کسی اندھے کنویں میں گرنے کی سزا نہ ملتی۔''

''کیا مرجانا زندگی کے تمام مسائل کا حل ہوتا ہے؟'' کاجل نے پوچھا تھا۔

''ہمارے مذہب میں حرام نہ ہوتا اور مجھے اماں کا خیال نہ ہوتا تو یقین کرو کہ میں مرنے کو ایسی زندگی پر ترجیح دیتی!'' کلثوم نے کہا تو بی بی جی دہل گئیں، کاش وہ اپنی بیٹی کو اس ظالم دنیا سے دور لے جاتیں، وہ تو اسے صبر کی تلقین بھی نہیں کر سکتی تھیں، اس بات پر انہیں ہی صبر نہیں آ رہا تھا۔

''کلثوم تمہیں معلوم ہے کہ شیکھر کیا کہتا ہے؟'' کاجل نے کہا تھا۔

''مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کہتا ہے!'' اس نے سادگی سے کہا تھا۔

''وہ دیا کا بھائی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرے اور دیا دونوں کے عباس سے ناجائز تعلقات تھے۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک کہتا ہو۔'' اس نے خلا میں کچھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو تمہیں بھی اس بات پر شک ہے کلثوم؟'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''مجھے کیا معلوم؟'' کلثوم کے انداز میں بے اعتنائی تھی۔

''مجھے تم پر تو یقین تھا کلثوم۔ تم بھی میرے سارے گھر والوں کی طرح مجھے مجرم سمجھتی ہو۔''

''ہاں! ہو تم مجرم۔ اگر تم مجھے بتا دیتیں اس روز جس دن میں نے تم سے پہلے دن پوچھا تھا تو میں لالے کو

روک لیتی، اسے بتاتی کہ ایسا کرنا کتنی زندگیاں برباد کر سکتا ہے!'' کلثوم نے اس کی طرف نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ ''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی کاجل، نہ دیا کو...... مر کر بھی نہیں۔ تم دونوں نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے!'' وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''اس میں سب سے زیادہ قصور تمہارے لالے کا ہے۔'' کاجل نے غصے سے کہا تھا۔

''میں لالے کو بھی کبھی معاف نہیں کروں گی!'' اس کے لہجے میں عزم تھا۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا کلثوم، میں ہمیشہ دیا کی وجہ سے مجبور رہی، اس نے مجھے بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس نے جو کالک ہمارے خاندان کے منہ پر ملی ہے اس کی وجہ سے ہم اس گاؤں میں رہنے کے قابل بھی نہیں رہے، اسی لیے ہم یہ گاؤں چھوڑ کر ہندوستان جا رہے ہیں۔'' کاجل نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

''جہاں چاہے تم لوگ جاؤ مگر تم ہمیشہ میری بددعاؤں کے حصار میں رہو گے، تمہیں ہندوستان جا کر بھی سکون نہ آئے گا، میرے دل سے تمہارے لیے ہمیشہ بددعا نکلے گی۔'' اس کی آنکھیں رو رو کر لال بوٹی جیسی ہو رہی تھیں۔

''جاتے جاتے ایک بار گلے تو مل لو سکھی!'' اس نے اپنے بازو وا کیے، کلثوم نے بے نیازی سے منہ موڑ لیا۔

''اسے کہیں بی بی جی ایک بار مجھے گلے لگا لے، یقین کریں بی بی جی، میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں دونوں کو سمجھاتی تھی مگر ان دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، اپنے گھر سے بھاگنے کے پروگرام کا اس نے مجھے بالکل نہیں بتایا تھا، ورنہ میں شور مچا دیتی۔''

''اتنا عرصہ تمہارے سامنے وہ عشق محبت کا کھیل کھیلتے رہے، تم سب کچھ جانتی تھیں مگر تم نے کسی کو بتانا گوارا نہیں کیا، اب تم خود کو بے قصور کہہ رہی ہو۔ سارا قصور تمہارا ہے لڑکی، اسی لیے میں تمہیں کبھی اپنے گھر میں نہیں گھسنے دیتی تھی اور وہ جو کتنی معصوم صورت لگتی تھی وہ اندر ہی اندر سے میری جڑیں کاٹ رہی تھی!'' بی بی جی اس وقت سے پہلی بار بولی تھیں۔ ان سے معافی ملنے سے ناامید ہو کر کاجل وہاں سے روتی ہوئی گئی تھی۔

ماں کی طرف دیکھتے دیکھتے جانے کون سے پہر اس کی آنکھ لگ گئی، خواب میں بھی اسے گھوٹو کا بھوت ڈراتا رہا تھا، اس کے ساتھ یہ کیا ہونے جا رہا تھا اسے یاد تھا کہ کبھی دیا کے گھر جانا ہوتا تو اسے دیکھ کر وہ ساری سہیلیاں خوف کھاتی تھیں۔ وہ تھا بھی اتنا ہی خوف ناک، جانے کتنے کتنے دن وہ نہاتا ہی نہیں تھا، اس کے کافی دور سے گزرنے سے بھی ناگواری بُو آتی تھی۔ وہ ایک کم عمر... کچی عمر کی لڑکی تھی، جس کے خوابوں میں ابھی تک لہریے دار دوپٹے آتے تھے، قوسِ قزح کے رنگ، ساون کی بارشیں اور جھولے ...اور اس کو کیسی بھیانک حقیقت کا سامنا ہونے والا تھا۔

فجر کی اذان کی آواز کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تو اس کی نظر اماں پر پڑی جو کہ سجدہ کر رہی تھیں، اس کی آنکھیں پھر مند گئیں۔ اسے معلوم تھا کہ سلام پھیر کر اماں اسے جگا لیں گی، ہر روز کا یہی معمول تھا، وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور پھر گہری نیند میں چلی گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھی، اماں وہیں جانماز

پر ہی کروٹ کے بل سو رہی تھیں، اس نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا، اسے معلوم تھا کہ وہ رات بھر مصلے پر رہی ہیں۔

وہ کسمسلندی سے اٹھی، اپنا بستر تہہ کیا اور چارپائی وہیں رہنے دی تا کہ آواز پیدا نہ ہو اور اماں نہ جاگ جائیں۔ گھڑے سے پانی لے کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور بغیر آواز پیدا کیے لکڑیوں کا چولھا جلا کر اس پر چائے رکھی تا کہ چائے تیار ہو تو وہ اماں کو بھی جگا لے۔ چائے کا پانی جب تک ابلتا، اس نے اندر والے دونوں کمروں میں جھاڑو لگا لی، صحن اور برآمدے میں جھاڑو لگانے کے لیے اسے اماں کا انتظار کرنا تھا۔

دوبارہ ہاتھ دھو کر اس نے چائے دو مگوں میں ڈالی اور اندر کمرے سے پاپے بھی نکال کر لے آئی۔ چائے والے پانی میں ہی اس نے پہلے دو دیسی انڈے بھی ابالے تھے، اسے معلوم تھا کہ اماں کو صبح کی چائے کے ساتھ انڈے بہت پسند تھے لیکن انہوں نے اپنی پسند کو ہمیشہ عباس کی پسند کے سامنے بھلائے رکھا، وہ ہمیشہ انڈے عباس کے ناشتے کے لیے بچا کر رکھتی تھیں۔ عباس کا خیال آتے ہی اس کے حلق میں پھر تلخی سی گھل گئی تھی، اس کا ماں جایا تھا لیکن کتنی بددعائیں اس نے ماں کی بھی لی تھیں، جانے کہاں اور کس حال میں ہوگا؟

اماں نے اسے رات کو کہا تھا کہ وہ انہیں کبھی معاف نہ کرے نہ ان کو اور نہ عباس کو مگر اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی ماں رات بھر اسی کی خاطر مصلے پر کھڑی رہی تھی، اسی کے لیے حرفِ دعا بنی، اسی کی خوشیوں کی التجائیں اللہ کے حضور کرتے ہوئے۔ وہ انہیں کس جرم کی سزا میں معاف نہ کرتی، اس کا دل تو اتنا بڑا تھا کہ کاجل کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس بات پر روتی رہی تھی کہ کاجل کے معافی مانگنے پر اس نے سنگ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ واقعی سارا قصور تو لالے اور دیا کا تھا، کاجل کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنی سہیلی کے جرم کی رازدار تھی اور اس کی دی ہوئی قسم کی پابند۔

''اماں تو میری جان ہیں، انہیں میں نے پریشان نہیں کرنا، جو بھی میرے ساتھ ہوگا وہ میرا نصیب ہوگا، جب میں نے کچھ غلط نہیں کیا تو میرا اللہ میرے ساتھ کچھ غلط کیوں کرے گا! ہاں میں لالے کو تب تک معاف نہیں کر سکتی، جب تک کہ وہ واپس نہ لوٹ کر آئے اور اماں سے ناک رگڑ کر معافی نہ مانگے گا، اس کا قصور تو ایسا ہے کہ اماں بھی اسے کبھی معاف نہ کریں لیکن اگر اماں نے معاف کر دیا تو میں بھی اسے معاف کر دوں گی۔''

انہی سوچوں میں غلطاں وہ انڈے چھیل کر پلیٹ میں رکھ کر برآمدے کی طرف چلی ہی تھی کہ ان کے گھر کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا، وہ بھاگی تا کہ فوراً دروازہ کھولے، اماں کی نیند خراب نہ ہو، یوں تو وہ انہیں جگانے ہی والی تھی۔

ایسے ہی ان کا دروازہ اس روز دھڑ دھڑایا گیا تھا، جس روز دیا اور عباس۔ اس نے آنکھوں میں امڈ کر آنے والے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا، دروازہ کھولا۔ عائشہ تھی۔

''کیا بات ہے عائشہ، سب ٹھیک تو ہے نا؟'' اس کا دل کانپ رہا تھا۔

''نہیں، سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' عائشہ نے اس سے کہا، اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' کلثوم نے پوچھا تھا۔

''کاجل نے۔'' وہ رکی۔

''کیا، کیا کاجل نے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''اس نے رات کو کنویں میں چھلانگ لگا دی!'' عائشہ نے جملہ مکمل کیا۔

''کیوں؟'' کلثوم کی حیرت بھری آواز آئی۔

''پتا نہیں کلثوم...... سب سہیلیاں وہیں ہیں، اس کی لاش کنویں سے نکالی جا رہی ہے، مجھے سب نے کہا کہ جا کر تمہیں بتا کر بلا لاؤں!''

''لاش؟'' کلثوم کی آواز لرزنے لگی۔ ''تو کیا مر گئی وہ؟''

''تو اور کیا...... تمہیں بتا رہی ہوں کہ اس نے رات کو کنویں میں کود کر۔'' عائشہ نے کہا۔

''اچھا میں اماں سے پوچھ کر آتی ہوں، تم یہیں رکو۔'' کلثوم نے اس کی بات کاٹی اور واپس مڑی۔

اسی طرح کروٹ پر پڑی اماں کو ہلایا۔ ''اماں!'' انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس نے پھر انہیں ہلایا۔ ''اماں!'' مگر کوئی جواب نہ پا کر وہ گھبرا گئی۔ ''اماں۔'' وہ زور سے چیخی تھی۔ اتنی زور سے کہ باہر سے عائشہ بھی بھاگ کر اندر آئی، ان دونوں نے مل کر ان کو ہلایا جلایا، ان کا جسم ٹھنڈا تھا۔

''بی بی جی کا جسم ٹھنڈا ہے کلثوم... مجھے لگتا ہے کہ انہیں کچھ ہو گیا ہے۔'' عائشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیا مطلب، کیا ہو گیا ہے انہیں؟'' اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے کہ یہ سانس بھی نہیں لے رہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم عائشہ۔ کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ اماں اب نہیں رہیں۔ وہ چلی گئی ہیں مجھے چھوڑ کر۔ مجھے اس بے رحم دنیا میں کس کے آسرے پر چھوڑ کر چلی گئی ہیں وہ؟'' وہ چیخ رہی تھی۔

''تم روؤ نہیں، یہیں رکو، میں بلا کر لاتی ہوں سب کو۔'' عائشہ کہہ کر باہر کو بھاگی اور اپنی بے بس اماں کا یخ ہاتھ تھامے، اسے اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس ہاتھ میں اب اس کے لیے شفقت نہیں رہی تھی، زندگی کی حرارت نہیں رہی تھی، وہ ان کے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگی جو جانے کب سے ٹھنڈا ہو کر اسی طرح سجدے کی حالت میں ہی اکڑ گیا تھا۔

''اماں! کس کے آسرے پر چھوڑ گئی ہو اپنی بیٹی کو۔ مجھے تو اپنی ساری مشکلات میں آپ کی دعاؤں کا ہی آسرا نظر آتا تھا، اب میں کس سے اپنے دکھ کہوں گی۔ اماں میں لالے کو کہاں سے بلاؤں یہ بتانے کے لیے کہ اب اس کی دعائیں کرنے والی ماں نہیں رہی، میری اماں!'' وہ چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور جب تک لوگ پہنچتے وہ صدمے سے نڈھال ہو کر تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی۔



باقی آئندہ



ایک لمحہ بھیگا بھیگا سا

گیتی آرا

تھک ہار کر انہوں نے مشکل ترین مرحلہ اپنے بیٹے کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ ان تینوں میں سے جس لڑکی کا انتخاب کرے گا اس کا ہاتھ اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھما دیں گی لیکن یہ بات طے تھی کہ وہ اچھے بھلے خاندان کی لڑکیاں چھوڑ کر خاندان سے باہر در بدر کی خاک نہیں چھانتی پھریں گی۔ بیگم عطیہ رحمان کی تو دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے طور پر اپنے اکلوتے بیٹے فواد کے لیے اپنی بہن نجمہ کی اکلوتی بیٹی اور اپنی

چہیتی بھانجی سحر کو اپنی بہو بنا کر لائیں۔

نجمہ بیگم کے بیوہ ہوتے ہی وہ اپنی اکلوتی بہن نجمہ اور اپنی لاڈلی بھانجی کو اپنے گھر لے آئی تھیں لیکن نجمہ بیگم کی خوددار طبیعت نے کسی طور یہ بات گوارا نہ کی کہ وہ ساری عمر بہن بہنوئی پر بوجھ بن کر زندگی گزاریں۔ بیوگی کے چند سالوں بعد ہی انہوں نے ایک مقامی اسکول میں جاب کرلی تھی اور اسی جاب سے وہ اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال رہی تھیں اور بہن بہنوئی کے گھر کے دو کمروں کا کرایہ دے رہی تھیں جہاں وہ اور ان کی بیٹی مقیم تھے۔

سحر بھی آس پاس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی تعلیم کا بار خود اٹھانے میں ماں کی مدد کررہی تھی اور نجمہ بیگم کے لیے تو بڑی خوش نصیبی کی بات تھی کہ فواد جیسا خوبرو، پڑھا لکھا، دولت مند انسان ان کی بیٹی سے منسوب ہوجائے۔

سحر معمولی شکل صورت کی ایک سانولی سلونی لڑکی سہی لیکن اس کی تعلیمی قابلیت، ذہانت، تہذیب، آداب، رکھ رکھاؤ اور پھر لمبا قد، چھریرا بدن، بڑی بڑی شرابی آنکھیں، دلکشی و رعنائی اور پھر اوپر سے اپنی مشرقی تہذیب کی پاسداری لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیتی تھی وہ مشرقی تہذیب وحسن کی ایک جیتی جاگتی منہ بولتی تصویر تھی لیکن فواد...... فواد کو تو جیسے سحر کے نام سے ہی چڑ تھی، کبھی کبھی تو اسے ماں کی باتوں سے یوں لگتا جیسے امی نے اسے سحر سے شادی کے لیے نہیں بلکہ کسی کنویں میں چھلانگ لگانے کا حکم دے دیا ہو۔

''امی آپ بھی کمال کرتی ہیں! ساری مائیں تو اپنے بیٹے کے لیے چاند سی دلہن لانے کے خواب دیکھتی ہیں اور ایک آپ ہیں کہ ایک معمولی شکل صورت والی، بیک ورڈ لڑکی کو میری دلہن بنانے کا سوچ رہی ہیں۔'' اس نے غصے سے تیوریاں چڑھا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''اماں شہر میں کیا خوب صورت لڑکیوں کا قحط پڑ گیا ہے جو آپ ایک معمولی صورت والی لڑکی کو میرے پلے باندھنے پر تلی ہوئی ہیں۔'' فواد کو تو بلاوجہ کا سحر سے بیر تھا۔

''بے شک وہ آپ کے لیے ہزاروں خوبیوں کی مالک ہوگی، بے شک آپ اس پر دل وجان سے صدقے واری ہوتی رہیں لیکن خدا کے لیے میری جان چھوڑ دیں۔ مجھ پر رحم کریں۔'' وہ عاجزی کے ساتھ اماں کے آگے ہاتھ جوڑنے لگتا۔

''ہاں میرے لیے تو وہ ہیرا لڑکی ہے! مجھے تو وہ پسند ہے اور رہے گی! چاہے تو کچھ بھی کہتا رہے۔'' بیگم ریحان بھی غصے میں تنک کر بولیں۔

''اچھا! تو پھر آپ ہی ہوتی رہیں اس منہ بڑی پر صدقے واری...... میں تو اب اس پر جان چھڑکنے سے رہا۔'' وہ طنزیہ مسکراہٹ ماں کی طرف اچھالتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔

سحر اسے پتا نہیں کیوں شروع سے ہی ناپسند تھی۔ سانولی رنگت والی سر پھری لڑکی پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھی، قلوپطرہ یا مس ورلڈ...... مزاج تھا کہ جناب کا آسمان سے باتیں کررہا تھا۔ مجال ہے جو اس نک چڑھی لڑکی نے کبھی غلطی سے بھی اس سے ہنس کر بات کی ہو یا اسے کوئی ایس ایم ایس کیا ہو یا فیس بک اور چیٹنگ پر اس سے بات کرنے کی کوشش کی ہو اور ایک راحیلہ، نبیلہ اور روحی تھیں۔ اپنے حسن میں یکتا اور منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہونے کے باوجود ان میں ذرا سی اکڑ تھی نہ غرور۔ وہ ہمیشہ رنگ برنگی تتلیوں کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتی رہتیں۔ گھنٹوں موبائل پر اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ نکالتیں اور جہاں وہ اداس ہوا یا اس کی طبیعت کی ناسازی کی اطلاع پہنچی، بس جھٹ وہ سارا دن پُرمزاح شعر اور لطیفے اسے ایس ایم ایس کر کرکے، اس کا دل بہلاتیں۔

انٹرنیٹ اور چیٹنگ پر اس سے گھنٹوں باتیں ہوتیں، آئے دن گھر پر صرف اسے خوش کرنے کے لیے پارٹیاں رکھی جاتیں، دعوتوں کا اہتمام ہوتا اور اس دوران مائیں اپنی بیٹیوں کی تعریفوں کے پل باندھتے نہ تھکتیں۔ لڑکیاں اس کی ایک مسکراہٹ اور ادا پر یوں اتراتی پھرتیں جیسے انہوں نے کوئی بڑا معرکہ سر کرلیا ہو۔ اور...... اور ایک وہ تھی معمولی شکل صورت والی لڑکی سحر، جو اس کی ڈیسنٹ پرسنیلٹی سے بے نیاز، لاتعلق سی نظر آتی جیسے کہ اس کی نظر میں اس کی خوب صورت شخصیت کی کوئی اہمیت، کوئی وقعت نہ ہو۔ اس کی مردانہ وجاہت، دولت، تعلیم اسٹیٹس اس کی کسی بات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہو، اگر یہی رویہ اس کے ساتھ روحی، نبیلہ اور راحیلہ کرتیں تو شاید وہ نظر انداز بھی کردیتا، یہ سوچ کر کہ تعلیم، حسن، مال و دولت نے انہیں ایسا بنا دیا ہے لیکن وہ ...... وہ لڑکی جس کے پاس شکل تھی نہ صورت، مال تھا نہ دولت اس کے پاس تھا ہی کیا سوائے تعلیم کے پھر بھی نہ جانے کیوں اسے کس

بات کا اتنا گھمنڈ تھا، اتنی اکڑ تھی کہ وہ اس سے بات کرنا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی، اس کے ساتھ دو گھڑی بیٹھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ شروع میں تو وہ اس کی اس خاموشی کو اور لیے دیے رہنے کی فطرت کو اس کا روایتی شرمیلا پن سمجھتا تھا اس کی غربت اور غریبی کا کومپلیکس گردانتا رہا اور یہی سمجھتا رہا کہ شاید ہر مڈل کلاس اور دولت مند گھرانے کی لڑکی کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی ایک موبائل فون اور اگر انٹرنیٹ کی سہولت ہوتی تو شاید وہ بھی اس سے دوستی اور بات بڑھانے کو ان چیزوں کا سہارا لے کر اسی حیلے بہانے سے اس کے قریب آنے کی کوشش کرتی لیکن جب اس کے انٹر فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد نجمہ بیگم نے اسے موبائل اور کمپیوٹر، انٹرنیٹ کے ساتھ گفٹ کیا...... اور اب پورے دو سال ہونے کو تھا اس بات کو مگر مجال ہے جو غلطی سے بھی اس لڑکی نے اس کا حال احوال پوچھنے کو ہی فون اور موبائل کیا ہو یا انٹرنیٹ پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ پتا نہیں وہ معمولی سی لڑکی اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھی۔

سحر کا یہ رویّہ اس کے لیے اب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے اس رویے سے اسے اپنی توہین کا احساس ہوتا تھا، اس کے پاس تھا ہی کیا ایک سانولا چہرہ جو اپنے نکھار کے لیے مخصوص رنگوں اور فیشن کا محتاج ہے اور جہاں ان مخصوص رنگوں سے بغاوت کی وہاں یہ سانولا رنگ اور زیادہ سانولا دکھائی دینے لگے اور اپنے اس سانولے حسن پر وہ یوں اتراتی پھرتی جیسے کہ ملکۂ حسن کا ایوارڈ ہی تو جیت کر آئی ہو فواد نے ایک طنزیہ مسکراہٹ فضا میں بکھیرتے ہوئے سوچا۔

مجال ہے جو اس اکڑ خوں لڑکی نے اسے کبھی ستائش بھری اور تعریفی نظروں سے .... کبھی دیکھا ہو۔ وہ تو بس ضرورت کے تحت مخاطب کر کے بھی یوں لگتا تھا جیسے وہ اس پر بہت بڑا احسان کر رہی ہو۔

”فواد بھائی' خالہ آپ کو بلا رہی ہیں۔“

”فواد بھائی' خالہ نے یہ بل دیا ہے جمع کرانے کو۔“

”فواد بھائی' خالہ کی دوا ختم ہو گئی ہے آفس سے واپسی پر لیتے آیئے گا۔“ وغیرہ وغیرہ...... وہ خود بھی کبھی کبھی اپنے کسی کام کی غرض سے اس کے پاس چلا جاتا۔

”سحر جلدی سے میرے کپڑے تو استری کر دو، مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔“ یا گھر میں کسی کو نہ پا کر وہ سیدھا اس کے کمرے میں چلا جاتا۔

”سب لوگ پتا نہیں کہاں مر گئے ہیں! سحر تم ہی ذرا میری قمیص کے بٹن لگا دو، مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔“ اور وہ بنا کسی خوشی و غم کا تاثر دیے بنا کسی ناگواری کا اظہار کیے اپنے سپاٹ سے چہرے کے ساتھ اس کا کام کر دیتی حالانکہ یہی کام اگر وہ راحیلہ، نبیلہ اور روحی کو کہہ دیتا تو وہ اپنی اس خوش نصیبی پر خوشی سے اچھلتی کودتی اس کے ایک کام کے بجائے سو کام کر ڈالتیں۔

سحر کے لیے فواد کے سخت رویے اور ذلت آمیز گفتگو نے بیگم ریحان کو فواد کی طرف سے بالکل مایوس سا کر کے رکھ دیا تھا یوں تو راحیلہ، نبیلہ' روحی تینوں اس کی بہت اچھی کزن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی دوست بھی تھیں لیکن فواد نے کبھی انہیں اس نظر سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی شادی کے سلسلے میں کبھی ان کے بارے میں غور کیا تھا لیکن اب وہ

اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

روحی بڑے چچا کی اکلوتی اولاد تھی، ان کی کروڑوں کی جائداد کی تنہا وارث، سرخ و سفید رنگت، نکلتا ہوا لمبا قد، چھریرا بدن، کھڑے نقش کی ایک ملنسار اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ حاضر جواب اور اسمارٹنس میں کوئی اسے مات نہیں دے سکتا تھا لیکن ایک بات روحی کی جو اسے سخت ناگوار اور گراں گزرتی تھی وہ اس کی دل پھینک طبیعت تھی، جہاں کہیں خوبرو نوجوان نظر آیا فوراً کسی حیلے بہانے سے اس کے گرد منڈلانے لگتی۔

راحیلہ، نبیلہ، چھوٹے چچا کی دونوں جڑواں بیٹیاں، دونوں بہنیں خوب صورتی میں یکتا و یکساں تعلیم یافتہ، فیشن ایبل ہونے کے ساتھ ساتھ سگھڑ اور بے حد پرخلوص اور محبت کرنے والی تھیں بس ان میں فرق تھا تو یہ کہ ایک بہن نبیلہ بے حد کم گو تھی اور دوسری بے حد باتونی اور اس کے برعکس بہت شوخ و چنچل اور شریر قسم کی تھی۔ اسے تو وہ دونوں بہنیں اپنے اپنے مزاج اور خول میں اپنی اپنی منفرد شخصیت کے حصار میں بہت بھلی بھلی سی بہت اچھی لگتی تھیں۔ گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد بھی اسے یہ فیصلہ ان دونوں بہنوں کے حق میں سے کسی ایک کے بارے میں کرنا، کسی ایک کے حق میں دینا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ یونہی سوچوں کے بھنور میں پھنسے پھنسے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

آکاش پر تیزی سے پھیلتے سیاہ بادلوں کا جال بس لمحے دو لمحے میں برسنے والی آمد برسات کی اطلاع دے رہا تھا۔ موسم اچانک ہی حسین ہو گیا تھا آج وہ طبیعت کی کچھ ناسازی کے باعث آفس نہیں جا سکا تھا۔ گھر پر آج صبح سے ایک ہو کا عالم تھا، درو دیوار پر چھائی خاموشی چیخ چیخ کر گھر کے مکینوں کی غیر موجودگی کی اطلاع دے رہی تھی پورے گھر پر مکمل ویرانی کا راج تھا۔ راحیلہ' نبیلہ اور روحی اپنی خالہ زاد بہن کی شادی میں شرکت کے لیے دو دن کے لیے خالہ کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ نجمہ خالہ اور اماں پڑوس میں درس میں شرکت کے لیے نکلی ہوئی تھیں۔ ریحان صاحب صبح سے اپنی بزنس میٹنگ میں شرکت کے لیے آفس گئے ہوئے تھے اور سحر اب تک کالج سے واپس نہیں لوٹی تھی...... خیر اس کا ہونا نہ ہونا فواد کے لیے برابر تھا۔ ہاں البتہ طبیعت کی خرابی اور حسین

موسم کے تقاضے کے مطابق اس وقت روحی، نبیلہ اور راحیلہ کی کمی اسے شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ وہ تینوں یا ان میں سے کوئی بھی اس وقت گھر پر ہوتی تو اس کی طبیعت کی ناسازی کا سن کر کوئی اس کا دکھتا سر دبا رہی ہوتی، کوئی اس کے لیے گرما گرم چکن سوپ بنا رہی ہوتی اور یا پھر اسے بھاگ بھاگ کر دوائی پلا رہی ہوتی اور وہ اس حسین موسم میں برسات کا مزہ دوبالا کرنے اور لطف لینے کے لیے ان سے گرم گرم پکوڑے، کھجوریں، خستہ نمک پارے وغیرہ گرم گرم چائے کے ساتھ لے کر اس بھیگی بھیگی برسات سے لطف اندوز ہورہا ہوتا۔

"ان کم بختوں کو بھی آج ہی جانا تھا، اتنے اچھے موسم کا ستیاناس مار کے رکھ دیا....." وہ جھنجلا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس وحشت ناک سناٹے سے بچنے کے لیے فیض احمد فیض کی دستِ صبا نکال کر اس حسین موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے ڈرائنگ روم کی دہلیز پر کرسی ڈال کر خود کو مطالعے میں محو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب ہی کالی گھٹا کے ساتھ بجلی کی زور دار گرج چمک کے بعد موسلادھار بارش نے موسم کو اور حسین بنا دیا۔ برسات کے موٹے موٹے چھینٹوں کے ساتھ ساتھ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کو وہ اپنے اندر آنکھیں بند کیے جذب کرتا ہی چلا گیا کہ تب ہی صدر دروازے پر کسی کی کنڈی کھول کر اندر داخل ہونے کی آہٹ نے اس کے اداس چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیے۔

کتنی شدت سے وہ اس وقت راحیلہ، نبیلہ اور روحی کی کمی محسوس کررہا تھا۔ اس حسین موسم سے لطف اندوز ہونے کو ان کی موجودگی یہاں کتنی ضروری تھی یہ تو وہی جانتا تھا کہ تب ہی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو یکدم ہی اس کے پُرمسرت چہرے پر ناگواری کے تاثرات اپنے نشان بنانے لگے۔ سامنے ہی سحر سر سے پیر تک بارش میں شرابور، اپنے سفید کالج یونیفارم کے ساتھ سر سے پیر تک کالی ململ کی چادر میں لپٹی تیز تیز قدم اٹھاتی، اس کی طرف ہی بڑھ رہی تھی اور وہ جو تھوڑی دیر پہلے برسات سے پوری طرح لطف اندوز ہونے میں مگن تھا سحر پر نگاہ پڑتے ہی ایک ناگواری کے تاثر کے ساتھ پھر سے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ وہ بڑے تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف ہی چلی آرہی تھی کیونکہ اندر جانے کا راستہ ڈرائنگ روم کی دہلیز کو پار کرکے ہی اندر جاتا تھا۔

فواد نے ایک ناگوار سی نگاہ سحر پر ڈالی اور پھر ایک ناگواری کے تاثر کے ساتھ مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ یہ سوچے سمجھے بنا کے وہ کسی کے اندر جانے کی ساری راہیں مسدود کرکے بیٹھا ہے۔

"فواد بھائی راستہ دیجیے۔" سحر نے بڑی نرمی اور شائستگی سے اسے مخاطب کیا۔

"فواد بھائی پلیز راستہ دیجیے۔" اپنی بات کا کوئی جواب نہ پاکر وہ پھر آہستگی سے بولی تو فواد نے نگاہ اٹھا کر ایک حقارت کی نگاہ اس پر ڈالی اور کچھ کہے بنا دہلیز پر پھیلے اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ ہلکی سی پیروں کو جنبش دے ڈالی۔

"فواد بھائی پلیز راستہ دیجیے...... مجھے اندر جانا ہے۔" اب سحر کی آواز میں ریکویسٹ کے بجائے غصے اور ڈانٹ کا عنصر شامل تھا۔

"جاؤ! میں نے کوئی روکا ہے تم کو....." وہ سحر کی آواز پر غصے سے آگ بگولہ ہوتا ہوا دہاڑا، تو وہ تو غصے اور حیرت سے بس اسے دیکھتی رہ گئی، اس لمبے چوڑے شخص کو جو اپنے پورے دیوہیکل وجود کے ساتھ اس کے اندر جانے کا راستے روکے بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا کہ میں نے کوئی روکا ہے۔

تب ہی سحر نے اس بدمزاج، بدتمیز انسان سے کچھ کہنا بیکار سمجھتے ہوئے اس نے جو احسان کرکے انگل بھر جگہ اور راستہ دیا تھا اس سے ہی گزر کر کسی طرح اندر جانا مناسب جانا اور دروازے کی دہلیز کو پار کرنا چاہا اور بری طرح اس کے پیروں میں الجھ کر اس کی بانہوں میں ڈھیر ہوگئی۔ کالی ململ کی چادر میں لپٹا اس کا سڈول نازک سا بھیگا وجود، اپنی بانہوں میں کسمساتا ایک لمحے کو فواد کو مدہوش کیے دے رہا تھا تب وہ بجلی کی طرح خود کو سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تڑاخ، تڑاخ تڑاخ لگاتار دو تین زوردار طمانچے فواد کے رخسار کو چھوتے گزر گئے۔

"کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟" وہ اپنی کالی چادر کو اپنے نازک بدن پر پوری طرح لپیٹتی غصے سے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ برسات میں بھیگا اس کا معصوم سا وجود اور بڑے بڑے خوابیدہ نینوں سے ٹپ ٹپ برستی دکھوں کی برسات جیسے فواد کے مکروہ وجود سے حقارت اور نفرت کا اظہار کررہی تھیں۔ وہ غصے اور حقارت سے تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چل دی اور وہ مٹی کا بت بنا اپنے چہرے پر پڑے انگلیوں کے نشان سہلاتا رہا۔ یہ جانے بنا کہ اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟ صرف اس لیے کہ وہ اس کا راستہ روکے بیٹھا تھا یا...... یا اس کا خیال تھا کہ اس نے اس خردماغ لڑکی کو اپنی جھولی میں گرانے کے یہ حرکت کی۔

"دھت تیری کی...... توبہ استغفار ایسی گھٹیا سوچ میرے بارے میں......" فواد نے دکھ سے سوچا اور خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

☆☆☆

"دیکھو فواد، میں کہے دے رہی ہوں کہ آج میں تمہارا فیصلہ سن کر ہی جاؤں گی آخر تم نے راحیلہ، نبیلہ اور روحی میں سے کس کا انتخاب اپنے لیے کیا ہے؟ دیکھو فواد! اب اس سلسلے میں، میں تمہارا کوئی عذر، بہانہ نہیں سنوں گی، بہت چھوٹ دے دی میں نے تمہیں...... آج تو تمہیں اپنا فیصلہ بتانا ہی پڑے گا۔"

صبح صبح اس کے آفس جانے سے پہلے بیگم ریحان آکر اس پر برس پڑیں تو وہ شرارت سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

"اماں، روحی، نبیلہ اور راحیلہ میں سے کسی کو پسند کرلوں اور آپ اپنی لاڈلی بھانجی کو بھول گئیں۔" وہ بیگم ریحان کو حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن چھوڑ کر سیٹی پر کوئی شوخ دُھن کا گیت گنگناتا کمرے سے نکل گیا۔

اب وہ ماں کو کیا بتاتا کہ اسے تو برسوں سے اسی گوہرِ نایاب کی تلاش تھی۔ حیا اور مشرقیت کا پیکر...... جس نے موبائل اور کمپیوٹر کے دور میں آنکھ کھولنے اور جنم لینے کے باوجود خود کو بھٹکنے اور زمانے کی بے راہ روی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اپنی مذہبی اور قومی اقدار کو مٹنے نہیں دیا، اسے اسی گوہرِ نایاب کی تو برسوں سے تلاش تھی، جس کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا وہ اب تک کنوارا بیٹھا تھا اور آج اس نے وہ گوہرِ مقصود پالیا تھا۔

قابلِ دید

ایک فقیر ایک کنجوس امیر کے پاس گیا اور اسے اپنی دردبھری کہانی سنانا شروع کی۔ اس کا لہجہ ایسا تھا کہ امیر آدمی کے آنسو نکل آئے۔ اس نے اپنے نوکر کو آواز دی تو فقیر سمجھا شاید اب کچھ ملے گا لیکن نوکر آیا تو امیر آدمی نے اس سے کہا۔ "اس کم بخت کو دھکے دے کر نکال دو، اس نے رُلا رُلا کر میرا برا حال کردیا ہے۔"

مرسلہ: سید حسین رضا رضوی، خیرپور میرس سندھ

ناولٹ

بدگمان

سیرینا راض

فولادی پٹریوں پر سرپٹ دوڑتی ریل گاڑی نے زوردار سیٹی بجائی تو احمر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ ہڑبڑاہٹ میں کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی اور پھر گھڑی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ اس کے گاؤں تک پہنچانے والے اسٹیشن کے آنے میں ابھی کئی گھنٹے باقی ہیں۔ باہر صبح کی سپیدی پھیل چکی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں اور کھڑکی کے یخ بستہ شیشے سے چہرہ ٹکا دیا۔ من کی حدت پر شیشے کی خنکی

Junaid Sajid

غالب آنے لگی اور وہ ایک بار پھر اپنے خیالوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

احمر خلیج کے ایک ملک میں زندگی کے تیس برس گزارنے کے بعد پہلی مرتبہ...... اپنے آبائی گاؤں جارہا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ ریل گاڑی سرپٹ دوڑتی جارہی تھی۔ اِدھر احمر پر کسی اپنے سے ملنے کی آرزو اور ان طویل برسوں میں بہت کچھ کھو جانے کا احساس طاری تھا۔ مَن کی حدت موسم کی یخ بستگی پر ایک بار پھر غالب آ چکی تھی۔

احمر سوچوں میں گم تھا۔ اس کے ذہن میں گاؤں اور اس کی یادیں گردش کررہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے اس کے گاؤں میں کسی دوسرے کے لیے کوئی نیا پن نہ ہو مگر اس کے لیے تو یہ گاؤں بہت کچھ تھا۔ درخت پوش پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک عام سا گاؤں جہاں جھرنے بہتے تھے، چشمے اُبلتے تھے، سرسبز کھیتیاں تھیں، حسین چراگاہیں تھیں، اپنے لوگ تھے..... احمر بدستور اپنے گاؤں کی یادوں میں گم تھا۔

''نہ جانے اب وہ گاؤں کیسا ہوگا؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگا۔

''جیسا بھی ہو، ہے تو میرا اپنا گاؤں۔''

اچانک گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ ''شاید کوئی اسٹیشن آنے والا ہے۔'' احمر نے سوچا اور آنکھیں کھول کر اطراف میں بیٹھے مسافروں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ ذرا ہی دیر میں گاڑی رک گئی۔ یہ کوئی چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ چند مسافر اترے، ایک دو سوار ہوئے۔ گارڈ نے وسل دی۔ انجن نے جواب میں زور سے سیٹی بجائی۔ پہیوں میں گڑگڑاہٹ ہوئی اور پھر نہایت دھیرے دھیرے ریل گاڑی آگے کھسکنے لگی۔ احمر نے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں، اس کے خیالوں کا سفر بھی ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا بالکل ویسے ہی جیسے کہ مختصر سے وقفے کے بعد ریل گاڑی اس اسٹیشن کو چھوڑ کر اگلے پڑاؤ پر کچھ دیر ٹھہرنے کے لیے ایک بار پھر چل پڑی تھی۔

احمر کی زندگی تنہا گزری تھی۔ اس نے شادی نہیں کی۔ پچھلے تیس برس مکمل تنہا زندگی گزارنے کے بعد اب اس کے لیے یہ خیال ہی محال تھا کہ کوئی اس کی تنہائیوں میں حصے دار بنے۔

گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی اور نہایت تیزی سے منزل کی طرف گامزن تھی۔ احمر نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دن نکل چکا تھا۔ سورج کی چمکیلی کرنیں باہر کے منظر کو جگمگا رہی تھیں۔ اسے لگا کہ باہر کی ہر شے نہایت تیزی سے دوڑتی ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی جارہی ہے۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ کچھ دیر تک وہ نہایت دلچسپی سے باہر کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کا دل بھر گیا، اس نے آنکھیں موند لیں اور ایک بار پھر ماضی میں کھو گیا۔

☆☆☆

احمر سول انجینئر تھا۔ چھبیس سال کی عمر میں اس نے تعلیم مکمل کی۔ دورانِ تعلیم وہ اپنے گاؤں سے بہت دور، یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ جب اس کی پڑھائی مکمل ہوگئی تو وہ گھر چلا آیا۔ اس کی خواہش تھی کہ کچھ عرصہ گھر والوں کے ساتھ گزارے، اس کے بعد نوکری کی تلاش کی جائے۔ ویسے بھی وہ زمیں دار گھرانے کا بیٹا تھا۔ نوکری نہ بھی کرتا تو اتنی زمینیں تھیں کہ ساری زندگی عیش سے گزار لیتا لیکن اس کی خواہش تھی کہ وہ بطور سول انجینئر اپنی ذات کی پہچان بنائے۔

تعلیم سے فراغت، خوشحال گھرانا، بہن بھائیوں

میں سب سے چھوٹا اور بوڑھے والدین...... لڑکا ایسا ہو تو پھر سب اپنوں کے سر میں یہی سودا سمایا ہوتا ہے کہ اس کے سہرے کے پھول کھلا دیے جائیں۔ یہی کچھ احمر کے ساتھ بھی ہوا۔ جب سے وہ تعلیم مکمل کر کے گھر لوٹا تھا، گاہے گاہے سب اس کی شادی کا تذکرہ کرنے لگے تھے لیکن ایک وہ تھا کہ بالکل ہی چپ سادھ رکھی تھی۔ اس دن سب بہنیں اور بھابیاں اکٹھی بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ موضوع وہی تھا کہ احمر کی شادی کس سے کی جائے۔ اتنے میں وہ بھی وہیں آ پہنچا۔

''کیا باتیں ہورہی ہیں؟'' احمر لاعلم تھا کہ وہ کس کے بارے میں باتیں کررہی ہیں۔ اس نے رسماً پوچھ لیا۔

''تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ آخر کس کو اپنی دیورانی بنائیں۔'' منجھلی بھابی نے شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جھینپ گیا۔

''ہاں چھوٹے بھائی...... یہ بتاؤ تم شادی کرنے سے کترا کیوں رہے ہوں۔'' بڑی بہن نے سنجیدگی سے پوچھا مگر وہ خاموش رہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بات چل نکلی تھی... بس اس کے بعد اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہوگئی لیکن وہ چپ رہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو لیکن اس کا نام لینے سے ڈر رہے ہو۔'' کافی دیر بعد جب بہنیں اور بھابیاں بولتے بولتے تھک گئیں تو منجھلی بھابی نے شرارت سے کہا۔

''ہاں...... یہ بات تو ہے۔'' ڈرتے ڈرتے اس نے زبان کھولی تو پھر گردان شروع ہوگئی۔

''اس لڑکی کا نام بتاؤ۔''

''شائستہ...... چاچا احمد نواز کی بیٹی۔'' احمر نے نہایت دھیمے سے کہا۔

کہاں تو سب اس کی پسند کا نام جاننا چاہ رہے تھے اور کہاں یہ کہ جب اس نے لب کشائی کی تو سب کے منہ بند ہوگئے۔ چہروں پر سنجیدگی طاری ہوگئی۔ بڑی بھابی کا منہ لٹک گیا۔ بہنیں افسردہ ہوگئیں اور منجھلی بھابی جو اس کی شادی کروانے کے لیے سب سے زیادہ بے تاب تھیں، سوالیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ تکنے لگیں۔

''تم جانتے ہو کس کا نام لے رہے ہو۔'' کافی دیر بعد بڑی بھابی نے زبان کھولی۔ وہ احمر کے سب سے بڑے بھائی کی بیوہ تھیں۔ ماں باپ کے بعد اس گھر میں ان کا سب سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔

''جانتا ہوں۔''

''تو پھر یہ بھی جانتے ہو گے کہ یہ ناممکن ہے۔''

''جانتا ہوں کہ اس وقت یہ ناممکن ہے لیکن ممکن ہو سکتا ہے۔'' احمر کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

''یہ بات اگر یہاں سے باہر نکلی تو تم جانتے ہو ابا اور اماں پر اس کا کتنا برا اثر پڑے گا۔''

''مجھے اندازہ ہے۔''

''تو پھر ایسی بات کیوں کررہے ہو، جس سے تم صرف دوسروں کو دکھ ہی پہنچا سکتے ہو خوشی نہیں۔'' احمر کی سب سے بڑی بہن نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا۔

''تمہیں تو ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے چند لڑکیوں کے نام لیے۔ احمر کی یہ بڑی بہن شادی شدہ تھی۔ قریب کے قصبے میں بیاہی گئی تھی۔ اکثر وہ ماں باپ کے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ سب حالات سے باخبر تھی۔ بھائی کی شادی کی خواہش اس کے دل میں بھی موجزن تھی لیکن جس لڑکی کا نام احمر نے لیا تھا، اس کو سننے کے بعد ماحول پر تناؤ چھا گیا تھا۔ اب جب اس نے مختلف لڑکیوں

کے نام لینا شروع کیے تو یہ تناؤ کچھ کم ہوا۔ احمر چپ چاپ بیٹھا.... سب کی سنتا رہا۔ جن جن لڑکیوں کے .... اس کا رشتہ طے کرنے کی غرض سے نام لیے گئے، وہ سب ہی خوب صورت، پڑھی لکھی اور حسب نسب کے لحاظ سے اعلیٰ خاندان کی تھیں لیکن احمر دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ نام سب کے سامنے اس کے لبوں پر آیا تھا۔

”یہاں ہر کوئی اپنی ذات کے حصار میں قید ہے۔“ اس نے خود کلامی کی۔ ”شائستہ نہیں تو پھر کوئی نہیں۔“ احمر نے بڑی بہن کو مخاطب کر کے جواب دیا اور وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔

اسی دن یہ بات پورے گھر میں پھیل چکی تھی کہ احمر، شائستہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جس نے بھی یہ سنا، دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ احمر، شائستہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ سب کو حیرت تھی کہ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ سب کچھ بھول کر اس لڑکی سے شادی کرنے پر کیوں تلا ہوا ہے۔ احمر ایک طرف اور پورا خاندان دوسری طرف کھڑا تھا۔ وہ جو آج صبح تک اس کی شادی کے منصوبے بنا رہے تھے، اب اپنی دانست میں اس کی کم عقلی پر رو رہے تھے۔

کئی دن گزر گئے، کئی ہفتے بیت گئے، مہینہ ہونے کو آ گیا مگر پورے گھر میں کوئی ایک شخص ایسا نہیں تھا جس نے اپنی رائے تبدیل کی ہو۔ احمر بھی اپنی جگہ اٹل تھا تو باقی گھر والے بھی اپنی جگہ ثابت قدم تھے۔ اس دوران کئی بار اس کی رائے تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی، طرح طرح کی دلیلیں دی گئیں، مختلف تاویلیں پیش کی گئیں مگر احمر اپنی بات پر قائم رہا۔

”شائستہ نہیں تو پھر کوئی نہیں۔“ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ آخر کار تنگ آ کر سب نے اس موضوع پر چپ سادھ لی۔ احمر بھی خاموش ہو گیا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ احمر کو یقین ہو چلا تھا کہ جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اس کا روایت اور قدامت پسند گھرانا کبھی بھی شائستہ کو بطور بہو تسلیم نہیں کرے گا۔ اس لیے اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کیا۔ اپنے بچپن کے دوست گل محمد کو اعتماد میں لیا اور سب کچھ اسے تفصیل سے بتانے کے بعد مدد کی درخواست کی۔ گل محمد تیار ہو گیا۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد ہر چیز طے کی جا چکی تھی۔

اس رات آسمان پر گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ شدید سردی تھی اور تیز ہوائیں شور مچا رہی تھیں۔ احمر اپنا مختصر سا سامان اور کاغذات ایک بیگ میں رکھ چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ آخر کار وہ لمحہ آ گیا، جس کا اسے بے تابی سے انتظار تھا۔ وہ اٹھا، بیگ کندھے پر لٹکایا۔ چند سطری خط اپنے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پُراسرار گمشدگی کے باعث اس کے گھر والوں کو کوئی پریشانی اٹھانی پڑے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد احمر قصبے کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی جیب میں کراچی جانے کے لیے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ تھے۔ نگاہوں میں بے چینی نظر آ رہی تھی۔ وہ بینچ پر بیٹھا بار بار بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ انجانے خوف سے لرز رہا لیکن پُرامید بھی تھا۔ اس کا حوصلہ مضبوط تھا لیکن اسے کسی انہونی سے ڈر بھی لگ رہا تھا...... امید و بیم کی اس کشمکش میں کافی وقت گزر گیا۔ اس کی

نگاہیں بار بار قصبے کی طرف جانے والے راستے پر اٹھ رہی تھیں۔ جتنی بار وہ گاؤں والے راستے کی طرف دیکھتا، اتنی ہی زیادہ اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔

صبح چار بجے سے ساڑھے چھ بجے کے درمیان وہاں سے تین ریل گاڑیاں کراچی کے لیے گزرا کرتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پہلی گاڑی سے چل دے گا لیکن اس کا انتظار جاری تھا۔ وہ بار بار گاؤں والے راستے کی طرف دیکھ رہا۔ اس دوران میں دو ریل گاڑیاں آئیں اور آ کر چلی بھی گئیں لیکن احمر بدستور پلیٹ فارم پر بیٹھا رہا۔ آخر پو پھٹی، اندھیرے کی جگہ شفق کی ہلکی ہلکی سرخی نے لی۔ یہ سرخی دودھیا روشنی میں تبدیل ہوئی جو پھیلتے پھیلتے دن میں بدلنے لگی۔ آسمان پر سورج طلوع ہونے والا ہی تھا۔ اس وقت تک چہار سو دن کی روشنی پھیل چکی تھی جب کراچی جانے والی آخری ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔ احمر بینچ سے اٹھا، بوجھل دل اور شکستہ قدموں سے ریل گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ڈبے میں داخل ہوا۔ ایک بار پھر امید بھری نظروں سے گاؤں والے راستے پر دیکھا۔ رہ گزر بالکل سنسان تھی۔ دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد...... رات بھر کی جاگی اور انتظار کی ماری آنکھوں میں دو آنسو اُمڈ آئے۔ گارڈ نے وسل دی، انجن نے سیٹی بجائی، گاڑی کے فولادی بریکوں نے پہیوں کو اپنی قید سے آزاد کیا، ایک گڑگڑاہٹ ہوئی اور...... سفر شروع ہو گیا۔ طویل سفر، تنہائی کا سفر، انتظار کی ماری آنکھوں کو پلکوں کی بھیگی چلمن نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ احمر ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا۔

”سب کچھ ختم ہو گیا۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ پلکوں کی چلمن کچھ اور بھیگ گئی تھی۔

ریل گاڑی دوڑتی رہی، رکتی رہی، چلتی رہی...... دن رات میں تبدیل ہوا اور آخر گھر چھوڑ دینے والے احمر کی منزل آ گئی۔ گاڑی کراچی کینٹ اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ احمر نے بھی بیگ تھاما اور باہر آ گیا۔

احمر کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار تھا۔ چند روز میں ہی اسے ایک بڑی تعمیراتی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اگلے چند روز میں اس نے کرایے کا فلیٹ لے لیا اور ہوٹل سے گھر شفٹ ہو گیا۔ زندگی کا پہیہ ایک بار پھر رواں ہو چکا تھا لیکن دل وہیں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں اس نے طوفانی رات کسی کا انتظار کرتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی تھی۔ ریلوے پلیٹ فارم، انتظار اور بہت کچھ کھو جانے کا احساس...... احمر کا من اب تک انہی چیزوں میں اٹکا ہوا تھا۔

پانچ سال بیت گئے۔ احمر کی زندگی مکمل طور پر لگے بندھے معمول پر گزر رہی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک بار بھی نہ تو اپنے گاؤں گیا، نہ ہی کوئی جاننے والا اسے ملا اور نہ ہی کسی نے اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ احمر کے گھر چھوڑنے کے بعد کیا ہوا، اسے اب اس بات کو جان لینے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ کراچی میں اس کا آخری دن تھا۔ احمر کو خلیج کی ایک بہت بڑی تعمیراتی کمپنی میں چیف سول انجینئر کی نوکری مل گئی تھی۔ اس دن وہ صدر بازار میں کچھ ضروری سامان خرید رہا تھا۔ وہ روڈ پار کرنے کے لیے کھڑا ہوا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ اس کے گاؤں میں رہنے والا ٹرک ڈرائیور نصیب زمان تھا۔ دونوں نہایت گرمجوشی سے گلے ملے۔

”تمہیں معلوم ہے کہ جس دن تم نے گھر چھوڑا

تھا۔ اس کے کچھ دن کے بعد تمہاری ماں اور باپ کا انتقال ہوگیا۔ پہلے تمہاری والدہ نے دنیا چھوڑی اور پھر چند روز کے بعد تمہارے والد بھی وہاں چلے گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔'' وہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ اس دوران میں نصیب زمان نے اسے گھر والوں کے بارے میں بتایا۔

''سب کچھ ختم ہوگیا۔'' ماں باپ کی موت کی خبر سن کر احمر نے آہستہ سے کہا۔ اس کے دل میں ساون بھادوں کا طوفان بپا تھا مگر چہرہ بے تاثر، آنکھیں خشک اور کھوئی تھیں۔

کچھ دیر تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ احمر نے اسے بتایا کہ وہ آج شام ملک چھوڑ رہا ہے۔ اس نے اپنا نیا پتا کاغذ پر لکھ کر نصیب زمان کو دے دیا کہ اس کے گھر والوں تک پہنچا دے۔

اور پھر...... نصیب زمان اپنے گاؤں اور احمر اجنبی ملک کو چل دیا۔

نصیب زمان نے اس کے گھر والوں کو پتا پہنچا دیا۔ اس کے بعد سے گھر والوں کے خطوط تواتر سے آنے لگے۔ گلے شکوے، گھر اور خاندان کی باتیں...... اس نے کبھی کسی خط کا جواب نہیں دیا۔

اسی طرح بہت سارے ماہ و سال آئے اور گزر گئے۔ احمر کی بڑی بہن کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی اور والدین تو پہلے ہی جہان سے اٹھ چکے تھے۔ باقی دونوں بھائی بھی اس جہاں کو چھوڑ گئے۔ زمین اور جائداد حصوں میں بٹتی چلی گئی، نئی نسل جوان ہو گئی۔ ان کے اپنے خواب تھے جن کی تعبیریں گاؤں اور ملک کی سرحدوں سے باہر بستی تھیں۔ زمین پہلے حصوں میں بٹی اور پھر جائداد کی شکل میں بکتی چلی گئی۔ نئی نسل نے مٹی سے محبت کا قرض ادا نہ کیا۔ سب نے شہروں کا رخ کیا اور پھر شہر آ کر بسنے والے رفتہ رفتہ دوسرے ملکوں میں جا کر آباد ہوتے رہے۔

اب بھی کبھی کبھار اسے کسی اپنے کا خط مل جاتا تھا۔ جس سے اسے سارا احوال ملتا رہتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ گاؤں میں اب اس کا نہ تو کوئی اپنا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی گاؤں جانے کا سوچا تھا۔

مہ و سال گزرتے چلے جا رہے تھے۔ احمر بدستور تنہا تھا۔ ہجوم میں گھرا احمر، جس کے من میں سناٹے بستے تھے۔

☆☆☆

احمر کی عمر ساٹھ سال کے اریب قریب تھی، جب اس نے تعمیراتی کمپنی سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اب وہ بطور کنسلٹنٹ کام کرنا چاہتا تھا۔ ملازمت سے فراغت کے بعد اس نے کچھ دن آرام کرتے ہوئے گزار دیے۔

اس دن دوپہر کا وقت تھا۔ وہ کھانا کھا کر آرام کر رہا تھا۔ نہ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ الماری کھول کر ایک بیگ نکالا۔ اس بیگ میں وہ تمام خطوط اور عید کارڈ رکھے ہوئے تھے، جو اس کے گھر والے وقتاً فوقتاً اسے بھیجا کرتے تھے۔ برسوں پرانے خطوط جن کا کاغذ بھی خستہ اور زرد ہو چکا تھا۔ وہ ایک، ایک خط کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ انہی میں چند ایسے خطوط بھی تھے جو گل محمد نے اسے لکھے تھے۔ گل محمد اس کے بچپن کا دوست اور رازدار تھا مگر اس کے لکھے ہوئے خطوط بدستور بند تھے۔ احمر نے لاکھ چاہنے کے باوجود بھی انہیں کھول کر نہیں پڑھا تھا۔ وہ گل محمد کو اپنا سب سے قریبی دوست سمجھتا تھا۔ وہ اس کا واحد رازدار تھا، جس نے مدد کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن تیس سال پہلے، اس طوفانی رات میں ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کرتے ہوئے احمر کے دل پر جو گزری تھی، اس نے اسے گل محمد کی طرف سے بدگمان

کر دیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پہلے احمر کے دل میں موہوم سا شک تھا لیکن پلیٹ فارم پر گزری ہوئی اس ایک رات میں ہی شک کا یہ کمزور سا پودا تناور درخت میں تبدیل ہوگیا اور اب تک اس کا سایہ احمر کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اسی لیے احمر نے گل کے خطوط کو پڑھے بنا ہی تھیلے میں رکھ دیا تھا۔ گل نے یہ خطوط ان ابتدائی مہینوں میں لکھے تھے، جب احمر کو ملک چھوڑے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور اس کے اہلِ خانہ کو نصیب زمان کے ذریعے اس کا پتا ملا تھا۔ ابتدا میں تو گل کے دو چار خط آئے مگر جب احمر نے انہیں پڑھا ہی نہیں تو جواب کیا دیتا۔ جواب نہ ملنے پر گل بھی مایوس ہوا، یوں یک طرفہ خط و کتابت بند ہو گئی ہمیشہ کے لیے۔

تیس سال پہلے جو کچھ ہوا تھا، اس کی یاد احمر کے دل میں ہمیشہ میٹھی کسک بن کر زندہ رہی لیکن گل کی طرف سے اسے اپنے دل میں ہمیشہ ایک پھانس چبھی ہوئی محسوس ہوتی۔ احمر نے ہمیشہ اس چبھن کو محسوس کیا۔ اب جو وہ پرانے خطوط نکال کر بیٹھا تو ایک بار پھر گزرا ہوا وقت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا...... وہ وقت جس میں اس کا گاؤں اور وہاں گزرے مہ و سال زندہ تھے۔ وہ بہت دیر تک ماضی کی یادوں میں کھویا رہا۔ سچ ہے کہ ماں، محبوب اور مادرِ وطن...... ان تینوں کی یاد آخری سانس تک انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی اس دن احمر کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ اپنے ماضی میں کھو گیا تھا جہاں ماں، ماں جائے، محبوب اور وطن...... سب نے اس کو اپنے مضبوط حصار میں قید کر لیا تھا۔

احمر کا گاؤں میں کوئی قریبی رشتے دار نہیں رہا تھا۔ سب ادھر اُدھر نکل گئے تھے۔ جو اس کے بڑے تھے وہ تو خاک میں مل کر خاک ہوئے جو نئی پود تھی، انہیں نہ تو احمر نے دیکھا تھا اور نہ ہی وہ اسے پہچانتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ قصے کہانیوں کی طرح انہوں نے اس کا نام سنا ہو اور انہیں اب تک...... یہ نام یاد بھی ہو۔ ممکن ہے وہ کسی کا ماموں، کسی کا چچا، کسی کا پھوپھا ہو مگر احمر کو احمر سمجھ کر ملنے والوں میں شاید ایک آدھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی ان سب کے بیچ تیس برس حائل تھے۔ اس سے پہلے کبھی احمر نے گاؤں جانے کا نہیں سوچا تھا۔ ویسے بھی اسے علم تھا کہ اس کے اپنے ایک، ایک کر کے وہاں سے چلے گئے ہیں، اسی لیے اس نے بھی بہت پہلے ہی گاؤں جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ اب زندگی کے ہنگاموں سے اسے کچھ مہلت ملی تو گاؤں کی یاد نے اسے بے چین کر دیا۔ ویسے اصل بات تو یہ ہے کہ جب سے اس نے گل کے ان پڑھے خطوط کو دیکھا تھا، گاؤں اور گل، دونوں سے ملنے کی خواہش نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ اگرچہ گل اس کے بچپن کا دوست تھا لیکن یہ اور بات کہ احمر اس کی طرف سے بدگمان تھا مگر پھر بھی وہ اس کا بچپن تھا۔ چند روز میں احمر کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اصل یاد گاؤں کی تو آ ہی رہی ہے لیکن اس کی ایک بڑی وجہ گل ہے، جسے وہ لاشعوری طور پر یاد کیے جا رہا تھا۔ سچ ہے کہ دوستوں اور محبت کے حوالے ہی شہروں اور مقامات کو زندہ رکھتے ہیں۔ کئی ہفتوں تک گاؤں جانے اور گل سے ملنے کی خواہش نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

''خیر جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ گل میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہمارے درمیان بچپن کی محبت کا رشتہ، اب بھی سب رشتوں سے بڑا ہے۔ اب زندگی کا کیا بھروسا کب چراغ گل ہو جائے۔ ایک بار تو مل لوں اس سے۔ مرنے سے پہلے ایک بار تو اپنے گاؤں کی فضا میں... سانس لے لوں۔'' ایک دن احمر نے سوچا

اور پھر رختِ سفر باندھ لیا۔ وہ جہاز کے ذریعے کراچی پہنچا اور اب اپنے گاؤں جا رہا تھا، پچھلے تیس برسوں میں پہلی بار۔

☆☆☆

ریل گاڑی کے بریک لگنے لگے۔ پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے احمر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اسے منظر مانوس محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور ایک بار پھر غور سے باہر دیکھنے لگا۔

"لگتا ہے کچھ نہیں بدلا۔" اس نے خود کلامی کی اور اٹھ کر اوپر ریک میں رکھا ہوا اپنا سامان اتارنے لگا۔ گاڑی اس کے مطلوبہ اسٹیشن پر پہنچنے ہی والی تھی۔ وہ سامان لے کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ ہر منظر مانوس تھا۔ تیس برس گزر چکے تھے لیکن اس کے باوجود اسے ہوا کی مہک شناسا سا معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی جیسے کہ وہ اپنے دیس کی ہواؤں سے اپنے پیاسے من کو سیراب کرنا چاہتا ہو۔

ریل گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہو چکی تھی۔ ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ بریکوں نے پہیوں کو جکڑ لیا۔ گاڑی ٹھہر گئی، وہ اترا۔ ایک سرد ہوا کا جھونکا اس سے ٹکرا گیا۔ وہ رک گیا۔ اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔ شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ دسمبر کے آخری دنوں کی شدید کہرے والی سردی اور برفیلی ہواؤں نے خزاں کا نوحہ کچھ اور دکھ آفرین کر دیا تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی۔ اداس ماحول، ماضی کا نوحہ، سرسراتی ہوا کے گیت، اپنے ہی دیس میں اجنبیت کا احساس اور تنہا مسافر......

احمر کچھ دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑا اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ ہر منظر اپنائیت لیے ہوئے تھا۔ گاڑی چلنا شروع ہوئی اور جب آخری ڈبا بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پلیٹ فارم پر بنے سائبان کی طرف چل دیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ گاڑی گزر جانے کے بعد پلیٹ فارم پر سکوتِ مضمحل طاری ہو چکا تھا۔ وہ تنہا مسافر تھا جو اس اسٹیشن پر اترا تھا۔ چائے خانہ کا مالک سردی سے بچاؤ کے لیے لکڑی کے بُرادے والی انگیٹھی کے گرد بیٹھا ہاتھ سینک رہا تھا۔

"آیئے، آیئے صاب! اس طرف آ جائیں، سردی بہت ہے۔" احمر کو قریب آتا دیکھ کر اس نے انگیٹھی کے گرد اسٹول رکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"چائے پئیں گے؟"

"ہاں...... پیوں گا۔" احمر کا جواب سن کر وہ کیتلی میں دودھ انڈیلنے لگا۔

"بابو صاب...... میرا نام رمضان ہے۔" اس نے وقت گزاری کے لیے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ "اجنبی لگتے ہو۔" یہ سن کر احمر نے سر اٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ رمضان گڑبڑا گیا۔

"وہ بابو صاب! بات یہ ہے کہ میں پچھلے پندرہ سال سے یہ ہوٹل چلا رہا ہوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس سے پہلے کبھی آپ کو یہاں دیکھا ہو۔ بس اسی لیے پوچھ لیا تھا۔" چائے خانہ کا مالک بہت باتونی تھا۔ اپنے بارے میں سب کچھ بتانے کے لیے بے چین اور احمر کے بارے میں سب کچھ جان لینے کا خواہشمند نظر آتا تھا۔

"لیجیے صاب...... چائے حاضر ہے۔ میں نے خالص دودھ میں پتی ڈال کر بنائی ہے۔"

"اوہ! ہاں......" احمر اپنے خیالات میں گم تھا۔ چائے والے کی بات سن کر چونکا۔ "آپ کا شکریہ جو ایک اجنبی مسافر کا اتنا خیال رکھا۔" اس نے چائے کا پیالہ تھامتے ہوئے کہا۔

شام کے سائے تیزی سے گھٹنے لگے تھے۔ اندھیرے کا احساس غالب آ رہا تھا۔ ہلکی زرد روشنی سرمئی رنگ میں رنگتی جا رہی تھی۔ سرد ہوائیں کچھ اور زیادہ منہ زور ہو رہی تھیں۔ احمر کو اس اسٹیشن سے مزید چار میل آگے اپنے گاؤں بخت پور پہنچنا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو صاب، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"شکریہ...... بہت سخت سردی ہے۔" احمر نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

"جی ہاں...... سردی تو کئی دنوں سے پڑ رہی ہے لیکن یہ طوفانی ہوائیں آج ہی چلی ہیں۔" رمضان نے اس کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر موسم کا حال بتانا شروع کر دیا۔

"شاید ہوا آج اپنائیت کے اظہار کے لیے اجنبی مسافر کو خوش آمدید کہنے چلی آئی ہے۔" احمر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پیالے میں باقی چائے کو ایک بڑا سا گھونٹ لے کر ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رمضان کو پیسے دیے، سامان تھاما اور پلیٹ فارم سے باہر نکلنے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

اسٹیشن کی سالخوردہ عمارت سے باہر نکلا تو آگ کا ایک چھوٹا سا الاؤ روشن کیے، اس کے گرد بیٹھا ہوا ایک تانگہ بان نظر آیا۔ اس کا تانگہ بھی برابر میں ہی کھڑا تھا۔ لگتا تھا کافی دیر سے اسے کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہی وجہ ہو کہ وہ انہماک سے آگ کے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ کر اپنے اور گھوڑے کی شکم کی آنچ سرد کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ ابھی احمر اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جب تانگہ بان نے قدموں کی آہٹ پر سر اٹھایا۔ ہاتھ میں بیگ دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ سواری ہے۔ وہ اٹھا اور اس کی طرف لپکا۔

"بخت پور چلو گے؟"

"کیوں نہیں صاب۔" احمر کا سوال سن کر اس نے جلدی سے جواب دیا اور اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر تانگے میں رکھنے لگا۔ "میں خود بخت پور سے آگے والے گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ ویسے بھی میں گھر جانے کی ہی سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ مل گئے۔"

تانگہ بان اگلی نشست پر بیٹھ چکا تھا اور احمر پچھلی نشست پر پاؤں پسار کر نیم دراز ہو گیا۔ منزل قریب آنے لگے تو سفر کی تھکاوٹ غالب ہونے لگتی ہے۔ یہی اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ طویل سفر کی تھکن اس پر غالب آ رہی تھی۔

تانگہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور وہ اطراف پر نظریں ڈالتا انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسے کہ تیس برس پہلے تھا۔ لگتا تھا وقت یہاں پر جیسے ٹھہر گیا ہوا، اگر کوئی یہاں سے گزرا ہے تو وہ لوگ تھے وقت نہیں۔

سرد ہوا سے ٹھٹھرتا گھوڑا، موسم کے تند و تیز کا مقابلہ کرتا تانگہ بان اور ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑ رگڑ کر ٹھنڈک کو حرارت میں تبدیل کرتا ہوا تنہا مسافر...... بالآخر مسافر اپنی منزل پر پہنچ ہی گیا۔

"میرا خیال ہے گاؤں آنے ہی والا ہے۔"

"ہاں جی......" تانگہ بان نے تائید کی۔

"تم ایسا کرو کہ مجھے چوہدری گل محمد کے ڈیرے تک پہنچا دو۔ پہچانتے ہو نہیں؟"

"ابھی پہنچا دیتا ہوں صاب، لیکن......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟"

''وہ میں نے چوہدری صاب کو دو روز ہوئے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ ٹکٹ لے رہے تھے وہ۔ شاید کہیں باہر گئے ہیں۔''

''کیا؟'' احمر نے چونک کر پوچھا۔

''اوہ فکر نہ کریں صاب۔ وہ اگر گھر پر نہیں ہیں تب بھی کوئی بات نہیں۔ ان کا چھوٹا بیٹا فرمان گھر پر ہی ہوتا ہے۔'' تانگہ بان نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ اسی لیے مطمئن کرتے ہوئے بولا۔ ''چوہدری صاب کا چھوٹا بیٹا فرمان ساتھ والے شہر کے کالج میں پڑھتا ہے۔ اس لیے وہ گاؤں میں ہی رہتا ہے۔ گھر پر ہی ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں جی۔'' اس کے آخری جملوں سے احمر کو سکون محسوس ہوا۔ ورنہ تو وہ اپنے ہی گاؤں میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر گل نہ ملا تو وہ پھر کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

باتوں باتوں میں تانگہ کھیتوں کے کنارے پر بنی ایک پختہ عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ ''لو جی...... یہ ہے چوہدری صاب کا ڈیرا۔''

احمر غور سے اس مکان کو دیکھنے لگا۔ یہ جگہ وہ پہچان گیا تھا مگر عمارت زیادہ پرانی نہیں تھی۔ احمر تانگے سے اترا تو تانگہ بان بھی اتر آیا۔

''آپ یہاں ٹھہریں، میں انہیں اطلاع کر کے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ جس طرف تانگہ بان جا رہا تھا، احمر اس راستے کو بھی پہچانتا تھا، سامنے گل کا گھر تھا...... آبائی گھر۔ احمر گھوم پھر کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اپنے ماضی میں پہنچ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تانگہ بان واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ ''لو جی...... یہ ہیں چوہدری فرمان۔'' تانگہ بان نے پہنچتے ہی تعارف کروایا۔ احمر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ لگتا تھا کہ وہ فرمان سے اس کا تعارف کروا چکا تھا، اس لیے آتے ہی نوجوان نے اسے چاچا کہہ کر سلام کیا تھا۔

''چاچا آئیں...... اندر چلتے ہیں۔'' فرمان نے اس کا سامان تانگے سے نکال لیا تھا۔ احمر نے تانگہ بان کو اس کی امید سے بڑھ کر کرایہ دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ آخر ایک چکر میں اس کو مہینے بھر کی کمائی جو مل گئی تھی۔

''سلام صاب۔''

''خوش رہو۔''

''بیٹا...... میں اور تمہارے والد بچپن کے دوست ہیں۔'' فرمان دروازہ کھول رہا تھا تو احمر نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

''لیکن چاچا...... میں نے تو آج سے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا؟'' فرمان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تالا کھول چکا تھا۔

''ٹھیک کہتے ہو تم...... بہت لمبے عرصے کے بعد اس سے ملنے آیا ہوں۔ تانگہ بان کہہ رہا تھا کہ گل کہیں باہر گیا ہوا ہے۔''

''ہاں چاچا...... بابا کچھ کام سے باہر گئے ہیں۔ کل شام تک واپس آ جائیں گے۔ تب تک آپ بے فکر ہو کر یہاں آرام کریں۔''

احمر نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اتنی دیر میں چائے بھی آ گئی اور فرمان نے آتشدان میں آگ بھی جلا دی۔ رات کے اندھیرے نے پوری طرح روشنی کو نگل لیا تھا۔ اسی دوران کھانا بھی آ گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر چائے پینے کے دوران فرمان، احمر سے ماضی کی باتیں سنتا رہا۔

''چاچا اب میں چلتا ہوں۔'' کافی دیر بعد فرمان اٹھا۔ ''تھرماس میں چائے ہے اور جگ میں

پانی موجود ہے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔''

''نہیں بیٹا...... کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک ہے چاچا۔ اب میں چلتا ہوں۔ ملازم ذرا باہر گیا ہوا ہے۔ رات کو کسی وقت آ جائے گا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے جگا دیجیے گا یہ برابر والے کمرے میں سوتا ہے وہ۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔''

''تو پھر میں چلتا ہوں۔'' فرمان کہنے لگا۔ ''کل صبح میرا ٹیسٹ ہے۔ اب جا کر پڑھائی بھی کرنی ہے۔ صبح ملازم آپ کے لیے ناشتا لے کر آئے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے بتا دیں۔ ویسے کل شام تک بابا آ ہی جائیں گے۔''

فرمان کے جانے کے بعد احمر نے کمرے کی چٹخنی لگائی اور پلٹ کر آتشدان کے سامنے رکھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ کر ٹیک لگا لی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے نہ جانے کس وقت وہ نیند کی وادی میں ڈوب گیا۔ آنکھ کھلی تو کھڑکی کے شیشے سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر کمرے کو جگمگا رہی تھیں۔ آتشدان کی آگ سرد ہو چکی تھی۔ لکڑیاں اپنی آگ میں جل کر کب کی خاکستر ہو چکی تھیں۔ اس نے اٹھ کر غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے۔ اتنی دیر میں ملازم ناشتا لے کر آ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دھوپ تاپنے کی غرض سے مہمان خانے کے سامنے بنے لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ لان چار دیواری کے تکلف سے آزاد تھا۔ سامنے حدِ نگاہ تک گاؤں کے کھیت کھلیان اور ان کے بیچ بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے پختہ، نیم پختہ گھر پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

احمر کی نگاہوں کے سامنے دور دور تک گاؤں پھیلا ہوا تھا۔ دن کی چمکیلی روشنی میں پورے تیس برس کے بعد آج وہ جی بھر کے گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ گاؤں جو کبھی اس کا اپنا گاؤں تھا۔ یہیں اس کا گھر تھا۔ اسی زمین کی مٹی اوڑھ کر اس کے پیارے ابدی نیند سو رہے تھے۔

''یہ گاؤں میرا گاؤں ہے۔'' احمر نے دل میں کہا۔ ''نہیں...... یہ کبھی میرا گاؤں تھا۔'' اس نے اپنی بات کو خود ہی رد کر دیا۔

کچھ بھی کہہ لو یہ گاؤں اس کا تھا یا وہ خود اس گاؤں کا تھا۔ بات جو بھی ہو مطلب ایک ہی ہے۔ اس گاؤں کے درخت، کھیت کھلیان، ندی نالے...... سب اس سے اور وہ سب سے مانوس تھا۔ اسی گاؤں میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اسی زمین پر گھٹنوں گھٹنوں چل کر، بڑوں کی انگلی تھام کر کھڑے ہونا اور چلنا سیکھا تھا...... لیکن یہ سب کچھ ماضی کی بازگشت ہے۔ آج جب تیس برس کے طویل ہجر کے بعد اس نے گاؤں پر چمکتے سورج کو دیکھا تو اس سورج اور احمر کے درمیان طلوع و غروب جتنا فاصلہ نہیں بلکہ ہزاروں دنوں کی مسافت اور دور تک پھیلی ہوئی اجنبیت کی خلیج حائل تھی۔ یہ خلیج جو گاؤں اور احمر کے درمیان تھی۔ وہی کھیت، وہی راستے، وہی موسم، وہی فضا مگر...... وقت کی دھول نے چہروں کو نا آشنا بنا دیا تھا۔

اچانک احمر کی نگاہ سامنے کو اٹھ گئی۔ ایک بچہ بغل میں بستہ دبائے، دوڑتا ہوا اسکول جا رہا تھا۔ شاید اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اس بچے کو دیکھ کر احمر خیالوں میں ڈوب گیا۔ تقریباً چون پچپن برس پہلے کی ایک صبح اس کے خیالوں میں روشن ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''احمر بیٹا...... احمر...... بیٹا اٹھ جاؤ۔ جلدی کرو

میرے بچے...... شاباش! جلدی سے اچھے بچوں کی طرح اٹھ جاؤ۔'' ماں بڑے پیار سے سرہانے بیٹھ کر اس کو نیند سے جگا رہی تھی لیکن وہ اٹھنے کے بجائے کسمساتے ہوئے اپنے گرد اور سختی سے لحاف کو لپیٹ رہا تھا۔

''بیٹا اٹھ جاؤ۔'' ماں نے ایک بار پھر پکارا۔ اس بار ان کا لہجہ سخت تھا۔ جواب نہ پا کر انہوں نے لحاف کھینچ کر اتار دیا۔ احمر کو ایک دم ٹھنڈ کا احساس ہوا اور وہ جھرجھری لے کر بستر پر سمٹ کر گٹھری بن گیا۔

''بیٹا اٹھ بھی جاؤ۔'' ماں نے ذرا خفگی سے کہا۔ ''آج اسکول میں تمہارا پہلا دن ہے۔ شاباش میرے چندا...... چل جلدی سے اٹھ جا۔ اسکول دیر سے پہنچا تو ماسٹر جی ڈنڈے سے تیری کھال ادھیڑ دیں گے۔'' ماں نے مار کا خوف دلایا تو اس کی نیند یکدم غائب ہوگئی اور وہ آنکھیں ملتا ہوا بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی ماں نے اسے ناشتا کروا کر تیار ہی کیا تھا کہ ایک اور بچہ گلے میں بستہ لٹکائے وہاں پہنچ گیا۔ یہ گل تھا اور پھر...... دونوں ننھے دوست ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گاؤں کے سرکاری اسکول کی طرف چل دیے۔

آج اسکول میں یوں تو احمر کا پہلا دن تھا لیکن حقیقت میں آج وہ دوسرے دن اسکول آیا تھا۔ کل جب اس کے ابا جی اسے اسکول میں داخل کرانے کے لیے لائے تھے تو ماسٹر جی نے اسے کچھ دیر کے لیے کلاس میں بٹھالیا تھا تا کہ وہ اسکول سے مانوس ہو جائے۔ اس دوران اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اسکول میں کون کون اس کا ساتھی ہوگا۔ گل اس دن کلاس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چند روز پہلے داخل ہوا تھا۔

احمر کے ہم جماعتوں میں بہترین دوست گل اور شائستہ تھے۔ ان تینوں کا نہ صرف اسکول ایک تھا بلکہ ان کے گھر بھی ایک دوسرے کے گھروں کے قریب قریب تھے۔ وہ تینوں ہم عمر تھے، ایک ساتھ کھیلتے کودتے تھے اور اب اسکول میں بھی ہم جماعت تھے۔ ان تینوں میں بہت دوستی تھی۔ وہ جو کھیل کھیلتے، گاؤں کے دوسرے بچے ان کے کھیل میں شریک ہو کر وہی کھیل کھیلا کرتے تھے۔ وہ تینوں ہی بہت شرارتی تھے۔ نت نئی شرارتیں اور کھیل ایجاد کرتے رہتے تھے۔ اسکول سے چھٹی ہونے پر گھر واپس جاتے ہوئے درختوں پر چڑھ جانا اور کبھی کبھار رستے روی سے باتیں کرتے ہوئے دور تک چلتے رہنا ان کا مشغلہ تھا۔

ننھی ننھی بے ضرر معصوم شرارتیں کرتے اور ہنستے کھیلتے انہوں نے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرلیا۔ گاؤں میں اسکول صرف پرائمری کلاس تک تھا لہٰذا احمر اور گل کو ان کے والدین نے قصبے کے مڈل اسکول میں داخل کروادیا لیکن یہاں شائستہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ شائستہ کو اس کے والدین نے بہت پڑھ لیا۔۔اب سینا پرونا بھی سیکھ لے کی ہدایت کر کے گھر بٹھالیا تھا۔ شائستہ کو اسکول چھوٹنے کا بہت دکھ تھا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے تعلیم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اسے افسوس اس بات کا تھا کہ جتنی دیر احمر اور گل اسکول میں ہوتے تھے، اتنی دیر تک وہ گھر کے دھندوں میں الجھی رہتی یا پھر اکیلے بور ہوتے ہوئے گھر اور گاؤں میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہتی تھی۔

وقت نے آگے کی سمت ایک اور جست لگائی۔ احمر اور گل مڈل کا امتحان پاس کر گئے۔ اس دوران میں شائستہ کے گھر والوں نے بھی اس کے آزادانہ باہر گھومنے پھرنے پر پابندی لگادی۔ بچپن رخصت ہو چکا تھا۔ لڑکپن نے دل میں بہت سی نئی جوت جگادی تھیں۔

احمر شائستہ کو دل ہی دل میں بہت پسند کرتا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس پسند کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے کبھی کسی ایک نے بھی اپنے دل میں پوشیدہ جذبے کا دوسرے سے اظہار نہیں کیا تھا۔ محبت کو اظہار کی ویسے بھی ضرورت نہیں ہوتی، یہ لفظوں کی قید سے ماورا ہے۔ یہ اپنے ہونے کا از خود احساس دلاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دل میں پوشیدہ اس احساس سے بخوبی واقف تھے۔

شائستہ کی ماں بچپن میں اپنی بچی کی دو چوٹیاں باندھتی تھی۔ احمر اکثر اس کی چوٹی کھینچ کر بھاگ جاتا تھا۔ جس پر شائستہ خوب شور مچاتی۔ وہ ہاتھ میں پتھر لیے اسے مارنے کے لیے پیچھے پیچھے دوڑا کرتی تھی مگر اب جب سے اس کے گھر والوں نے بڑی ہو جانے کی دلیل دے کر اس کے گھر سے باہر تنہا نکلنے پر پابندی لگائی تھی، تب سے احمر بے قرار رہنے لگا تھا۔

''یہ بچپن ہمیشہ کیوں نہیں رہتا۔ کم از کم شائستہ اور ہم کھیل تو سکتے تھے۔'' ایک دن احمر نے خود سے کہا۔ وہ کئی گھنٹوں سے اس انتظار میں اپنے گھر سے باہر بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی ایک جھلک نظر آجائے۔ احمر ہر روز گھنٹوں انتظار کرتا رہتا تھا کہ کسی طرح اسے شائستہ کی صرف ایک جھلک ہی نظر آجائے۔ یہ شدتِ جذبات یک طرفہ نہیں تھے۔ وہ بھی اسے دیکھنے کے لیے بے چین رہتی تھی اور کسی نہ کسی طرح دن میں ایک آدھ بار اس کے گھر کا چکر لگا لیا کرتی تھی۔ ہر بار وہ ایسا بہانہ تراشتی کہ اس کی ماں روک نہ پاتی۔ یہی وہ قیمتی لمحات ہوتے تھے جو ان دونوں کے لیے پورے دن کا حاصل ہوتے۔

وقت دبے پاؤں چلتا رہا۔ اسی دوران میں احمر کے والد نے سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی طے کردی۔ آخر کار وہ دن آپہنچے جب شادی کی تیاریاں اپنے آخری مراحل میں داخل ہوگئیں۔ جونہی احمر کے گھر میں شادی کی چہل پہل شروع ہوئی تو سمجھو کہ شائستہ کو بیٹھے بٹھائے انمول موقع مل گیا۔ وہ شادی کی تیاریوں میں ہاتھ بٹانے کا کہہ کر دن کا زیادہ تر وقت احمر کے گھر پر گزارنے لگی تھی۔

وہ موسمِ بہار کی ایک پُرلطف شام تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملگجے آسمان پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی سرخی اسے سحر انگیز بنا رہی تھی۔ گھر کے صحن میں شادی بیاہ کے گیت گائے جا رہے تھے۔ مہمانوں کی چہل پہل تھی۔ بچوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ احمر گھر کی چھت پر بچھی چارپائی پر لیٹا ہوا آسمان تک رہا تھا، وہ بالکل تنہا تھا۔ اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے نظر گھما کر دیکھا تو شائستہ تھی۔ اسے دیکھتے ہی احمر کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ جب سے شائستہ کے گھر والوں نے اس کے تنہا گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگائی تھی تب سے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ تنہائی میں ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ اس روز پورے چاند کی تاریخ تھی۔ چاند چمکنے لگا تھا۔ چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں وہ دونوں ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ لب خاموش تھے مگر نگاہیں باتیں کر رہی تھیں۔

شائستہ دم سادھے احمر کی چارپائی کے برابر کھڑی تھی اور وہ دم بخود لیٹا اس کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔ دونوں بے خود ہو چکے تھے۔ اسی عالمِ بے خودی میں احمر چارپائی سے اٹھا اور اسے شانوں سے پکڑ کر

اپنے قریب کرلیا۔ وہ بھی کٹے درخت کی طرح لڑکھڑائی اور اس کے شانوں پہ سر ٹکادیا۔ وصال کا لمحہ تھا...... قیامت کی گھڑی تھی...... دونوں اپنے حواس کھو چکے تھے...... ہر شے کا وجود مٹ چکا تھا...... اگر کچھ باقی تھا تو وہ صرف اور صرف لمحۂ موجود تھا...... محبت اور محبوب کے وصال کا لمحہ...... گردشِ وقت ٹھہر چکی تھی...... دونوں چپ تھے لیکن اکھڑی اکھڑی سانسیں بولے چلی جارہی تھیں۔ پھر اسی بے خودی کے عالم میں، اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان احمر نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو وہ اس سے کہنا چاہتا تھا لیکن آج تک کہہ نہ پایا تھا۔ احمر بولتا رہا اور اس کی بانہوں میں سکڑی سمٹی، شانے سے سر ٹکائے شائستہ دم بخود سب کچھ سنتی رہی۔ وہ کسی ردِ عمل کا انتظار کیے بغیر اپنی خاموش محبت، وصال کی خواہش اور ہجر کا شکوہ بیان کرگیا۔

احمر جب اپنی محبت کا اقبالِ جرم کرچکا تو اس کی خاموشی کو ہاں سمجھنے کے باوجود اسے بھی جواباً اقرار سننے کی تمنا ہوئی لیکن شائستہ کی زبان تو جیسے گنگ ہوچکی تھی۔

”کچھ تو بولو...... شائستہ...... میری جان...... کیا تمہیں بھی مجھ سے...... بولو...... کچھ تو بولو......“ الفاظ احمر کی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کرادا ہورہے تھے۔

”کیا...... کیا بولوں؟“ شائستہ نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔ اس کے الفاظ بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ ”تم...... تم سب کچھ تو کہہ چکے...... وہی...... بس وہی...... میں بھی ہاں......“

اکھڑی اکھڑی سانسوں اور بہکے بہکے لفظوں میں شائستہ نے بھی اعترافِ محبت کرلیا۔ ساتھ جینے، ساتھ مرنے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ساتھ چلتے رہنے کا وعدہ کرلیا گیا۔

دونوں کے دلوں کے آتشدان میں برابر کی آگ لگی ہوئی تھی۔ احمر نے ایک بار پھر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ شائستہ کا سر اس کے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ احمر کے ہاتھوں کی انگلیاں اس کی ریشمی زلفوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ پاؤں وجود کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو رہے تھے...... دو بے قرار دل ایک دوسرے کی بے قراریوں میں مدغم تھے۔ گردشِ وقت بدستور تھمی ہوئی تھی لیکن وقت کب تک ٹھہرا رہتا۔ اچانک زینے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ آواز سنتے ہی شائستہ تیزی سے اس کی بانہوں کے حصار سے نکلی اور اپنی بکھری سانسوں کی ڈوری کو سمیٹتے ہوئے سوکھنے کے لیے لٹکائے گئے کپڑے اتارنے لگی۔ احمر بھی جھٹ سے چارپائی پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں...... دو دلوں کے باہمی تعلق کو محبت کا نام مل چکا تھا۔

دوسرے دن احمر کی بہن بیاہ کر پیا کے گھر چلی گئی۔ شادی کے بعد شائستہ کے احمر کے ہاں آنے جانے کی وجہ بھی ختم ہوگئی۔ دونوں اب پہلے سے بھی زیادہ بے قرار رہنے لگے تھے۔ محبت، عشق کی آتش میں بدل چکی تھی، جس میں ان کا تن جلے جارہا تھا۔ ہجر کی مسافتیں تو کٹ رہی تھیں لیکن وصال کی منزل کا کوئی پتا نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ احمر کے بس میں ہوتا تو وہ کب کا شائستہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا لیکن اس کا خیال تھا کہ ابھی وقت مناسب نہیں ہے۔ اسی دوران میں اس نے انٹر کا امتحان پاس کرلیا۔ گل نے تعلیم کو خیر باد کہہ کر زمینداری سنبھالی اور احمر انجینئرنگ میں داخلہ لے کر لاہور چلا گیا۔ اس کا خیال تھا انجینئر بننے کے بعد وہ شائستہ کا ہاتھ مانگنے کی خواہش کا اظہار کرے گا۔ وہ مطمئن تھا، اسے یقین تھا کہ ایسی کوئی

وجہ نہیں جو اُن کی شادی میں رکاوٹ بن سکے۔

شائستہ اور احمر کی محبت سے کوئی واقف نہیں تھا ماسوائے گل اور اس کی چھوٹی بہن زینب کے۔ ان دونوں بہن بھائیوں میں بہت دوستی تھی۔ خود زینب بھی شائستہ کی بہت قریبی سہیلی تھی۔ احمر چھٹیوں میں جب بھی گاؤں جاتا تو گل، زینب کے ذریعے ان دونوں کی ملاقات کا اہتمام کروادیتا تھا۔ یہ مختصر سی ملاقاتیں وصال کی تشنگی کو اور بڑھادیتی تھیں مگر احمر کو ابھی مناسب وقت کا انتظار تھا۔ وہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا۔

ان دنوں یونیورسٹی میں موسم گرما کی تعطیلات ہونے والی تھیں۔ ابھی چھٹیاں ہونے میں چند روز باقی تھے۔ ایک دن احمر کو خط موصول ہوا۔ لکھا تھا۔

”پیارے دوست

جب تک تمہیں یہ خط ملے گا، اس وقت تک میری شادی میں صرف ایک آدھ ہفتہ ہی باقی بچا ہوگا۔ مجھے اندازہ ہے کہ یونیورسٹی بھی گرمی کی چھٹیوں کے لیے بند ہونے والی ہوگی۔ اس لیے جتنی جلد ممکن ہوسکے گاؤں پہنچ جاؤ تاکہ میرے سہرے کے پھولوں کو ہاتھوں میں تھام کر ”اپنے لیے ایک اچھی سی دلہن“ مانگنے کی دعا میں تمہیں دیر نہ ہوجائے۔

تمہارا منتظر گل“

احمر گاؤں پہنچا تو گل کی شادی کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بجھا بجھا سا ہے۔ ایک دن احمر نے موقع دیکھ کر جب گل سے اس اداسی کا سبب پوچھا تو وہ ہنس دیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”یہ سب نصیبوں کے کھیل ہیں۔ کسی کے سہرے کے پھول جلدی تو کسی کے دیر سے کھِل جاتے ہیں۔ ویسے میں تو کام کی زیادتی کی وجہ سے تھک گیا ہوں ورنہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔“

”تم اس شادی سے تو خوش ہونا؟“ گل کی بات سن کر احمر نے پوچھا۔

”کیوں نہیں...... ہماری کیا مجال کہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف سوچیں۔ ویسے بھی جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے، وہی ملتا ہے۔“ وہ ہنس دیا لیکن احمر کو یہ ہنسی کھوکھلی لگی۔

”ویسے یہ بتاؤ شائستہ سے ملاقات ہوئی؟“ یہ کہتے ہوئے گل کے چہرے پر اداسی جھلک گئی۔

”نہیں...... اب تک تو نہیں ہوئی۔“ احمر نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ گل کی اداسی اس کے دل میں کھب گئی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں کچھ کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر گل چلا گیا۔

احمر بدستور گل کی اداسی پر غور کرتا رہا۔ ”کہیں شائستہ......“ اچانک اس کے دل میں خیال آیا لیکن پھر اس نے فوراً اسے رد بھی کردیا۔ ”اب تو اس کی شادی ہورہی ہے۔ ایسے میں وہ کسی دوسری لڑکی کے متعلق سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔“ احمر نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”ویسے بھی وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ شائستہ اور میرے متعلق ہر بات سے باخبر ہے۔ وہ بھلا ایسا کیوں سوچے گا۔“ احمر بدستور گل کی اداسی کی وجہ سمجھنے پر سوچ بچار کررہا تھا۔ ”وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اکیلا ہے نا، تھک گیا ہوگا کام کاج سے۔“ احمر نے خود کو سمجھایا۔

دو دن بعد گل کی شادی ہوگئی۔

ولیمے کی تقریب بہت شان دار تھی۔ مہمانوں نے خوب لطف اٹھایا۔ ولیمہ دوپہر کو ہوا۔ شام کو دور سے آئے ہوئے مہمان واپس جارہے تھے۔ گھر میں

خوب چہل پہل تھی۔ احمر کسی کام سے گھر کے اندر گیا تو ایک کونے میں اسے شائستہ مل گئی۔ زینب بھی اس کے ساتھ تھی۔ جب سے وہ آیا تھا، پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں مبہوت کھڑے تھے۔

''احمر بھائی......'' زینب کی بات سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ ''یونہی کھڑے کھڑے نہ دیکھا کریں۔ جلدی کریں۔ گل بھائی تو اپنے گھر بار کے ہوئے۔ اب آپ کی باری کب آئے گی۔'' اس کا لہجہ شرارتی تھا۔ یہ سن کر وہ دونوں جھینپ گئے، شائستہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے زینب کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گئی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب احمر نے تہیہ کر لیا کہ کل ہی وہ شادی کے لیے اپنی پسند سے بڑی بھابی کے ذریعے والدین کو آگاہ کر دے گا تاکہ وہ رشتہ مانگ سکیں۔ احمر کا خیال تک کہ جب تک وہ انجینئر نہیں بن جاتا تب تک شادی ممکن نہیں البتہ منگنی تو کی جا سکتی ہے۔ اس دن وہ بہت مطمئن تھا لیکن کاتبِ تقدیر نے کچھ اور لکھ رکھا تھا۔ ابھی اس کے دل کی بات دل ہی میں تھی کہ دوسرے دن جو کچھ ہوا، اس نے دونوں خاندانوں کے درمیان نہ مٹنے والی خون کی لکیر کھینچ دی۔

احمر اور شائستہ، دونوں کے خاندان کا شمار علاقے کے معتبر اور مالدار زمیں داروں میں ہوتا تھا۔ اونچ نیچ اور ذات برادری کے اس روایتی ماحول کا ہی اثر تھا کہ ہم پلہ ہونے کی وجہ سے ان دونوں خاندانوں کے درمیان بہت اچھے مراسم تھے لیکن اس صبح کے سورج نے ان دونوں خاندانوں کے درمیان دشمنی کی بنیاد پڑتے دیکھی۔

احمر کے سب سے بڑے بھائی نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد سیر کے عادی تھے۔ وہ روزانہ کئی میل دور تک پیدل چلتے تھے۔ اس دن جب وہ حسبِ معمول سیر کے لیے جانے لگے تو احمر بھی بیدار ہو چکا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

اپنے کھیتوں کی منڈیروں پر چلتے چلتے وہ کافی دور نکل آئے تھے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ان کی زمینوں کے ساتھ ساتھ شائستہ کے والد کے کھیت واقع تھے۔ جب وہ اس مقام پر پہنچے تو انہیں دو آدمیوں کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ احمر کے بھائی شور شرابہ سن کر آواز کی سمت بڑھے۔ احمر بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھے تو دیکھا کہ شائستہ کا بڑا بھائی عزیز اور ان کے کسان محمد خان کی آپس میں تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ عزیز کی بدمزاجی سے پورا گاؤں واقف تھا۔ بھائی صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ابھی وہ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر تھے کہ انہوں نے سنا عزیز، محمد خان کو ہاتھ روک لینے کا کہہ رہا ہے۔

''چوہدری جی آج ہماری باری ہے۔ پانی لگانے دو، ورنہ فصل کا نقصان ہوگا۔'' محمد خان نہایت عاجزی سے اس کی منت سماجت کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھاوڑا تھا۔

''تو پھر...... میں کیا کروں۔ جب تک میری فصل کو پورا پانی نہیں مل جاتا، تجھے پانی کاٹنے نہیں دوں گا۔'' عزیز نے درشت لہجے میں اسے دھتکارا۔

''تو پھر ٹھیک ہے چوہدری جی، جو کرنا ہے کر لو۔ میں پانی کاٹ رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے محمد خان پھاوڑے کی مدد سے کھالے کا بند کاٹ کر پانی کھولنے لگا۔ محمد خان کو پھاوڑا چلاتے دیکھ کر عزیز سخت مشتعل ہو گیا۔ اسی اثنا میں احمر اور اس کے بھائی بھی قریب پہنچ چکے تھے لیکن وہ اتنا غصے میں تھا کہ اس نے ان دونوں کو بھی نہیں دیکھا۔

''کمی ہو کر چوہدریوں کے منہ لگتا ہے۔'' وہ محمد خان کو گالی دیتے ہوئے بولا۔

''چوہدری جی! زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں آپ کا نوکر نہیں ہوں۔'' گالی سن کر محمد خان کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ اس کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ عزیز آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے بغل میں لٹکتے ہولسٹر سے پستول نکالا۔ صورتِ حال دیکھ کر احمر اور اس کا بھائی بیچ بچاؤ کروانے کے لیے دوڑے لیکن عزیز اپنے آپ میں ہی کہاں تھا، اس نے گولی چلا دی۔

عزیز نے محمد خان پر سیدھا فائر کیا تھا لیکن اس کا نشانہ ذرا سا چوک گیا۔ احمر کے بڑے بھائی اپنے کسان کو بچانے کے لیے دوڑے تھے لیکن عزیز کے پستول سے نکلی ہوئی گولی کا نشانہ چوکا اور وہ بھائی صاحب کے سینے میں جا لگی۔ وہ زمین پر گر گئے۔ گولی چلانے کے بعد عزیز کو بھی ہوش آ گیا۔ اس نے احمر کے بھائی کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب جو اس نے یہ منظر دیکھا تو حواس باختہ ہو گیا اور جائے وقوع سے دوڑ پڑا۔ گولی دل میں پیوست ہوئی تھی، اس لیے وہ فوراً ہی دم توڑ گئے۔

عزیز جائے وقوع سے فرار ہو چکا تھا لیکن پولیس نے اسے دو دن بعد ہی گرفتار کر لیا۔ مقدمہ سیدھا سادہ تھا۔ دونوں خاندان پیسے والے اور بااثر تھے۔ دونوں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اچھے سے اچھا وکیل کر کے، ان پر پانی کی طرح پیسہ بہایا جا رہا تھا لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔

عزیز کے خلاف قتل کے مقدمے کا چالان عدالت میں پیش ہونے کے بعد اسے جوڈیشل ریمانڈ پر ضلع کی جیل میں بھیج دیا گیا۔ کوششوں کے باوجود بھی اس کی ضمانت نہیں ہو پا رہی تھی۔ عزیز کے ورثا مصالحت کے لیے کوششیں کر رہے تھے لیکن بات نہیں بن رہی تھی۔ معاملہ خون کا تھا۔ احمر کا خاندان عزیز کو پھانسی کے پھندے پر جھولتا دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ مقدمے کا فیصلہ کب ہوگا، اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا لیکن اوپر والے کی عدالت میں اس مقدمے کا فیصلہ لکھ دیا گیا تھا۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے، جن دنوں عزیز جیل میں تھا۔ ان دنوں ساون بھادوں کی رُت تھی۔ چار پانچ دن سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ایک صبح بارش ہو رہی تھی، جب پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیلی کہ گزشتہ رات عزیز کو جیل میں سانپ نے ڈس لیا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا لیکن وہ طبی امداد ملنے سے قبل ہی خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

قدرت کے فیصلے پر مقتول کے والدین، بیوہ اور دیگر اہلِ خانہ نے خدا کا شکر ادا کیا اور شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ وہ سب خوش تھے کہ بے گناہ کو موت کی نیند سلانے والا اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ احمر بھی بہت خوش تھا کہ خدا نے خود انصاف کر دیا۔ اگر عزیز کو پھانسی ہو جاتی تو دونوں خاندانوں کے درمیان ہونے والی یہ دشمنی بہت آگے تک چلتی لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ روایت پسند معاشرے میں دو ہم پلہ خاندانوں کے درمیان خون کی لکیر نے سرحد قائم کر دی تھی۔ دونوں خاندان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے تھے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ احمر واپس شہر لوٹ گیا اور اپنی تعلیم میں منہمک ہو گیا۔ جب انجینئرنگ پاس کر کے وہ شہر سے واپس گھر لوٹا تو اس کی شادی کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ جب شادی کے لیے اس نے شائستہ کا نام لیا تو جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس کے بڑے بھائی کی موت کے بعد ان دونوں

خاندانوں کے درمیان ہر قسم کے تعلقات ٹوٹ چکے تھے۔ احمر کے والدین کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے بے گناہ بیٹے کے قاتل کی بہن کو بہو بنا کر اپنے گھر لانے کے لیے رشتہ مانگنے جائیں۔ احمر بھی اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ یہ شادی ان حالات میں ممکن نہیں۔ وہ کئی دن تک اس سوچ میں غلطاں رہا اور آخر ایک دن گل کے پاس جا پہنچا۔ گل اس وقت اپنے ڈیرے پر اکیلا بیٹھا ہوا فصل کے حساب کتاب میں مصروف تھا۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد احمر دل کی بات زبان پر لایا اور سارا احوال بیان کر ڈالا۔

''یہ تو ہونا ہی تھا۔'' ساری روداد سن کر گل نے افسردہ لہجے میں کہا اور کچھ لمحے تک سوچتا رہا پھر احمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''یار میں تجھے بتانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن کیا کروں۔ آج نہیں تو کل تجھے خبر مل ہی جانی تھی۔''

''کیا بات ہے۔ کھل کر کہو۔'' احمر اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا تھا۔

''شائستہ کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ زینب نے بتایا ہے کہ وہ خود بھی بہت پریشان ہے لیکن بے چاری کر بھی کیا سکتی ہے سوائے پریشان ہونے کے۔''

''تو پھر اب کیا کیا جائے۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ میری تو عقل ہی جواب دے گئی ہے۔'' گل کا جواب سن کر وہ بہت ہی پریشان دکھائی دینے لگا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ بالکل ہی بے بس ہو چکا ہے۔

''معاملہ اب فیصلے کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔'' گل نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اب تجھے فیصلہ کرنا ہوگا کہ زندگی شائستہ کے ساتھ گزارے گا یا اپنے گھر والوں کی مرضی کے مطابق جیے گا۔''

گل کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا اور اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں سارا منصوبہ تیار کر چکے تھے۔

زینب کی وساطت سے گل نے شائستہ سے ملاقات کی۔ وہ بھی احمر کے عشق میں ہر بازی کھیل جانے کو تیار تھی۔ منصوبہ مکمل تھا۔ کسی کو ان کی محبت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا، لہٰذا کسی کو بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ احمر، شائستہ اور گل کے درمیان کیا معاملہ تھا۔

منصوبے کے مطابق احمر کو جس رات گھر چھوڑ کر اسٹیشن پہنچنا تھا، اسی رات شائستہ اپنے گھر سے نکل کر قبرستان کے داخلی دروازے کے قریب والے پیپل کے درخت کے نیچے پہنچتی، جہاں سے گل اسے ساتھ لے کر اسٹیشن پہنچتا اور یوں وہ دونوں پہلی دستیاب ریل گاڑی سے کراچی چلے جاتے۔

احمر تو طے شدہ منصوبے کے مطابق اسٹیشن پر پہنچ گیا، ٹکٹ بھی خرید لیے تھے لیکن گل، شائستہ کو ساتھ لے کر نہیں پہنچا۔ یوں جب دن نکلنے لگا تو احمر تنہا ہی چل دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب احمر کے دل میں شک پیدا ہوا کہ شاید گل ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ شائستہ کو ساتھ لے کر یہاں سے نکل جائے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ حقیقت میں گل بھی شائستہ کو پسند کرتا تھا لیکن اس کی شادی اس لیے نہیں ہو سکی کہ اس کی چچازاد سے بچپن میں ہی رشتہ طے ہو چکا تھا۔ وہ اسے رقیب سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے وعدہ خلافی کر کے اس سے جذبۂ رقابت کے تحت انتقام لیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے نہ تو کبھی گل سے کوئی رابطہ کیا اور نہ ہی اس کا لکھا ہوا کوئی خط کبھی کھول کر پڑھا...... مگر وقت سب سے بڑا

مرہم ہے۔ جب زندگی کے چراغ کی لو مدھم پڑنے لگی تو گل کے خلاف احمر کے دل میں موجود نفرت کم ہونے لگی اور آخرکار وہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنے بچپن کے ہمدم سے ملنے کے لیے اپنے گاؤں چلا آیا۔

☆☆☆

رات خاصی سردی تھی لیکن خوشگوار دھوپ نے سردی کا احساس کم کر دیا۔ احمر لان میں دھوپ تاپنے بیٹھا تھا لیکن سفر کی تھکن غالب تھی۔ خیالوں میں ڈوبا احمر بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا۔ اچانک کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تو وہ بیدار ہوا۔ دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ ملازم کھانا لے کر آیا تھا۔ ریل گاڑی کے طویل سفر نے اس کے بوڑھے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد احمر کچھ دیر مزید آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

احمر میٹھی نیند سویا ہوا تھا جب کمرے میں کھٹکا ہوا۔ آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے لیکن جب چند لمحے گزر گئے تو اس کی آنکھیں اندھیرے کمرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت باہر سورج غروب ہو چکا تھا اور کمرے میں دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی کھڑا ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ جیسے ہی وہ بستر سے اٹھا وہ سایہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے بغل گیر ہو گیا۔ کمرے میں بدستور اندھیرا تھا لیکن احمر اس لمس کو پہچان گیا۔ جس جوش اور والہانہ پن سے وہ سایہ بغل گیر ہوا، یہ گل کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی دیر میں ملازم بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بلب روشن کر دیا۔ وہ دونوں بدستور گلے لگے ہوئے تھے۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ بچپن کے دو دوست تیس سال بعد جب گلے ملے تو برسوں سے آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ دونوں کافی دیر تک ہنسنے رونے کی کیفیت سے گزرتے رہے۔

''یار احمر...... میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس لوٹا ہوں۔'' گل اس سے علیحدہ ہوا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''گھر پہنچتے ہی فرمان نے مجھے بتایا کہ میرا کوئی بچپن کا دوست آیا ہوا ہے۔ جب میں نے اس سے نام معلوم کیا تو جو کچھ اس نے بتایا اسے پورا سننے سے پہلے ہی میں دوڑا دوڑا یہاں چلا آیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تو ہی ہوگا۔''

''میں سویا ہوا تھا۔ کھٹکا ہوا تو اس نے مجھے میرے خواب سے جگا دیا، میں ڈر گیا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ آنکھ کھلے گی تو تعبیر سامنے ہوگی۔''

''ارے یار...... خواب دیکھنے اور پھر ڈر جانے کی بچپن کی عادت اس بڑھاپے میں بھی نہ گئی۔ وہ میں نے دروازہ زور سے کھولا تھا۔ اسی کی آواز تھی۔'' گل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہم تو بچپن کی ہر بات اپنے دل میں سنبھالے ہوئے ہیں اور ساتھ ساتھ لیے قبر میں اتر جائیں گے۔'' احمر نے گل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اگر بچپن کی عادتوں کو بھلا دینے والا ہوتا تو پھر تجھ سے ملنے کیوں آتا...... تو بھی تو میرا بچپن ہی ہے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''تو تو فلسفی ہو گیا۔ کہیں سٹھیا تو نہیں گیا۔ ویسے دیکھ کر لگتا ہے کہ سٹھیانے کی عمر کو تو پہنچ گیا ہے۔'' گل نے اس کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''ویسے تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لگتا ہے کہ تیری زندگی بچپن کی یادوں کے سہارے ہی گزری ہے ورنہ

یہاں تنہا نہ آتا۔ کیوں...... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!'' گل کا لہجہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔ یہ سن کر احمر مسکرا دیا۔

اتنی دیر میں ملازم چائے لے کر آ گیا۔ کمرے میں خاصی ٹھنڈ تھی۔ ملازم آتش دان میں لکڑیاں جلانے لگا۔ اس نے سرد ہواؤں کو کمرے میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے کھڑکی کے پٹ اور دروازے کے کواڑ بھی بھیڑ دیے تھے۔

چائے پینے کے دوران میں وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ کافی دیر بعد گل اٹھا۔ ''میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔ رات کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ میں بھی رات کو یہیں سوؤں گا پھر باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی ذرا منہ ہاتھ دھولوں۔'' احمر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو میں آتا ہوں کچھ دیر میں۔'' یہ کہہ کر گل چلا گیا۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن ان دونوں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ کتنی رات بیت چکی اور کتنی باقی ہے۔ وہ دونوں کئی گھنٹوں سے ماضی کی باتیں کیے جا رہے تھے۔ وہ ماضی جو دونوں کی قدرِ مشترک تھا۔ تیس سال بعد گزرے کل کے واقعات آج انہیں کہانی لگ رہے تھے۔

آتشدان میں جلنے والی لکڑیاں کب کی کوئلہ بن چکی تھیں اور اب ان پر سفید راکھ جمنے لگی تھی۔ باہر گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ پانی گرنے کے شور نے ماحول پر عجیب سی افسردگی طاری کر دی تھی۔ اندر کمرے میں بچپن کے دو دوست ماضی کی یادوں میں ڈوبتے ابھرتے چلے جا رہے تھے۔

''ایسی ہی رات تھی نا جب تو ہمیں چھوڑ کر گیا تھا؟'' اچانک گل نے نہایت افسردہ لہجے میں کہا۔

''سچ ہے...... لیکن میں نے نہیں، تم نے مجھے چھوڑا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک میں بالکل تنہا ہوں۔'' احمر کا لہجہ بہت اداس ہو چکا تھا۔

''کیا مطلب...... کیا کہنا چاہتا ہے تو؟'' یہ سنتے ہی گل نے چونک کر پوچھا۔ ''تجھے جو میں نے اپنے خطوں میں وضاحتیں لکھی تھیں، تجھے وہ مطمئن نہ کر سکیں۔'' اس نے احمر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''کون سی وضاحتیں......؟''

''وہی وضاحتیں، جن کے حوالے سے تو بات کر رہا ہے۔ میرے خط تو تجھے ملے تھے نا؟''

''ہاں...... سب خط ملے تھے۔'' احمر نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''تو پھر اس رات جو کچھ ہوا تھا، اس بارے میں مجھ سے کیوں ناراض ہے اب تک۔'' گل نے پوچھا۔ ''چل اچھا ہے۔ اب تو تو آ ہی گیا ہے۔ تجھے سب کچھ پتا چل جائے گا۔''

''کیا پتا چل جائے گا؟'' احمر نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''وہی سب کچھ جو میں برسوں تک تجھے لکھے گئے خطوں میں بتانے کی کوشش کرتا رہا ہوں مگر تو تو اتنا ناراض تھا کہ کسی ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا۔'' گل کے لہجے سے شکوہ جھلک رہا تھا۔

''گل! مجھے تیرے لکھے ہوئے سارے خطوط ملے تھے۔'' احمر نے کہنا شروع کیا۔ گل نہایت غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ''جب تو نے دوستی جیسے بندھن میں دغا کی دراڑ ڈال دی تو پھر میں تیرے خط کیوں پڑھتا۔ میں نے تو ان بند لفافوں کو کھولا تک

نہیں۔ البتہ ایک دوست کی نشانی سمجھ کر آج تک ان بند لفافوں کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ آخر ان کے اوپر میرے دوست کے ہاتھوں میرا نام لکھا ہوا ہے۔ دوست تو کھو چکا تھا۔ ایسے میں بے وفا دوست کے ہاتھ سے لکھے گئے اپنے نام کو اپنے ہی ہاتھوں چاک کرنے کی ہمت کہاں سے لاتا۔"

"کمبخت...... یہ تو نے کیا کیا۔" احمر کی بات سنتے ہی وہ اچھل کر کرسی سے کھڑا ہوا اور احمر کے شانوں کو پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔ "اتنی بڑی زیادتی کی مجھ سے...... تو اتنا عرصہ اپنے دل میں میری طرف سے بدگمانی کا ناگ پالتا رہا۔ اس کا مطلب ہے کہ تجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ روہانسا ہو چکا تھا۔

"واقعی...... مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہو جاتا کہ تو خود شائستہ کی محبت میں گرفتار ہے تو میں خود ہی راستے سے ہٹ جاتا۔" احمر چھت کو گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ یہ کہہ چکنے کے بعد اس نے نظریں گھمائیں اور گل کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں دوستی پر محبت کو قربان کر دیتا مگر افسوس...... واقعی مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔"

"میں نہیں جاننا چاہتا کہ تو کیوں یہ بکواس کیے جا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شائستہ تجھ سے پیار نہیں کرتی تھی، اسے عشق تھا تجھ سے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔" احمر نے یہ سن کر کہا۔ "یہاں تک تو بالکل درست ہے کہ شائستہ کو مجھ سے عشق تھا لیکن تو خود بھی اس کا طلب گار تھا۔ یہ باقی کا آدھا سچ ہے، ورنہ تو مجھے اس رات دھوکا کیوں دیتا۔"

"تیری آدھی بات درست ہے۔" اب گل تھکا ماندہ لگ رہا تھا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ "وہ مجھے بچپن سے ہی اچھی لگتی تھی لیکن جب مجھے شعور آیا اور تم دونوں کی محبت کا احساس ہوا تو مجھے پشیمانی ہوئی۔ مجھے یہ بات بہت نیچ لگی کہ تم دونوں کے بیچ، اپنی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لیے رکاوٹ بنوں۔ ویسے بھی میرا رشتہ تو بچپن میں ہی چچازاد سے طے ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے قسمت کے لکھے کو قبول کرلیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے تم دونوں کے خلاف کوئی سازش کی تھی۔ میں نے ہمیشہ خلوصِ دل سے تم دونوں کا بھلا چاہا تھا۔" اس کا لہجہ نہایت افسردہ تھا۔

"تو اگر سچ کہہ رہا ہے تو پھر اس رات کیا ہوا تھا؟" گل کی بات سن کر احمر اور زیادہ بھڑک چکا تھا۔

"اگر تو میرے خطوط پڑھ لیتا تو آج یہ سوال نہ کرتا۔ تجھے خود ہی پتا چل جاتا کہ اس رات اور پھر اس کے بعد کیا کچھ ہوا تھا مگر تو نے تو......" گل نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

یہ سن کر احمر چونک گیا۔ اسے گل کے خط نہ پڑھنے پر افسوس ہوا۔ "تو کھل کر بتا اس رات کیا ہوا تھا؟" احمر نے ہذیانی کیفیت میں پوچھا۔

"خیر...... اب ان گزری باتوں کو جان لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ جو ہونا تھا وہ کب کا ہو چکا۔"

"تو بتا تا کیوں نہیں ہے۔" احمر نے بے تاب لہجے میں پھر پوچھا۔

"ٹھیک ہے...... تو سننا چاہتا ہے تو پھر سن۔" گل نے بددلی سے جواب دیا۔ "اس رات طے شدہ منصوبے کے مطابق میں رات ہونے پر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے تیری بھابی کو یہ کہہ کر چلا آیا کہ رات ڈیرے پر سوؤں گا۔" گل نے بتانا شروع کیا۔ احمر دم سادھے بیٹھا سن رہا تھا۔ "جب رات کافی



ہوگئی تو میں اٹھا اور قبرستان والے پیپل کے پیڑ کے پاس پہنچا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آدھی رات بیت چکی ہو۔ میں درخت کے نیچے کھڑا ہو کر شائستہ کا انتظار کرنے لگا۔ وقت گزرتا جارہا تھا مگر اس کے آنے کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔ جب رات کے بارہ بج گئے تو مجھے ہول سے اٹھنے لگے۔ خدا جانے کیا ہوگیا تھا۔ میں بہت پریشان ہو رہا تھا۔ کبھی میرے دل میں خیال آتا کہ تیرے پاس اسٹیشن چلا آؤں اور تجھے سارا حال بتادوں مگر دوسری طرف میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر میں تیری طرف گیا اور اُدھر شائستہ پہنچ گئی تو...... اگر اس نے مجھے نہ پایا تو کہیں وہ پلٹ نہ جائے۔ میں اسی کشمکش میں الجھا ہوا تھا۔ خیر رات گزرتی چلی گئی اور اسی کشمکش میں صبح ہوگئی۔ جب مؤذن نے فجر کی اذان دی تو مجھے یقین ہوگیا کہ شائستہ اب نہیں آئے گی۔ پھر میں مایوس ہو کر وہاں سے اٹھا اور تجھے خبر کرنے کے لیے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اب قسمت کا لکھا دیکھ کہ جب میں چار میل کا راستہ پیدل طے کرکے اسٹیشن پہنچا تو کراچی جانے والی آخری گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا پلیٹ فارم پر پہنچا۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا تجھے پکارتا چلا گیا۔ مگر سب بے سود رہا...... گاڑی نکل گئی۔ میں نے تجھے اِدھر اُدھر بھی تلاش کیا لیکن سب بیکار ثابت ہوا۔ تو جاچکا تھا۔ میں بھی تھک ہار کر گھر لوٹ آیا۔''

''لیکن شائستہ کیوں نہیں پہنچی تھی؟ بقول تمہارے وہ مجھ سے عشق کرتی تھی۔'' احمر نے یہ سن کر تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''ہاں...... وہ تم سے عشق کرتی تھی اور اس نے تم سے عشق کرنے کی قیمت بھی چکائی ہے۔'' گل کا لہجہ نہایت ہی تلخ ہو چکا تھا۔ ''وہ تمہاری طرح نہیں تھی کہ پردوں میں منہ چھپا کر سمجھ لیا کہ خطرہ ٹل گیا۔'' اس نے طنز کا بھرپور وار کیا۔

''لیکن شائستہ کے ساتھ ہوا کیا تھا......'' احمر اب روہانسا ہو چکا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا مگر ایک بات صاف ہو چکی تھی کہ اس رات جو کچھ بھی ہوا، بہت ہی برا ہوا تھا۔

''میرے بھائی...... سب کچھ تو صرف اس بے چاری کے ساتھ ہی ہوا۔ باقی کسی اور کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔'' گل نے نہایت آہستہ آواز میں طنز کے نشتر سے ایک بار پھر گھاؤ لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یاد ہے اس روز سر شام ہی کالی گھٹا چھا گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت موسلا دھار بارش ہونے لگے گی۔''

''ہاں ہاں...... مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے، تم آگے کی بات بتاؤ۔''

''سب گھر والوں کے سوجانے کے بعد شائستہ چھت پر آئی۔ اس نے وہاں سے حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی بھوسے کی بوریوں پر چھلانگ لگائی لیکن یہ اتفاق تھا کہ بارش کے خطرے کے باعث ملازمین نے اسی شام بھوسے کی بوریوں کو وہاں سے اٹھالیا تھا تاکہ بارش کی وجہ سے وہ خراب نہ ہوجائیں۔ جب شائستہ نے نیچے چھلانگ لگائی تو وہ بھوسے کے بجائے پختہ اینٹوں سے بنے فرش پر جا گری۔ اونچائی سے پکے فرش پر گرنے کے سبب اس کے ہاتھ پاؤں کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ سر پر بھی شدید چوٹ آئی۔ بعد میں پتا چلا کہ دماغ کی بند چوٹ نے شائستہ سے اس کی یادداشت بھی چھین لی ہے۔''

''تو کیا شائستہ سب کچھ بھول گئی تھی؟'' احمر نے

[بھ]ائی سے پوچھا۔

''سب کچھ...... البتہ اسے صرف ایک بات یاد [تھ]ی۔ احمر اور پیپل کا پیڑ۔''

''کیا مطلب؟'' احمر کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ہوا یہ کہ اسٹیشن سے واپس آنے کے بعد میں گھر آکر سوگیا۔ دوپہر کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو تیری بھابی نے بتایا کہ شائستہ کل رات حویلی کی چھت سے نیچے گرگئی ہے۔ گھر والوں کو اس واقعے کا صبح اس وقت پتا چلا جب نمازی مسجد جانے کے لیے گھروں سے نکلے۔ اسے نیند میں چلنے کی عادت تھی۔ گھر والے یہی وجہ سمجھے، وہ بے ہوش تھی۔ اسے اسپتال لے گئے۔'' یہ کہہ کر گل لمحہ بھر کے لیے رکا۔

''پھر آگے کیا ہوا؟'' احمر بے تاب ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ندامت چھائی ہوئی تھی۔ وہ یہ سب کچھ سننے کے بعد گل سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

''شائستہ کے گھر والوں نے اسے اتفاقی حادثہ قرار دے دیا۔ گاؤں والوں نے بھی اسے حادثہ سمجھا مگر جب کئی روز کے بعد اسے ہوش آیا تو اس کی زبان پر صرف دو نام تھے۔ احمر اور پیپل کا پیڑ۔ اس پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے لیکن جب بھی ہوش میں آتی، یہی پکارتی تھی۔ اس بات نے سارا راز اس کے گھر والوں پر افشا کردیا۔ تمہاری پُراسرار گمشدگی اور اس کا چھت سے باہر گلی میں چھلانگ لگانے کا واقعہ، اس کے گھر والوں کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ کئی مہینے اسپتال میں رہی لیکن اس کی دماغی حالت بہتر نہ ہوئی۔ ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ مریضہ جس شخص کا نام لیتی ہے اگر اس کو سامنے لایا جائے تو

ممکن ہے کہ اس کی کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آئے۔ اب اس خاندان کی ناموس کا سوال تھا۔ وہ ایک دن اسے چپ چاپ اسپتال سے گھر لے آئے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا۔ اس کے پاؤں میں زنجیر باندھ دی گئی کہ وہ کہیں جا نہ سکے۔ ویسے زنجیر نہ بھی باندھتے تو وہ بے چاری کہاں جاتی۔ وہ تو مکمل طور پر اپنے حواس کھو چکی تھی۔'' گل افسردہ تھا۔ احمر کی آنکھوں سے بدستور پشیمانی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''تو پھر وہ ٹھیک ہوگئی؟''

''نہیں۔'' گل نے یہ سن کر مختصر سا جواب دیا۔ ''اسی طرح چھ سات سال گزر گئے مگر اس کی حالت نہیں بدلی۔ وہ مکمل طور پر پاگل ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ گھر والے بھی اس کے وجود سے عاجز ہوگئے اور انہوں نے اس کی زنجیریں کھول دیں۔ نہ جانے کس طرح اب تک تمہارا نام اور درگاہ کے قریب والا پیپل کا پیڑ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اس نے اسی پیپل کے پیڑ کے نیچے اپنا ڈیرا جما لیا۔ دل کرتا تو گھر لوٹ آتی ورنہ سردی، گرمی، بارش یا طوفان...... اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ بدستور اسی پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیا ورنہ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ رفتہ رفتہ گھر والے بھی اس سے لاتعلق ہوتے چلے گئے۔ والدین کی موت کے بعد تو ویسے بھی کسی اپنے کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا۔''

''افسوس......'' احمر نے روتے روتے کہا۔ اس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ گل کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔ کافی دیر تک کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔

''اسی دوران تمہارا اپنے گھر والوں سے رابطہ ہو چکا تھا۔'' گل نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ ''میں نے بڑی بھابی سے تمہارا پتا لیا اور تمہیں خط میں سب احوال لکھ لکھ کر بھیجتا رہا۔ میں نے اپنے خطوں میں تم سے واپسی کی التجائیں کی تھیں مگر تم نے کبھی جواب نہ دیا۔ تھک ہار کر میں بھی خاموش ہوگیا۔ مجھے لگا کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے...... تو پھر میں نے بھی اسے تقدیر کا لکھا ہوا سمجھ کر قبول کر لیا۔''

''شائستہ زندہ ہے، کیسی ہے، کہاں ہے وہ؟'' اچانک احمر ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا۔

''بڑی جلدی خیال آ گیا یہ بات پوچھنے کا۔'' گل بدستور احمر سے ناراض نظر آ رہا تھا۔

''یہ بتاؤ کہ وہ زندہ ہے؟''

''میں نے شروع شروع میں ہر ممکن طور پر شائستہ کا خیال رکھا لیکن کب تک...... رفتہ رفتہ میں بھی اپنے کاموں میں الجھ کر اسے بھولتا چلا گیا۔ اب تو بہت عرصہ ہوگیا ہے۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ہوں گے جو یہ بات جانتے ہیں کہ شائستہ کون ہے۔ اب تو لوگوں نے اس کا نام پاگل رکھ دیا ہے۔ کوئی اسے اللہ والی کہتا ہے۔ کسی کے لیے وہ مجذوب ہے۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر وہ کسی کو دعا دے دے تو وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو جاتی ہے۔''

''شائستہ زندہ ہے؟'' احمر گل کی یہ بات سن کر خوشی سے چلا اٹھا۔

''ہاں...... سانس لینے کا نام زندگی ہے تو پھر وہ بھی زندہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' احمر نے حیرت سے پوچھا۔

''ملو گے، دیکھو گے تو خود ہی جان جاؤ گے۔''

''میں شائستہ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''تو میں نے کب روکا ہے۔ تم نے خود ہی آنے میں دیر کی ہے۔''

''میں اسی وقت اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' احمر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' گل بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو۔''

جب وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے تو بارش تھم چکی تھی۔ باہر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ گل نے باہر آتے ہوئے چھتری اور ٹارچ ساتھ لے لی تھی۔ چھتری تلے ٹارچ کی روشنی میں وہ قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ کیچڑ میں پھنستے، الجھتے ہوئے آخر کار وہ دونوں درگاہ کے قریب پہنچ گئے۔ درگاہ پر نظر پڑتے ہی احمر گرتا پڑتا تیزی سے پیپل کے پیڑ کی طرف لپکا۔ پیڑ تلے ایک ہیولہ تنے سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا ہوا نظر آیا۔ احمر جان گیا کہ وہی شائستہ ہے۔ وہ دوڑ کر اس تک پہنچا اور کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گھٹنوں کے بل گرتا چلا گیا۔ وہ شائستہ کے قریب بیٹھ چکا تھا۔ اس نے قریب بیٹھتے ہی اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا بالکل اسی طرح جیسے برسوں پہلے اس نے اپنی حویلی کی چھت پر اسے سینے سے لگایا تھا۔ شاید شائستہ بھی یہ خوشبو پہچان چکی تھی۔ اس نے اپنا سر احمر کے شانے سے ٹکا دیا۔

زمین پر دو پیار کرنے والے مل رہے تھے تو آسمان پر دونوں وقت کا ملاپ تھا۔ نہ دن تھا نہ رات۔ فضا پر سوگوار سی سپیدی چھائی ہوئی تھی۔ ملگجی روشنی جیسی کہ برسوں پہلے اس شام کو تھی جب احمر نے پہلی بار محبت کا اعتراف کیا تھا۔ دونوں وقت جب ملتے ہیں تو یہ گھڑیاں نہایت ہی مختصر ہوتی ہیں۔ ایک کا آنا دوسرے کے جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ ان دونوں کی تقدیر میں بھی یہی لکھا جا چکا تھا۔

شائستہ کو گلے سے لگائے لگائے احمر کافی دیر تک روتا رہا۔ شائستہ خاموش تھی۔ جب رو رو کر دل ہلکا ہو گیا تو احمر نے شانوں سے پکڑ کر اسے خود سے علیحدہ کیا مگر اس کا ساکت جسم زمین پر گرتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر احمر کے حلق سے زوردار چیخ نکلی۔ شائستہ جا چکی تھی کہیں بہت دور۔ احمر کی چیخ سن کر تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہوا گل بھی دوڑتا ہوا قریب پہنچا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی شائستہ کے چہرے پر کی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بے نور ضرور تھیں لیکن ان میں سکون نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دو آنکھیں کہہ رہی ہوں کہ دیکھا میرا عشق......

احمر کی چیخ درگاہ کے مجاور نے بھی سن لی تھی۔ وہ بھی فوراً وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا۔ ''بے چاری کو سکون مل گیا۔'' یہ کہہ کر وہ میت کے لیے چارپائی لانے کا کہہ کر چل دیا۔ احمر نے کانپتے ہاتھوں سے اپنے شانوں پر پڑی ہوئی چادر اتاری اور اسے شائستہ کے مردہ تن پر ڈال دیا۔

ہجر کی طویل مسافت کے بعد چند لمحوں کا وصال......

بارش تھم چکی تھی...... رات کا اندھیرا غائب ہو رہا تھا...... صبح کا نور چہار سو پھیلتا جا رہا تھا...... لگتا تھا کہ جیسے یہ نورِ صبح شائستہ کے عشق کی سچائی کا نور ہو۔ احمر اپنی بدگمانی پر شدید پچھتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے لیکن اب سب کچھ بیت چکا تھا۔ شائستہ عشق کے چلّے میں کامیابی حاصل کر کے سرخرو ہوئی اور احمر تیس برس کی تپسیا کے باوجود ایک بار پھر خالی ہاتھ تھا۔



ایک تھی نیناں

راحت وفا

کچھ کھٹی سی، کچھ میٹھی سی ... کبھی شعلہ سی ... کبھی شبنم سی ... تھوڑی بھولی سی ... تھوڑی نادان سی ... محبت، نفرت اور اعتبار کے تکون میں سرگرداں ... رشتوں کے ٹکراؤ اور الجھاؤ کی داستان ... جس میں بھول اور نادانی کی کسک اور گناہ بے لذت کی حقیقت کا اسرار ہر قدم پر کچوکے لگاتا ہے۔

ایک نابغہ روزگار، پر تجسس، نفسیاتی اور رومانوی ناول جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا

قسط 5

Ayisha

چھنا کے سے کرسٹل کا واز کرچی کرچی ہوگیا۔ آواز سن کر بوا اور رابعہ ایک ساتھ دوڑ کر اس کے کمرے میں آئیں...... وہ غصے میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا، غصہ سہم کی صورت اختیار کرتا تو وہ ننھی منی رنگین چڑیا کی طرح دبک سی جاتی اور اگر غصہ ابال کی شکل میں ڈھلتا تو ایک دو چیز کی توڑ پھوڑ کے بعد وہ نارمل سے انداز میں چہل قدمی شروع کر دیتی۔ بوا واز کی کرچیوں کو سمیٹتے ہوئے آبدیدہ سی ہوگئیں۔ پرانی یادوں سے جڑا یہ واز ڈاکٹر مہ جبیں کے جہیز میں آیا تھا، ان کے کمرے میں کتنے زمانوں سے محفوظ تھا۔

''دھیرے دھیرے سب یادیں مٹتی جاتی ہیں۔'' بوا نے گلوگیر لہجے میں کہا تو رابعہ کو شدت سے احساس ہوا۔

''بوا! نیناں کو معاف کر دیں، مجھے معلوم ہے یہ امی جان کا پسندیدہ گلدان تھا۔''

''خیر، اتنے غصے کی وجہ کیا تھی؟'' طویل آہ بھر کے انہوں نے براہِ راست نیناں کو مخاطب کیا۔

''سب بابا جیسے ہیں، طلال بھائی، رمان بھائی سب برے ہیں۔'' وہ چلانے لگی تو طلال نہ چاہتے ہوئے بھی آواز سن کر کمرے میں آگیا۔

''ایکسکیوزمی! خبردار جو مجھے سب کے ساتھ ملایا۔''

''ارے کیوں نہ ملائیں، اس نے ہوش میں تم سب کو غصہ کرتے ہی دیکھا ہے اور طلال تم تو بالکل اپنی ماں جیسے ہو۔'' بوا کو غیر معمولی غصہ آگیا تو وہ چڑ گیا۔

''کیوں؟ میری ماں میں خرابی تھی؟''

''اخاہ! ارے بچے نہ منہ کھلواؤ، خرابی تو تم کیا سمجھو گے؟'' بوا نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''آپ جیسے ملازم ہی ہوتے ہیں جو گھر والوں میں کیڑے نکالتے ہیں۔'' طلال نے انتہائی بدتمیزی سے کہا اور چلا گیا جبکہ بوا کے ہاتھ کی مٹھی سختی سے بند ہوئی اور کرچیوں نے لہو بہا دیا۔ برسوں کی خدمت کا صلہ لمحوں میں وہ اس طرح دے گیا کہ وہ صدمے سے بے حال ہوگئیں، رابعہ اور نیناں کو افسوس ہوا۔

''بوا! اس کی بات کا برا نہ منائیں، آپ ہی تو کہتی ہیں کہ یہ وسیمہ باجی جیسا ہے۔'' رابعہ نے کہا تو انہوں نے رابعہ کی طرف دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''سوری بوا! سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' نیناں ان کے ہاتھ سے سب کرچیاں اپنے دوپٹے کے پلو میں ڈال کر بولی۔

''ارے وسیمہ تو طوفان برپا کر دیتی تھی، ایسے بہت سے گلدان، قیمتی برتن اٹھا اٹھا کر پٹختی تھی، ماں کی بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھاتی تھی۔''

''اور دادا جی انہیں کچھ نہیں کہتے تھے؟'' نیناں نے معصومیت سے پوچھا، ڈسٹ بن میں سب کانچ کے ٹکڑے اور ذرے جھاڑے۔

''دادا جی تمہارے تو بہت بڑے تاجر بن گئے تھے، وسیمہ کو وقت دینے کے بجائے آزادی اور روپیہ دیتے رہے۔'' وہ بولیں۔

''چلیں اٹھیں، میں ڈرائیور سے کہتی ہوں گاڑی نکالے۔'' نیناں نے کہا۔

''وہ کس لیے......؟'' انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

''ڈاکٹر کے پاس چلیں اور کس لیے......؟''

''نیناں ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' رابعہ نے تائید کی۔

''ایسے معمولی زخموں سے تو دامن بھرا ہے، میں ہاتھ دھو کر دوا لگا لوں گی۔'' انہوں نے کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

''مما! طلال بھائی نے بہت ہرٹ کیا ہے۔'' نیناں دکھ سے بولی۔

''ریحان اختر کا بھانجا اور کر بھی کیا سکتا ہے؟'' رابعہ کا منہ کڑوا ہوگیا۔

''اسی لیے مجھے کوئی مرد اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ بھی حقیقت نہیں ہے شاید......'' رابعہ نے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو وہ رمان کو بھی برا بھلا کہنے لگی۔

''رمان تو بہت اچھا ہے، میرا اور آپ کا خیال رکھتا ہے۔'' رابعہ نے بڑی نرمی سے کہا۔

''بس مجھے اچھی نہیں لگتیں ان کی حرکتیں۔'' وہ جھلا کر بولی۔

''کون سی حرکتیں......؟''

''بس چھوڑیں۔''

''شریر ہے، اس کی شرارت کو انجوائے کیا کرو۔''

''یہ آپ کہہ رہی ہیں......؟'' اسے خاصا تعجب ہوا۔

''ہاں! کیونکہ رمان کو میں جانتی بھی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں۔''

''بہر حال ان کی وجہ سے سب غلط ہوا، انہیں سمجھا دیں آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کریں۔''

''اسے سمجھانا مشکل ہے، اب اپنی پڑھائی کرو اور غصہ نہ کیا کرو۔'' وہ یہ کہہ کر چلی گئیں...... اس کے لیے ماں کی بات سمجھنا آسان نہیں تھا بس سوچتی رہ گئی۔

کبھی کبھی تو وہ مما کو بھی ایک پہیلی کے مانند بوجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے کبھی بابا ٹھیک لگتے اور کبھی مما...... اس کی ذات ماں باپ کے فاصلوں کی زد میں قید تھی۔ بابا کا بے پناہ پیار اور مما کی خوفزدہ سی ممتا اسے الجھا دیتی تھی۔

☆☆☆

سارا شہر سو گیا تھا مگر اُن کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ہلکی سی روشنی میں کمرے کی چار دیواری سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ بے بس اور بے اختیار، لاوارث اور بے نشان...... پلکوں سے موتی ٹوٹ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے...... مدتوں بعد دل کا درد جاگا تھا...... ایک بار پہلے ایسی زہر آلود برچھی دل و جگر کو چیرتی ہوئی گزری تھی...... جب ماں سے کڑوا بولتی وسیمہ کو انہوں نے سرزنش کی تھی اور وہ بپھر کر کمرے میں طوفان لے آئی تھی۔

''اوقات میں رہا کرو، گھر کی ملازمہ بن کر آئی ہو۔'' یہ جملہ یاد کر کے وہ اس وقت بھی بلبلا کر اٹھ

بیٹھیں...... اس رات بھی وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں، رات بھر جاگنے سے اور رونے سے آنکھوں کی حالت گوشت کی بوٹیوں جیسی ہوگئی تھی۔

''سکھاں! یہ تمہاری آنکھیں......؟'' ڈاکٹر مہ جبیں کے حلق میں... کئی کانٹے ٹوٹے۔

''کچھ پڑ گیا تھا......''

''نہیں، وسیمہ نے اچھا نہیں کیا۔'' وہ جان گئی تھیں۔

''سب اچھا ہے بی بی، میں جہیز کا سامان ہی تو ہوں، سونا موتی، کپڑے لتے، برتن، میز کرسیاں، قالین، مشین سب استعمال کے لیے آپ کو دی گئیں تو میں بھی کام کے لیے بھیجی گئی۔''

''نہیں، تم میرے لیے امید اور سہارا ہو، تمہارے ماں باپ نے، میرے ماں باپ نے جو بھی سوچا مگر میرے پاس تم نہ ہوتیں تو راجا صاحب مجھے مار ڈالتے۔'' وہ تڑپ اٹھیں۔

''ارے نہیں بی بی، راجا صاحب تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''جانتی ہوں میں مگر تم کیا ہو میرے لیے یہ یاد رکھنا۔'' وہ تھوڑا سا جھکیں اور سکھاں کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

''آپ وہم نہ کریں، یہ لیں دلیہ کھالیں۔''

''تم نے کچھ کھایا، نہیں کھایا ہوگا۔''

''مجھے تو بھوک کی خواہش بھی نہیں ہوتی، ماں اور باپ کی بھوک مٹاتے مٹاتے مجھے بھول گیا کہ بھوک بھی کوئی چیز ہے۔'' وہ اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

''تمہاری طرح راجا صاحب نے میری بھوک مٹا دی بلکہ میری ذات ہی مٹا دی۔'' وہ دکھ سے کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔

''ذات مٹ جائے تو اچھا برا احساس کہاں باقی رہتا ہے...... طلال نے کچھ غلط نہیں کہا...... میں نے ہی غلط سمجھ لیا...... میں بھول گئی، میرا یہاں سے کیا تعلق ہے، میری بی بی یہاں موجود ہیں، میں تو اُن کے لیے ہوں۔'' اپنے اندر کے غم کو مقفل کر کے انہوں نے بڑی ہمت سے کروٹ لی اور آنکھیں موند لیں...... تو موقع پا کر رحمت چھم سے آ گیا۔

''سکھاں...... سکھاں! اب تو آنکھیں کھول دے۔'' ان کے کان میں کہا گیا تو جھٹ سے آنکھیں کھل گئیں مگر کمرے میں تو کوئی نہیں تھا۔

''اللہ کے بندے، کیوں میرے صبر کو آزمانے آجاتا ہے؟'' انہوں نے خاصی بلند آواز میں اسے ایسے لتاڑا جیسے وہ سچ مچ ان کے سامنے کھڑا ہو، باتیں کر رہا ہو وہاں کوئی نہیں تھا مگر کچھ تو تھا کہ ایک بار پھر اُن کی بوڑھی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی...... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں دکھائی دینے لگا۔ انہیں یہ احساس تڑپانے لگا کہ اگر رحمت ہوتا تو وہ طلال کے کڑوے جملے سننے کے لیے یہاں نہ ہوتیں۔ کچی سوندھی مٹی کے چھوٹے سے گھر میں اس کے ساتھ من چاہی زندگی بسر کر رہی ہوتیں۔

''بوا! بوا!'' دروازے پر فیضو نے آواز دی تو وہ ہوش کی دنیا میں آ گئیں۔

''ہاں، ہاں، فیضو......''

''بوا! بابا مر گیا ہے۔''

''کو...... کون مر گیا......؟'' وہ گھبرا کر دروازے کی طرف لپکیں۔

''وہ جھاڑو دینے والا بابا، شام سے اس کی طبیعت خراب تھی۔'' فیضو ہمدردی سے بولا۔

''اب؟''

''ڈرائیور سے کہیں اس کے گاؤں میت چھوڑ آئے۔'' فیضو نے مشورہ دیا۔

''تمہیں اتا پتا معلوم ہے تو ڈرائیور کے ساتھ چلے جاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم، رحمت نام ہے، میں تو اتنا ہی جانتا ہوں۔''

''ر...... رحمت، کون رحمت؟'' وہ کپکپا اٹھیں۔

''جمعدار جھاڑو والا بابا......''

''میں نے کبھی نہیں دیکھا......'' ان کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

''چل کر دیکھ لیں پھر جیسا کہیں......'' فیضو نے کہا اور آگے چلا گیا...... ان کے قدم وہیں جم گئے...... دل کہتا چل کر دیکھ یہ رحمت کون ہے مگر ذہن نے تاویل پیش کی، چھوڑ نہ جاننا بہتر ہے، انجانے اور ان کہے حوالے اچھے ہوتے ہیں، کچھ دیر کی کشمکش کے بعد انہوں نے ریحان اختر کو جگانے کے خیال سے اُن کے کمرے کا رخ کیا۔

☆☆☆

جونہی طلال نے نیناں کے ہمراہ گاڑی گیٹ سے نکالی تو ریحان اختر نے بھی فوراً ڈرائیور کو آواز دی...... بریف کیس اٹھایا مگر بوا نے آ کر روک دیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، کل رات تک آؤں گا۔''

''اور وہ، وہ کون تھا؟'' دل میں پھنسی بات زبان پر آ ہی گئی۔

''وہ کون؟ رابعہ نے آپ کے بھی کان بھر دیے ہیں۔'' وہ کچھ سے کچھ سمجھ کر برسے۔

''وہ رحمت......؟'' وہ ہکلائیں۔

''رحمت مسیح، اس کی میت اس کے شہر بھیج دی ہے، کچھ پیسے بھی ساتھ دیے ہیں۔'' وہ عجلت میں بتا کر آگے بڑھ گئے۔

''رحمت مسیح......'' سہم زدہ ہونٹوں کے درمیان سے جملہ نکلا، ساتھ ہی دل کی بے قراری کو سکون سا آ گیا، انہیں انجانا سا خوف تھا جس میں درد اور ندامت کا احساس بھی شامل تھا کہ کہیں یہ وہ رحمت تو نہیں۔

''نہ، نہیں...... اللہ نہ کرے......'' بے اختیار ہی دل نے کہا تو رابعہ نے سن کر بے دھیانی میں پوچھ لیا۔

''کیا ہوا......؟''

''ہاں! کچھ نہیں، وہ بس وہم سا تھا۔'' وہ چونک کر بولیں۔

''آپ وہم کے لیے پریشان تھیں، مجھے دیکھیں جو حقیقت جان کر بھی زندہ ہوں۔'' رابعہ نے جس انداز

میں کہا تو انہوں نے غور سے دیکھا، سرخ آنکھیں بے ترتیب بال، سلوٹ زدہ کپڑے کچھ بھی تو ٹھیک نہیں تھا۔

''رابعہ! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''یہ حالت آپ کو پسند نہیں؟'' انہوں نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

''میری یہ حیثیت نہیں، بس اچھا لگنا چاہیے۔'' وہ طلال کے کڑوے جملے کے پس منظر میں بولیں۔

''جب اپنے گلے میں بازو ڈال کر تمام رات رونا پڑے تو ایسی حالت ہو جاتی ہے۔'' وہ صوفے پر گر سی گئیں۔

''کیا ضرورت ہے رونے کی، اسے تو پروا بھی نہیں رہی، تیار ہو کر شہر سے باہر چلا گیا۔'' وہ کافی سنجیدگی سے بولیں۔

''مجھے اس کے آنے جانے سے کچھ سروکار نہیں، بس وہ میری پروا نہ ہی کرے، ایک فریبی شخص کی پروا مجھے چاہیے بھی نہیں۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''کیوں نہ کرے، اسے اس طرح آزاد مت چھوڑو۔''

''ایسی کوئی خواہش میرے اندر نہیں رہی، مجھے تو دلِ ناداں کی تسلی کا کوئی افسانہ نہیں چاہیے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''رابعہ بیٹی! جانے کیا حقیقت ہے کیا افسانہ ہے......؟''

''میں دادی کے پاس جا رہی ہوں، نیناں چاہے تو اسے بھی میرے ساتھ بھیج دیں۔''

''مگر ریحان......''

''بوا! ریحان کی بات مت کیا کریں......'' وہ الجھیں۔

''سمجھو، وہ شہر سے باہر گیا ہے، مجھ سے پوچھے گا اور نیناں کیسے آئے گی؟''

''بوا! میں نے رات بھر سلگ کر گزاری ہے، مجھے سکون چاہیے، میں رکشے پر جا رہی ہوں، نیناں کو رمان آ کر لے جائے گا۔''

''رابعہ! فساد برپا ہوگا، طلال کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے، اپنی نیناں کا خیال کرو۔'' انہوں نے بہت پیار سے سمجھایا تو وہ کٹی پتنگ کے مانند دوبارہ اسی صوفے پر گر گئیں۔ نیناں ان کے لیے اہم تھی، بوا نے سچ ہی کہا تھا کہ طلال کو سمجھانا مشکل ہے اور سچ مچ وہ کوئی طوفان برپا کر دے گا، رمان سے تو اسے ویسے ہی اللہ واسطے کا بیر تھا۔

''آپ کا مطلب ہے، میں گھٹ گھٹ کے مر جاؤں؟'' کچھ دیر بعد انہوں نے دھیما سا شکوہ کیا۔

''راکھ کو کریدنا چھوڑو، ریحان کے سچ جھوٹ کا فیصلہ اللہ پر چھوڑو، کبھی تو سب سامنے آئے گا مگر اس وقت تک کے لیے خود کو سنبھالو۔'' انہوں نے مشورہ دیا۔

''مگر کیسے؟ وہ میرے سامنے آتا ہے تو مجھے کوفت ہوتی ہے۔''

''کہا نا کہ کچھ صبر سے کام لو، نیناں کے امتحان ہونے والے ہیں وہ پریشان ہوگی۔''

''میری نیناں کی قسمت اچھی ہو، وہ تو خود ڈسٹرب رہتی ہے۔'' وہ بولیں۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا، میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔'' بوا نے تسلی دی۔

''گرم پانی اور روئی بھی، میرے سر سے خون نکلا تھا۔'' انہوں نے سر کے بال ہٹاتے ہوئے وہ حصہ انہیں دکھانا چاہا جہاں چوٹ لگی تھی، درد تھا اور بال خون سے تر ہو کر جڑ گئے تھے۔

''کیسے...... کیسے چوٹ لگی......؟'' وہ تڑپ کر اس کے سر پر جھکیں۔

''اب تو سمجھ جایا کریں بوا......'' زخمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیل گئی۔

''ارے بچی......!'' بوا دکھی ہو کر فقط اتنا ہی بولیں اور باہر کو بھاگیں۔

☆☆☆

نیناں گلاس ویئر انڈسٹری کا مونوگرام بن کر آ گیا تھا، طلال نے غور سے دیکھتے ہوئے منیجر کو واپس کر دیا اور کہا۔

''یہ ایم ڈی صاحب کی میز پر رکھ دیں، فائنل تو انہوں نے کرنا ہے، میرے خیال میں تو ٹھیک ہے۔''

''جی بہتر......'' منیجر صاحب یہ کہہ کر چلے گئے تو طلال اپنے دوست بلال کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں! کیا کہہ رہے تھے تم......؟''

''پوچھ رہا تھا۔''

''کیا......؟''

''تمہاری نیناں کا دماغ نیچے آیا کہ نہیں؟''

''سوری یار...... تمیز سے، نیناں میری عزت ہے......'' اسے اچھا نہیں لگا۔

''سوری، ویسے عزت اور محبت میں فرق ہوتا ہے۔'' بلال نے معذرت کے ساتھ ہی ٹکڑا لگا دیا۔

''جس سے محبت ہو اس کی عزت بھی کی جاتی ہے۔''

''یار! تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔''

''ایسی بات نہیں ہے، بس نیناں میرے لیے بہت اسپیشل ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''جانتا ہوں، اس کے نام سے سارا کاروبار منسوب کر دیا ہے اس سے زیادہ اہم بات کیا ہوگی۔''

''یہ ماموں کا فیصلہ ہے۔''

''اور تمہارا کیا رہا؟'' بلال نے کچھ ذومعنی انداز اختیار کیا۔

''میرا سب کچھ، نیناں میری تو سب میرا......''

''اور اگر نیناں نہ مانی تو......''

''ماموں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، نیناں کی نہیں ماموں کی مرضی چلے گی۔'' وہ بولا۔

''پھر بھی اسے کچھ تو اختیار ہوگا؟''

''میں جانتا ہوں، کچھ بھی ہو نیناں میری ہی ہے۔'' وہ وثوق سے بولا۔

''اور وہ جو تم اس کے کزن کی بات کر رہے تھے؟'' بلال نے کہا۔

''وہ اوور اسمارٹ بننے کی کوشش کرتا ہے مگر ہاتھ کچھ آنے والا نہیں......'' اس نے خاصے فخریہ انداز میں سینہ پھلا کر کہا۔

"اوکے! وش یو گڈ لک، میں اب چلتا ہوں بیگم صاحبہ کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔" بلال اٹھ کھڑا ہوا تو اسے بھی ایک دم یاد آیا نیناں کو کالج سے لینا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہی باہر نکلا اور اپنی گاڑی کی طرف تیزی قدموں سے گیا جبکہ بلال نے اپنی گاڑی کی جانب رخ کیا...... طلال نے گاڑی سیدھی کر کے نکالی ہی تھی کہ موبائل فون بجنے لگا...... ان نون نمبر دیکھ کر اس نے فون ریسیو نہیں کیا مگر بار بار فون آنے کی صورت میں اٹینڈ کرنا پڑا۔

"جی......"

"مسٹر طلال! نیناں کو ڈرامے کی ریہرسل کے لیے کچھ دیر کالج میں رکنا ہے، لہٰذا آپ آنے کی زحمت نہ کیجیے۔" اجنبی بھاری سی آواز میں کہا گیا تو ایک لمحے کو وہ الجھن کا شکار ہو گیا۔

"کون سا ڈراما؟ کیسی ریہرسل؟ ہمارے علم میں نہیں، آپ کون ہیں......؟" اس نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے۔

"جناب! ڈراما فیسٹول ہے، اس کے لیے تیاری ضروری ہے، پلیز......" دوبارہ انتہائی مودب انداز میں کہا گیا۔

"پھر کتنے بجے لینا ہے......؟"

"تقریباً دو گھنٹے بعد......"

"مجھے ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔"

"کسی کو بھیج دیجیے گا۔"

"آج تو میں ایسا کر رہا ہوں، پر آئندہ مس نیناں ریحان کو روکنے کی اجازت نہیں۔" اس نے بڑے بارعب لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

"نیناں بیگم! تم نے بہت اختیارات استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں۔" کھولتے ذہن کے ساتھ اس نے نیناں کو مخاطب کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔

گھر تو آنا ہی تھا...... لہٰذا گھر کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی ڈال کر خود کو نارمل کیا...... کیونکہ غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... وہ سامنے ہوتی تو سوال جواب کرتا...... اب عدم موجودگی میں غصہ کرنا احمقانہ سی حرکت تھی یہی سوچ کر خود کو سمجھایا بجھایا اور گھر کے گیٹ پر ہارن دیا۔

☆☆☆

اسکرپٹ میڈم حمیدہ جمال کی میز پر رکھ وہ تیز قدموں سے باہر نکلی، نیناں اس کے پیچھے پیچھے آوازیں دیتی باہر آئی۔

"مدیحہ! یہ بری بات ہے۔" بالکل برابر پہنچ کر کہا تو وہ وہیں کامن روم کے سامنے والی سیمنٹ کی بینچ پر ٹک گئی۔

"کوئی بری بات نہیں ہے، بس میں یہ کردار نہیں کر سکتی۔" مدیحہ کے پتلے پتلے ہونٹوں سے جملہ نکلا۔

"مگر کیوں؟" نیناں کو حیرت ہو رہی تھی اتنی اچھی ایکٹنگ کرنے والی مدیحہ کو اچانک کیا ہو گیا تھا۔

"نیناں! مجھے یہ اسکرپٹ پسند نہیں۔"

"اور اتنی ریہرسل کے بعد یہ کہہ رہی ہو......" نیناں نے کہا۔

"میرا کردار تو آج ہی سامنے آیا، اس لیے میں ڈراما نہیں کر سکتی۔" مدیحہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"مدیحہ کردار تم پر خوب جچ رہا ہے، میڈم کیا سوچیں گی؟"

"کچھ نہیں، بس میری مرضی......" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"مدیحہ! تم میری اچھی کالج فیلو ہو، پہلا موقع ہے کہ تم اس طرح سنجیدہ اور اکھڑی اکھڑی ہو......" نیناں نے اس کا سانولا سا ہاتھ تھام کر کہا۔

"نیناں! میرا خیال ہے مجھے گیٹ پر دیکھنا چاہیے، زلفی بھائی آ گئے ہوں گے۔"

"کمال ہے تمہیں کیا ہو گیا، میں اکیلی کیسے رہوں گی؟ مجھے تو لیٹ لینے آئیں گے۔" نیناں نے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو۔"

"تمہارے ساتھ، کہاں؟"

"میرے گھر، یہاں اکیلے بیٹھنے سے بہتر ہے۔" وہ اس کا جواب سنے بنا ہی کھڑی ہو گئی۔

"طلال بھائی ناراض ہوں گے۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"بزدل کہیں کی......" مدیحہ کو ہنسی آ گئی۔

"تمہارے بھائی اور بابا میرے جیسے ہوتے تو پھر پوچھتی......" وہ برا مان گئی۔

"نیناں! کبھی کہتی ہو کہ بابا بہت پیار کرتے ہیں۔"

"مگر مما سے تو...... خیر تم جاؤ میں طلال بھائی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔" وہ کچھ کہتے کہتے ٹال گئی۔

"مگر میں حیران ہوں کہ تم بڑے امرا کا اصل مسئلہ کیا ہے؟" مدیحہ نے تعجب سے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں ہو سکا مگر اتنا ضرور ہے کہ مجھے تمہارے جیسی زندگی پسند ہے۔"

"مت کرو مائی ڈیئر غیر حقیقی باتیں، ہم کیا اور ہماری زندگی کیا؟" مدیحہ نے خاصی طنزیہ بات کی تو نیناں کو غصہ آ گیا۔

"اوکے! میرا خیال ہے تم جاؤ۔"

"میڈم کو سمجھا دینا......" وہ جاتے جاتے بولی۔

"ایک بار پھر سوچ لو، اب فوری طور پر یہ کردار ڈھونڈنا مشکل ہو گا۔"

"نیناں! بس میں معذرت چاہتی ہوں۔" وہ بجھ سی گئی۔

"تمہاری تم جانو مگر میرا مشورہ یہی ہے کہ پلیز کر لو۔"

"کبھی وقت ملا تو بات کریں گے۔" وہ کرب ناک سے لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

کالج میں اکا دکا طالبات آ جا رہی تھیں، عجیب سی ویرانی ہو گئی تھی، اس نے بیگ کندھے پر ڈالا اور موبائل فون سے طلال کا نمبر ملایا مگر مسلسل بیل ہونے کے باوجود فون اٹینڈ نہیں ہوا تو وہ خوفزدہ سی ہو گئی اور طلال کے

ناراض ہونے کا سوچ کر ہی عجیب سی فکر لاحق ہوگئی۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ گیٹ تک آ گئی...... طلال نے فون اٹینڈ نہیں کیا تو اس نے مما کا نمبر ملا کر گاڑی بھجوانے کو کہا۔

☆☆☆

دروازہ کھلتے ہی وہ پٹ پٹ کرتی سیدھی صحن عبور کر کے کمرے میں چلی گئی...... زلفی نے موٹر سائیکل اندر لاتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

"مدیحہ کو کیا ہوا ہے؟"

"ہیں! آئی تمہارے ساتھ ہے، پوچھ ہم سے رہے ہو۔" اکبری بیگم نے بیٹے سے بات کرتے کرتے پالک کاٹتی آپا کو دیکھا۔ آپا نے چھری اور پالک وہیں چھوڑ کر پریشانی سے زلفی کی طرف دیکھا اور سلیپر پیروں میں ڈال کر اپنے اور مدیحہ کے مشترکہ کمرے کا رخ کیا، وہ چارپائی پر لیٹی بازو کو آنکھوں پر رکھے آپا کو یقین دلا گئی کہ کوئی بات ضرور ہے۔

"مدیحہ...... مدیحہ!" انہوں نے پیار سے پکارا تو وہ کسمسائی۔

"آپا، پلیز مجھے سونے دو۔" ماں باپ کی طرح وہ بھی انہیں آپا ہی پکارتی تھی۔

"یہ سونے کا کون سا وقت ہے؟ اور کھانا کھائے بغیر ہی......"

"آپا بھوک نہیں، نیناں نے کینٹین سے بہت کچھ کھلا دیا تھا۔"

"تو نہیں کھانا تھا۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"دو وجوہات ہیں۔" وہ دھیرے سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"کون سی؟"

"تمہارے بنا میں کھانا نہیں کھاتی اور امیر کبیلی کے ساتھ اپنی عادت کبھی خراب نہ کرنا۔"

"نیناں تو بہت اچھی ہے، بے چاری پتا نہیں اب تک گھر پہنچی کہ نہیں......" اسے نیناں کا خیال آیا تو سب کچھ بھول کر اٹھ بیٹھی۔

"کیا مطلب......؟"

"بس میں نے ریہرسل سے انکار کر دیا تو......" وہ بتاتے بتاتے رک گئی۔

"ریہرسل کے لیے رکی تھیں تو انکار کیوں کیا......؟"

"بس مجھے کردار پسند نہیں آیا، میڈم چاہتی ہیں کہ میں وہی کروں۔"

"تو کرو ناں......"

"نہیں، آپ کو نہیں پتا وہ کون سا کردار ہے؟" وہ چپ سی ہوگئی۔

"ایسا کون سا کردار ہے۔"

"آپ چھوڑیں، چلیں کھانا لائیں، کھاتے ہیں۔" وہ ٹال گئی۔

"چلو ہاتھ منہ دھو لو مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں ڈراما کرنا چاہیے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"آپا، ڈراما، ڈراما ہوتا تو کر لیتی۔" وہ مبہم سا جواب دے کر باہر برآمدے میں رکھی میز اور کرسی پر آ کر بیٹھ گئی...... وہاں زلفی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اسے دیکھ کر اس نے کچھ سوچا اور دھیرے سے بولا۔

"آپا کو ٹف ٹائم کیوں دیتی ہو......؟" وہ چپ رہی کیونکہ زلفی بھائی کے ساتھ وہ بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"وہ اب تک بھوکی ہیں اور تمہارے نخرے ختم نہیں ہوتے۔" وہ کھانا ختم کر کے دوبارہ بولا تو جواب دینا پڑا۔

"یہ میرا اور آپا کا معاملہ ہے زلفی بھائی......" تین سال بڑے زلفی کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

"امی! آپا! آپ کی مدیحہ بیگم کے دماغ میں کسی کیڑے نے جنم لیا ہے، ہوشیار ہو جائیں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا...... آپا نے مسکرا کر کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھ دی اور دُلار سے بولیں۔

"بھائی کی باتوں کا برا نہیں مانتے، بھائی بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر انہیں آنکھوں کے کونے دوپٹے کے پلو سے صاف کرنے پڑے...... مدیحہ کا دل درد سے کٹ کے رہ گیا۔

☆☆☆

طلال اپنے بیڈروم کو لاک کر کے سو گیا تھا...... رمان آؤٹ آف اسٹیشن تھا، رابعہ نے دادی کو فون کر کے ڈرائیور بھجوانے کو کہا تو وہاں سجان موجود تھے انہوں نے فوراً نیناں کو لانے کی ذمے داری لے لی، زیتون بیگم سے اجازت لی اور چلے آئے۔ نیناں انہیں دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی مگر انہوں نے اس کے لیے گاڑی کا فرنٹ دروازہ کھول کر حیرت اور پریشانی دونوں دور کر دیں۔

"مجھے آپ کی بڑی امی اور مما نے بھیجا ہے شاید ڈرائیور نہیں تھا۔"

"اوہ! آپ کو زحمت دی ہے۔" وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

"یقیناً مگر اب تو زحمت ہم نے اٹھا لی بچے......" وہ بہت اپنائیت سے بولے اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ نیناں کو ان کا انداز اچھا لگا۔

"ویسے اتنا لیٹ، آئی مین کالج ٹائمنگز......؟" وہ کچھ تذبذب کا شکار تھے۔

"دراصل! ڈراما فیسٹول ہو رہا ہے، اس کی تیاری کرنی تھی۔"

"کر لی......؟" انہوں نے سرسری طور پر پوچھ لیا۔

"اونہہ، مدیحہ نے سب گڑبڑ کر دی......" وہ منہ بسور کر بولی۔

"کون مدیحہ؟"

"میری فرینڈ ہے، اس نے اسکرپٹ پڑھ کر انکار کر دیا اور چلی گئی۔"

"یہ تو اس نے برا کیا لیکن کوئی وجہ......"

"پتا نہیں، بس ایکدم ہی اس کا موڈ خراب ہو گیا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"خیر آپ اپنا موڈ ٹھیک کرو، گھر کے قریب پہنچ چکے ہیں۔" گیٹ سے ذرا فاصلے پر انہوں نے گویا اطلاع دی تو وہ نارمل ہوگئی۔

"مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔" انہوں نے ہنس کر کہا تو وہ ہولے سے بادِ نسیم کے جھونکے کے مانند

مسکرادی۔
''بالکل اپنی مما کی طرح مسکراتی ہو۔'' گیٹ پر گاڑی روک کر ہلکا سا ہارن دے کر انہوں نے غیر ارادی طور پر کہا۔
''میری مما مسکراتی بھی ہوں گی، یہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔'' گاڑی سے اترتے ہوئے وہ بولی۔
''کیوں، آپ نے مما کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' پورچ سے مین دروازے کی طرف چلتے ہوئے انہوں نے پوچھا تو اس نے نفی میں گردن ہلادی...... اب سجان کے چونکنے کی باری تھی۔
''کمال ہے، رابعہ تو مسکرانے کا، قہقہہ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔'' وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔
''جیتے رہیے سجان میاں......'' زیتون بیگم نے تشکر آمیز لہجے میں دعا دی تو انہوں نے جانے کی اجازت طلب کی۔
''اجازت دیجیے، تایا ابا فکر مند ہوں گے۔''
''ارے ابھی نہیں، رابعہ سے مل کر جانا، اسے رمان لے کر آئے گا۔''
''ہاں! سجان انکل پلیز......'' نیناں نے بھی اپنائیت سے کہا۔
''نہیں دادی، میں پھر آجاؤں گا، رمان نے دوسرے شہر سے آنا ہے اور پھر رابعہ کو لانا ہے...... میرے تایا ابا شہر میں منادی کرادیں گے۔'' انہوں نے بڑے جولی موڈ میں کہا تو زیتون بیگم نے اجازت دے دی۔ نیناں ہلکی سی اداس ہوگئی۔
''آپ ہمارے گھر آیا کریں، مما کو خوشی ہوگی۔'' وہ بولی۔
''کاش! میں ایسا کرسکتا۔'' وہ خود بھی اداس ہوگئے۔
''بس اللہ ہی میری رابی کو خوش رکھے، آمین۔'' زیتون بیگم نے بے اختیار ہی دعا کی۔
''او کے اللہ حافظ......'' وہ بولے۔
''اللہ حافظ......'' اس کے لبوں سے بڑی مشکل سے ادا ہوا شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جائیں۔ ان سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا مگر وہ چلے گئے تب وہ بڑی امی کہہ کر ان سے لپٹ گئی...... وہ اسے لپٹائے لپٹائے صوفے پر بیٹھ گئیں...... اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں گلو اس کے لیے ٹرے میں کھانا لے کر وہیں آگیا۔
''چلو جلدی سے ہاتھ دھوکر آؤ۔''
''مگر بڑی امی مجھے تو بھوک نہیں ہے۔''
''فضول باتیں نہیں بلکہ لاؤ گلو ہم خود نیناں کو کھانا کھلائیں گے۔'' انہوں نے گلو کے ہاتھ سے ٹرے لے کر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ تینوں زیتون بیگم کے کمرے میں تھے۔ رمان سفر کی تھکان کے باعث بیڈ پر ترچھا سا لیٹا تھا...... رابعہ

اور نیناں بڑے عرصے بعد ٹی وی کی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔ زیتون بیگم...... کمرے میں آئیں تو ایک دم ہی رمان نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا اور کہا۔
''کسی کو میرا خیال نہیں......''
''ہیں! یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' زیتون بیگم نے کہا۔
''آپ دیکھ رہی ہیں دونوں ماں بیٹی کتنی محو ہیں، میں رابی خالہ کو لے کر آیا ہوں اور یہ آکر بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئی ہیں۔''
''رمان بھائی! آپ لڑائی کے بہانے کیوں ڈھونڈتے ہیں؟'' نیناں نے کہا۔
''زیادہ باتیں نہ بناؤ، آج کا ٹیسٹ دو لے کر کاغذ پین۔'' وہ اکڑ کر بولا۔
''میں نے ٹیسٹ تیار نہیں کیا۔''
''کیوں، تمہیں اندازہ ہے نیناں بیگم کہ امتحان کتنے قریب آچکے ہیں؟''
''دراصل......'' وہ ہکلائی۔
''اچھا، اچھا جاؤ کافی بنا کر لاؤ۔'' اس نے شرارت سے تحکمانہ لہجے میں کہا تو اسے برقی رو چھو گئی۔
''یہ میری بڑی امی کا گھر ہے یہاں میں آپ کی نوکر نہیں ہوں۔''
''واہ! تو یہ میری بھی بڑی امی کا گھر ہے، میں یہاں کا مالک ہوں۔'' وہ دوبدو ہوگیا۔
''ہونہہ، کیا مصیبت ہے......؟'' نیناں پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی...... تو رابعہ اور زیتون بیگم نے اسے گھیر لیا۔
''رمان کیوں ستاتے ہو؟''
''رابی خالہ! آپ نہیں جان سکتیں......'' وہ مسکرایا۔
''کیوں......؟''
''ابھی تو آپ کی بونگی بیٹی نہیں جان سکی، کیوں بڑی امی؟'' اس نے شرارت سے آنکھ دبا کر زیتون بیگم کو مخاطب کیا۔
''شریر! خبردار جو میری نیناں کو بونگی کہا۔'' زیتون بیگم نے اسے لتاڑا۔
''بونگی ہی تو ہے، کچھ بھی نہیں سمجھتی۔''
''جو آپ اسے سمجھانا چاہتے ہو وہ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' رابعہ نے گھور کر جواب دیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا مگر ہنستے ہنستے اسے بریک لگ گئی۔ گلو کی ہمراہی میں طلال بڑے کروفر کے ساتھ آرہا تھا۔ وہ تینوں چپ سے ہوگئے تو گلو نے ہی زبان کھولی۔
''میری بیوی مرحومہ کہتی تھی مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔''
''بہت بہت شکریہ! آپ نے معلومات عطا فرمائیں۔'' رمان نے طلال کو نظر انداز کرکے گلو کی بات کا مذاق اڑایا۔
''بیٹھو طلال بیٹا......'' زیتون بیگم نے کہا تو ازراہِ رسم رمان نے اس سے مصافحہ کیا۔

''جی شکریہ، جلدی ہے، چلیں مامی......'' طلال نے رابعہ کو مخاطب کیا۔

''ارے ایسی بھی کیا جلدی، میں چائے بنواتی ہوں۔'' زیتون بیگم گلو کو اشارہ کرتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

''طلال! ریحان اختر نے دو ڈرائیور رکھے ہوئے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ کو ہمارے لیے کیوں آنا پڑتا ہے؟'' رابعہ کو چڑ سی تھی۔

''یہ ماموں سے ہی پوچھیے گا، مجھے بزنس ڈنر پر جانا ہے آپ جلدی چلیں۔'' وہ خشک سے لہجے میں ابرو چڑھا کر بولا۔

''یار! آپ جاؤ میں چھوڑ دوں گا۔'' رمان نے آفر پیش کی جو کہ طلال کو اور زیادہ بری لگی۔

''کیوں؟ اس اتنے بڑے گھر میں ایک بھی ڈرائیور نہیں......؟''

''ہم اپنوں کو پیار سے لاتے اور لے جاتے ہیں۔'' رمان نے چسکا لیا۔

''طلال! ہم کل آئیں گے، میں نے بوا کو فون کر دیا ہے۔'' رابعہ نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں۔

''بوا گھر کی ملازمہ ہیں مامی......'' اس نے جتایا۔

''وہ آپ کی نانو کے ساتھ اس گھر میں آئی تھیں سمجھے......'' رابعہ نے مڑ کر تلخ جواب دیا تو وہ احساس توہین سے سرخ پڑ گیا۔

''مگر وہ میری نانو نہیں ہیں۔''

''کون کیا ہے اس بحث میں مجھے نہیں پڑنا......'' رابعہ یہ کہہ کر چلی گئیں تو طلال بھی پھنکارتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو یار! بڑی امی چائے بنوا چکی ہوں گی......'' رمان نے کہا۔

''میں جلدی میں ہوں......'' اس نے تن کر کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

میڈم حمیدہ کی آنکھوں میں جلال ہی جلال تھا۔ وہ دونوں خفت و خجالت سے سر جھکائے کھڑی تھیں...... ان کے پیچھے اور چند طالبات موجود تھیں۔

''خود سوچو، تینوں ہاؤسسز کے ڈرامے تیار ہیں اور ہم انکار کر کے مطمئن ہیں۔'' انہوں نے لتاڑا، وہ چپ رہیں تو وہ اور زور سے گرجیں۔

''جواب دو مدیحہ رمضان، نیناں ریحان، میں پرنسپل کو کیا جواب دوں؟''

''سوری میڈم!'' نیناں نے کہا۔

''فار واٹ! میری بے عزتی کرانے کے لیے؟'' وہ تاؤ کھا گئیں۔

''ایکچولی! میڈم میں نے انکار ڈرامے سے نہیں، اس ڈرامے سے کیا ہے، اس کردار سے کیا ہے......؟'' مدیحہ میں ایک دم ہی جرأت آ گئی کہ میڈم حمیدہ کے غصے کی پروا کیے بغیر کہہ دیا۔

''کیا...... کیا کہا......؟''
''مجھے یہ کردار نہیں کرنا، آپ کسی اور سے کروالیں۔''
''اس وقت لاسٹ اسٹیج پر آپ مجھے مشورہ دے رہی ہو؟'' انہوں نے سختی سے پوچھا۔
''سوری میڈم!'' وہ فقط اتنا بولی۔
''یہ ڈراما تو کرنا ہے، میں پرنسپل صاحبہ کو کیا جواب دوں گی؟''
''میڈم! آپ مدیحہ کی جگہ کسی اور کو یہ کردار دے دیں۔'' نیناں نے لقمہ دیا۔
''تو پہلے یہ کہنا تھا، اب کس کا آڈیشن لوں اور کس کو ریہرسل کراؤں......؟'' وہ پھر خاموش ہوگئیں...... تو میڈم حمیدہ غصے سے لال پیلی ہوگئیں۔
''گیٹ آؤٹ، چلی جائیں آپ لوگ......''
''سوری میڈم!''
''نو سوری، میں نے کہا کہ آپ لوگ جائیں......'' وہ سر تھام کر بیٹھ گئیں...... نیناں کو ان پر خاصا ترس آیا۔ باہر آکر اس نے مدیحہ کو کچھ سختی سے لعن طعن کیا۔
''اپنے استاد کی تمہاری نظروں میں ذرا سی بھی عزت نہیں۔''
''نیناں! اپنی حد میں رہو، میری سہیلی ہو بس......'' مدیحہ کو جانے کیا ہوگیا تھا۔ نیناں دنگ رہ گئی۔
''مدیحہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ معمولی سی بات کو ضد بنالی۔''
''بس یہی تو بات ہے...... معمولی جان کر ہم عمر بھر اس کی سزا بھگتتے ہیں۔''
''ویسے بات کیا ہے؟ مجھے بتاؤ، کیوں ڈسٹرب ہو؟'' نیناں کو سنجیدہ ہونا پڑا کہ کچھ تو ہے۔
''بڑے لوگوں کو بتانے سے فائدہ......؟'' مدیحہ نے ایک دم طنز کیا۔
''کیسی باتیں کرتی ہو...... فار گاڈ سیک......!'' نیناں کو غصہ آگیا اور رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔
''سوری نیناں، بات کچھ نہیں ہے، بس میں نے ہی زیادہ محسوس کرلی ہے۔'' وہ کچھ شرمندہ سی ہوکر بولی۔
''اٹس او کے! لیکن مجھے یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے۔'' نیناں نے اس کی تسلی کو دل سے قبول نہیں کیا۔
اسی وقت بریک ٹائم ہوگیا۔ مدیحہ نے اپنے بیگ سے اخبار میں لپٹا پراٹھا اور آملیٹ نکالا اور بینچ پر درمیان میں کھول کر اسے دعوت دینے لگی تو نیناں نے نفی میں گردن ہلادی۔
''میں ناشتا کر کے آئی تھی۔''
''ٹھیک ہے۔'' مدیحہ نے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے کہا اور تیزی سے کھانے لگی، نیناں کو صاف اس کے کھانے کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کی لڑائی کو چھپانا چاہ رہی ہے مگر اس وقت کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں تھا لہٰذا وہ انگلش کا ناول نکال کر ورق گردانی کرنے لگی جبکہ مدیحہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مزے سے ٹھنڈا پراٹھا کھانے میں مگن رہی اسے دائیں بائیں آنے جانے والوں کی تنقیدی نگاہوں کی بھی پروا نہیں تھی...... اپنی حیثیت اور اوقات میں مست مدیحہ کو اپنی آپا کے لفظوں کا پاس تھا۔

☆☆☆

کئی روز سے ہونے والے گھٹنے کے درد نے شدت اختیار کرلی تھی۔ طاہرہ اور دعا بہت خیال رکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ریسٹ کی پابندی، دوائیں استعمال کراتا...... دعا تو عارفہ کی پٹی سے لگ گئی تھی...... رمان کو ماں کی فکر بہت تھی لیکن تھوڑی سی بے فکری بھی تھی کہ ماں کی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔
ماسی نے واشنگ مشین لگائی تو دعا نے جلدی جلدی بیڈ شیٹس، تکیے کے کور، رمان اور عارفہ کے واش روم سے میلے کپڑے اس کو لاکر دیے۔ عارفہ نے آواز دے کر کہا۔
''دعا بیٹا! رمان کی عادت ہے کہ وہ کمرے میں بھی دائیں بائیں شرٹس اور بنیان وغیرہ ڈال دیتا ہے۔''
''جی مامی......'' وہ تو اس کو اپنی خوش بختی سمجھتی تھی کہ رمان کو چھو کر گزرنے والی ہوا کو بھی ہاتھوں میں تھام لے، بانہوں میں بھر لے لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا، وہ لپک کر اس کے کمرے میں گئی تو سچ مچ بیڈ کے دوسری طرف گلت میں اتار کر پھینکی ہوئی سوفٹ پنک شرٹ پڑی تھی۔ اس نے بڑی اپنائیت سے اسے اٹھایا، بے اختیار رہی مٹھیوں میں دبا کر ناک کے نتھنوں تک لائی اور پھر رمان کے بدن کی مخصوص مہک اور پرفیوم کی سحر انگیز خوشبو نے مل کر اسے بے خود بنادیا...... آنکھیں موند کر وہ اس معطر احساس کو اپنی روح تک میں اتارتی رہی۔
''رمان! خدا کے لیے، بس ایک پل، صرف ایک پل ایسا مہکا مہکا سا دے دو جس میں زندگی کی ساری خوشیاں ہوں، تمہارا سارا پیار ہو۔''
''ہوں! دیکھو کپڑے سونگھنے سے کپڑوں کے رنگ خراب ہو جاتے ہیں اور سونگھنے والے کو دمہ ہو جاتا ہے۔'' پشت پر سے رمان کی شوخ آواز آئی تو وہ چونکی شرٹ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شرمندہ سی ہو کر نظریں جھکالیں۔
''ویسے میری چند شرٹس جو بے رنگ سی ہوگئی ہیں، وجہ آج معلوم ہوئی ہے۔'' اس نے اس کی چپ اور شرمندگی سے فائدہ اٹھایا۔
''وہ شرٹس نیناں کو دے دو، اس کے سونگھنے سے ٹھیک ہوجائیں گی۔'' وہ حواس بحال کر کے حملہ آور ہوئی۔
''خالی شرٹ اسے کیوں دوں......؟'' اس نے مزہ لیا۔
''ہوں! جانتی ہوں۔''
''پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو ڈیئر......؟'' وہ ضروری کاغذات لینے کے لیے گھر آیا تھا، کمرے میں اسے دیکھ کر شرارت سوجھ گئی...... یاد آیا تو الماری کھول کر مطلوبہ کاغذات کی فائل نکالنے لگا۔
''بہت ناز ہے اس بات پر......'' وہ دکھی سی ہوگئی۔
''کس بات پر......؟'' فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بے دھیانی سے پوچھا۔
''کہ نیناں بھی تمہیں گھاس ڈالے گی۔'' وہ جل کر بولی۔
''نیناں پاگل ہے کیا کہ ایک خوبرو نوجوان کو گھاس ڈالے۔'' اس نے فائل بند کر کے پوری طرح متوجہ ہو کر جواب دیا۔

''نیناں...... نیناں، بس کرو میرے کان پک گئے ہیں۔'' اسے شدید غصہ آ گیا۔

''دعا فاطمہ! تمہارا دماغ چل گیا ہے، میں کہتا ہوں طاہرہ پھپھو کو کہ تمہارا علاج کروائیں۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا تو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے موتی ٹوٹ کر برسنے لگے۔ کس حسرت سے اس کے بدن کی لطافت کو محسوس کیا تھا، کس چاہ سے تمنا کی تھی سب ہوا میں اڑا کے وہ چلا گیا۔ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر وہ اشک بہانے لگی۔

''رمان! تم کس قدر سنگ دل ہو، میری چاہت تمہیں دکھائی نہیں دیتی اور جو تمہیں دیکھتی نہیں وہ تمہارے ذہن میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔'' اس نے سائڈ ٹیبل پر مسکراتی رمان کی تصویر سے کہا مگر کوئی جواب نہیں آیا کچھ لمحات اسی کیفیت میں گزر گئے تب شرٹ اٹھا کر افسردہ خاطر سی باہر آ گئی۔ عارفہ نے بلایا تو آنکھیں صاف کر کے ان کے کمرے میں آ گئی۔

''جی مامی!''

''دعا مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ خود پر اتنا ظلم کرو۔'' اس کی نم آلود آنکھوں نے راز افشا کر دیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ انجان بن گئی۔

''بیٹا، مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے، میں کیسے آپ کو سلگتا دیکھوں؟''

''مامی، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ میری فکر نہ کریں۔'' اس نے تسلی دی۔

''دعا بچے میں رمان کی ماں ہوں، اسے اچھی طرح جانتی ہوں لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی ماں کی بات مان لو جو بھی اب آئے اسے قبول کر لو۔'' انہوں نے خاصا بے تکلف رویہ اختیار کیا تو اسے اچھا نہیں لگا۔

''مامی! آپ مجھے راستے سے نکالنا چاہتی ہیں، رمان کی مرضی پوری کرنا چاہتی ہیں۔''

''ارے نہیں میری بچی۔'' وہ تڑپ اٹھیں اسے گلے لگا لیا۔

''کاش...... میں ایسا کر سکتی۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

''اور کاش! میرا کوئی دوسرا بیٹا بھی ہوتا مگر کیا کروں؟'' وہ شکست خوردہ سی ہو کر بولیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں اللہ مالک ہے۔'' وہ بڑے پیار سے کہہ کر چلی گئی۔ عارفہ مضمحل سی اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں لیے کچھ سوچتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پاگل سی لڑکی کو کیا سمجھائیں اور کس طرح بتائیں کہ دشتِ طلب میں کبھی کبھی انسان کی اتنی سی اوقات رہ جاتی ہے کہ سکے کی طرح دستِ گدا گر پر جا گرتا ہے...... یہ طلب کا صحرا بے نشاں، بے نور ہوتا ہے اس میں دیوانگی کا مقام سسی پنوں جیسا ہے مگر ان کے لیے جو یک طرفہ آگ میں جل رہے ہوں وہ صرف صحرا کی دھول کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ انہوں نے دعا سے محبت کے باعث اس کے حوالے سے سوچا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم کی لائٹس آن دیکھ کر ریحان اختر وہیں آ گئے۔ رمان، نیناں کو پڑھا رہا تھا۔ انہیں غیر معمولی خوشی ہوئی اندر آ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

''رمان یار، میری نیناں کو میتھس کا چیمپئن بنا دو۔'' ان کی ہر خوشی کا مرکز نیناں تھی اس لیے انہوں نے

وہیں سے بات شروع کی۔

''معاف کریں انکل، نیناں کا دماغ ہے ہی نہیں اور میتھس دماغ والے سیکھتے ہیں۔'' وہ شرارت سے باز نہیں آیا۔ نیناں نے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

''نہیں، نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہ دماغ کے معاملے میں اپنے دادا پر گئی ہے۔'' ریحان اختر کا لہجہ فخر سے رنگین ہو گیا، سینہ پھول گیا۔

''آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میرا تو مشورہ ہے کہ نیناں کی آنکھیں، کان سب چیک کرائیں۔'' ذومعنی جملہ کہہ کر نیناں کی طرف دیکھا۔

''جی نہیں، میں دیکھ سکتی ہوں، سن سکتی ہوں۔''

''ہا...... ہاہاہا......!'' ریحان اختر نے قہقہہ لگایا۔

''اچھا یہ بتاؤ تو میں کیسا دکھتا ہوں، کیسا بولتا ہوں؟'' اس نے مزید تنگ کیا تو وہ چپ ہو گئی۔

''بتا دو کہ آپ اچھے ہو۔'' ریحان اختر نے نیناں سے کہا مگر وہ نظریں نیچی کر کے بیٹھی رہی۔

''دیکھا آپ نے، یہ بول بھی نہیں سکتی۔'' رمان نے موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

''آپ کام کرو، میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر گپ شپ کریں گے۔'' ریحان اختر نے کہا اور اٹھ کر باہر چلے گئے تب نیناں نے غرا کر اسے دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو سفید بلی؟''

''رمان بھائی آپ......'' اس نے انگلی کے اشارے سے غصے کا اظہار کیا مگر اس نے بڑے پیار سے اس کی انگلی پکڑ کر نرمی سے کہا۔

''کتنی بار کہا ہے کہ طلال بھائی اور رمان احمر صرف رمان ہے تمہارے لیے۔'' اس کی آواز کا زیر و بم اور آنکھوں میں چھپا شوق کا عالم...... نیناں کچھ گڑبڑا سی گئی جلدی سے نوٹ بک پر نظریں جمالیں۔

''اب جواب دو ناں!''

''وہ بس آج اتنا کام کافی ہے، باقی کل۔'' وہ یکدم ہی چیزیں سمیٹنے لگی۔

''ٹھیک ہے، میں رابی خالہ سے مل لیتا ہوں۔''

''یہ بابا سے پوچھنا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیوں، کیوں معلوم نہیں؟'' اس نے جرح کی۔

''مما سوئی ہوں گی اور بابا بول رہے ہوں گے۔'' وہ فقط اتنا کہہ کر باہر چلی گئی جبکہ وہ الجھن کا شکار ہو گیا۔ اس کی بات میں عجب سا اسرار تھا۔ الجھا الجھا سا باہر نکلا تو قدم پتھر کے ہو گئے۔ انکل ریحان کی غصیلی آواز اور رابی خالہ کا احتجاج صاف سنائی دے رہا تھا۔

''جی تو چاہتا ہے کہ تمہارا گلا دبا دوں مگر پھر خیال آ جاتا ہے۔'' ریحان انکل کی آواز تھی۔

''یہ حسنِ سلوک کر ہی ڈالو...... میری بھی یہی خواہش ہے۔''

''بکواس بند کرو مجھے اپنی بیٹی کا خیال ہے ورنہ......''

''ورنہ کیا، بتاؤ بیٹی کو کہ تمہاری اصلیت کیا ہے؟ دکھاؤ وہ ثبوت جو تم نے غائب کر دیے ہیں۔ کاش...... میں نے تم سے شادی کا فیصلہ ہی نہ کیا ہوتا۔''

''ہاں...... تو نہ کرتیں، کرلیتیں اس دو ٹکے کے پروفیسر سے...... اب بھی کچھ نہیں بگڑا وہ اب تک اکیلا ہے۔''

''وہ تم سے بہتر تھا اور بہتر ہے۔'' چٹاخ، چٹاخ۔

''اوہ گاڈ۔'' رمان غصے سے کھول اٹھا جذباتی ہو کر اندر جانا چاہا مگر روتی ہوئی نیناں بھاگ کر آئی اور کپکپاتے ہوئے بولی۔

''میری مما، میری مما نہیں مل سکتیں، جاؤ آپ......'' وہ اس کی حالت دیکھ کر تیز قدموں سے نکل آیا۔ مزید وہاں رک کر اپنا ٹمپرامنٹ لوز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ مداخلت کا موقع نہیں تھا لہٰذا دور اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ خاموش رہا جائے۔ یہی سوچ کر وہ نکل آیا۔

☆☆☆

''اُف توبہ ہے بھئی خواتین کے ساتھ بازار آنا کڑا امتحان ہوتا ہے۔'' مدیحہ اور آپا کو بازار کی بھیڑ میں گم ہوئے گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ چند منٹ کا کام کہہ کر مدیحہ نے منت کی تھی مگر اب چھوٹے سے پُرہجوم بازار کے باہر موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اتنا وقت ہو گیا کہ اسے غصہ آرہا تھا۔ بار بار رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر بڑبڑاہٹ میں برا بھلا کہہ رہا تھا لیکن کر کچھ نہیں سکتا تھا۔

''چلیں زلفی بھائی۔'' پشت سے مدیحہ کی آواز آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ شاپنگ مکمل ہو گئی۔

''میڈیکل اسٹور ہمارے ابا مرحوم کا نہیں ہے۔ میں وہاں ملازم ہوں، کتنا وقت لگا دیا۔'' زلفی کے منہ سے چنگاریاں نکلیں۔ اردگرد کے خیال سے آپا نے اس کا کندھا دبایا تو وہ کچھ دھیرے سے بولا۔

''آپا اس بے ہودہ بازار میں یوں موٹر سائیکل پر انتظار کرتا انسان احمق لگتا ہے اور مارکیٹیں بند تھیں کیا؟''

''اور مارکیٹیں زلفی! گاڑیوں کے حوالے سے بنی ہیں۔ ہم وہاں کیسے جائیں۔'' آپا نے چادر سنبھال کر اس کا کندھا پکڑ کے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ مدیحہ نے ان کی تائید کی اور اچک کر خود بھی بیٹھ گئی۔

''بھائی صاحب، وہاں نہ ہم جا سکتے ہیں نہ ہماری حیثیت ہے۔ ہم نے پانچ سو روپے کا سوٹ لیا ہے، یہ اس بازار میں ہی ملتا ہے۔''

''تم عورتوں سے اللہ بچائے۔'' زلفی نے کہا اور سلو سلو موٹر سائیکل بھیڑ کے درمیان سے نکالی کھلی سڑک پر نکلتے ہی مدیحہ ایک دم چلائی۔

''روکو، روکو یہ تو نیناں ہے۔'' زلفی نے جھٹکے سے بریک لگائے۔

''کیا مصیبت ہے؟''

''وہ سامنے پلازہ کی پارکنگ میں ابھی گاڑی گئی ہے پلیز ذرا دیر کو چلیں۔'' مدیحہ نے سامنے دیکھتے ہوئے بے تابی سے کہا۔ زلفی کے شدید ردِعمل سے پہلے ہی آپا نے بات سنبھال لی۔

''چلو دو منٹ کے لیے لے چلو۔'' زلفی آپا کی بات رد نہیں کر سکتا تھا مجبوراً موٹر سائیکل سامنے کی طرف لے آیا۔ نیناں اتر کر ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ مدیحہ کی آواز پر مڑ کے دیکھا اور واپس باہر آگئی۔

''میں نے گاڑی دیکھی اور زلفی بھائی کو کہا کہ نیناں سے ملنا ہے۔''

''آپ؟'' نیناں آپا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں، یہ میری پیاری پیاری سی آپا ہیں یعنی حقیقی پھپو ہیں اور یہ میرے زلفی بھائی ہیں۔'' مدیحہ نے تعارف کرایا۔

''پھپو اور آپا......'' وہ بولی۔

''ان کے امی ابا مجھے آپا کہتے ہیں بس یہ بھی آپا ہی کہنے لگے۔'' سرمئی بالوں پر سلیقے سے سفید چادر جمائے انتہائی متانت سے آپا نے ہی وضاحت کی، نیناں ان کے لب و لہجے سے بہت متاثر ہوئی۔

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ مدیحہ ہر وقت آپ کا ذکر کرتی ہے۔''

''یہ دونوں ہی میری کل کائنات ہیں۔'' انتہائی پُرمٹھاس لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''چلیں۔'' زلفی نے یاد دہانی کرائی۔

''اوہ نیناں بس ہم چلتے ہیں، دیر ہو رہی ہے۔ زلفی بھائی نے کام پر جانا ہے اور میں نے بھی امی کے ساتھ کچھ بنانا ہے۔'' مدیحہ نے تیزی سے بتایا۔

''کہاں آئی تھیں یہ تو بتایا ہی نہیں؟'' نیناں کو یاد آیا۔

''وہ وہاں اندر چھوٹے سے بازار میں، آپا کے لیے سوٹ خریدنا تھا۔'' مدیحہ نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا جہاں بازار تھا۔

''تو یہاں سے خرید لیتیں۔'' نیناں بھولپن سے کہہ گئی۔

''یہاں سے خریدنے کے لیے بیچنے کو ہمارے جیسے لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا بیٹا۔'' آپا نے کہا تو وہ خفت سے صرف ہونٹ پھیلا کر رہ گئی، مسکرا نہیں سکی۔

''نیناں آج میری طرف آؤ پلیز۔'' مدیحہ نے ایک دم فرمائش کی تو نیناں سوچ میں پڑ گئی۔

''وہ، میں...... وہ مما سے پوچھ کر بتادوں گی۔''

''مدیحہ!'' زلفی نے چلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ دونوں نیناں کو خدا حافظ کہہ کر موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی ان تینوں کا تجزیہ کرتی رہی پھر اچھا سوچ کر اندر واپس آگئی مگر یہ سادہ سے بے باک سے لوگ اسے اچھے لگے پرانی سی پینٹ شرٹ میں ملبوس آزاد بے فکر نوجوان، سادہ باوقار سی آپا جن کا سوتی معمولی سا لباس بہت صاف ستھرا اور پاکیزہ سا تاثر قائم کر رہا تھا اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ ان کے گھر جائے بہت سا وقت وہاں بتائے۔

☆☆☆

مدیحہ کے گھر جانے کی خواہش سب سے پہلے اس نے بوا کے سامنے ظاہر کی تو انہوں نے بہلانے کی کوشش کی۔

"چھوڑو بیٹا، دو ہفتے بعد امتحان شروع ہونے والے ہیں۔"

"بوا تھوڑی دیر کے لیے بس۔"

"اپنے بابا کو جانتی نہیں ہو" بوا نے دھیرے سے کہا تو رابعہ نے واش روم سے نکلتے ہوئے سن کر کہا۔

"خدا نہ کرے کہ میری بیٹی ریحان اختر کو جانے۔"

"مما، بابا مجھے آنے جانے سے تو نہیں روکتے۔"

"نیناں، جب یہ بتاؤ گی کہ کہاں جانا ہے تو پھر باپ کا اصل چہرہ نظر آئے گا۔"

"یعنی......"

"چھوڑو بیٹا آپ اپنے کمرے میں جا کر پڑھائی کرو۔" بوا نے نیناں کو ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"مما مجھے جانا ہے، وہ لوگ اتنے اچھے ہیں کہ کیا بتاؤں۔" نیناں نے براہ راست ماں سے کہا۔

"بوا جانے دیں نیناں کو...... یہ تو اچھے لوگ دیکھے۔" انہوں نے بہت سنجیدگی سے کہا تو بوا نے جواب کے لیے جلدی اختیار کی۔

"نیناں کو تو سب اچھے لگنے دو کیونکہ لوگ تو سبھی اچھے ہوتے ہیں بس بھاگ دغا نہ دیں۔" رابعہ ان کے لہجے کی گہرائی میں اتر کر خاموش ہو گئیں کیونکہ خاموشی ہی بہتر تھی۔

"مما پلیز۔" نیناں نے پھر منت کی۔

"کوئی اور بات کرو سر نہ کھاؤ۔" رابعہ جھنجلا سی گئیں۔

گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا تو بوا نے مسکرا کر نیناں کو مخاطب کیا۔

"جاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ، رمان بیٹا آ گیا ہے اس کے ساتھ جانا۔"

"ہیں سچ۔" نیناں، رمان کے ساتھ جانے پر بھی راضی ہو گئی۔ خوشی سے چلائی یہ پہلا موقع تھا کہ نیناں رمان کے ساتھ جانے پر اتنا خوش ہوئی۔ بوا اور رابعہ نے واضح طور پر محسوس کیا۔ وہ چھلانگ مار کر تیار ہونے چلی گئی اور رابعہ نے بوا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"رمان کے ساتھ جانے پر ریحان اختر کو اعتراض نہیں ہوتا۔ طلال کے ساتھ جانے پر نیناں پریشان ہوتی ہے۔" انہوں نے انتہائی دوراندیشی سے کام لیا تھا، رابعہ ان سے متفق ہو گئیں۔

"اور طلال جو آگ بگولہ ہوتا ہے اسے رمان ایک نظر نہیں بھاتا۔"

"یہ سچ ہے لیکن ریحان کو تو رمان کے آنے جانے پر اعتراض نہیں۔"

"مجھے نیناں کی فکر لاحق ہے طلال کی خودسری اور حق جتانے کی عادت سے مجھے کوفت سی ہوتی ہے۔"

"طلال بھی ریحان اختر کو بہت عزیز ہے۔ یہ خودسری اور ہٹ دھرمی ریحان نے ہی دی ہے۔ مرحومہ بہن کی اولاد جان کر بہت پیار اور اختیار دیا ہے بلکہ ریحان نے ہی پالا ہے، تمہاری ساس سسر تو سال بھی زندہ

فلسفہء احتجاج

میں 1980ء میں لندن کے ٹریفالگر اسکوائر سے گزر رہا تھا کہ میں نے جنوبی افریقا کے سفارت خانے کے سامنے چند کالے اور گورے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک گروہ دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں جھنڈے لیے کھڑا تھا جن پر لکھا تھا "نیلسن منڈیلا کو رہا کرو۔" سفارت خانے کا بڑا دروازہ بند تھا اس لیے کہ انگلستان اور جنوبی افریقا میں سفارتی تعلقات ختم ہو چکے تھے۔ میں نے ایک نوجوان سے پوچھا۔

"آپ لوگ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "کوئی پانچ برس ہو گئے۔"

"اور کب تک کھڑے رہنے کا ارادہ ہے؟"

نوجوان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "جب تک نیلسن رہا نہیں ہو جاتا۔"

"آپ کو اس کی کوئی امید ہے؟" میں نے سوال کیا۔

نوجوان نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا "احتجاج حق کے لیے کیا جاتا ہے۔ کامیابی کی ضمانت کی بنیاد پر نہیں۔"

اقتباس: "لکھتے رہے جنوں کی حکایت" از الطاف گوہر

فصیحہ آصف خان۔ ملتان

نہیں رہے۔ بیٹی کی موت کا صدمہ چاٹ گیا دونوں سال کے اندر اندر رخصت ہو گئے۔" بوا گئے دنوں کے منظر میں کھو گئیں لہجہ گلوگیر ہو گیا، آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔

☆☆☆

سفید اور لیمن کنٹراس شلوار کرتے میں اونچی سی پونی بنائے خوشبو اڑاتی پہلی بار مسکرا کر فرنٹ ڈور کھول کے اس کے برابر بیٹھی تھی...... کچھ دیر تو رمان کو یقین نہیں آیا، اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں کلائی پر زور سے چٹکی کاٹی اور منہ سے سی نکلی تو یقین آیا۔

"جلدی چلیں ناں......" ستاروں جیسی آنکھوں میں کاجل کی باریک سی لکیر کی جھلک دکھلاتے ہوئے وہ بولی تو وہ شوخ ہو گیا۔

"ذرا پھر سے کہنا......" گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے ہوئے وہ گنگنایا۔

"کیا......؟"

"حیرت سے مر نہ جاؤں اے خدا!" بار بار اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بوا بہت اچھی ہیں، یہ انہوں نے کہا اور میں نے مان لیا۔" اس نے سادگی سے بتایا۔

"یعنی تم دودھ پیتی بچی ہو، بوا نے کہا تو میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئیں ورنہ......" وہ ایک دم ہی چلایا تو وہ سہم گئی۔

"ورنہ کیا......؟"

"ورنہ کچھ نہیں، اچھے بھلے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔" اس نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"میں نے تو کچھ نہیں کہا۔"

''یہی تو رونا ہے کہ تم کیوں نہیں کہتیں؟'' گاری کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے وہ بولا۔

''کیا کہوں......؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''واہ! کیا ادا ہے، ایمان سے کافر ادا ہو لیکن اللہ میاں حسن کے ساتھ ذہن بھی دے دیتا تو کتنا اچھا ہوتا......'' مست لہجے میں خماری تھی۔ وہ گھبرا کر نظریں چرا گئی۔

''میتھس پڑھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ذہین نہیں ہوں رمان بھا......'' آخری لفظ پر اس کی زبان رک سی گئی۔

''آج اگر نیناں ریحان تم نے مجھے رمان بھائی کہنا تھا تو میں نے تمہیں گاڑی سے اٹھا کر پھینک دینا تھا۔'' اس نے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا۔ اسے کہنے پر ہی یقین آ گیا...... جان چھڑانے کے لیے بولی۔

''آپ کو معلوم ہے ہمیں کہاں جانا ہے؟''

''تمہارے ساتھ تو میں کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔''

''میری سہیلی مدیحہ کے گھر، محلہ گوالان نزد بستی مہر داد۔''

''ہیں، ہیں، یہ کہاں ہے بھئی، مجھے اس کا رستہ معلوم نہیں۔''

''جی ٹی بس اڈے سے سیدھے ہاتھ والی سڑک پر چلیں۔''

''یہ کون ہے، کہاں رہتی ہے؟''

''پرانا علاقہ ہے، بس مجھے یہی پتا ہے۔''

''اچھا سرکار! اب آئیں ہیں تو اصل جگہ پہنچا کر ہی جائیں گے۔'' اس نے اس کی خاطر کچھ سوچ کر الٹے ہاتھ والی سڑک پر گاڑی ڈالی اور پھر اس کے کہنے کے مطابق جی ٹی بس اڈے پر پہنچ کر دائیں ہاتھ والی سڑک کا انتخاب کیا۔

مغرب کی اذان ہو رہی تھی، جھٹ پٹے کا سا وقت تھا...... اب گھر تلاش کرنا مشکل کام تھا، تنگ ٹیڑھی سی گلیوں میں مشکل سے گاڑی چلتی ہے، کچھ دور تو جا سکے، آگے گاڑی نہیں جا سکتی تھی لہٰذا رمان نے بے بسی سے اسے دیکھا اور کہا۔

''یار! ایسی سہیلی سے ملنے کو اتنی بے قراری کیا تھی؟''

''اس نے بہت پیار سے بلایا تھا۔''

''پیار سے کوئی بلائے تو تم چلی آتی ہو کیا؟''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب چھوڑو، اب کیا کریں واپس چلنا پڑے گا۔'' اس نے مجبوراً کہا تو وہ افسردہ سی ہو گئی۔

''چلیں!'' دکھی ہو کر واپسی کا کہا۔

رمان کو کافی پیچھے گاڑی ریورس کرنی پڑی...... خاصی مشکل برداشت کر کے گلی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

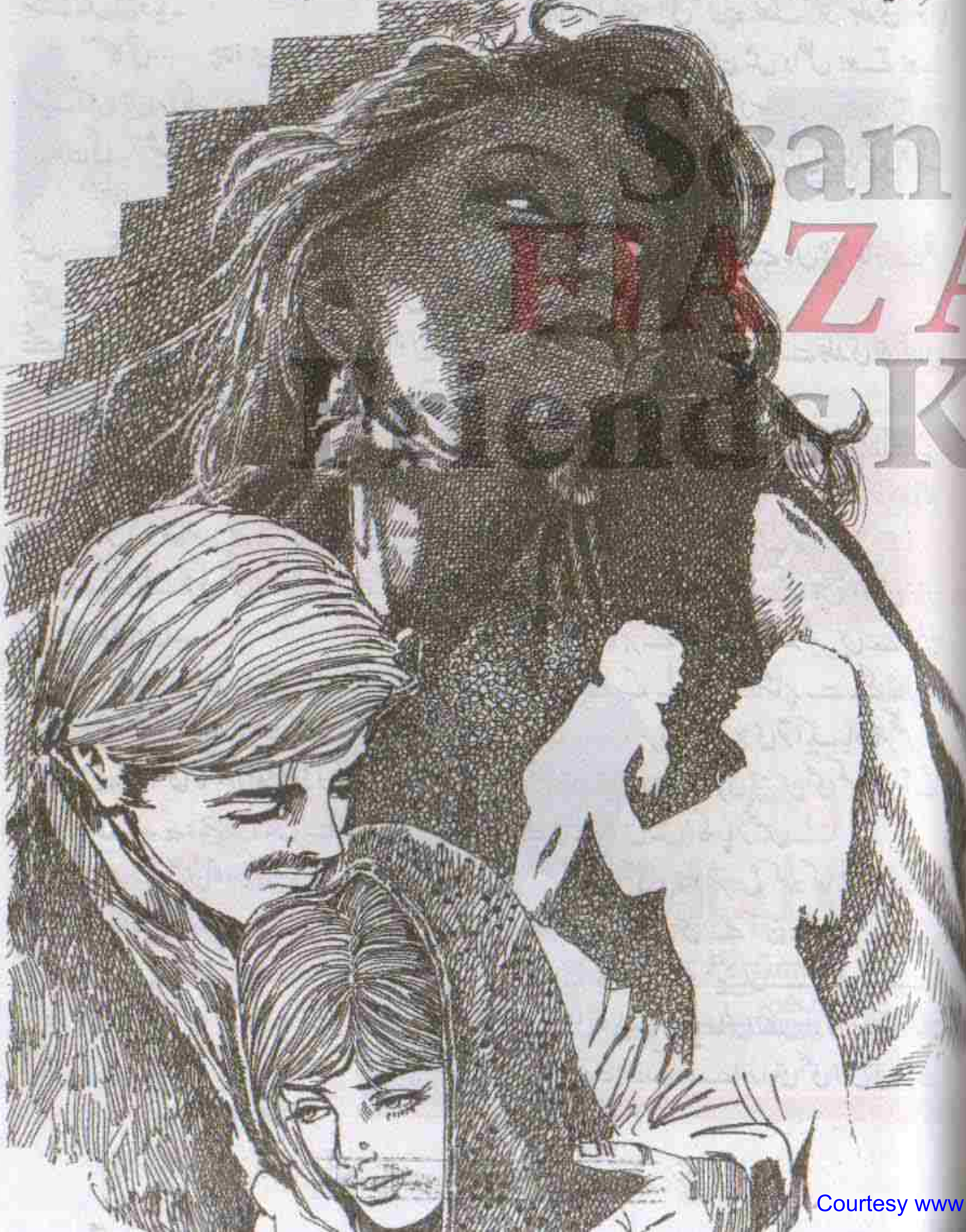
باقی آئندہ

جان ہے تو جہان ہے

فاخرہ گل

''مینو فیکچرنگ ڈیٹ 18-10-2010 ایکسپائر ڈیٹ 30-5-2011'' شیریں نے زیرلب پڑھا اور غصے سے بسکٹ کا پیکٹ شیلف پر پٹخ کر اپنا سر پکڑ لیا۔

''واؤ میرے فیورٹ بسکٹ......'' کاشی نے شیریں کے تاثرات محسوس کیے بغیر شیلف سے بسکٹ کا پیکٹ اٹھانا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پیکٹ کھول کر بسکٹ اپنے منہ میں ڈالتا، اس کی نسبت



زیادہ تیزی سے شیریں نے بسکٹ واپس لیا اور اس کی چیخ و پکار نظر انداز کرتے ہوئے فوراً کیبنٹ میں رکھ دیا۔

''مما آپ ہمیشہ اسی طرح کرتی ہیں، میری ساری فیورٹ چیزیں چھپا دیتی ہیں۔'' کاشی نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور غصے میں سامنے پڑا چمچ اٹھا کر سنک میں پٹخ دیا۔

''کاشی...... چندا میری جان...... یہ بسکٹ ٹھیک نہیں ہیں، ایکسپائر ہو چکے ہیں، ڈیٹ ختم ہو چکی ہے ان کی۔'' شیریں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''خراب ہیں تو پاپا لاتے کیوں ہیں گھر میں...... جی نہیں، مجھے پتا ہے پاپا کبھی خراب چیزیں نہیں لاتے میرے لیے، بس آپ کا دل نہیں چاہتا مجھے دینے کا سب چیزیں میرا خیال نہیں مہمانوں کے لیے رکھ دیتی ہیں۔'' اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔

''اچھا بابا، میں آپ کو دے دوں گی لیکن ابھی تو میں اپنے سونو کے لیے بیکڈ پٹاٹو بنانے لگی ہوں، ایسا کرو ناں وہ کھا لو پہلے۔'' جانتی تھی کہ اس کی سمجھ میں بات نہیں آئے گی جبھی دماغ کھپانے کے بجائے بات ہی بدل دی۔

''آپ ایسا کرو روم میں جا کر ٹی وی آن کر کے کارٹونز دیکھو میں دس منٹ میں بنا کر وہیں لے آتی ہوں۔'' کاشی کا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر شیریں نے فوراً اس کی پسندیدہ چیزوں میں سے ایک کا نام لیا تو اس کی امید کے عین مطابق وہ فوراً مان بھی گیا اور کچن سے اٹھ کر ٹی وی روم میں جا کر بیٹھ گیا جبکہ شیریں نے اس کا موڈ بحال ہوتا دیکھ کر سکھ کی سانس لی اور فوراً اوون آن کر کے باسکٹ سے آلو نکالنے لگی۔

☆☆☆

''شیریں...... کاشی کہاں ہے بھئی؟'' طاہر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کاشی کا پوچھا تھا۔

''السلام علیکم!'' شیریں نے حسبِ معمول پہلے سلام کرتے ہوئے طاہر کے ہاتھ سے شاپرز لیے اور بولی۔

''کاشی آج پارک میں کافی دیر تک فٹ بال کھیلتا رہا تھا اسی لیے تھک کر جلدی سو گیا ہے۔'' شاپرز لے کر کچن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے جواب دیا اور شاپرز سلیپ پر رکھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں ڈال کر طاہر کی طرف بڑھایا۔

''کھانا تو کھا کر سویا ہے ناں؟'' طاہر نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ہاں، کھانا تو میں نے اسے جلدی ہی کھلا دیا تھا۔''

''چلو ٹھیک ہے، میرے لیے بھی کھانا لگاؤ میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں۔'' گلاس ٹیبل پر رکھ کر وہ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک کر بولا۔

''سنو، شاپر میں فریزڈ تکے ہیں' وہ بھی فرائی کر لینا۔'' طاہر کے جانے کے بعد شیریں نے سالن گرم کرنے کے لیے رکھا اور شاپر سے تکے نکال کر حسبِ عادت نظر ڈیٹ پر پڑی تو ایک بار پھر کلس کر رہ گئی شاپر میں موجود دوسری چیزیں بھی کم و بیش آگے پیچھے کی تاریخوں میں ایکسپائر تھیں۔

''ہاں بھئی، چلو شروع کرو کھانا...... مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے آج۔'' طاہر نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا تو شیریں نے ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالی، پلیٹ میں سالن نکال کر اس کے آگے رکھتے ہوئے سلاد کی ٹرے اور دہی بھی اس کی طرف کھسکا دی۔

"لیکن میں تو تمہیں تکے فرائی کرنے کا کہہ کر گیا تھا...... وہ کہاں ہیں؟" دل میں تکوں کا خیال لیے کھانے کے لیے بیٹھنے والا طاہر سامنے گوبھی آلو دیکھ کر یقیناً بدمزہ ہوا تھا۔

"وہ تو میں نے فرائی نہیں کیے۔" شیریں نے بڑے سکون سے چھوٹی پلیٹ میں دہی ڈالتے ہوئے کہا تو وہ تپ گیا۔

"فرائی نہیں کیے...... لیکن کیوں؟ جب میں نے تم سے کہا تھا پھر......"

"طاہر میں نے آپ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ جن چیزوں کی ڈیٹ ایکسپائر ہو جائے وہ گھر نہ لایا کریں، نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں لیکن پھر بھی آپ......" حتی الامکان اپنے لہجے کو تلخ ہونے سے بچاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ہزار دفعہ کی کہی ہوئی بات دہرائی۔

"اور میں نے بھی تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ گھر نہ لاؤں تو اور کیا کروں......؟" طاہر نے کھانے کو چھوا تک نہیں تھا۔

"یہ سب چیزیں بھی روپوں کی آتی ہیں، پیسہ لگتا ہے ان پر بھی...... تو تمہارے کہنے پر میں روپے پیسے کچرے کے ڈبے میں تو پھینکنے سے رہا، اسی پیسے کی خاطر دن رات محنت کرتا ہوں، اس کی یوں ناقدری نہیں کر سکتا میں۔"

"تو میں نے یہ کب کہا آپ سے؟ میں تو......"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ پہلے ہماری دکان کی نوعیت بھی اور تھی اور وہ علاقہ بھی دوسرا تھا، کام چل جاتا تھا لیکن اب یہ کوئی چھوٹی موٹی دکان نہیں بلکہ فوڈ اسٹور ہے اور ہے بھی ایسے ایریا میں جہاں لوگ ہر چیز خریدنے سے پہلے اس کی ایکسپائر ڈیٹ ضرور چیک کرتے ہیں تو ظاہر ہے اب ایسی چیزیں میں وہاں رکھ کر نہ تو اسٹور کی ویلیو ڈاؤن کر سکتا ہوں اور نہ بیچ سکتا ہوں...... تو پھر کیا راستے میں پرندوں کو کھلاتا آؤں...... کیا کروں۔" کئی دفعہ اسے سمجھانے کے باوجود جب ایک بار پھر شیریں نے وہی اعتراض کیا تو وہ زچ ہو گیا تھا۔

"لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی تو نہیں ہے کہ یہ چیزیں کھا کھا کر ہم اپنی صحت خراب کر لیں۔" وہ بھی ہنوز اپنے محاذ پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"تمہارے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھ سکتی...... بھئی یہ کوئی دوائیاں تو ہیں نہیں کہ میں ایکسپائر کھلا کر کسی کی خدانخواستہ جان لوں، اب ذرا سوچو چاول، چینی اور دالوں وغیرہ کے اوپر بھی ایکسپائر ڈیٹ درج ہوتی ہے حالانکہ یہ چیزیں تو عرصے تک خراب نہیں ہوتیں اور پھر......"

"تو ایسی چیزیں تو میں نے کبھی بھی استعمال کرنے سے منع نہیں کیا لیکن یہ بسکٹ تکے، وغیرہ تو اپنی مدت میعاد ختم ہونے کے بعد نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں اور پھر فروٹ جو......"

"کچھ نہیں ہوتا شیریں، یہ خوامخواہ کی بحث آئے روز مجھ سے نہ کیا کرو...... اگر تمہارا دل نہیں چاہتا تو نہ ہی لیکن تم مجھے بنا دیا کرو جو کچھ بھی میں لاؤں۔"

"طاہر......!" شیریں نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن طاہر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"تم رہنے دو...... میرا خیال ہے میں خود ہی اٹھ کر فرائی کر لیتا ہوں۔" اس نے کرسی پیچھے کو سرکاتے ہوئے کہا تو اس سے پہلے ہی شیریں اٹھ کر چولھے کی طرف بڑھ گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس بات پر مزید کوئی بدمزگی ہو۔ دل ہی دل میں کلستے ہوئے لائٹر سے چولھا جلانے لگی۔

☆☆☆

ایک سال پہلے تک ان کے گھر میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا، اچھی اور بہترین چیزیں گھر میں استعمال کی جاتی تھیں، وہ بھی اس لیے کہ پہلے طاہر کا جنرل اسٹور ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں کے لوگوں کو اس بارے میں کوئی آگاہی نہیں تھی کہ خصوصاً اشیائے خوردنی خریدنے سے پہلے اس کے اوپر موجود ایکسپائر ڈیٹ کو دیکھنا کتنا ضروری ہے۔ بس پیسے دیے اور مطلوبہ چیز خرید کر گھر واپس۔ بنیادی طور پر طاہر کی ترقی کا سبب بھی یہی بات بنی تھی کہ دکان پر موجود ہر طرح کی چیز بک جاتی تھی اور اگر کبھی کوئی گاہک کھلی ہوئی چیز کسی خرابی کی بنا پر واپس کرتا تو وہ بڑی خوش دلی سے یہ کہہ کر انکار کر دیتا کہ کھلی ہوئی چیز تو کمپنی واپس نہیں لیتی اگر آپ کھولنے سے پہلے لے آتے تو میں ضرور اس کی جگہ دوسری چیز دے دیتا۔ خوش اخلاقی اس قدر دکھاتا کہ گاہک بہ خوشی وہی چیز واپس لے جاتا کہ ظاہری ہی سہی مگر خوش اخلاقی ہی دکان داروں کی کامیابی اور ترقی کا بنیادی گر ہوا کرتی ہے۔ دکان میں موجود فروٹ ذرا سا گل جاتا یا خراب ہونے کے نزدیک ہوتا تو وہ اسے آدھی قیمت پر لگا دیتا جس سے لوگ خوشی خوشی خرید کر گھر لے جاتے۔ روز بروز بڑھتی ہوئی آمدنی کے باعث طاہر نے وہ جنرل اسٹور بیچ کر شہر کی مہنگے ترین مارکیٹ میں ایک چلتا ہوا فوڈ اسٹور خرید لیا لیکن وہاں کے گاہک اس کے سابقہ گاہکوں سے مکمل طور پر مختلف تھے۔ ہر چیز خریدنے سے پہلے اس کی ڈیٹ چیک کرتے اور اگر اس کی مدتِ استعمال گزر چکی ہوتی تو کاؤنٹر پر آ کر اسے اطلاع کرتے کہ کھانے پینے کی اشیا کے معاملے میں اسے احتیاط کرنی چاہیے اس بات سے قطع نظر کہ وہاں موجود دوسرے گاہک اس بات کا کیا اثر لیں گے۔ وہ اپنی بات پوری تفصیل سے مکمل کرتے۔

نتیجتاً وہ تمام ایسی اشیا جن کی ڈیٹ ختم ہو جاتی اٹھا کر گھر لے آتا اور اسی بات سے ان کے گھر میں چخ چخ نے جنم لیا کہ گھر میں ضرورت کا تمام سودا بھی وہی لایا جاتا جو نزدیکی دنوں میں دکان کے لیے قابلِ استعمال نہ ہو۔

شیریں کا خیال تھا کہ ایسی چیزیں استعمال کر کے وہ بیمار بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ ڈیٹ لکھنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس تاریخ کے بعد کمپنی ذمے دار نہیں ہے لیکن اس کے برعکس طاہر کا خیال تھا کہ اتنی مہنگی چیزیں کچرے میں پھینک دینا بھی کوئی عقلمندی نہیں ہے۔

☆☆☆

کاشی کو صبح..... سے ہلکا ہلکا بخار ہو رہا تھا۔ شیریں نے ہمیشہ کی طرح فوراً ڈاکٹر کے پاس بھاگنے کے بجائے گھر میں ہی موجود بخار کا سیرپ پلانا اسے مناسب سمجھا۔ وہ ہمیشہ ہی بخار، کھانسی، نزلہ زکام اور اسی طرح کی چھوٹی موٹی ادویات گھر میں رکھتی تھی تاکہ وقت بے وقت کام آ سکیں، یہ وہ ادویات تھیں جو اس نے ڈاکٹر سے پوچھنے کے بعد گھر میں رکھ چھوڑی تھیں جن سے ہمیشہ اسے کافی سہولت رہتی لیکن اس دن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ دوپہر کو تو اس نے کاشی کو دوا پلا دی لیکن شام کے لیے نہ ہونے کے باعث اس نے طاہر کو فون کر دیا کہ آتے ہوئے فلاں سیرپ لیتے آئیں سو اب اسٹور سے واپسی پر طاہر نے اپنی گاڑی شہر کے ایک معروف میڈیکل اسٹور کے سامنے روک کر انہیں مطلوبہ دوا کے بارے میں بتایا۔

"یہ لیں جی آپ کا سیرپ....." چند ہی سیکنڈز میں وہاں موجود لڑکے نے سیرپ اس کے سامنے لا رکھا۔ طاہر نے والٹ سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا اور بقایا رقم کے انتظار میں سیرپ کے

ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تیوری چڑھ گئی، ایک نظر اس نے سیلز مین کو غصے سے گھورا اور پھر سیدھا اسٹور کے مالک کے پاس جا پہنچا۔

"خیریت جناب..... کیا مدد کر سکتے ہیں آپ کی؟" اس کے تیوروں کا اندازہ کرتے ہوئے وہ قدرے نرم لہجے میں بولا تھا۔

"خیریت جائے بھاڑ میں، میں کہتا ہوں انسان کو پیسے کی ہوس میں اتنا اندھا نہیں ہونا چاہیے کہ چند روپوں کے لیے کسی کی جان لینے پر تل جائے۔"

"بھائی صاحب، ذرا تحمل رکھیے آخر ہوا کیا ہے کچھ بتائیں تو پتا بھی چلے....." اسٹور کا مالک ایک تو اس کے اس طرح کے رویے اور پھر تمام گاہکوں کے متوجہ ہو جانے پر بوکھلا گیا تھا۔

"ہونا کیا ہے..... کچھ خوفِ خدا کریں وہ ادویات بیچ رہے ہیں جن کی مدت استعمال ختم ہوئے بھی ڈیڑھ مہینہ گزر گیا ہے۔ میں تو اپنے بچے کے لیے دوا خرید کر اسے صحت مند دیکھنا چاہتا تھا یہ جانے بغیر کے میں تو خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے زہر خرید رہا ہوں۔" طاہر کی برداشت ختم ہو چکی تھی اور بہ آواز بلند انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا باقی گاہک بھی سب کچھ چھوڑ کر اس کی طرف چلے آئے تھے۔

"شیخ صاحب یہ طریقہ تو ٹھیک نہیں ہے ان صاحب نے تو تاریخ استعمال پڑھ لی لیکن ہم جیسے ان پڑھ تو جانتے ہی نہیں کہ یہ سب ماجرا کیا ہے۔ خدا کا واسطہ ہے ہم پر رحم کریں۔"

"یہ پیسے کتنے دن چل جائیں گے آپ کے؟ اور جن کی آسائشوں کے لیے آپ خود پر یہ بوجھ سمیٹ رہے ہیں ناں قبر میں وہ آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ آپ وہاں جا کر دینا حساب کتاب اور وہ کریں گے یہاں عیش۔" شیخ صاحب کو صفائی کا موقع دیے بغیر تمام گاہک اپنی اپنی رائے کا اظہار کر کے انہیں لعن طعن کر رہے تھے سو وہ ہمت کر کے بولے۔

"جناب آپ پورے میڈیکل اسٹور میں کہیں سے بھی کوئی بھی دوا اٹھا کر دیکھ لیں سب ہی معیاری اور قابلِ استعمال ہیں، میں خود بچوں والا ہوں اور ہر چیز کی بہت احتیاط کرتا ہوں، اللہ کو جان دینی ہے یہ محض نادانستگی میں ہوا جس کے لیے میں آپ سب سے معافی مانگتا ہوں۔"

"ہونہہ معافی....." طاہر نے گردن جھٹکی۔

"جناب میرا یقین کریں یہ سب نادانستہ طور پر ہوا ورنہ آج سے پہلے تو سالوں میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے، میرا یقین کریں میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ایک موقع تو دیں پلیز....." اس کے بعد وہ گڑگڑانے پر اتر آیا تھا کیونکہ بات اس کی ساکھ کی تھی اور اگر بات اخبار والوں تک پہنچ جاتی تو یقیناً پولیس بھی وارد ہو جاتی سو کافی دیر کی منت سماجت کے بعد اسے آئندہ کے لیے محتاط رہنے کے وعدے پر یہ معافی دے دی گئی۔

☆☆☆

"شیریں، یہ دودھ کے پیکٹ کی پرسوں ڈیٹ ختم ہو گئی تھی، پیکٹ میں نے اٹھا کر گودام میں رکھوا دیا لیکن لانا یاد ہی نہیں رہا۔" طاہر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دودھ کا پیکٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرو تم اس کی کھیر بنا لینا تاکہ فوراً استعمال میں آ ئے۔" طاہر کی بات پر شیریں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اچھا کہہ کر دودھ کو اسی وقت پتیلی میں ڈال کر ابلنے کے لیے رکھ دیا۔

"یہ کاشی کہاں ہے، آواز نہیں آ رہی اس کی؟"

طاہر نے ایک نظر کمروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پڑوس میں گیا ہے ابھی دانش بلانے آیا تھا۔ شاید وہ کوئی نئی کارٹون فلم لایا ہے تو بس وہی دیکھ رہا ہوگا بیٹھا۔''

''میرا خیال ہے اسے بلا لینا چاہیے کیونکہ میں سوچ رہا تھا کہ کافی دن ہوئے امی کی طرف چکر نہیں لگا، ایسا کرتے ہیں کھانا کھا کر کچھ دیر کے لیے وہاں سے ہو آتے ہیں، کیا خیال ہے؟'' طاہر نے تائیدی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں، یہ تو بہت اچھی بات ہے، آپ جلدی سے کاشی کو بلا لیں تاکہ وہ بھی کھانا کھالے تو بس نکلتے ہیں۔'' شیریں نے خوش دلی سے کہا تو طاہر فوراً کاشی کو بلانے چل دیا۔

☆☆☆

رات کو دیر سے واپس آنے کی وجہ سے اس پر ابھی تک کسلمندی طاری تھی، طاہر اور کاشی کے جانے کے بعد اس کا دل چاہا کہ کچھ بھی کرنے سے پہلے ایک کپ کڑک سی چائے بنا کر پی جائے۔ اسی ارادے سے وہ کچن میں داخل ہوئی تو ضرور لیکن سامنے موجود رات کے بھیگے ہوئے چاولوں پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ دودھ تو اس نے رات کو ہی اچھی طرح ابال کر یہ جانچ لیا تھا کہ اس میں ابھی کوئی نقص نہیں ہے سو چولھا جلا کر کھیر کی تیاری میں لگ گئی۔

☆☆☆

''واہ بھئی واہ آج تو مزہ آگیا...... کیا کھیر بنائی ہے تم نے کمال کر دیا، میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ کسی بھی چیز کی ڈیٹ اوور ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اب یہی دیکھ لو دو دن پہلے اس کی ڈیٹ ختم ہو چکی تھی اور گرمی میں رکھا رہنے کے باوجود اس پر کوئی فرق نہیں پڑا۔'' طاہر کو اپنی بات کے حق میں ایک دلیل ہاتھ آگئی تھی۔

''جی ہاں، آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا اور ویسے بھی احتیاط بہر حال لازم ہے۔ میں نے یہ بھی پہلے اچھی طرح ابالنے کے بعد کھیر بنائی ہے۔''

''ارے چھوڑو بھی، یہ سب ڈھکوسلے ہوتے ہیں کمپنی والوں کے تاکہ جو مال وہ بنا کر بیچ رہے ہیں وہ کم از کم اس تاریخ تک تو نکل ہی جائے اور اگر ان کے اپنے پاس کوئی ایسا مال موجود ہو جس کی ڈیٹ ختم ہو جائے تو وہیں پر...... فیکٹری ہی میں صرف اس پر نئی تاریخ پرنٹ کر دیتے ہیں۔''

طاہر کی بہر حال اپنی منطق تھی اور شیریں نے ہمیشہ کی طرح اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی جواب میں کوئی دلیل دینا چاہی تھی جبھی اس نے غیر محسوس طریقے سے موضوع ہی بدل دیا۔

لیکن اگلے ہی روز دوپہر کو پیش آنے والا واقعہ شیریں کے حق میں ایک مضبوط دلیل بن کر سامنے آگیا۔ جب دوپہر کے کھانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھی تو تب جب ادھ موا سا کاشی اسے جگانے کی کوشش میں آدھا اس کے اوپر اور آدھا فرش پر گر گیا۔ فوری طور پر تو خود اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ زرد چہرہ لیے کاشی اس کے سامنے تو تھا لیکن دماغ کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر۔

کچھ دیر پہلے اسکول یونیفارم چینج کروا کر اسے نہلانے دھلانے کے بعد جو صاف ستھرے کپڑے پہنائے تھے وہ اب مسلسل کی گئی الٹیوں سے انتہائی بدبودار ہو چکے تھے۔ شیریں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے...... گھڑی پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ وہ دو گھنٹے تک سوتی رہی ہے۔ سو اپنی تمام تر ہمت کو جمع کر کے آخر اس نے بے ہوش پڑے کاشی کا لباس تبدیل کیا اور

پڑوسیوں کی مدد سے فوراً اسپتال پہنچ گئی۔

☆☆☆

''آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا بیٹا الحمدللہ ایک بار پھر نئی زندگی لیے آپ کے سامنے ہے ورنہ جتنا شدید فوڈ پوائزن انہیں ہوا تھا اس سے تو ان کا بچنا کسی معجزے سے کم نہیں لگتا۔'' ڈاکٹر آغائی نے شیریں اور طاہر کو جیسے اک بار پھر جی اٹھنے کی نوید دی تھی۔

''ابھی وہ ہوش میں تو نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ کمرے میں جا سکتے ہیں، انشاء اللہ چند گھنٹوں میں انہیں ہوش آجائے گا اور وہ پہلے کی طرح مسکرانے لگیں گے۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب یہ سب ہوا کیسے؟'' طاہر یقیناً وجہ جاننا چاہتا تھا۔

''درست وجہ تو کاشی میاں ہی بتا سکتے ہیں لیکن گلے سڑے پھل، غیر معیاری اشیا کا استعمال فوڈ پوائزن کی بڑی وجہ ہے، اس کے علاوہ اسکول، کالجز کے باہر ٹھیلوں سے ایسی اشیا خرید کر کھانا جو حفظانِ صحت کے اصولوں پر پوری نہ اترتی ہوں، وہ بھی فوڈ پوائزن کا باعث بن سکتی ہیں۔''

ڈاکٹر کی بات سن کر وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن جب کاشی نے ہوش میں آنے کے بعد ڈرتے ڈرتے بتایا کہ شیریں کے سو جانے کے بعد وہ ٹی وی آف کر کے کچن میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے اس نے رات کو لائے گئے پیٹیز کی خوش نما پیکنگ ہٹا کر انہیں پیٹ بھر کر کھایا، گو کہ ذائقے میں کھٹاس نمایاں ہو چکی تھی لیکن اس کا ہمیشہ کی طرح یہ خیال تھا کہ پاپا خراب چیز تو ظاہر ہے گھر لانے سے رہے اس لیے یقیناً ان کا ٹیسٹ ہی ایسا ہوگا اور جب سینے میں جلن محسوس ہوئی تو اس نے فریج سے آڑو نکال کر کھانا چاہا جو کہ کسی حد تک پلپلا ہو چکا تھا بس وہیں سے اسے الٹیاں شروع ہو گئیں۔ شیریں سے ڈرتے ہوئے آخری حد تک اس نے چاہا کہ نہ جگائے لیکن جب آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تو وہ جا کر شیریں کے سامنے ہی ڈھیر ہو گیا اور یہی سب باتیں طاہر کے لیے ندامت کا باعث تھیں۔

''واقعی شیریں، تم ٹھیک کہتی تھیں کھانے پینے کی چیزوں میں خاص طور پر احتیاط سے کام لینا چاہیے۔'' وہ شرمندہ تھا، شیریں نے کاشی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے دیکھا۔

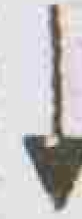
''طاہر صاحب، جعلی ادویات کا تو سب ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن خوردنی اشیا کے متعلق کوئی بھی محتاط نہیں ہے اور لوگ نہیں سوچتے کہ تاریخ استعمال گزر جانے کے بعد یہ اشیا بھی نقصان پہنچانے میں جعلی ادویات سے کسی طور کم نہیں ہوتیں۔ حالانکہ خراب فروٹ ہو یا کھانا اس میں ہمیشہ اور خصوصاً گرمیوں یا ساون کے موسم میں چھوٹے چھوٹے کیڑے پلک جھپکنے سے بھی پہلے پیدا ہونے لگتے ہیں لیکن ہم سوائے سنڈی کے دوسرے کیڑوں کو دیکھ نہیں پاتے اور یہی ہمارے اندر جا کر مختلف بیماریاں اور انفیکشنز پیدا کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر آغائی نے تفصیلاً سمجھانا اپنا فرض سمجھا تھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب، میں شرمندہ ہوں لیکن انشاء اللہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا کیونکہ چند روپے بچانے سے جان بچانا اہم ہے اور اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ایک بار پھر میرا بچہ مجھے لوٹا دیا ہے۔''

''ہاں، اسی لیے تو کہتے ہیں ناں کہ جان ہے تو جہان ہے۔'' ڈاکٹر آغائی کی اس بات پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ سب کے چہرے پر بکھر گئی جن میں سے سب سے زیادہ نمایاں مسکراہٹ شیریں ہی کی تھی۔



ناولٹ



قربتوں کی دوری

رضوانہ پرنس

چھٹا حصہ



زندگی کتنی اداس اور بوجھل سی ہوگئی تھی۔ رومی کا ہر پل جیسے کانٹوں پر بسر ہورہا تھا۔ دل میں کسی کی بے رخی کی چبھن، اسے ایک عجیب سی اذیت سے دوچار کرتی رہتی اور وہ بے قرار ہو کر عفان کو مسلسل فون کررہی تھی لیکن اس کی کال ریسیو ہی نہیں کی جارہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ عفان ایک دم سے اتنا کیوں بدل گیا ہے۔ وہ اس کے والہانہ جملے جو اپنے اندر رومی کے لیے ایک

دیوانگی سمیٹے ہوئے تھے، آخر کہاں جا سوئے ہیں۔ اس کے محبت بھرے جذبات و احساسات جو رومی کے دل میں ایک خوشبو بن کر اتر جاتے تھے اب اچانک نفرت کی سیاہی بن کر اس کے دل میں اندھیرا پھیلا رہے تھے اور وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس دن عفان نے کتنے پیار سے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی برتھ ڈے والے دن ہرگز بھی ایمان سے نہیں ملے گا پھر راحت آنٹی کے فون سے اس کے وعدے کی تصدیق بھی ہوگئی تھی لیکن پھر دو گھنٹوں کے اندر اندر سب کچھ کیسے بدل گیا۔ وہ حیران ہو کر سوچتی...... کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی کہ دل میں چور جو تھا۔ ویسے بھی اس دن ایمان کے گھر سے وہ جس غصے اور بدتمیزی کے ساتھ واپس آئی تھی۔ اس کو وہاں سب ہی نے مائنڈ کیا تھا بلکہ راحت بیگم تو باقاعدہ اس سے خفا ہی ہوگئی تھیں۔

"کمال ہے بھئی، اس لڑکی میں تو جیسے بارود بھرا ہوا ہے۔ اتنی سی بات پر بھلا کوئی ایسے بگڑتا ہے' میں بڑی ہونے کے باوجود اس سے معذرت بھی کر رہی تھی۔" راحت بیگم کا لہجہ خفگی بھرا تھا۔ وہ لوگ اس وقت سب مہمانوں کے جانے کے بعد کافی پیتے ہوئے رومی کے یوں غصے میں واپس چلے جانے پر ڈسکشن کر رہے تھے۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی...... رومی نے تو آج حد ہی کر دی۔ ایمان کی زندگی کے اتنے اہم دن کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی...... بس اپنے کپڑوں' اپنی تیاری اور اپنے حسن کو چار چاند نہ لگانے کا غم زیادہ تھا۔" شازی بھی اس سے پوری طرح متنفر تھی۔ ایمان کچھ رنجیدہ سی بیٹھی ان لوگوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اسے بھی رومی کے رویے سے بہت شاک پہنچا تھا۔ زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ رومی نے اس کی محبت، اس کی دوستی اور اس کے خلوص پر بلاوجہ کا شک کیا تھا۔ کتنی نفرت سے اس نے کہا تھا۔

"ایمان، تمہارا بس چلتا تو تم مجھے اس سے بھی برے حلیے میں بلالیتیں...... تم سے اچھے تو میرے دشمن ہوں گے۔" یہ جملے جیسے ایمان کے دل میں پیوست ہو گئے تھے۔ اس کی بے تحاشا خوشیوں کو اس کی زندگی کے حسین ترین دن کو رومی کے بے درد رویے اور سفاک جملوں نے جیسے دھندلا سا دیا تھا لیکن پھر عفان کی حسین سنگت اس کی خوب صورت باتیں اور اس سرپرائز پارٹی پر اس کے بے پناہ خوشی اور شکر گزاری کے دل چھو لینے والے انداز نے اس دھندلاہٹ کو خوشی کی جھلملاہٹ میں چھپا دیا تھا اور جب شہریار صاحب نے عفان کو اس کی سالگرہ کے تحفے کے طور پر ایک ماہ بعد ایمان کو ہمیشہ کے لیے اس کا بنا دینے کی اناؤنسمنٹ بھی کی تو بے شمار تالیوں کی گونج میں وہ خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ بے اختیار راحیلہ بیگم کے گلے لگ گیا تھا۔ جس پر ایمان کی ایک شوخ سی کزن نے شرارت سے کہا تھا۔

"ایمان ذرا بچ کے، اب آنٹی کے بعد تمہاری باری ہے۔" سب کے بے ساختہ قہقہوں کے درمیان ایمان کی حیا آلود مسکراہٹ کو عفان نے بہت دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہوئے فائزہ بیگم کے دل کی گہرائیوں سے ان دونوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں نکلی تھیں۔ انہیں رومی کے اس بدصورت رویے کی وجہ سے بہت ندامت محسوس ہو رہی تھی ساتھ ساتھ دل میں کچھ خوف بھی تھا کہ..... رومی اپنی نادانی اپنی دیوانگی میں اپنے دل کا حال عیاں نہ کر بیٹھے تبھی گھر آ کر وہ رومی پر برس اٹھی تھیں۔

"رومی، تم نے اپنی اس حرکت سے اپنے آپ کو ایمان اور اس کے گھر والوں کی نظر میں بالکل گرا دیا ہے...... جانتی ہو وہاں سب ہی کے دلوں میں تمہاری طرف سے کتنی برائی آ گئی ہے۔ راحت بیگم نے تو باقاعدہ مجھ سے تمہاری شکایت کی ہے اور ایمان بھی مجھے کافی خفا خفا سی لگ رہی تھی۔ ارے بے چاری راحت اپنی پریشانی میں تمہیں بتانا بھول گئیں تو تم نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔" فائزہ بیگم نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے بھی پروا نہیں ہے کسی کی۔ ان لوگوں نے جان بوجھ کر میرے ساتھ یہ کھیل کھیلا تھا تاکہ ایمان میرے سامنے زیادہ خوب صورت لگے۔ جلتے ہیں وہ لوگ میرے حسن سے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ وہ لوگ ڈرتے ہیں میری خوب صورتی سے کہ کہیں عفان......"

"چپ ہو جاؤ رومی...... ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔" فائزہ بیگم بہت زور سے چلائیں۔ "شرم نہیں آتی تمہیں ایسی گھٹیا بات سوچتے ہوئے بلکہ میرے خیال میں تم خود جلنے لگی ہو ایمان سے۔ اللہ ایسی دشمن نما دوست کسی کو نہ دے۔ کیوں ایک معصوم دل کی آہ لینے پر تل گئی ہو تم رومی...... آج میں نے عفان اور ایمان کو بہت خوش دیکھا ہے' تم زبردستی ان کے درمیان اپنی جگہ بنانے کے چکر میں اپنے آپ کو کتنا گرا رہی ہو اس بات کا کچھ احساس ہے تمہیں۔" فائزہ بیگم کی کونین کی طرح کڑوی مگر سچی بات رومی سے برداشت نہیں ہو سکی۔

"امی آپ...ہر بات کا الزام مجھے دیے جا رہی ہیں۔ پتا نہیں ایمان نے آپ پر کون سا جادو کر دیا ہے کہ اپنی بیٹی کو اس کی خاطر مسلسل ذلیل کرتی رہتی ہیں۔ میں نفرت کرتی ہوں ایمان سے، مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی ہے۔" وہ بے اختیار روتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگی تو سامنے سے آتے ہوئے ریاض صاحب نے اسے جلدی سے تھام لیا۔

"ارے، ارے رومی کیا ہوا بیٹا، ایسے کیوں رو رہی ہو؟" انہوں نے پریشان ہو کر اسے گلے سے لگا لیا...... وہ ان کے سینے سے لگ کر کچھ اس بے قراری سے روئی کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ فائزہ بیگم بھی اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔ اپنا غصہ بھول کر وہ بھی اسے چپ کرانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ کافی دیر بعد جا کر اس کی حالت کچھ سنبھلی تو ریاض صاحب اسے کافی دیر سمجھاتے رہے۔

"بیٹا تمہیں پہلے ایمان سے ہر بات کلیئر کر لینی چاہیے تھی۔ تم اسے بچپن سے جانتی ہو۔ اس کی نیچر سے واقف ہو پھر بنا اس کی صفائی سنے تم نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا، تم دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کیا وہ اس کی مستحق تھی۔ بیٹا سچی دوستی تو کلی طور پر اعتماد سے عبارت ہوتی ہے اور تم نے ذرا سی بات پر ایمان پر سے اپنا اعتماد اٹھا لیا۔" وہ خالی الذہنی کے ساتھ ان کی باتیں سنتی رہی۔ اسے بس ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک لفظ بھی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ذہن اس وقت صرف ایک سوال پر اٹکا ہوا تھا کہ آخر عفان اچانک کیوں واپس لوٹ آیا۔ کتنے پیار سے اس نے کہا تھا کہ وہ اپنا وعدہ کبھی بھی نہیں توڑے گا۔ وہ اس کے محبت بھرے دلاسے ایک دم سے نفرت بھرے رویے کا روپ کیوں دھار بیٹھے، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی اور آج اس بات کو دو دن بیت چکے تھے' نہ ہی وہ اس کا فون ریسیو کر رہا تھا اور نہ اس کے میسجز کا جواب دے رہا تھا۔ ایمان کی طرف سے بھی مکمل خاموشی تھی۔ اسے منانا تو دور کی بات پہلی بار ایمان نے اس کی اتنی شدید خفگی کو مکمل طور پر اگنور

کردیا تھا اور یہ بات بھی رومی سے بالکل برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ فائزہ بیگم بھی اس سے کھنچی کھنچی سی تھیں۔ رومی جیسے ڈپریشن میں جانے لگی۔

''ایک ماہ میں وہ بے وفا ہمیشہ کے لیے ایمان کا ہو جائے گا اور کیسی کڑی اور بے رحم شرط رکھی ہے اس سنگدل نے کہ اگر میں مرگئی تو وہ مجھے کبھی بھی یاد نہیں کرے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا دے گا اور اگر میں اس کی جدائی کا زہر پی کر بھی زندہ رہی تو پھر میں ہمیشہ اس کی روح میں سمائی رہوں گی لیکن اب میں کیا کروں...... عفان نے تو مجھے جیتے جی مار دیا۔ جدائی کا زہر بھی پلا دیا اور صلے میں صرف اپنی نفرت اپنی بے رخی اور بے اعتنائی دے رہا ہے۔ جب وہ مجھے بھلا ہی بیٹھا ہے تو پھر میں کیوں ایسے سسک کر جیوں لیکن مرنے سے پہلے اس ستم گر سے اس طرح آنکھیں پھیر لینے کی وجہ پوچھنے کا حق تو حاصل ہونا چاہیے۔'' اس نے تپتے ذہن کے ساتھ سوچا اور دوسرے ہی لمحے وہ عفان کو ایس ایم ایس کر رہی تھی۔

''عفان یہ میرا آخری میسج ہے جب میں نہ زندہ رہ کر تمہاری روح میں سما سکتی ہوں اور نہ مر کر بھی تمہاری یادوں میں زندہ رہ سکتی ہوں تو پھر میرا مرجانا ہی بہتر ہے کہ دونوں صورتوں میں ہی مجھے تمہاری محبت نہیں مل سکتی۔

لوگ مرتے ہیں زندگی کے لیے

موت ہے زندگی کسی کے لیے

لیکن جانے سے پہلے صرف مجھے میرا قصور بتا دو تا کہ میری روح بے چین نہ رہے۔'' رومی نے میسج بھیج کر بیڈ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ دل بے یقین سا ہو رہا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اسے عفان کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں ملے گا لیکن اچانک ہی موبائل کی ٹون بج اٹھی۔ رومی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا کیونکہ اسکرین پر عفان کا نمبر جگمگا رہا تھا

''ہیلو......'' وہ بہت بے تابی سے بولی۔

''رومی اب میں مزید تمہارا ڈراما نہیں برداشت کر سکتا۔ پلیز آئندہ تم مجھے کوئی میسج نہیں کرنا۔'' اس کا سرد لہجہ رومی کا دل کملا گیا۔

''عفان، یہ میرا آخری میسج تھا۔ آپ کو یاد دہانی کرانے کی ضرورت نہیں بس مجھے اپنی اس بے رخی، اس وعدہ خلافی کی وجہ بتا دیں۔'' وہ رو دی۔

''میں حیران ہوں رومی کہ کوئی تم جیسا سنگدل بھی ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ہے شاید میں بھی کوئی اچھا شخص نہیں ثابت ہو رہا ہوں لیکن تم از کم میں ایمان کا دل اس بے دردی کے ساتھ توڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس سنگدلی کے ساتھ تم نے اس کی معصوم خوشیوں کو روندنے کی کوشش کی تھی، کیا تمہیں اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا تھا۔ مجھے تمہاری خود غرض طبیعت سے گھن آ رہی ہے رومی اور ایمان کی معصومیت اور اس کی سچی اور بے لوث فطرت اور محبت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ سوری رومی، میں اب نادانستگی میں بھی ایمان کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا۔ کاش تم مجھے اس پارٹی کے بارے میں بتا دیتیں۔ یقین جانو میں پھر بھی ایسی کوئی راہ نکال لیتا جس سے نہ ایمان کا دل ٹوٹتا اور نہ ہی میں تم سے کیے ہوئے وعدے پر کوئی حرف آنے دیتا لیکن تم نے تو بہت ہی چھوٹی بات کر ڈالی رومی...... وہ تمہاری بیسٹ فرینڈ ہے لیکن تم تو اس کے لیے دشمن سے بھی بدتر ثابت ہو رہی ہو۔'' عفان بے حد غصے میں بولتا ہی چلا گیا۔ اس کا ہر جملہ جیسے ایک تازیانے کی طرح رومی کے دل کو چھو کے لگا رہا تھا۔

''بس کہہ چکے آپ سب کچھ...... قتل کے مجرم کو بھی سزا دینے سے پہلے اسے صفائی کا موقع دیا جاتا ہے لیکن آپ نے تو مجھ سے کچھ جانے کچھ پوچھے بنا ہی مجھے اتنی کڑی سزا دے دی۔ کیا آپ نے کبھی کوئی ایسی لڑکی دیکھی ہے جو ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو جو اسے صاف صاف بتا چکا ہو کہ وہ لڑکی کبھی بھی اس کی زندگی میں شامل نہیں ہو سکتی۔ وہ لڑکی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا محبوب کسی اور کو چاہتا ہے پھر بھی اس سے پیار کیے جائے۔ اس کی بے رخی کے زخم سہے، وہ جب چاہے اس لڑکی کی انسلٹ کر دے اور وہ آنسو پی کر خاموش ہو جائے...... عفان میں نے تو آپ کی محبت میں اپنی انا کو بھی ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ جو کہتے ہیں میں اس پر سر جھکا دیتی ہوں پھر اگر میں نے آپ کے پیار میں اگر تھوڑی سی خود غرضی دکھا دی تو آپ کو میری فطرت سے گھن ہی آنے لگی۔ کتنی بڑی بات کر دی آپ نے۔ میرے لیے آپ کا یہ کمنٹ موت سے کم نہیں۔'' وہ بری طرح سے رونے لگی۔ عفان کو تھوڑی سی شرمندگی محسوس ہوئی جذبات میں آ کر وہ کچھ زیادہ ہی کہہ گیا تھا۔ رومی کی باتوں میں چھپی صداقت کو اس نے دل ہی دل میں تسلیم بھی کیا لیکن اپنے انداز سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''پلیز رومی، رونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میرے خیال میں ہم لوگوں کو اب اپنے قدم روک لینے چاہئیں۔ میں تھک چکا ہوں رومی...... ایک عجیب سی الجھن اور خلش مجھے ہر وقت پریشان کرتی رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایمان کے ساتھ ساتھ میں تمہاری زندگی کو بھی بلاوجہ ہی اندھیروں کی نذر کر رہا ہوں۔ رومی یقیناً تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی محبت کی دیوانگی میں کیا لیکن یہ دیوانگی آگے چل کر بہت تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سارے معاملے میں قصوروار میں ہوں رومی...... پلیز مجھے معاف کر دو اور جہاں آنٹی انکل کہہ رہے ہیں وہاں شادی کر لو، اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔'' وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

''واہ...... عفان آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ میں شادی کر لوں...... لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ میں نے اپنی خودداری ایک طرف رکھ کر آپ سے آپ کی زندگی میں آنے کی بھیک مانگی تھی جسے آپ نے بہت بے رخی سے مسترد کر دیا پھر میں نے آپ سے صرف آپ کی سالگرہ کا دن مانگا تھا لیکن آپ نے......''

''اس دن کا تذکرہ اگر تم نہ ہی کرو تو بہتر ہے کیونکہ وہ دن مجھے تمہاری خود غرض طبیعت کی یاد دلانے لگتا ہے۔'' عفان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کافی درشت لہجے میں کہا۔ ''اس دن تم مجھے بہت روکھی اور ظالم لگی تھیں رومی۔ ایسی لڑکی جو صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچتی ہے چاہے کسی کی جان ہی چلی جائے۔''

''ہاں عفان، مجھے آپ کی محبت نے اتنا پاگل کر دیا ہے کہ میں جو تھی اب وہ نہیں رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ ہمیشہ کے لیے ایمان کے ہو جائیں گے، میری زندگی محض ایک پیاس بن کر رہ جائے گی لیکن میں وقت سے پہلے نہیں مرنا چاہتی ہوں عفان، آپ کی شادی میرے لیے ایک موت ہی تو ہے۔ اس کے بعد بے شک میں زندہ رہوں گی لیکن بنا زندگی کے...... کیوں نہیں سمجھ رہے آپ میری فیلنگز، کیوں میری محبت کو اتنے سخت سخت القاب سے نواز رہے ہیں اور میں اتنی انسلٹ سہہ کر بھی بے غیرت بن کر آپ کی محبت میں مر رہی

ہوں۔ میں کیا کروں عفان، میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔" وہ زاروقطار رونے لگی۔ عفان کے دل میں اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ جیسے آنسو بن کر گر رہا تھا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ وہ جو رومی کو آئینہ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ خود بھی تو اسی زمرے میں آ رہا تھا۔ ایک لڑکی کے معصوم دل سے اس کے جذبات سے کھیلنے کا مجرم تو وہ بھی تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں اسے اس وقت صرف رومی کے آنسو اور اس کی آہیں ہی نظر آئیں۔ اس کی محبت کی شدت عفان پر بالکل واضح اور زیادہ روشن ہوتی جا رہی تھی۔

"رومی میری زندگی، پلیز ایسے مت روؤ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔" پتا نہیں کیسے بالکل اچانک ہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے جو رومی کے تپتے ہوئے وجود میں ایک پھوار بن کر برس گئے۔ وہ اور بے قراری سے رونے لگی۔

"پلیز رومی، میری خاطر چپ ہو جاؤ۔ خدا کی قسم تمہاری محبت کی سچائی کو میں مان رہا ہوں۔ شاید ہم دونوں کے درمیان یہ انوکھا سا روحانی تعلق کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ میں تمہاری محبت کی شدتوں کے سامنے ہار گیا ہوں رومی...... شاید اس لیے بھی کہ تم میرے دل کے کسی کونے میں ایسے چھپ کر بیٹھی ہو کہ نکالے نہیں نکل رہی ہو۔" وہ بہت بے بسی سے بولا لیکن اس کی یہ بے بسی رومی کے لیے خوشیوں کا خزانہ چھپائے ہوئے تھی۔

"عفان آپ کچھ دنوں بعد ہمیشہ کے لیے ایمان کے ہو جائیں گے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے آج میں نے اس سے پہلے آپ کو پالیا ہے۔ میں آپ کے ان جملوں میں اپنی پوری زندگی جی لوں گی۔ شاید ایسی محبت کبھی کسی نے کسی سے نہیں کی ہوگی جو ہم دونوں کے درمیان ہے۔ میں آپ کی شادی کی ہر تقریب میں شریک ہوں گی عفان...... بس ایک التجا ہے کہ پہلے کی طرح ہر روز مجھ سے باتیں کیجیے گا۔ جس دن ایمان آپ کی زندگی میں داخل ہو جائے گی بس اس دن کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جائیں گے۔ فون تو دور کی بات، میں آپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی، اجنبی بن جاؤں گی میں آپ کے لیے لیکن ابھی کم از کم فون کی حد تک تو آپ میرے بن کر رہیں۔ آپ کی آواز، آپ کی باتیں میں ساری زندگی اپنے دل میں چھپا کر جی لوں گی۔" اس کے آنسوؤں سے بوجھل جملے عفان کے دل میں ہلچل مچا گئے۔

"ٹھیک ہے رومی...... میں تمہیں ہر روز فون کروں گا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل شدت سے تمہیں دیکھنے کو بھی چاہ رہا ہے۔ کل تم ایمان کے گھر آ جاؤ، میں بھی کل شام کو وہاں آ رہا ہوں ایمان کو ڈنر پر لے جانے کے لیے لیکن اب وہ ڈنر صرف تمہارے اعزاز میں ہے۔ تمہارے آنسوؤں کی تلافی کے لیے۔" وہ ایک بار پھر پیار کا سمندر بن گیا۔

"لیکن عفان میں وہاں جاؤں گی کیسے؟ ایمان تو مجھ سے سخت خفا ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"دیکھو رومی، اس سارے معاملے میں ایمان کا کوئی قصور نہیں اور کیا تم میری خاطر اس سے سوری نہیں کہہ سکتیں۔"

"میں اپنے رویے پر خود بھی شرمندہ ہوں عفان...... میں کل جا کر ایمان اور آنٹی دونوں سے معافی مانگ لوں گی۔ میرے لیے تو کل کا دن عید سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں آپ کو دیکھوں گی آپ سے ملوں گی۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"رومی میں چاہتا تو تمہیں کہیں اور بھی بلا سکتا تھا، میں جانتا ہوں کہ تم کبھی انکار نہیں کرتیں لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا...... تم سمجھ رہی ہو نا......؟" وہ کچھ کہتے ہوئے رک سا گیا۔

"میں سب سمجھ رہی ہوں عفان...... آپ ایمان کی امانت ہیں اس کے باوجود اگر آپ خیرات میں محض محبت کے چند جملے اور التفات کی بچی نظر میری نذر کر رہے ہیں تو یہ بھی میرے لیے کسی خزانے سے کم نہیں۔ ایک دوسرے کو نہ پا کر بھی روحانی طور پر ساتھ رہنا بھی آپ ہی نے تو سکھایا ہے۔" وہ رنجیدگی سے بولی۔

"تھینکس رومی، آج دل چاہ رہا ہے کہ تم سے کہہ دوں کہ تم میرے دل کی گہرائیوں میں بستی جا رہی ہو۔ میں ہر بار تمہارے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی ہار جاتا ہوں اور رومی ہمارا یہ خوب صورت سچا تعلق کبھی آلودہ نہیں ہوگا۔" وہ بہت جذب سے کہہ رہا تھا اور رومی موبائل کانوں سے لگائے آنکھیں بند کیے جیسے بنا پر کے اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

"امینہ تمہارا یہ فیصلہ تمہارے لیے کتنا نقصان دہ ہے، تم شاید ابھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتی ہو لیکن بعد میں جب تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔" عندلیب آخری جملہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ وہ کافی دیر سے امینہ کو سمجھا رہی تھی لیکن امینہ ہونٹوں پر جامد خاموشی لیے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ عندلیب کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دے رہی تھی البتہ آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ رکنے والا سلسلہ جاری تھا۔

"ٹھیک ہے امینہ، اب میں چلتی ہوں۔ امی جب سو کر اٹھیں تو پلیز اس وقت تک اپنے آپ کو فریش اپ کر لینا۔ تمہارا یہ اترا چہرہ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کہیں ان کا بلڈ پریشر پھر سے بہت ہائی نہ ہو جائے۔ اب اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اتنا رونے دھونے کی کیا تک ہے بھلا۔" عندلیب کے لہجے میں چھپی ناگواری کو امینہ نے صاف محسوس کر لیا۔ ظاہری بات تھی کہ اس کے اتنے سمجھانے کے باوجود امینہ اپنی بات پر قائم رہی تھی تو اسے غصہ تو آنا ہی تھا۔ ایک تو اتنی اچھی ملازمہ اس کے ہاتھ سے جا رہی تھی جس نے اسے مسز رازی کی طرف سے بالکل بے فکر کر دیا تھا اور دوسرے اس کے نزدیک امینہ کا یہ فیصلہ سراسر احمقانہ تھا ایک ناکارہ، خودغرض اور چرسی آدمی کے لیے وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو ایک عذاب میں ڈالنے جا رہی تھی اور سب سے کڑی سزا کو بھی بھگتنا تھا۔ پتا نہیں وہ شخص کون تھا کیسا تھا اور وہ امینہ کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا...... بھلا رحیم جیسے آدمی کا کیا بھروسا جو اگر اپنے بچوں کو بیچ سکتا تھا تو پتا نہیں امینہ سے دوبارہ شادی کرنے کی خاطر وہ کس قماش کے شخص کے ہاتھوں میں امینہ کو سونپ رہا تھا۔ اسے امینہ پر بھی شدید حیرت ہو رہی تھی جس کے خیالات یکایک ایسے پلٹ گئے تھے جیسے تیز بارش میں اچانک سخت دھوپ نکل آئے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھی انسان کی زندگی میں آنے والا ایک چھوٹا سا لمحہ اسے اندر تک سے بدل کے رکھ دیتا ہے جیسا کہ امینہ کے ساتھ ہوا تھا۔ خوف اور دہشت کے ان لمحات میں رحیم کی ذات سے اسے جس تحفظ اور سکون کا احساس ہوا تھا وہ احساس جیسے روشنی بن کر نفرت کے اندھیروں کو ختم کر گیا تھا۔

"عندلیب بی بی، میں جانتی ہوں کہ آپ کو میرا

یہ قدم بہت برا لگ رہا ہے اور مجھے بھی حلالہ جیسی آزمائش سے گزر کر رحیم تک پہنچنا ہے لیکن میں بہت مجبور ہوں عندلیب بی بی، میری چندا تو ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ اس کی موت ایک کانٹے کی طرح میرے دل میں ہر وقت چبھتی رہتی ہے لیکن ابھی حمید اور رشید کے ملنے کی آس میری زندگی میں باقی ہے وہ جب مل جائیں گے تو انہیں ماں اور باپ دونوں کے سائے کی ضرورت ہوگی ورنہ ان کا حشر بھی چندا جیسا ہوجائے گا۔ رحیم بہت ٹوٹا ہوا ہے اگر وہ بھی مرگیا نا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ کو نہیں پتا عندلیب بی بی مجھ پر کیا گزر رہی ہے، یہ نکاح کرتے ہوئے میں اندر سے مر رہی ہوں۔“ وہ بے اختیار رونے لگی تو عندلیب نے بہت بیزاری سے اسے دیکھا۔

”امینہ فار گاڈ سیک، بھئی اب یہ رونا دھونا بالکل بند کرو، میں تھک چکی ہوں تمہارے یہ آنسو دیکھ دیکھ کر۔ جاؤ پہلے مولوی فضل کے ساتھ نکاح کرو پھر رحیم کے ساتھ شادی کر کے ہنی مون مناؤ۔ یہ مگر مچھ کے آنسو مجھے بالکل امپریس نہیں کر رہے۔“ عندلیب کے بے رحم لہجے پر امینہ کا دل ٹوٹ گیا اور وہ سر جھکا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”اور ابھی مجھے جمعے سے پہلے پہلے کسی اور کیئر ٹیکر کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ امی کتنی تمہاری عادی ہوگئی تھیں۔ آج کل ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن تم لوگ تو ہوتے ہی خود غرض ہو۔“ عندلیب اس سے سخت ناراض نظر آرہی تھی۔

”عندلیب بی بی، میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں بیگم صاحبہ کو چھوڑ کر کہیں جارہی ہوں۔ میں نے رحیم سے کہہ دیا ہے کہ میں نوکری ہرگز بھی نہیں چھوڑوں گی۔“

”واہ، تم بھی کمال کرتی ہو امینہ، تمہارا مطلب ہے کہ تم اور مولوی فضل اور پھر بعد میں وہ چرسی رحیم یہاں اس گھر میں تمہارے بیڈ روم میں رہیں گے؟“ عندلیب نے سخت جھنجلا کر اسے دیکھا۔

”ہم لوگ سرونٹ کوارٹر میں رہ لیں گے عندلیب بی بی لیکن میں بیگم صاحبہ کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ ویسے بھی میں تو سارا وقت بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی رہوں گی اور رحیم کبھی بھی گھر کے اندر نہیں آئے گا، میں وعدہ کرتی ہوں۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”امینہ تم بالکل فضول باتیں کررہی ہو۔ میں کسی بھی قیمت پر رحیم کو اس گھر میں رکھنے پر تیار نہیں ہوں، اپنے میاں کے ہوتے ہوئے بھلا تم کیسے ہر وقت امی کے پاس رہ سکتی ہو۔ اس وقت ان کو بہت برابر دیکھ بھال کی ضرورت ہے اور ابھی دیکھو تمہیں یہ تمہارا مولوی فضل چھوڑتا بھی ہے یا نہیں۔“ وہ الجھے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور امینہ بے بسی سے بس اس کی پشت تکتی رہ گئی۔ عندلیب کی باتوں نے جیسے اس کی رہی سہی خوشی بھی ختم کر کے رکھ دی تھی۔ ایک خوف اور وسوسے نے اس کے دل کو جکڑنا شروع کردیا کہ اگر واقعی میں مولوی فضل نے اسے طلاق نہیں دی تو پھر کیا ہوگا۔ اس نے تو کبھی اس شخص کو دیکھا بھی نہیں تھا، رحیم بتا رہا تھا کہ نکاح کے بعد وہ اس کو گاؤں اپنی ماں کے پاس لے جائے گا جو کہ بیمار ہے اسے وہاں کچھ دن رہنا ہوگا اور پھر واپس آکر وہ امینہ کو طلاق دے دے گا لیکن اس وقت عندلیب نے جو کچھ کہا تھا نہ جانے کیوں اس کے خیالات امینہ کے دل کو بھی بے اعتبار کرنے لگے لیکن پھر رحیم کے دکھلائے ہوئے اس حسین خواب کا خیال آتے ہی وہ سر جھٹک کر اپنا اندیشہ بھلا دینے کی کوشش کرتے ہوئے اس خوب صورت تصور میں کھوگئی جب وہ اور رحیم اپنے چھوٹے سے گھر میں حمید اور رشید کے ساتھ خوشیوں بھری زندگی گزاریں گے۔ رحیم نے اسے یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ اکرم کا ایک دوست اسے ملا تھا جو بتا رہا تھا کہ اکرم کبھی بھی دبئی نہیں گیا بلکہ وہ وہیں کہیں ملتان میں ہے اور امینہ کی عدت کے دوران وہ اپنے بچوں کو ڈھونڈ کر لے آئے گا تاکہ جب وہ لوگ پھر سے نکاح کریں تو اپنے بچوں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کریں۔ تبھی مسز رازی کے پکارنے پر وہ اپنے خوش کن خیالات سے باہر نکل آئی اور تیز تیز قدموں کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی بیگم رازی اسے دیکھ کر نقاہت سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”امینہ تم مجھے چھوڑ کر کبھی مت جانا، تم سے مجھے بہت تسلی رہتی ہے۔“ وہ اس کے ہاتھوں سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے بہت کمزور آواز میں بولیں تو امینہ کا حساس دل تڑپ ہی تو گیا۔

”بیگم صاحبہ، میرا بس چلے تو میں مرتے دم تک آپ کے پاس رہوں لیکن......“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

”دیکھو امینہ تم کبھی شادی مت کرنا۔ میرا شاہد جو میرے بغیر پانی بھی نہیں پیتا تھا شادی کے بعد اس کی محبت، اس کی فکریں بس اپنی بیوی بچوں میں منتقل ہوگئی ہیں۔ فریال بیٹی ہوکر بھی اتنی پتھر دل ہوگئی ہے کہ اسے اسلام آباد سے کراچی آنا بھی اتنا دوبھر لگتا ہے کہ وہ دو سال سے میرے پاس نہیں آئی ہے اور میرا سب سے چھوٹا بیٹا شہزاد تو جیسے یہ بھول ہی گیا ہے کہ اس کی کوئی بوڑھی ماں بھی ہے جو اسے پل پل یاد کرتی ہے۔ پتا ہے اس نے مجھے اطلاع دینے کی بھی زحمت نہیں کی اور گرین کارڈ کی خاطر کسی امریکن لڑکی سے وہیں امریکا میں شادی بھی کرلی، چار سال سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ امینہ، رازی صاحب کہتے تھے کہ تم اپنے بچوں کی خاطر مجھے نظر انداز کردیتی ہو اب میں سوچتی ہوں تو اُن کی یہ شکایت جیسے میرے کلیجے میں کچوکے لگانے لگتی ہے، ان بچوں کی مصروفیات میں گم ہو کر جیسے میں نے اپنے آپ کو بھلا دیا تھا۔ رازی صاحب دفتر سے تھکے ماندے آتے تھے تو نوکر اُن کو چائے بنا کر دے دیتا تھا، میں نے تو کبھی ہنس کر ان کا استقبال بھی نہیں کیا۔ کبھی کسی بچے کو پڑھا رہی ہوں، کبھی کھلا رہی ہوں، ان کے کپڑے بدل رہی ہوں اوپر تلے کے چار بچوں نے مجھے رازی صاحب سے کتنا دور کردیا تھا۔ کاش میں نے کچھ خوب صورت وقت رازی صاحب کے ساتھ بھی گزارا ہوتا جیسے میرے بچے مجھے نظر انداز کر کے اپنے اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔“ آج مسز رازی کو شدت سے رازی صاحب کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا احساس ہورہا تھا اور امینہ خاموشی سے ان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی اور اس کا دل ڈوبا جارہا تھا کہ کیسے وہ اس تنہا بوڑھی عورت کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔

”امینہ تم دوبارہ ہرگز بھی شادی نہیں کرنا۔“ انہوں نے بچوں کی طرح پھر سے اپنی بات دُہرائی۔ ”ورنہ پھر تم بھی بدل جاؤ گی۔ دیکھو نا عندلیب میرا جتنا بھی خیال رکھے لیکن فوقیت وہ بہرحال اپنے گھر کو دیتی ہے۔ اگر اس کے بچوں کے امتحان ہورہے ہوں تو کئی کئی دن میں اس کی شکل کو ترس جاتی ہوں لیکن پھر بھی امینہ اس کی وجہ سے مجھے بہت تقویت بھی رہتی ہے۔ میری یہ بیٹی یہاں نہ ہوتی تو شاید میں بہت پہلے ہی مرگئی ہوتی، بڑا سہارا ہے مجھے عندلیب اور اس کے بچوں سے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ، عندلیب

بی بی آپ کا واقعی میں بہت خیال رکھتی ہیں، اپنی اتنی مصروفیت میں بھی ہمیشہ آپ کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ویسے فریال بی بی بھی تو شاید کل تک آجائیں۔'' اینہ نے ان کے رنجیدہ دل کو کچھ خوشی دینا چاہی۔

''نہیں اینہ، ایسے کئی وعدے وہ پہلے بھی کر چکی ہے۔ جب تک وہ آنہیں جاتی مجھے یقین نہیں آئے گا۔ میری دوست ہے ایک بانو، وہ جب بیمار پڑی تھی تو اس کی دونوں بیٹیاں امریکا اور لندن سے دو دو بار اسے دیکھنے آگئی تھیں لیکن فریال اسلام آباد سے نہیں آسکتی۔ میں اس معاملے میں بہت بدقسمت ہوں اینہ۔'' ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''ورنہ بانو کے بچوں کو بھی میں دیکھتی ہوں، ماشاء اللہ سے اس کے پانچوں بچے اس کی صورت دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس رہتی ہے لیکن دوسرا بیٹا بھی ضد کر کر کے اسے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ ایک بیٹی یہیں کراچی میں رہتی ہے۔ دو بیٹیاں باہر کے ملکوں میں ہیں لیکن وہ بھی ہر سال آجاتی ہیں۔ اینہ پتا نہیں، میں کیوں اپنے بچوں کے لیے ہر وقت ترستی رہتی ہوں۔ شاہد اور شہزاد اپنی اپنی دنیا میں گم ہو کر مجھے بھلا بیٹھے ہیں۔ لڑکیاں بھی اپنے گھروں میں مگن ہیں۔ جب میرے یہ بچے شادی سے پہلے میرے ساتھ رہتے تھے نا تو ایسی رونق رہتی تھی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔''

آج مسز رازی بہت زیادہ ڈپریسڈ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر بھی کافی کمزوری نمایاں تھی۔ اینہ نے بڑی فکرمندی سے انہیں دیکھا۔

''بیگم صاحبہ آپ اچھی اچھی باتیں سوچیں مجھے دیکھیں، میری بچی تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ ہی گئی اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے دونوں بیٹوں کی جدائی کا غم بھی سہنا پڑ رہا ہے جن کے بارے میں مجھے کچھ پتا ہی نہیں ہے کہ وہ کس حال میں ہیں۔ بیگم صاحبہ آپ اپنا خیال کیجیے۔ اپنی صحت کی طرف توجہ دیجیے انشاء اللہ فریال بی بی بھی کل تک ضرور آجائیں گی۔'' وہ ان کا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو اینہ، تمہارے غم کے سامنے میرا دکھ تو کچھ بھی نہیں ہے اور یہ تو ایک فطری بات ہے کہ بچے بڑے ہو کر اپنی دنیا الگ بسا ہی لیتے ہیں شاید میں ہی اس معاملے میں زیادہ حساس ہوتی جا رہی ہوں۔ مجھے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے اس بڑھاپے میں مجھے تمہارے جیسا ساتھی دے دیا ہے۔ تم میرا دکھ سکھ سنتی ہو، میری خدمت کرتی ہو تم سے میرا دل بہلا رہتا ہے اینہ تم کبھی مجھے چھوڑ کر مت جانا۔'' ان کے لہجے میں چھپی التجا محسوس کر کے اینہ نے پیار سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

''بیگم صاحبہ آپ یقین کیجیے میں آپ کو کبھی بھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی بس مجھے چند روز کی چھٹیاں چاہئیں پھر میں واپس آجاؤں گی۔''

''نہیں، نہیں اینہ میں تم کو ایک روز کے لیے بھی کہیں نہیں جانے دوں گی۔ دیکھو اگر تم نے مجھے ایسے اکیلے چھوڑ دیا تو تم کو بہت گناہ ملے گا۔'' وہ بہت معصومیت سے اسے ڈرانے کی کوشش کرنے لگیں تو اینہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس وقت وہ اسے ایک ایسی چھوٹی سی بچی کے مانند لگیں جو اپنی ماں کے بغیر اکیلے رہنے کے تصور سے بھی گھبرا رہی ہو۔ ہاں اس وقت وہ انہیں اپنی چندا... جیسی لگی تھیں جسے اس نے اس ظالم دنیا میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

''نہیں، نہیں بیگم صاحبہ، آپ فکر مت کیجیے، میں یہیں رہوں گی آپ کے پاس ہی...... بس عندلیب بی بی سے میری سفارش کر دیجیے کہ وہ رحیم کو سرونٹ کوارٹر میں رہنے کی اجازت دے دیں، بیگم صاحبہ میں اپنے سر کے سائیں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''اینہ تم اپنی زندگی کا بہت ہی غلط فیصلہ کرنے جا رہی ہو۔ وہ آدمی بالکل ٹھیک نہیں ہے اور تم اس کی خاطر حلالہ جیسا قدم بھی اٹھانے کو تیار ہو۔ اینہ میں عندلیب کی ضدی طبیعت سے واقف ہوں۔ وہ تمہاری اس شادی کے سخت خلاف ہے اگر تم نے شادی کر لی تو وہ تمہیں میرے گھر میں قدم بھی نہیں رکھنے دے گی۔ میری خاطر اپنا فیصلہ بدل دو اینہ۔'' انہوں نے بڑے ملتجانہ انداز میں اسے دیکھا تو وہ آنسوؤں سے جل تھل آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''بیگم صاحبہ میں رحیم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ سب انتظام ہو چکا ہے۔ اب اگر میں نے اچانک انکار کر دیا تو شاید وہ مر جائے گا۔ مجھے معاف کر دیجیے بیگم صاحبہ، میں بہت مجبور ہوں۔''

☆☆☆

''پتا ہے رومی، پرسوں ہم لوگ ڈھولکی رکھ رہے ہیں تمہاری آواز اتنی خوب صورت ہے سمجھو نمایاں سنگر تم ہی ہو گی ہم سب تو بس تمہارے ساتھی ہوں گے۔'' شازی فون پر اسے بہت خوشی سے اطلاع دے رہی تھی۔

''اچھا پھر تو بہت مزہ آئے گا لیکن شازی پلیز مجھے گانوں کے لیے مت کہو، مجھے تو زیادہ گانے یاد بھی نہیں ہیں۔'' وہ بظاہر بہت خوش ہو کر بولی تھی لیکن دل کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔

''ارے بھئی، میں نے اور میری کزنز نے بہت سارے گانے لکھ لیے ہیں لیکن یار مین سنگر تو تمہارے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ قسم سے اتنی حسین آواز ہے تمہاری کہ اگر شوبز میں آجاتیں نا تو انڈیا والے بھی تمہیں نہ چھوڑتے، ہائے ایمان سے تمہارے طفیل ہم بھی وہاں کے ہیرو ہیروئنز سے مل لیتے۔'' شازی نے کچھ اتنے مزے سے کہا کہ رومی کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

''اچھا بابا میں گالوں گی لیکن پلیز تم انڈیا سے واپس لوٹ آؤ ورنہ بغیر ویزے کے پکڑی جاؤ گی۔ اچھا ذرا ایمان سے تو میری بات کروا دو۔''

''وہ ذرا عفان بھائی کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی ہے۔'' شازی کی اس اطلاع پر وہ بجھ کر رہ گئی۔

''اچھا، کیا وہ دونوں اکیلے گئے ہیں؟'' لہجے میں زبردستی کی شوخی چھپا کر اس نے پوچھا۔

''نہیں، ایک بڑی سی ظالم سماج کی دیوار بھی ساتھ میں ہیں، میرا مطلب ہے کہ راحیلہ آنٹی بھی ساتھ ہیں، اصل میں وہ لوگ جیولری ایمان کی پسند سے خریدنا چاہتے ہیں۔ اب ٹائم بھی تو کتنا کم رہ گیا ہے۔'' شازی کی بات پر رومی کے دل کے اندر تک ایک اداسی اتر گئی۔ عفان کچھ دنوں کے بعد ہمیشہ کے لیے ایمان کا ہو جائے گا، وہ تنہائیوں کی آگ میں جلتے ہوئے نارسائی کا کرب سہے گی اور وہ ایمان کے خوب صورت قرب میں کھو کر اس کی محبت کو فراموش کر دے گا اور پھر ان دونوں کے درمیان یہ عہد بھی تو ہوا تھا کہ شادی کے دن سے وہ لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جائیں گے، اس نے عفان کے کہنے کے مطابق اس کی محبت اپنے دل میں چھپا کر جینے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اس پر عمل کرنے کا اس کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''سوری عفان، میں تمہاری اس منطق کو نہیں مان سکتی..... بھلا ایک دوسرے کو پائے بنا بھی کیسے

خوش رہا جا سکتا ہے۔ تمہیں ایمان کا ہوتا دیکھ کر جو کرب میں سہوں گی تمہیں اس اذیت کا اندازہ ہی نہیں ہوگا کیونکہ تمہیں اپنی من پسند حسین دلہن کے جلوؤں میں گم ہو کر بھلا میرا خیال ہی کب آئے گا۔ کتنی سنگ دلی سے تم نے کہہ دیا کہ میں تمہاری جدائی کا زہر پی کر بھی مسکراتی رہوں، نہیں عفان... میرے آنسوؤں کی آگ میں تمہارے ساتھ ساتھ ایمان کو بھی جلنا ہوگا۔ اگر میں جیتے جی مر رہی ہوں تو تم دونوں کو بھی خوش ہونے کا حق نہیں ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر سوچا تھا۔

رات کو جب عفان کا فون آیا تو اس کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے پیار سے پوچھا۔ "کیا ہوا رومی، آج تمہاری باتوں میں وہ زندگی نہیں جو مجھے اندر تک فریش کر دیتی ہے۔"

"عفان جس انسان کو اپنی موت کے دن کا علم ہو جائے اور وہ دن روز بروز نزدیک آتا جا رہا ہو تو دل تو بیٹھنے لگتا ہے نا؟" وہ اداسی سے بولی تو عفان اس کی بات کو سمجھتے ہوئے ایک لمحے کو خاموش رہ گیا۔

"دیکھو رومی، میں تمہاری کیفیت، تمہارے جذبات کو سمجھ رہا ہوں۔ میں تو خود اپنے اوپر حیران ہوں کہ لاکھ نہ چاہنے کے باوجود میں ہر روز تم سے باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اٹھارہ تاریخ کے بعد جب یہ سلسلہ بند ہو جائے گا تو پتا نہیں میں کیسا محسوس کروں گا یا تم کتنا الجھو گی۔ ہمیں ایک دوسرے کا اتنا عادی نہیں ہونا چاہیے رومی۔ پلیز! تم یہ ہر رات فون پر باتیں کرنے کی ضد چھوڑ دو، یہ ہم دونوں کے لیے ہی ٹھیک نہیں ہے۔"

"عفان مرنے والے کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے میری اس ضد کو برداشت کر لیجیے۔ میری اس انوکھی محبت کو شاید دنیا میں کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے تو آپ کو کھونے کی اذیت میں بھی مزہ آ رہا ہے۔ آپ کی جدائی کا درد بھی مجھے بہت پیارا لگ رہا ہے۔" رومی کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اس کی یہی باتیں تو عفان کو کسی اور دنیا میں لے جاتی تھیں۔ اس کی محبت ایک سحر بن کر اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی اور وہ اپنے دل کے ہاتھوں بے بس ہو کر اس کے لفظوں کی پھوار میں بھیگتا چلا جاتا تھا۔

"آپ آج ایمان کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئے تھے نا۔ کتنا اچھا لگ رہا ہوگا آپ دونوں کو اپنے حسین مستقبل کی پلاننگ کرتے ہوئے۔" دکھ اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

"پلیز رومی، ایسی باتیں کر کے اپنے آپ کو کیوں اتنا دکھی کرتی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کل شام ایمان کے گھر پر ڈھولکی رکھی جا رہی ہے، تم آؤ گی نا؟" وہ اس کا دھیان بٹانے کی کوشش میں اسے مزید دکھوں میں دھکیل گیا۔

"ہاں، ضرور جاؤں گی۔ آپ دونوں کی خوشیوں کی ابتدا میں اپنے آنسو چھپا کر خوب گانے گا کر کروں گی۔"

"رومی تمہاری باتیں آج مجھے بہت ڈپریسڈ کر رہی ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ......"

"پلیز عفان، آپ بار بار ایک بات مت دُہرائیں۔ بس ایک بات یاد رکھیں کہ اگر کسی رات آپ کا فون نہیں آیا نہ تو شاید پھر میری اس رات کی صبح کبھی نہیں ہوگی۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے کچھ خفگی سے بولی تو عفان نے بات بدلتے ہوئے کچھ شوخی سے کہا۔

"اچھا ذرا اسی بات پر ایک اچھا سا شعر تو سنا

دو۔"

"تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا"

اس کی پُرسوز آواز عفان کے دل میں اتر گئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہنے لگا کہ یہ اٹھارہ تاریخ بہت دور چلی جائے اور وہ یونہی ہر رات رومی کی خوب صورت باتوں کی مہک سے اپنی زندگی کو معطر کرتا رہے۔

☆☆☆

"دیکھو اینہ، کل سے ایک اور عورت امی کی دیکھ بھال کے لیے آ رہی ہے، میرے خیال میں تمہیں کل شام تک یہ کمرا خالی کر دینا ہوگا۔" عندلیب کے لہجے میں بے رخی اور بیگانگی محسوس کر کے اینہ نے بہت اداسی سے اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے عندلیب بی بی، میں یہ کمرا خالی کر دوں گی لیکن صرف ایک بار بیگم صاحبہ کے بارے میں تو سوچ لیجیے جو شاید میرا جانا برداشت نہ کر پائیں۔"

"اینہ تم بلاوجہ کی خوش گمانیوں میں کیوں اپنے آپ کو مبتلا کر رہی ہو۔ امی کو تمہارے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ عورت جو میں رکھ رہی ہوں وہ تم سے کہیں بہتر طریقے سے ان کی دیکھ بھال کرے گی۔ امی کو وقت پر دوائیں اور کھانا ہی تو چاہیے ہوتا ہے یا پھر اچھی کمپنی ان کو خوش رکھتی ہے۔ راشدہ میں یہ سب باتیں ہیں۔ وہ امی کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنے کے علاوہ اپنی دلچسپ شخصیت سے ان کو خوش بھی رکھے گی۔ ویسے وہ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے کہہ رہی تھی کہ وہ امی کو اخبار سے دلچسپ خبریں بھی پڑھ کر سنایا کرے گی۔" عندلیب کی بات پر اینہ نے بہت ہولے سے پوچھا۔

"کیا وہ ان کو وہ محبت اور اپنائیت بھی دے گی عندلیب بی بی جو بیگم صاحبہ مجھ سے لیتی رہی ہیں۔"

"ہونہہ بھاڑ میں گئی ایسی محبت اور اپنائیت جو وقت آنے پر واپس لے لی جائے۔ تم لوگ سب ایک جیسے ہوتے ہو۔ راشدہ بھی تمہاری طرح اچھی تنخواہ کے عوض امی کو محبت اور اپنائیت آرام سے دیتی رہے گی۔ اس کی تم فکر مت کرو اور اگر راشدہ کی بھی کوئی مجبوری ہو گئی تو میرے لیے دوسری راشدہ اور دوسری اینہ جیسی عورتوں کی کوئی کمی نہیں۔ بس تم کل شام تک اپنی پیکنگ پوری کر لینا۔" عندلیب کے لہجے میں اس کے لیے نفرت اور غصہ دونوں ہی پھنکار رہے تھے۔ اینہ کا دل چاہا کہ اس سے پوچھے کہ "میں تو پیسوں کے عوض ہی سہی انہیں محبت اور کمپنی دیتی تو تھی لیکن آپ بہن بھائیوں نے تو انہیں ملازموں کے سپرد کر کے کتنا تنہا کر دیا ہے، یہ آپ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ کاش آپ لوگوں کو بھی اللہ اتنا غریب کر دے کہ بیگم صاحبہ آپ لوگوں کو پیسے دے کر ہی سہی آپ کی محبت آپ کا وقت خرید سکیں کہ رازی صاحب نے آخر اتنا پیسہ کس لیے چھوڑا ہے ان کے لیے؟" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا لیکن منہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

"ٹھیک ہے عندلیب بی بی، میں یہ کمرا کل شام تک خالی کر دوں گی لیکن بس مجھے ایک دو راتیں ان کے کمرے میں رہنے دیجیے ویسے بھی میں آنے والی عورت کو بیگم صاحبہ کے معاملات کے بارے میں سب کچھ بتانا چاہتی ہوں تاکہ بیگم صاحبہ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔" اس نے بہت ہی عاجزی کے ساتھ عندلیب سے درخواست کی تو عندلیب نے ایک لمحے کے لیے متذبذب ہو کر اسے دیکھا۔ اینہ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ راشدہ کو جتنی اچھی طرح سے اینہ بریفنگ

دے سکتی تھی اس کے متعلق تو عندلیب نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ویسے خود عندلیب بھی دل سے ہرگز نہیں چاہ رہی تھی کہ ایمنہ نوکری چھوڑ کر چلی جائے۔ اسے خود بھی احساس تھا کہ اس کی ماں جتنی خوش اور مطمئن ایمنہ کے ساتھ تھیں آج تک کسی اور ملازمہ کے ساتھ نہیں ہوئی تھیں۔ راشدہ سے ملنے کے بعد اس میں بھی عندلیب کو ایمنہ جیسی بات نظر نہیں آئی تھی لیکن اس وقت اسے ایمنہ کو اپنا بھرم بھی تو دکھانا تھا اور دوسرے یہ کہ شاید راشدہ کے آنے کی دھمکی سن کر ایمنہ اپنا ارادہ بدل دیتی لیکن یوں لگتا تھا جیسے ایمنہ اپنے ارادے سے ذرا بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں ہے اور یہی بات عندلیب کی الجھن اور غصے کو اور بھی ہوا دے رہی تھی۔ لیکن بہرحال ایمنہ کی بات میں وزن محسوس کرتے ہوئے وہ بادلِ ناخواستہ بولی۔

''ٹھیک ہے، ایک دو راتیں تم یہاں رک سکتی ہو لیکن بس بدھ تک تم چلی جانا۔ میں نے تمہارا سارا حساب کلیئر کر دیا ہے۔ راشدہ کو امی کے بارے میں اچھی طرح سے سمجھا دینا۔ ابھی مجھے امی کو بھی اس بارے میں بتانا ہے۔ پتا نہیں کیا ری ایکشن ہوتا ہے ان کا۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے مسز رازی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ایمنہ خود بھی مسز رازی کے لیے بہت فکر مند ہو رہی تھی۔ کیسی بے چارگی سے وہ اس سے رکنے کے لیے التجا کر رہی تھیں۔ کیا وہ اپنی چندا کو ایسے کسی اجنبی ہاتھوں میں سونپ کر جا سکتی تھی، مسز رازی بھی تو اپنے بچوں کی محبتوں کی ترسی ہوئی ایک تنہا ڈری ہوئی معصوم بچی کے مانند ہی تو ہو گئی تھیں۔ پتا نہیں راشدہ ان کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں جھانکنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ مسز رازی نے تو اس میں ڈھیر ساری محبتوں کو ڈھونڈ لیا تھا لیکن یہ راشدہ تو شاید ایک محبت کی کمی بھی نہ پوری کر پائے گی اور مسز رازی ایسے ہی گھٹ گھٹ کر مر جائیں گی۔ عندلیب بھی تو کبھی کبھی اپنی مصروفیات کے باعث دو دو دن نہیں آ پاتی تھی۔ تب وہی تو ان کی دل جوئی کرتی تھی، ان کا دل بہلاتی تھی۔ وقت پر کھانا اور دوائیں دینا تو ہر کوئی کر سکتا ہے لیکن ان کی آنکھوں کے آنسو اپنے دل میں اتارنا ہر کسی کے بس کی بات تو نہیں۔ اس نے دکھ سے بوجھل دل کے ساتھ سوچا۔

سامان پیک کرنے کا ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ جیسے اسے اندر ہی اندر توڑ رہا تھا۔ پرسوں اس کا نکاح تھا اور اس کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کا ہونے والا وقتی شوہر کیسا ہے۔ اس نے تو اس کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ بس وہ رحیم کے ساتھ کے لیے اپنے ایک مکمل گھر کے لیے جس میں اس کے حمید اور رشید اپنے ماں باپ کی محبتوں کے سائے میں رہنے والے تھے آنکھیں بند کر کے اپنے فیصلے پر عمل کرنے جا رہی تھی۔ رحیم نے اسے بتایا تھا کہ مولوی فضل اسے دو دن کے لیے اپنی قریب المرگ ماں سے ملوانے لے جائے گا اور پھر واپسی پر اسے طلاق دے دے گا۔ پھر وہ اپنے گھر میں عدت پوری کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے رحیم کی ہو جائے گی۔ وہ عجیب متضاد کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔ عندلیب نے اسے کتنا سمجھایا تھا کہ وہ رحیم کی باتوں میں ہرگز نہ آئے وہ کبھی بھی اس کے بچوں کو اس سے نہیں ملوا سکتا جبکہ عندلیب اپنی سورس سے اس کے بچوں کو ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ بھی کر چکی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ ایک لمحہ جب رحیم کے بازوؤں کے حصار میں وہ سہمی ہوئی چڑیا کے مانند سمٹی ہوئی تھی اور اسے ایک عجیب طرح کے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا بس وہ ایک لمحہ باقی سب باتوں پر حاوی ہو گیا تھا لیکن اس وقت اس کا دل صرف اور صرف مسز رازی کے لیے فکر مند ہو رہا تھا... کڑھ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے دھیمے قدموں کے ساتھ مسز رازی کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن اندر سے آتی عندلیب اور مسز رازی کی باتوں کی آوازوں نے اسے دروازے کے پاس ہی رکنے پر مجبور کر دیا۔

''لیکن عندلیب میں کسی نئی عورت کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پاؤں گی۔ ایمنہ نے جتنا مجھے جانا ہے۔ بنا کہے میری ہر بات کو سمجھا ہے۔ جتنا میرا وہ خیال رکھتی ہے کوئی اور رکھ ہی نہیں سکتی عندلیب...... تم اس کی بات کو مان لو۔ اس کا شوہر سرونٹ کوارٹر میں ہی تو رہے گا۔'' بیگم رازی کے ٹوٹے ہوئے لہجے کی کرچیاں ایمنہ کو اپنے دل میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ عندلیب کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

''امی پلیز، آپ پریکٹیکل ہو کر سوچیں۔ آپ ایسی عورت پر بھروسا کر رہی ہیں جو بری طرح سے اپنے حالات کا شکار ہے۔ شادیوں کے چکر میں پڑی ہوئی ہے۔ پہلے ایک شادی پھر کچھ ماہ بعد دوسری شادی۔ خود سوچیں کیا ان سب جھمیلوں کے لیے اسے چھٹیوں کی ضرورت نہیں پڑے گی اور امی سب سے بڑی بات یہ کہ پتا نہیں وہ مولوی اسے طلاق دیتا بھی ہے کہ نہیں...... پتا نہیں کون سے گاؤں وہ اسے لے جا رہا ہے کب ان کی واپسی ہو گی؟ راشدہ ایک اچھی اور پڑھی لکھی عورت ہے۔ شوہر مر چکا ہے، اولاد کوئی نہیں ہے بھائی بھابی کے گھر رہتی ہے لیکن بھابی سے اس کا وجود برداشت نہیں ہو رہا سو وہ پریشان ہو کر وہاں سے نکلنا چاہ رہی ہے۔ ہمارا گھر اسے بہت بڑی پناہ گاہ لگ رہا ہے اور وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے پر خوش بھی ہے۔ اگر ایمنہ کے چکر میں یہ عورت ہاتھ سے نکل گئی تو آپ بہت پچھتائیں گی۔ کبھی اپنے آپ کو کسی کا ایسا عادی نہیں بنانا چاہیے کہ پھر اس کے بغیر جیا ہی نہ جائے۔'' عندلیب کا اتنا بڑا لیکچر مسز رازی کے علاوہ ایمنہ نے بھی بڑی مایوسی سے سنا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ دونوں ماں بیٹی نے اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ عندلیب واقعتاً کھڑی ہو گئی۔

''اچھا امی، میں چلتی ہوں کل صبح گیارہ بجے تک میں راشدہ کو لے کر آ جاؤں گی۔ ایمنہ بدھ تک یہیں ہے تاکہ وہ راشدہ کو آپ کی روٹین اور پسند ناپسند وغیرہ سب بتا سکے۔'' وہ ایمنہ کو اگنور کرتے ہوئے مسز رازی سے ہی مخاطب رہی اور پھر انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کچھ یاد آنے پر وہ واپس پلٹ آئی۔

''امی فریال کو سیٹ نہیں ملی، فلائٹ فل جا رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے اتوار کی بکنگ ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا۔'' وہ بہت بے دلی سے بولیں۔ ''وہ مجھے خود بھی فون کر کے بتا سکتی تھی۔''

''اس کو ڈر تھا کہ آپ اپ سیٹ ہو جائیں گی۔ خیر اب تو سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔'' عندلیب نے دلاسا دیتے ہوئے دوبارہ قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے جانے کے بعد مسز رازی نے ٹھنڈی سانس بھر کر ایمنہ کی طرف دیکھا۔

''میں تم سے کیا شکایت کروں ایمنہ، میری اپنی بیٹی ہی میرے پاس آنے کے لیے کتنی مشکل سے تیار ہو رہی ہے۔ میرے دونوں بیٹے اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ عندلیب بے چاری میرے لیے اتنا تردد کرتی ہے یہ اس کا احسان ہے۔ اللہ اسے خوش رکھے۔'' وہ کافی ڈپریسڈ لہجے میں بولیں تو ایمنہ نے بے اختیار

ان کے دونوں پیروں کو تھام لیا۔

"بیگم صاحبہ آپ کو چھوڑ کر جاتے ہوئے مجھے اتنا ہی صدمہ ہو رہا ہے جتنا دل میرا حمید اور رشید کے لیے دکھتا ہے۔" امینہ نے انہیں اپنی محبت کی شدت اپنی فطری سادگی سے بتائی تو مسز رازی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔

"امینہ تم ایک بہت سادہ، نیک اور معصوم عورت ہو، پتا نہیں وہ مولوی تمہیں اپنے نکاح سے آزاد کر بھی پاتا ہے یا نہیں، بہرحال امینہ تم کوشش کرنا کہ اپنے دل میں چھپی یہ بے لوث محبت اور ہمدردی تھوڑی سی راشدہ کے دل میں بھی منتقل کر سکو۔" اس بار انہوں نے مسکرا کر امینہ کی طرف دیکھا۔

"بیگم صاحبہ مجھے بدھ تک آپ کے ساتھ رہنے کی اجازت ملی ہے۔ میں یہ دو دن ایک عبادت کی طرح آپ کی خدمت کروں گی بس آپ سے التجا ہے کہ ان دو دنوں میں راشدہ سے اپنا کوئی بھی کام مت کروایے گا۔ وہ بس چپ چاپ بیٹھ کر دیکھتی رہے کہ میں آپ کا کیسے خیال رکھتی ہوں تاکہ بعد میں آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔" وہ بڑے ملتجیانہ انداز میں ان کی طرف دیکھ کر بولی تو مسز رازی نے بے اختیار اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"عفان بھائی آپ بلاوجہ کی ضد کر رہے ہیں۔ ہم لوگ تو آپ کو اب ایمان کی ایک جھلک تک نہیں دیکھنے دیں گے بس مہندی کے فنکشن میں رسموں کے وقت آپ اپنا یہ شوق کچھ دیر کے لیے پورا کر لیجیے گا پھر شادی کے روز ہی دلہن بنی ایمان کو جی بھر کر دیکھیے گا۔" شازی فون پر عفان کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے کہہ رہی تھی جب رومی کمرے میں داخل ہوئی۔

"جی نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا، چلیں ابھی ابھی آپ کی دوسری سالی بھی اندر داخل ہوئی ہے ہم اس سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔" عفان شاید اصرار کیے جا رہا تھا اس لیے شازی نے ہنستے ہوئے اشارے سے رومی کو اپنی طرف بلایا تو دوسری طرف ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

"ارے، سانپ کیوں سونگھ گیا جناب کو...... ذرا رومی سے بھی دو دو ہاتھ کر لیجیے، مجھے تو تنگ کر کے رکھ دیا ہے آپ نے۔" شازی نے عفان کی خاموشی پر اسے چھیڑا...... تبھی رومی نے سلگتے ہوئے دل کے ساتھ شازی سے ریسیور لے لیا۔

"تو آپ بہت بے قرار ہو رہے ہیں ایمان کی صورت دیکھنے کے لیے؟" اس نے بظاہر ہنس کر کہا لیکن اس کے طنز کی دھار ٹھیک ٹھاک عفان کے دل پر ضرب لگا گئی۔

"میں بس ایسے ہی شازی کو تنگ کر رہا تھا۔ ہمیشہ یہی ستاتی رہتی ہے مجھ کو۔" وہ گھبرا کر جیسے صفائی دینے لگا۔ کس مشکل میں پڑ گیا تھا وہ اپنے دل کی بے جا بات مان کر۔ اپنی زندگی کی پہلی خوشی کو دو حصوں میں بانٹ کر وہ شادی کے خوب صورت ہنگاموں اور امنگوں بھرے دنوں کو ٹھیک سے انجوائے ہی نہیں کر پا رہا تھا۔

"اچھا، اچھا زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا بہادر بن کر اپنی بے قراری کو ڈنکے کی چوٹ پر سب کے سامنے ظاہر کیجیے۔" اس کا شیریں لہجہ اپنے اندر کتنا زہر سمیٹے ہوئے تھا یہ عفان اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔ ان دنوں رومی کچھ زیادہ ہی حساس اور جذباتی ہو رہی تھی۔ رات کو اگر عفان کسی وجہ سے فون نہیں کر پاتا تھا تو اس کے موبائل پر وہ مس کالز کی بھرمار کر دیتی اور پھر عفان کے فون کرنے پر وہ کتنی دیر تو اس سے روٹھی ہی رہتی تھی۔ عفان اس کے دل کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اپنے خوب صورت جملوں سے اس کے ٹوٹتے ہوئے دل کو جوڑنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن دل ہی دل میں وہ اس کی محبت کی شدت پر اب ہراساں بھی رہنے لگا تھا لیکن شاید اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کاش اس نے رومی کو پہلے ہی قدم پر روک دیا ہوتا تو آج وہ کم از کم دل بھر کر اپنی زندگی میں آنے والے اس خوب صورت نئے موڑ کی خوشی کو دل بھر کر منا تو سکتا اور رومی بھی ان اذیت بھرے لمحات سے دور رہتی جیسے کہ اس وقت وہ بہت زود رنج ہو رہی تھی اور عفان کو اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔ اس وقت وہ شازی کو فون کر کے پچھتا رہا تھا۔ اصل میں کل سے شازی نے اس پر ایمان سے ملنے پر پابندی لگا دی تھی۔ بس اس بات پر اس وقت وہ شازی سے بحث کر رہا تھا کہ خلافِ توقع رومی نے بھی اسی وقت ایمان کے گھر پہنچ کر اسے اس لمحے کافی کنفیوز کر دیا تھا۔

جوں جوں شادی کے دن نزدیک آ رہے تھے رومی کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی جا رہی تھی۔ وہ روز شام کو ڈھولکی میں ایمان کے گھر جاتی اور ہر بار دل ایک نئی اذیت سے دوچار ہوتا تھا لیکن پھر رات کو عفان کا فون اس کے رستے ہوئے زخموں پر اپنے الفاظ کا پھایا رکھتا اور وہ پھر سے زندہ ہو جاتی...... کوئی اپنا نہ ہو کر بھی اپنا لگنے لگتا۔ عفان خود بھی ایک عجیب دوراہے پر اپنے آپ کو کھڑا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ ایمان کا ملن اور رومی کی جدائی جیسے اس کی زندگی میں غم اور خوشی کا ایک عجیب امتزاج بن کر اسے ایک نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت سے دوچار کرنے لگے تھے اور پھر یہی ہوا رات کو جب عفان نے اسے فون کیا تو وہ دل بھر کر روئی۔ عفان کو سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب کچھ ہی دنوں کی بات رہ گئی تھی۔ پھر حسبِ وعدہ رومی کو ہمیشہ کے لیے عفان سے اجنبی بن جانا تھا اور نارسائی کے اس انوکھے کرب کے ساتھ ان دونوں کو اپنی اپنی راہ پر چلے جانا تھا سو وہ اتنے دن رومی کے دل بھر کے ناز اٹھا رہا تھا۔ اس نے کبھی رومی سے اکیلے میں ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ اس کے ہوش ربا حسن سے اپنی تنہائیوں کو روشن کرنے کے متعلق کبھی کوئی خیال اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ بقول عفان ٹیلی فونک محبت کا اینڈ بھی فون پر ہی ہوگا لیکن دلوں میں بسی محبت ہمیشہ ہمیشہ ایک خاموش احساس بن کر ان دونوں کے دلوں میں چھپی رہے گی۔ رومی کی عقل، اس کے دماغ نے عفان کی اس منطق کو کبھی قبول نہیں کیا تھا لیکن اپنے پریتم کی اس خواہش کو انتہائی فضول گردانتے ہوئے بھی اس نے عفان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا لیکن صرف اس کی خوشنودی کی خاطر ورنہ اگر عفان اس کے دل میں بھڑکتے شعلوں کی ہلکی سی لپک بھی محسوس کر لیتا تو شاید پلٹ کر بھی رومی کی طرف نہ دیکھتا جو اس کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑنے کا سوچ رہی تھی۔ ہاں فائزہ بیگم البتہ اس کی اداسی اس کی دیوانگی اور آنکھوں میں لہراتے نفرت اور جیلسی کے احساسات کو اچھی طرح سے محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے دل کو عجیب طرح کا دھڑکا لگا رہنے لگا تھا۔ اپنی بیٹی انہیں کسی معصوم لڑکی کی خوشیوں کو ڈسنے والی ناگن سے مشابہ لگنے لگی تھی۔ وہ بار بار اس موضوع پر گفتگو کر کے رومی اور اپنے درمیان حائل اس بھرم کے پردے کو ہٹانا نہیں چاہ رہی تھیں کم از کم رومی ان سے ڈری ہوئی تو تھی کچھ لحاظ کچھ مروت کے سبب اس کے قدم رکے ہوئے تو تھے لیکن وہ بھی یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کی یہ خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

پرسوں مہندی تھی۔ رات عفان کا فون آیا تو اتفاق سے فائزہ بیگم اس وقت رومی کے کمرے میں موجود تھیں۔ اس وقت تک وہ عموماً سو جایا کرتی تھیں لیکن آج وہ رومی کے کمرے میں ایک خاص مقصد کے لیے آئی تھیں۔ اسلم صاحب اپنی فیملی کے ساتھ ان کے گھر آنا چاہ رہے تھے۔ اسلم صاحب کا بیٹا ذیشان شارجہ سے آیا ہوا تھا اور وہ چاہ رہے تھے کہ ذیشان اور رومی ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو ان کی رضامندی سے پھر باقاعدہ رشتہ دیا جائے۔ اس وقت بھی وہ رومی کو کنوینس کرنے میں لگی ہوئی تھیں جبکہ رومی کا پورا دھیان گھڑی کی جانب تھا جس میں نظر آتا ہوا ٹائم عفان کے فون آنے کی نوید دے رہا تھا۔

''اچھا امی! ابھی مجھے نیند آرہی ہے ہم کل اس ٹاپک پر بات کرلیں گے۔'' وہ جمائی لیتے ہوئے بولی۔

''نہیں، اب میں اس ٹاپک پر تم سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔ ایمان کی شادی کے فوراً بعد میں ان لوگوں کو کھانے پر بلوا رہی ہوں۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے اٹھی ہی تھیں کہ رومی کے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ فائزہ بیگم کے جاتے ہوئے قدم پل بھر کو تھم گئے۔ انہوں نے گہری نظروں سے رومی کے اڑتے ہوئے رنگ کو دیکھا۔

''فون کیوں نہیں اٹھا رہی ہو رومی...... کب سے بیل ہو رہی ہے؟'' انہوں نے گھبرائی ہوئی سی رومی کو مخاطب کرتے ہوئے موبائل کی طرف اشارہ کیا جو کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا مسلسل بج رہا تھا۔

''افوہ امی، آپ کی باتوں نے میرا موڈ آف کردیا ہے۔ یہ یقیناً ایمان ہوگی لیکن ابھی مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔'' اس نے تیزی سے اٹھ کر موبائل اٹھایا اور لائن ڈس کنیکٹ کردی۔ فائزہ بیگم کا دل چاہا کہ اس کے منہ پر بہت زور کا تھپڑ ماریں لیکن وہ برداشت کر گئیں۔

''رومی خدا کرے ایمان کی شادی خیریت سے ہو جائے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایک عجیب سا خوف محسوس ہو رہا ہے۔ اللہ اس معصوم بچی کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔'' انہوں نے بہت تلخ بھری نظروں سے رومی کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ نظریں چرا گئیں۔ فائزہ بیگم دل میں ہزاروں وسوسے لیے کمرے سے باہر چلی آئیں۔ نہ جانے کیوں انہیں یقین ہو رہا تھا کہ یہ فون عفان کا تھا انہیں عفان پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی چاہ سے ایمان کو اپنا بنانے کے باوجود وہ کیسے رومی میں اتنا انوالو ہو رہا تھا اور پھر اپنی شادی کے ہنگاموں میں بھلا اسے رومی کو اتنی رات گئے فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔

یہ ایمان کی زندگی میں شامل اس کی دو عزیز ترین ہستیاں آخر اسے دکھوں کے سمندر میں دھکیلنے کے کیوں درپے تھیں۔ عفان سے تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں لیکن رومی سے اب انہیں دوٹوک بات کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے اب یہ قدم اٹھانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ بے اختیار وہ رومی کے کمرے کی طرف واپس پلٹیں تو اس کے کمرے کا دروازہ لاک تھا اور اندر سے دھیمے دھیمے اس کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''رومی!'' انہوں نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اسے پکارا تو اندر ایک دم خاموشی چھا گئی اور پھر کچھ لمحوں کے بعد رومی نے دروازہ کھول دیا۔

''کس سے باتیں کر رہی تھیں تم؟'' ان کا لہجہ بے حد قہر آلود لیکن دھیما تھا کہ ریاض صاحب اپنے بیڈروم میں سو رہے تھے۔

''امی پلیز، آپ میری جاسوسی کرنا چھوڑ دیں۔ کیا میں اپنی کسی فرینڈ سے بات نہیں کرسکتی۔'' وہ بھی ڈھٹائی پر اتر آئی۔

''بدتمیز لڑکی، میں نے بہت برداشت کرلیا لیکن اب مجھے تمہارا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ دانت پیس کر بھنچی ہوئی آواز میں بولیں۔ ان کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں جیسے خون اترنے لگا تھا۔ ان کا یہ انداز رومی کو خوف زدہ سا کر گیا۔

''امی پلیز، آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے کمزور آواز میں بولی۔

''نہیں، غلط میں نہیں تم سمجھ رہی ہو کہ جو کچھ تم کر رہی ہو اسے میں کرنے دوں گی۔'' ان کی آواز غصے کی شدت سے لرز رہی تھی۔ رومی جواباً بس انہیں خوفزدہ نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

''رومی یاد رکھو اگر تم اپنی حرکت سے باز نہیں آئیں تو میں ریاض کو سب کچھ بتا دوں گی اور ہفتے کے اندر اندر تمہاری شادی نہ کردی تو میرا نام بدل دینا۔'' انہوں نے انتہائی نفرت سے اسے دیکھا۔

''اور خبردار پرسوں مہندی میں عفان سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کی۔ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی رہنا۔ ورنہ میں اسی وقت تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں واپس لے آؤں گی۔'' وہ پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے واپس پلٹ گئیں۔ رومی کچھ دیر سناٹے میں کھڑی رہی، اس کے ابو نے اسے بے حد لاڈ پیار سے رکھا تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اس نے کبھی بھی اپنے ابو کے منہ سے بیٹے کی کمی کی شکایت نہیں سنی تھی۔ رومی کے بعد کچھ اندرونی پیچیدگیوں کے باعث فائزہ بیگم پھر کبھی ماں نہیں بن سکی تھیں لیکن ریاض صاحب نے کبھی بھی انہیں اس کمی کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اپنی ساری محبت رومی پر نچھاور کرتے ہوئے انہوں نے اسے سارے زمانے کی خوشیاں دینے کی کوشش میں اسے کافی بگاڑ دیا تھا لیکن پھر بھی ان کی شخصیت میں چھپے رعب نے ہمیشہ گھر میں ایک ڈسپلن کی فضا قائم رکھی تھی۔ بے پناہ ناز نخرے اٹھانے والے ریاض صاحب کی غصے کی ایک نگاہ ہی رومی کا دل دہلا دیتی تھی اور فائزہ بیگم ابھی جو دھمکی دے کر گئی تھیں اس نے رومی کو کافی سہما سا دیا تھا۔ اگر ریاض صاحب کو ذرا بھی اس بات کے بارے میں پتا چل جاتا تو پتا نہیں وہ رومی کا کیا حشر کرتے۔ وہ چپ چاپ آکر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''صرف تین دن ہی تو رہ گئے عفان کے پرائے ہونے میں۔ پرایا تو وہ آج بھی ہے لیکن پھر بھی میری محبت کے سحر میں گرفتار تو ہے لیکن اٹھارہ تاریخ کو وہ بہت خوشی خوشی میرے سحر سے رہا ہو کر ہمیشہ کے لیے ایمان کی محبت کے حصار میں چلا جائے گا۔'' اس نے گہری سانس لے کر سوچا۔ ''اور امی نے آج مجھے ٹھیک سے اس سے بات نہیں کرنے دی میں نے گھبرا کر لائن کاٹ دی تھی، پتا نہیں عفان نے کیا سوچا ہوگا۔ میں اس سے کتنی ڈپریسڈ باتیں کر رہی تھی اور پھر اچانک فون بند ہو جانے سے وہ یہی سمجھا ہوگا کہ میں نے جان کر لائن ڈس کنکٹ کردی۔ ویسے بھی آج وہ کچھ بیزار سا لگ رہا تھا۔'' رومی نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

''ٹھیک ہے، امی جو چاہتی ہیں میں ویسا ہی کروں گی۔ عفان بھی بہت خوشی خوشی میری دنیا سے جا رہا ہے۔ میں اس کی محبت میں امی کی نظروں سے تو گر ہی چکی ہوں لیکن ابو کے جاننے سے پہلے میں اپنی چاہ کا گلا گھونٹ دوں گی۔ عفان آپ کو میں کبھی بھی نہیں بھلا سکتی۔ آپ کی خود غرض محبت کو جانتے ہوئے بھی میں آپ سے دیوانوں کی طرح پیار کرتی ہوں اگر میں آپ کی محبت میں برباد ہو رہی ہوں تو آباد آپ بھی نہیں رہیں گے۔ مہندی کی رات آپ

کے لیے بہت ساری سیاہی چھپا کر لا رہی ہے اور اس سیاہی میں آپ کی زندگی میں آنے والی تمام خوشیاں چھپ جائیں گی عفان۔'' وہ تلخی سے مسکرائی پھر کچھ سوچ کر اس نے عفان کو دوبارہ فون ٹرائی کیا لیکن وہ سوئچ آف تھا۔ وہ کافی دیر گہری سوچ میں ڈوبی رہی پھر نہ جانے رات کے کس پہر نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

صبح وہ کافی دیر سے سو کر اٹھی۔ منہ ہاتھ دھو کر جب وہ باہر آئی تو ابو آفس جا چکے تھے جبکہ فائزہ بیگم اس سے کافی اکھڑی اکھڑی سی کچن میں کھڑی خانساماں کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ جا کر لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ فائزہ بیگم نے اس سے معمول کے مطابق ناشتے کو بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اُن کے کچن سے باہر آنے کا انتظار کرتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کچن سے باہر آئیں اور اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے لگیں تو رومی نے انہیں پکارا۔

''امی آپ اسلم انکل کو فون کر کے کسی بھی دن ان سب کو ڈنر پر بلا لیجیے۔ میں اس رشتے پر تیار ہوں لیکن پلیز مجھ سے ناراض مت ہوں۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔ فائزہ بیگم کے تنے ہوئے چہرے پر جیسے خوشی رقص کر اٹھی۔ وہ بے اختیار اس کے نزدیک چلی آئیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ فائزہ بیگم نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا لیا۔

''رومی میری بچی، اس وقت تم نے مجھے ایک نئی زندگی دے دی ہے۔ جانتی ہو میں پوری رات سوئی نہیں۔ تمہارا کوئی بھی غلط قدم کتنی زندگیوں کو تباہ کر سکتا ہے اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔''

''جی امی، پلیز مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ کبھی میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جو آپ کو تکلیف دے یا پریشانی میں ڈالے۔ چاہے میرے دل پر کچھ بھی گزر جائے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''بیٹا تم دیکھنا کہ انشاء اللہ تمہیں کتنی ڈھیر ساری خوشیاں ملیں گی۔ وقت کے ساتھ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ تم خود کو کن اندھیروں میں ڈبونے جا رہی تھیں۔ ارے میری جان یہ سب وقتی جذبے ہوتے ہیں جن پر بعد میں سوچ کر ہی تمہیں ہنسی آیا کرے گی۔ بس اب تم اپنے آپ کو مضبوط رکھنا۔ مجھے خوشی دے کر دوبارہ کسی اذیت میں مت ڈالنا ورنہ میں سہہ نہیں پاؤں گی۔'' وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھیں اور وہ سعادت مندی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، پھر میں ایمان کے ولیمے کے دوسرے روز ان لوگوں کو انوائٹ کر لیتی ہوں۔ ذیشان بہت کم چھٹیوں پر آیا ہوا ہے۔'' انہوں نے مطمئن سی مسکراہٹ کے ساتھ رومی کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

کار تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ امینہ کار کی پچھلی سیٹ پر بڑی سی چادر میں منہ چھپائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی کافی موٹی سی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ گہرے عنابی لچکے والے سوٹ میں ملبوس اس عورت کے پاس سے بہت سستے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ..... عنابی ہی لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کاجل کی بھرمار لیے۔ وہ بار بار تیکھی نظروں سے امینہ کی جانب دیکھتی اور پھر منہ بنا کر کار سے باہر جھانکنے لگتی۔ اگلی سیٹ پر مولوی فضل بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال ہی ہوگی۔ سانولے چہرے پر سیاہ داڑھی

کے ساتھ سر پر صافہ باندھے وہ ڈرائیونگ کرنے والے شخص کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص مولوی فضل کا ہی ہم عمر ہوگا۔ شاید اس کا کوئی دوست تھا۔ سفر کافی طویل تھا۔ امینہ کی کمر بیٹھے بیٹھے درد کرنے لگی۔ ابھی کچھ گھنٹے قبل اس کا نکاح مولوی فضل سے ہوا تھا۔ رحیم نے محلے والوں کے ڈر اور ان کے اعتراضات سے بچنے کے لیے اپنے کسی دوست کے توسط سے دوسرے محلے میں ایک چھوٹے سے مکان میں نکاح کا بندوبست کیا تھا۔ آج کا دن امینہ کی زندگی میں ایک بہت بڑی آزمائش بن کر آیا تھا۔ رحیم جب اسے لینے مسز رازی کے گھر پہنچا تھا تو مسز رازی نے اس سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا البتہ امینہ کو گلے لگا کر اس کے ہاتھ میں پانچ ہزار کا نوٹ رکھتے ہوئے بہت اداسی سے کہا تھا۔

''امینہ اللہ کرے تمہارا یہ فیصلہ تمہاری زندگی کے لیے بہتر ہو لیکن خدانخواستہ اگر کبھی تمہیں دوبارہ اس گھر میں آنے کی ضرورت محسوس ہو تو بلا جھجک چلی آنا۔'' امینہ بے اختیار رو پڑی تھی۔

''بیگم صاحبہ اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ اگر مجھ پر کوئی مشکل وقت آیا تو اللہ کے بعد میں صرف آپ کو آواز دوں گی۔''

پھر وہ رحیم کے ہمراہ بوجھل قدموں سے بیگم رازی کی دہلیز پار کر گئی تھی۔ راستے میں کئی بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ واپس پلٹ جائے۔ دل انجانے وسوسوں سے لرز رہا تھا لیکن رحیم سارے راستے اسے جن خوش کن خوابوں کی سیر کراتا رہا تھا، ان خوب صورت سپنوں نے اس کا خوف زائل کرنے میں کافی مدد کی تھی۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ مولوی فضل کا بھیجا ہوا سرخ جوڑا پہن کر کافی گھبرائی سی بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر صحن میں کچھ مرد بیٹھے ہوئے تھے جو شاید رحیم کے دوست تھے..... تبھی رحیم کمرے میں داخل ہوا۔ امینہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ جیسے مبہوت کھڑا اسے تکے جا رہا تھا۔ امینہ کا دل بری طرح سے دھڑک اٹھا۔ ایسے تو رحیم نے اسے پہلی بار، اپنی شادی کے روز بھی نہیں دیکھا تھا۔

''مجھے پتا نہیں تھا امینہ کہ تو اتنی زیادہ خوب صورت ہے۔'' وہ سرگوشی میں کہتا ہوا اس کے بالکل نزدیک آ گیا۔

''رحیم ذرا دور ہٹ کر بات کر۔'' وہ کچھ سخت لہجے میں بولی تو رحیم جیسے ہوش میں آ گیا۔

''امینہ جب تم مجھ سے دوبارہ نکاح کرو گی نا تو یہی کپڑے پھر سے پہننا، دیکھنا اس دن میں تجھے خوب سارے زیور بھی پہناؤں گا۔'' وہ بچوں کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر بڑے ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''رحیم ابھی بھی سوچ لے کہیں ایسا نہ ہو کہ.....'' امینہ نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن رحیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

''امینہ اگر تو میری زندگی میں واپس نہیں آئی تو میں مر جاؤں گا۔ حمید اور رشید بھی پھر تجھے کبھی نہیں ملیں گے بس مجھے کچھ بھی نہیں سوچنا اور تو بھی کچھ نہ سوچ..... ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔'' تبھی باہر سے اس کے کسی دوست نے آواز دی تو وہ اٹھ کر باہر چلا گیا اور ایک منٹ کے بعد ہی وہ ایک عورت کے ہمراہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔

''امینہ، یہ میرے دوست قیصر کی بیوی شاہینہ ہے۔ ہو سکتا ہے مولوی فضل کے ساتھ کوئی عورت بھی آ جائے تو یہ اس سے بات چیت کرے گی۔'' رحیم نے شاہینہ کو پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے امینہ کو بتایا اور خود فوراً ہی باہر چلا گیا کیونکہ باہر دھیما دھیما سا شور بتا رہا تھا کہ مہمان اندر داخل ہو رہے ہیں۔

اینہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ شاہینہ نے غور سے اس کے متغیر ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور اس کے مزید نزدیک سرک گئی۔

''بہت بڑا دل ہے تمہارے مرد کا اور تم پر بھی شاباش ہے۔ بھئی میں اگر تمہاری جگہ ہوتی نا تو کبھی ایسی شادی نہیں کرتی۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

''مجبوری سب کچھ کروا دیتی ہے، بہن! تم نہیں سمجھوں گی۔'' وہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھنے لگی تبھی ایک موٹی سی عورت اندر داخل ہوئی اس کی سج دھج بتا رہی تھی کہ وہ چار لوگوں پر مشتمل اس برات میں شامل لوگوں میں سے ایک ہے۔

''میں مولوی فضل کے گاؤں سے ہوں۔ اس کی ماں کی پڑوسی ہوں، بہت خیال رکھتی ہوں اس کا...... اسی وجہ سے اس نے مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ برات میں بھیجا ہے۔ ارے بے چاری کچھ ہی دنوں کی مہمان ہے یوں سمجھو بہو کا چہرہ دیکھنے کے لیے زندہ ہے بس۔'' وہ ان دونوں کے نزدیک بیٹھتے ہوئے خود ہی اپنا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ مزید تفصیل بھی بتانے لگی پھر جھک کر اس نے غور سے اینہ کا چہرہ دیکھا۔

''اے ہے...... بہت کچی عمر کی عورت سے نکاح کر رہا ہے فضل! انذیراں دیکھے گی تو کل کی مرتی آج ہی مر جائے گی۔'' شاہینہ کی بات پر جہاں اینہ نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا وہاں شاہینہ اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکی۔

''کیوں، کیا دولھا میاں اپنی دلہن سے چھوٹے ہیں؟'' شاہینہ کے سوال پر وہ عورت جس کا نام اکبری تھا چہک کر بولی۔

''ارے، بارہ پندرہ برس کا فرق تو کہیں نہیں گیا، پتا نہیں فضل کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا تھا بھلا کوئی جوڑ ہے ان دونوں کا؟'' اینہ نے بہت گھبرا کر اس عورت کی جانب دیکھا دل جیسے ایک بار پھر وسوسوں میں گھر گیا۔ پتا نہیں رحیم اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اس کی زندگی کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے جا رہا تھا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ کوئی رحیم ہی کی عمر کا آدمی ہوگا۔ ویسے بھی اسے کچھ دنوں کے لیے اپنی زندگی میں داخل ہونے والے شخص سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس وقت اس عورت کے انکشاف نے اسے ایک حیرت آمیز پریشانی سے دوچار کر دیا تھا۔ بھلا اس نوجوان آدمی کو اپنے سے اتنی بڑی عورت سے محض کچھ دنوں کے لیے شادی کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ رحیم جیسے غریب اور مفلس آدمی سے پیسوں کی بھی امید نہیں تھی۔ پھر آخر کیوں وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ دفعتاً کار ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی اور اینہ کی سوچوں کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا۔

''چلو اترو، گھر آگیا ہے۔'' وہ عورت اپنی سائڈ کا کار کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے بہت نروٹھے پن سے بولی جبکہ مولوی فضل کار سے اتر کر ان لوگوں کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ اینہ دھڑ دھڑاتے ہوئے دل کے ساتھ کار سے نیچے اتر آئی۔ سامنے ایک چھوٹے سے مکان کا دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

''چلو بھئی، کیا ساری رات یہیں کھڑی رہو گی؟'' اس عورت کی کرخت آواز پر وہ گھبرا کر آگے بڑھ آئی تو مولوی فضل ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

''ارے فضل، اپنی بیوی کو تو ساتھ لے جا۔'' اکبری نے تقریباً اس کو گھسیٹ کر مولوی فضل کے پاس لا کھڑا کیا۔ اسی تگ و دو میں اچانک ہی اینہ کے سر سے چادر اتر گئی اور مولوی فضل نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

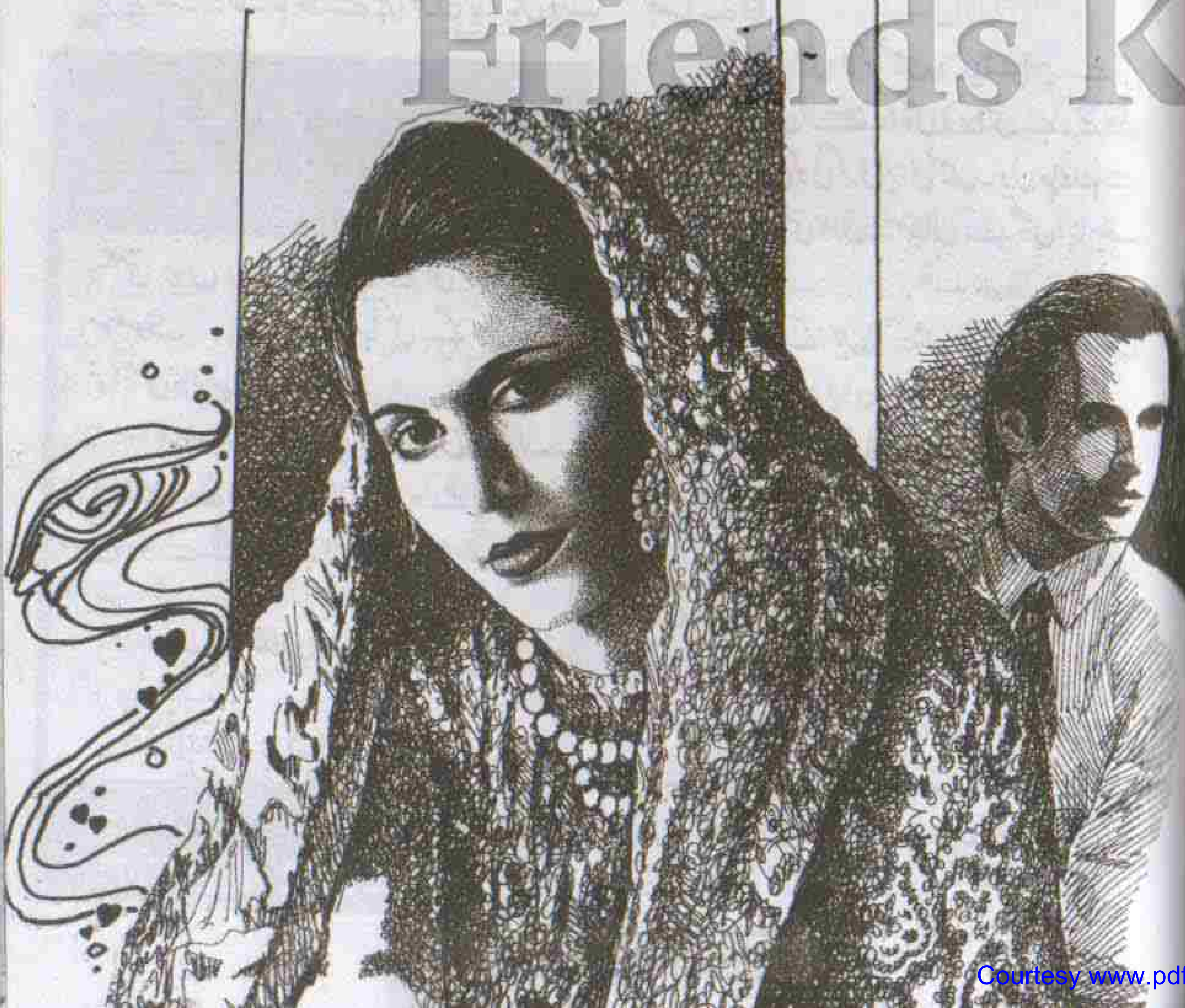
باقی آئندہ

اک خوشی اور ہنسی

فوزیہ فرخ

وہ ایک عام سی بات تھی لیکن اس دن کو ہمارے لیے خاص بنا گئی۔

اس دن بھی ہم ہمیشہ کی طرح واک پر نکلے تھے اور ہمیشہ کی طرح یہ واک گاڑی پر سوار ہو کر کی جا رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ہی ٹریفک کا اژدہام اور میاں جی کا پارہ آسمان پر۔ پہلے سگنل پر گاڑی رکی ہی تھی کہ ایک بچی نے لپک جھپک ونڈ اسکرین پر پانی پھینکا اور چلی اسے صاف کرنے۔



صاحب بہادر نے کھڑکی سے سر نکالا اور لگے اسے دھمکانے۔ ''پانی کیوں پھینکا؟ کیا میں نے کہا تھا...... بولو؟''

بچی نے تیور دیکھے اور مایوس ہو کر پلٹ گئی۔ غالباً اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ''ان تلوں میں تیل نہیں۔''

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ونڈ اسکرین پر گندا پانی تو پڑ چکا تھا لیکن اسے پونچھنے والا کوئی نہیں۔ اُدھر سگنل آن ہونے کو ہے۔ اِدھر یہ گڑبڑا کر چیخ رہے ہیں۔

''ارے، اب ڈال ہی دیا ہے تو صاف بھی تو کرو۔''

میں نے چپ چاپ کپڑا اٹھایا اور خود ہی ہاتھ باہر نکال کر ان کا کام آسان کرنے کی کوشش کی۔ مزید غصہ بڑھا۔ ہاتھ سے کپڑا چھین لیا۔ میں دبک کر چپ ہو رہی۔

اگلے سگنل پر ایک صاحب ننھے منے کھلونے لیے چلے آئے۔ اُف ان پر تو میرا ابھی دل آ گیا۔ پتا نہیں کیوں جب بھی میں ان روئی کے بنے کھلونوں کو دیکھتی ہوں دل چاہتا ہے لے ہی لوں...... لیکن موصوف...... کچا ہی کھا جائیں گے اگر ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا تو۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس طرح کی واک سے پہلے ہمارے درمیان ایک معاہدہ طے پاتا ہے۔ جس کی رو سے مجھے مندرجہ ذیل نوعیت کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔

''میں کسی سگنل پر کوئی چیز خریدنے کی ضد نہیں کروں گی۔''

''میں گاڑی کا رخ کسی (سسرالی و غیر سسرالی) رشتے دار کے گھر کی طرف موڑنے کو نہیں کہوں گی۔''

''میں شاپنگ سینٹرز کے سامنے سے گزرتے ہوئے اپنی نظریں سیدھی سڑک پر جمائے رکھوں گی۔''

بظاہر تو یہ سیدھا سادہ حلف نامہ ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ ہم تو محض دل بہلانے کو نکلے ہوتے ہیں مگر خدا معلوم کچھ ہی دیر بعد یہی سادہ سی شرائط اتنی ناقابلِ عمل کیوں لگنے لگتی ہیں۔

میں تو پہلے ہی مقام پر ہمت ہار جاتی ہوں۔ خاص طور پر اس وقت جب......

''گجرے۔'' کوئی میری سمت والی کھڑکی کی طرف رکا اور پھول آگے بڑھائے۔

''اب کیا کروں؟ موصوف سے کہوں تو حلف نامہ آڑے آتا ہے اور نہ لوں تو میرا دل......'' مجھے غصہ آنے لگا۔

''خود تو کبھی لا کر نہیں دیتے۔ اوپر سے ہم فرمائش بھی نہیں کر سکتے۔ اچھی زبردستی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں کوئی گری پڑی نہیں۔ دل چاہ رہا ہے تو خود بھی خرید سکتی ہوں۔ سنبھال کے رکھیں اپنا حلف نامہ۔''

''کتنے کے ہیں؟'' میں نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

''جی دس کی جوڑی۔'' میں نے چپکے سے دائیں طرف دیکھا۔

وہ کسی کو ہدایتیں دینے میں مصروف تھے۔ اچھا موقع تھا۔ میں نے پرس ٹٹولنا شروع کر دیا۔ ''دس روپے تو ہونے ہی چاہئیں۔ اُفوہ اتنی چیزیں ٹھونس لیتی ہوں۔ کام کے وقت کچھ نہیں ملتا۔ حد ہو گئی دس روپے نہیں مل کر دے رہے۔ یہ بے عزتی بھی ہونی تھی۔ بھئی مل بھی جاؤ۔ کہاں رہ گئے...... ارے مل گئے۔''

پھر ہاتھ باہر نکالا۔ ''پانچ روپے۔''

''کیا مصیبت ہے؟'' اب تو سگنل بھی آن ہونے کو تھا۔ ''چلو یہی سہی۔''

''ایسا کرو ایک ہی دے دو۔''

پتا نہیں کیا ہوا۔ اس نے گجروں کی جوڑی ڈیش بورڈ پر رکھی اور چلا گیا، میرا ہاتھ بڑھا کا بڑھا رہ گیا۔

کچھ دیر کو تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا پھر جونہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی میں چلائی۔

''سنیے سنیے، اس گجرے والے کا پیچھا کریں۔ پتا نہیں اس نے کیا سمجھا۔ پیسے لیے بغیر ہی چلا گیا۔''

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر ڈیش بورڈ کو... اس کے بعد دانت پیسنے لگے۔

''تم بھی ناں......!''

''اچھا ناراض بعد میں ہو لیجیے گا۔ پہلے یہ مسئلہ تو حل کریں۔ میری عزت کا سوال ہے۔'' میں نے منت کی۔

اب یہ ہوا کہ ہم اسے آواز دے رہے ہیں اور وہ سن ہی نہیں رہا۔ نظر انداز کر کے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچھا خاصا تماشا بن گیا۔

ہم نے دوبارہ ٹرن لیا اور اسے پکڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ ٹریفک کانسٹیبل نے جو یہ صورتِ حال دیکھی تو کچھ اور سمجھا۔ بھاگ کے اسے قابو کیا اور گاڑی تک لے آیا۔

وہ مسلسل کہے جا رہا تھا۔

''بھابی کو دیے ہیں، میں نے بھابی کو دیے ہیں۔''

''میں بھی تو بھائی کو ہی دے رہا ہوں۔'' میاں جی نے زبردستی پیسے اسے تھمائے۔

اب سنتری صاحب کو بھی سمجھ آئی۔ انہوں نے دانت نکال دیے۔ قریب سے گزرنے والوں نے یہ سب دیکھا تو مسکرا دیے۔ ہم نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔

پھر پورا راستہ ہم بات بات پر ہنستے ہی رہے۔ میری خوش مزاجی کی تو خیر تھی لیکن موصوف کا موڈ خوش گوار ہو، وہ بھی ڈرائیونگ کے دوران یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو تاریخ میں بجا طور پر سنہری حروف سے لکھا جا سکتا ہے۔

ایک عجب سی خوشی تھی جو دونوں کو محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اس بے یقینی کے دور میں جہاں ہر شخص خوف، وہم اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جھنجلاہٹ کا شکار ہے، وہیں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں لیکن دل اتنا وسیع ہے کہ بڑے بڑے زرداروں کو بھی خود کو چھوٹا محسوس کرنے پر مجبور کر دے۔

شادی میرے بھائی کی

مدت سے ہے یہ ارماں کہ بھابی گھر آئے گی۔ اپنے بھائی کی شادی کا احوال تاخیر سے لکھ رہی ہوں...... مگر پاکیزہ کے لیے لکھ رہی ہوں۔ اکتوبر 2005ء کا مہینہ تھا۔ جب منگنی کی سادہ تقریب کے بعد شادی کی تاریخ بھی عدنان مجتبیٰ ہمراہ سمیرا عدنان...... 18 فروری 2006ء کو ہونا قرار پائی۔ دونوں کی منگنی کے مختصر عرصے بعد جونہی شادی کی ڈیٹ قریب آئی دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں ہم تین بھائی اور دو بہنیں سب شادی شدہ۔ والد والدہ عرصہ ہوئے ہمیں چھوڑ گئے پھر بڑے مرتضیٰ صاحب کے زیر نگرانی اللہ تعالیٰ انہیں عمر تا حیات رکھے (ہماری انٹی ملکہ باجی جواُن کے استاد صاحب کی بیگم تھی ان کی اچھی گائیڈ لائن نے ہمارے بھائی کو ہماری محبت اور سرپرستی کا سہرا بخشا) بڑے بھائی بھی شادہ شدہ تھے اوران کے چار بچے چاچو کی شادی کے دیوانے۔ گھر میں یہ آخری شادی تھی۔ اس لیے آنسوؤں کی چھم چھم بھی جاری تھی کہ آنگن میں ماں باپ کی خوشبوان کی مسکراہٹ ارد گرد کہیں بکھری نظر آرہی تھی۔ ظاہر ہے گھر میں دلہن کو لانے کی تیاریاں تھیں اس لیے گھر کو بھی خوب سجایا گیا۔ محفلِ میلاد اور قرآن خوانی نے سماں باندھ دیا اور اسی دن مہندی کا بھی انتظام کردیا گیا۔ دونوں گھروں میں مہندی کا فنکشن اپنا اپنا تھا۔ اس لیے اتنا ہنگامہ نہیں تھا۔ 18 فروری گھر بھر کے لیے اہم دن تھا۔ صبح ہی سے افراتفری کا سماں تھا اور موسم بہار تھا۔ عدنان تو دوستوں کے ساتھ تیار ہونے پارلر روانہ ہوگئے اور گھر میں ہم بہنوں اور بھابیوں، بچوں نے شوروغل مچایا ہوا تھا۔ کسی کا دوپٹا غائب تو کوئی جیولری کی میچنگ کے لیے پریشان مگر بہرحال سہرا بندی کا مرحلہ آپہنچا۔ دولہا صاحب تیار ہوگئے۔ مہمان بھی سب آگئے۔ سب نے خوش دلی سے ہار پہنائے، دعائے خیر ہوئی اور برات روانہ ہوگئی۔

سمیرا بھابی چھ بہنیں اور تین عدد بھائی۔ امی ابو کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا، اردو اسپیکنگ ہیں۔ خوش شکل اور اخلاق والی ہیں۔ برات پہنچی تو وہ پہلے ہی سے تیار ملی۔ استقبالیہ برات کا اچھا تھا سب کو پھول، گجرے پہنائے گئے۔ سمیرا، دلہن پہ روپ خوب آیا تھا۔ نکاح ہوا مبارک باد وصول ہوئی۔ کھانے کے بعد فوٹو اسٹیشن کا طویل سلسلہ۔ اس دوران وقت کی بچت کرتے ہوئے دودھ پلائی اور کرسی کی رسم ادا کی گئی۔ نیگ کی وصولی کے بعد عدنان کو سمیرا کے ساتھ بٹھایا گیا۔ پھر رخصتی کا مرحلہ، بہتے آنسو اور پھر چاول پھینکنے کی رسم ہوئی اور یوں دلہن ہمارے ساتھ دولھا کے گھر آپہنچی۔ رخصتی شام کو ہوئی تھی گھر پر چھوٹی موٹی رسموں کے بعد فوٹو سیشن کا سلسلہ جاری رہا اور پھر اگلے دن کے انتظام کو بھی دیکھنا تھا۔ ظاہر ہے ولیمہ تھا۔

ولیمے کا فنکشن 19 فروری کو ہونا تھا۔ سمیرا پر میرون اور گولڈن چوڑی دار پاجامے اور لانگ شرٹ اور بھاری میرون گولڈن دوپٹے میں آج مزید نکھار آیا تھا۔ عدنان بھائی بھی نیوی بلو کرتے اور وائٹ شلوار میں خاصے سج رہے تھے۔ دلہن دولھا سب کی دعائیں سمیٹتے، پُرتپاک استقبال میں ہم بہن بھائی پیش پیش۔ دلہن کے گھر والوں کا پُرتپاک استقبال، لذیذ عمدہ کھانا اور پھر سب کا فوٹو سیشن اور گروپ فوٹو۔ خوب صورتی میں اعلیٰ اور بے مثال جوڑی اور اب دو بچوں کے ساتھ آنگن میں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ مریم اور حسن شرارتی اور مسکراتے چہرے لیے گھر میں قلقاریاں مارتے پھرتے ہیں۔ آج 2011ء میں بڑی باجی ہم میں موجود نہیں اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ سب کو اپنے اپنے گھروں میں خوش اور آباد رکھے، آمین۔

تحریر: رقیہ مہر اعوان

ناولٹ

رقص میں سارا جنگل ہوگا

عالیہ حرا

ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے، آتے جاتے امو جان مسلسل سائرہ کو نوٹ کر رہی تھیں۔ پچھلے دو دن سے وہ میکے آئی ہوئی تھی اور سر جھاڑ منہ پھاڑ پھر رہی تھی۔ ہر وقت منہ پر چپ کی بکل مارے کشن میں منہ چھپائے سوتی رہتی...... اٹھتی تو چائے کا کپ لے کر چھت پر چلی جاتی۔

دو چار بار کھڑے کھڑے رشیدہ بھی آئی۔ منہ سر لپیٹے دیکھ کر پلٹ گئی۔ امو جان کے لیے اندر ہی

اندر یہ انداز لمحہٴ فکریہ تھے جبکہ والدہ محترمہ کو اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ وہ بیٹی کو بیاہ کر مطمئن تھیں۔ آگے کے چکر وہ جانے اور اس کا نصیب۔

''اور میرا نصیب۔'' ہتھیلیوں کو کھول کر پھیلایا۔

''جس نے بھی دیکھا تھا یہی کہا تھا تمہارا نصیب بہت اچھا اور فراخ ہے اور...... یہاں......'' دل بھر آیا۔ مٹھی بند کر کے بھینچ لی۔

''اور یہاں تو کسی کو میرے جذبات و احساسات کی پروا ہی نہیں ہے کہ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں۔ کیا حال ہوتا ہے میرا عثمان کی قربت میں...... چھ ماہ کی اس ازدواجی زندگی میں ایک بار بھی جو دل ملا ہو...... اور اب تو عثمان کو بھی اس گریز اور دوری کا احساس ہو گیا۔''

''چھ ماہ ہو گئے ہیں ہماری شادی کو اور تم ابھی تک اولین دن کی طرح چھب دکھلا کر بھاگتی ہو؟'' اس نے سر جھکا لیا تھا۔

''یہ شرم ہے یا......!'' اور وہ ہڑبڑا گئی تھی۔

اس شرم، جھجک کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دھیرے سے سر اٹھا کر لامتناہی حد تک پھیلے آسمان کو دیکھا۔

''جب میرے پاس ہر سوال کا جواب تھا تو کوئی سنتا نہیں تھا۔ اب کسی کو کیا جواب دوں۔ دل کو کیسے سمجھاؤں۔ کیسے سسرال میں دل لگاؤں...... جب...... جب......'' آنکھ بھرنے کو تھی۔

''ارے سارہ تم یہاں بیٹھی ہو چھپ کر ادھر فرحت تم سے ملنے گئی ہے۔'' برابر کی دیوار سے بھابی نے جھانکا۔

''خیریت تو ہے نا...... طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' آنکھ دبا کر وہ شرارت سے ہنسیں۔ وہ اندر ہی اندر گڑبڑا گئی۔

''مجھے تمہارا میاں بہت پسند آیا ہے۔ آپا نے چن کر داماد ڈھونڈا ہے۔'' ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''شوہر میں کچھ ہو نہ ہو پیسہ ڈھیر سارا ہو، دولت ہر عیب کو ڈھک لیتی ہے، انسان خواہش کے پیچھے خوار نہیں ہوتا۔'' سارہ انہیں دیکھے گئی۔ اس بات کا اس نے تو خیال ہی نہیں کیا تھا وہ تو بس اپنے خوابوں کے ٹوٹنے پر آج تک رنجور تھی۔

''کتنے دن کے لیے آئی ہو؟''

''دو دن کے لیے۔'' (زبردستی ہفتہ رہ لیتی تھی)

''اور ہفتہ بھر رہ کر جاتی ہو، کتنا اچھا ہے عثمان کوئی روک ٹوک نہیں یہاں چھ بچوں کے بعد بھی چار دن کے لیے نہیں چھوڑتے۔'' رشک سے کہا۔

سارہ ہنس دی۔ بھابی کی باتیں بڑی لمبی ہوتی تھیں اٹھ جانے ہی میں عافیت تھی۔ کپ لے کر کھڑی ہو گئی۔

''اچھا بھابی، نیچے امو جان آواز دے رہی ہیں۔'' وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

''چکر لگانا نا میری طرف۔''

''اچھا۔'' وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

سامنے ہی برآمدے میں امو جان تخت پر پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ ان کا طوطا ان کے برابر میں اپنا تخت طاؤس سمجھے براجمان تھا۔ زمین پر بیٹھا حماد اسے امرود کھلا کر دوستی کر رہا تھا۔ امو جان نے خاموش نظر سارہ پر ڈالی جو ان کی نظروں سے بچ کر کپ کچن میں رکھ کر اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ اندر سے نکل کر آتے وہاب سے ٹکرا گئی۔

''کہاں ہو تم...... کل سے آئی ہوئی ہو اور اب نظر آ رہی ہو؟'' وہ مسکرا کر ادھر ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہو۔'' وہ برابر میں بیٹھا۔

''ہاں۔''

''سسرال میں سب ٹھیک ہے نا؟''

''ہوں...... تمہاری جاب کیسی چل رہی ہے؟''

''ایک دم ٹھیک ٹھاک۔ فرسٹ کلاس بس اب جلد سے جلد اک پری وش ماہ وش کی خواہش پوری کرنی ہے۔'' ذومعنی انداز میں مسکرایا۔ (تم مرد ہو، کر سکتے ہو اپنی کرنی...... اور میں......) سامنے سے امی نکل کر آ رہی تھیں۔

''تم سمجھاؤ نا امی کو...... کچھ خیال کریں اکیلے کام کر کر کے تھک جاتی ہیں، بہو لے آئیں نا۔'' وہ شرارت سے گویا تھا۔ امی مسکرا دیں۔

''رہنے دے، میرے لیے ماسی کافی ہے۔''

''امی...... ماسی وہ آرام کہاں دے سکتی ہے جو بہو دے گی۔''

''آج کل کی بہویں ٹکتی کب ہیں گھر میں، انہیں تو آتے ہی آرام چاہیے ہوتا ہے جیسے میکے میں مویشی ڈھو کر آئی ہوں، ماسی انہیں چاہیے، آرام انہیں چاہیے۔ ہر وقت میکے میں رہنے کی اجازت انہیں چاہیے بلکہ پائی ہی میکے میں جاتی ہیں۔'' وہاب اپنا سر کھجانے لگا اور سارہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

''جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں نوکری کو لگے...... مجھے پڑھانے لگے ہیں۔'' چیزوں کی اٹھا پٹخ کر کے وہ اندر چلی گئیں۔ وہاب شرمندگی سے آئیں بائیں شائیں دیکھ کر اٹھا اور اوپر چھت پر چلا گیا۔

''چھت......! کتھارسس کے لیے بہترین جگہ۔ کھلی ہوا...... کھلا آسمان اور کھلا ماحول سناٹا۔'' ابھی وہ بھی تو کھلی ہواؤں سے دکھ سکھ کہہ کر آ رہی تھی۔ سارہ سوچ رہی تھی اور امو جان اسے پڑھ رہی تھیں۔ بظاہر پاندان کھنگال رہی تھیں۔

امو جان بھی اسے سمجھ نہ سکیں۔ من پسند چیزیں نہ ملیں تو سمجھوتا کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ زور...... زبردستی...... چاہے حلق میں نوالے پھنس جائیں یا آنکھیں تر رہیں۔

''سارہ تیرے سسرال میں سب ٹھیک ہے نا؟'' وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے اس کا ارتکاز توڑ دیا۔

''جی امو جان۔'' ہتھیلیاں مسلیں۔

''اللہ اچھا رکھے، نصیبوں والوں کو ملتا ہے ایسا گھر اور پڑھا لکھا خاندان...... خوش حال اور ملنسار...... عثمان کیسا ہے تیرے ساتھ؟'' سارہ کی آنکھ بھر آئی۔

(ویسا ہی جیسے ہر شوہر کو استحقاق ہوتا ہے...... حق...... اگر میری مرضی...... میری پسند......) سوچوں میں بے چارگی در آئی...... سوچوں کے در وا ہونے لگے۔

''تیری ساس مجھے بڑی پسند ہے، سوجھ بوجھ والی...... سمجھ دار ساس بہو کا جھگڑا تو نہیں ہوتا نا؟''

امو جان اپنی رو میں اسے کرید رہی تھیں...... بظاہر پاندان کی کلیا صاف کر رہی تھیں۔ انہیں وقت کب دے رہی تھی وہ جانتی تھی نا کہ امو جان اسے پڑھ لیں گی۔

''تو ہی نٹ کھٹ ہے، سنبھل کر رہنا چاؤ چونچلے باوا کے گھر اچھے لگتے ہیں سسرال میں بردباری سے لگاؤ سے رہنا پڑتا ہے دل تو لگ گیا نا؟''

''دل۔'' اک آنسو نکلا۔

''تو اتنی چپ چپ سی کیوں ہے، طبیعت تو

بوجھل نہیں ہے نا؟" ہاتھ روک کر بغور جائزہ لیا۔
"امو جان میں ابھی آتی ہوں۔" وہ ایک دم سے کھڑی ہوئی اور اندر کی جانب بڑھ گئی۔
امو جان کی ساری مصروفیات تخت پر بکھری رہ گئیں کچھ تھا ضرور ورنہ سارہ اور خاموشی...... پاندان بند کر دیا۔ تبھی گیٹ کھلا اور نصیبن اندر آ گئی۔
"آ جا...... نصیبن کیسی ہے؟"
"ٹھیک ہوں امو جان۔" وہ کچھ اداس سی لگی۔
"بیٹھ جا۔" تخت پر جگہ بنائی۔ "سب ٹھیک ہے نا؟"
"سب ٹھیک کب ہوتا ہے امو جان...... کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ خرابی رہتی ہے۔ لوگوں کے دماغ آسمان پر پہنچ گئے ہیں کچھ لڑکیوں کے مزاج نہیں ملتے۔" پاؤں سمیٹ کر اوپر کر لیے۔
"کیا ہوا؟" ٹھوڑی پر انگلی ٹکا کر تفکرانہ انداز میں دیکھا۔
"آپا زلیخا کی بیٹی کو طلاق ہو گئی ہے۔" نصیبن نے گویا دھماکا کیا۔ "اور چھوٹی والی کے مزاج ہی نہیں مل رہے کہتی ہے چاہے بڈھا ہو مگر پیسے والا ہو...... برکتی بوا کے لائے رشتے کو انکار کر دیا۔" امو جان بیٹھی رہ گئیں۔
"شبانہ تو بہت خوش تھی اپنے گھر میں اور یہ ریحانہ کو کیا ہوا؟"
"بس امو جان...... جو لڑکیاں ہواؤں میں رہتی ہیں وہ اک دن یونہی گرتی ہیں۔ والدین فیصلہ کریں تو مشکل نہ کریں تو آفت۔" وہ ہاتھ مل رہی تھیں۔ امو جان نے پاندان کھول کر گلوری بنائی اور نصیبن کی جانب بڑھائی۔
"بس نصیبن لڑکیوں کے نصیبوں سے ہی تو ڈر لگتا ہے۔" سارہ کی خاموشی انہیں خبردار کرنے لگی۔
"بہت رو رہی تھی شبانہ کی ماں...... مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔"
"ہونی...... انہونی۔" امو جان کا دل دھڑکا۔ سارہ کی خاموشی بے معنی نہیں۔ وسوسہ سر اٹھانے لگا...... "وہ تو ہے بھی بہت جذباتی سی۔" مگر امو جان نہیں جانتی تھیں کہ سارہ اب جذباتی نہیں رہی سمجھ دار ہو گئی ہے۔
"بس امو جان کہیں خوشی ہے کہیں غم...... اب ساجدہ کو ہی لے لو...... وہی بیگ صاحب کی بیٹی بیٹا ہوا ہے اس کے گھر، شوہر کی ترقی ہوئی ہے، نند کا رشتہ لگ گیا ہے گھر میں ٹیوشن سینٹر کھولا ہوا ہے کیسی غربت، کاہے کی غریبی، سمجھ دار لڑکیوں کے یہی تو سبھاؤ ہوتے ہیں۔"
"بس اللہ ہر لڑکی کو ایسی ہی سمجھ داری دے۔" تمباکو کی چٹکی منہ میں رکھی۔
"آمین۔" تبھی آمنہ چائے کے دو کپ لے آئی۔
"ارے ابھی تو پی کر آئی تھی۔"
"پی لیں خالہ...... موسم بدل رہا ہے۔" ان کے قریب بیٹھی اور مٹھو سے چھیڑ خانی کرنے لگی۔
"خالہ...... رشیدہ کو بھیجے گا میں نے قمیص مکمل کروانی ہے۔"
"بھیج دوں گی پر آج نہیں کل صبح۔ ویسے بھی اب مغرب ہونے والی ہے۔" امو جان خاموش تھیں۔ انہیں سارہ کی چپ کھل رہی تھی اور نجمہ اسے سسرال کی تھکاوٹ گردان رہی تھیں۔ تھکاوٹ اور آنکھوں کے رنج میں بڑا فرق ہوتا ہے یہ ہر کوئی نوٹ نہیں کر سکتا۔
"آمنہ...... سارہ کہاں ہے؟"
"ٹی وی کے آگے بیٹھی حالاتِ حاضرہ سن رہی ہے۔"
"حالاتِ حاضرہ۔" دل میں کھٹک ہوئی۔ "وہ تو گانے، ڈرامے، ہلا گلا، شور شرابہ...... دیکھتی تھی۔ حالاتِ حاضرہ کہاں سے آ گیا۔"
"اچھا امو جان میں چلوں۔ مغرب کا وقت ہو رہا ہے۔" نصیبن جانے کی تیاری کرنے لگی۔
"پھر آنا...... نصیبن...... آپا کے گھر چلیں گے۔"
"اچھا اب کے چکر لگاؤں گی تو چلیں گے۔" نصیبن گیٹ کی جانب بڑھی۔
"آمنہ...... یہ سارہ اتنی چپ چپ سی کیوں ہے؟"
"معلوم نہیں امو جان...... میں نے پوچھا تو کہنے لگی سر میں درد ہے......"
"کوئی دوا دی؟"
"کہہ رہی تھی لے لی۔" آمنہ کپ اٹھا کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ سوچوں کے در کھل گئے امو جان دھیرے سے تخت سے اترنے لگیں مٹھو شور مچانے لگا۔
"چپ کر جا کلمو ہے۔" امو جان نے گھر کا۔
"پہلے ہم جانوروں کو بولنا سکھاتے ہیں پھر چپ کراتے ہیں۔" وہاب سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔
"آ جاؤ مٹھو چوری کھاؤ گے۔" قریب آ کر تخت پر براجمان ہوا اور مٹھو کے آگے بند مٹھی کر دی۔ طوطا فخر سے آ بیٹھا۔
"کھاؤں گا...... کھاؤں گا۔"
"کہو بسم اللہ۔" طوطا گانے لگا۔
"کہو بسم اللہ۔"
"یہ لو...... بسم اللہ۔" کچن سے آمنہ کٹوری میں چوری لے آئی۔ وہاب لاڈ سے کھلانے لگا۔ امو

جان اندر کی جانب بڑھ گئیں جہاں سارہ غائب دماغی سے چینل سرچنگ میں لگی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھی۔

''سارہ!'' امو جان اس کے پہلو میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہے، اتنی چپ چپ سی کیوں ہے بیٹا؟'' سر گھما کر انہیں دیکھا اور پھر ٹی وی دیکھنے لگی۔

''نہ مذاق نہ ہنسی...... شادی نے کتنا بدل دیا ہے تجھے۔'' ایک تلخ سی ہنسی نے ہونٹوں کو چھولیا۔

لڑکیاں بدلیں تب مشکل نہ بدلیں تب مشکل۔''

''بیٹا۔'' دھیرے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''تو خوش تو ہے نا؟'' وہ سر گھما کر انہیں دیکھنے لگی۔

''خوش! میں بہت خوش ہوں امو جان مجھے اتنا اچھا گھر، اتنا اچھا شوہر ملا ہے۔'' اس کے لہجے کی کڑواہٹ انہیں اپنے اندر محسوس ہوئی۔

''تو آئی ہے تو کوئی بات کیوں نہیں کرتی۔''

''آپ خود ہی تو کہتی ہیں لڑکی کو سسرال کی باتیں میکے میں آ کر نہیں کرنی چاہئیں۔''

''سسرال میں کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے، انسان مشورہ تو لے سکتا ہے نا۔''

''وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' سارہ نے رعونت بھرے انداز میں کہا۔

''اگر کوئی مسئلہ نہیں ہے تو تم مسئلہ مت بنانا...... تین کو بیاہ دیا ہے ابھی دو کو اور بیاہنا ہے۔'' نجمہ بیگم اندر آ گئیں، ان کا لہجہ کرخت تھا۔ سارہ ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

''زندگی ہماری ہوتی ہے اور اسے دوسرے بسر کرتے ہیں۔''

''کوئی کارنامہ انجام مت دے لینا، تمہارے ابا پہلے ہی دل کے مریض ہیں۔''

''پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں کچھ مت پوچھیں مجھ سے...... منع کر دیں بس نہیں آؤں گی یہاں...... اتنی نفرت ہے مجھ سے تو۔'' وہ سلگ کر کھڑی ہوئی۔

''تجھ سے نفرت نہیں ہے، تیری اس منحوس تھوتھنی سے نفرت ہے جو تو گلے میں لٹکائے پھرتی ہے کم بخت۔'' نجمہ بیگم کو غصہ آ رہا تھا اور امو جان ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''تو خود بڑی حور پری ہے جو ہم نے تجھ پر ظلم کر دیا۔ دنیا میں حبشی بھی ہیں شکر کر کہ تیری حبشی سے شادی نہیں ہوئی ہزار درجے بہتر ہے تجھ سے۔'' غصے میں نجمہ بیگم کو کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا بول رہی ہیں۔

''تو کر دیتیں حبشی سے، آپ سے کیا امید سر سے اتارا ہوا بوجھ سمجھ لیا تھا۔'' اس نے ترخ کر جواب دیا، پلٹی اور باہر نکل گئی۔

''یہ کوئی گل کھلا کر رہے گی۔'' نجمہ بیگم صوفے پر گر گئیں اور امو جان کو سارا مسئلہ سمجھ آ گیا۔

''امو جان!'' روہانسی انداز میں انہیں دیکھا۔

''اس نے ابھی تک عثمان سے سمجھوتا نہیں کیا کہ وہ کالا ہے۔ امو جان وہ کالا ہے حبشی تو نہیں ہے۔ پڑھا لکھا، سلجھا ہوا انسان ہے، بڑے بہنوئی کی طرح شکی مزاج اور طعنے باز تو نہیں اور نہ ہی ثنا کے شوہر کی طرح طنطنہ ہے۔''

''پاگل لڑکی......'' امو جان نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ انہیں سارہ سے ایسی بچکانہ باتوں کی امید نہیں تھی۔ ''اب تو ساری عمر کا ساتھ ہے۔ سارہ تو پہلے قدم پر ہی گھبرا رہی ہے کس بات کی کمی ہے عثمان میں...... اور اگر عثمان کو سارہ کے رویے کا

تعلق پتا چلے گا تو......'' امو جان کو فکر لگ گئی۔

''امو جان اسے سمجھائیں...... آپ کی تو سن لیتی ہے۔'' ملتجی انداز میں امو جان کو دیکھا۔ جو تاسف و دکھ سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور آج تک وہ سارہ کی باتوں کو ہنسی مذاق سمجھتی رہیں۔

''مجھے تو گورا چٹا، خوب صورت، ہینڈسم، ڈیسنٹ مین چاہیے جو ثنا کے شوہر کی طرح کھڑوس ہو نہ آپی کے شوہر کی طرح شکی مزاج اور نہ ہی ایسا ہو جو ہر وقت بیوی سے حساب کتاب مانگتا ہو۔ کہاں کتنا خرچ کیا فضول خرچی کے طعنے دے......'' سارہ بڑے فخر سے اپنے آئیڈیل کا بت تراش رہی تھی۔ اپنی کزنز کے سامنے اور حسب معمول تخت پر بیٹھی وہ سن رہی تھیں۔

''ایسا کرو...... ایک بت بناؤ...... تصور میں تو یہاں لاؤ اور اس کی پوجا کرو شروع۔ تم پر اسٹار پلس کے ڈراموں کا اثر ہے۔''

''ارے! اسٹار پلس کو تو اپنے میڈیا نے بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔''

''اور کیا...... یہ بڑے بڑے گھر...... وسیع و عریض لان...... ایک سے ایک ملبوسات...... فیشن...... اور دیکھتا کون ہے یہ ڈرامے۔ درمیانے درجے کے لوگ اور پھر خواب بسا لیتے ہیں آنکھوں میں اور بن جاتے ہیں سارہ حفیظ احمد۔'' سرمد واشگاف انداز میں اس پر طنز کر رہا تھا۔ سارہ اسے لب بھینچے گھورنے لگی۔ اس پر مطلق اثر نہ تھا۔

''اتنے لمبے لمبے خواب مت دیکھا کرو لڑکی! زمین پر گرو گی تو اٹھ نہ سکو گی۔ ہم جو ہیں وہی ہمیں ملے گا۔''

''دیکھ لینا میں اپنے خواب، اپنا آئیڈیل حاصل کر کے رہوں گی۔'' ضد سے سرمد کو دیکھا۔

''ہا...... ہا...... ہا...... اور آئیڈیل کبھی نہیں ملتے۔ انہیں ہمیں بنانا...... تراشنا ہوتا ہے اپنے قالب میں ڈھالنے کے لیے۔''

''بس تم جلتے رہنا۔'' سارہ پاؤں پٹخ کر کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

''میں تو اپنی جوتی کو بھی جلنے نہ دوں...... فضول میں۔'' وہ پیچھے سے ہانکا تھا۔ اس وقت امو جان ان بچوں کی بحث پر سر جھٹک کر ہنسی تھیں۔

''بچے ہیں جب نصیب جاگیں گے تو خود ہی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔'' مگر وہ بھی یہ بات بھول گئی تھیں کہ سمجھوتے کی چادر اڑھانے سے پہلے سمجھوتا کرنا سکھانا پڑتا ہے...... چھوٹی چھوٹی چیزوں میں، بہن بھائیوں کی لڑائیوں میں، گھر کے کام کاج میں یا پھر فیشن اپنانے میں، خواہشیں پوری کرنے میں...... مگر

سارہ کچھ ضدی تھی کچھ خودسر بھی اسے سمجھوتا کرنا نہیں آیا اور اب...... امو جان بے چین ہونے لگیں۔ تفکر کے بادل پھیلتے چلے گئے۔ انہیں سارہ کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اور اسے سمجھانا ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے سارہ! ماں کو پریشان کیوں کر رہی ہو؟" صبح امو جان کے کمرے میں سلام کرنے آئی تو انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

"میں خود جو پریشان ہو گئی ہوں۔" اِک نگاہ اٹھا کر جھکالی۔ اپنی ہتھیلیاں کریدنے لگی...... ناخن سے۔

"تجھے کس بات کی شکایت، پریشانی...... یا فکر ہے؟" اس کی ہتھیلی تھام لی۔

"کس چیز کی کمی ہے تیرے پاس؟ پیسہ، آسائش، گاڑی، ایک اچھا شوہر، بغیر کسی روک ٹوک کے سسرال......" سارہ نے گہری سانس لی۔

"یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیں ہمارا آئیڈیل ہی ملے۔ ہم من پسند خوبیاں اپنے ساتھی میں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ ذرا سی کوشش سے پیدا کر سکتے ہیں یہ تو زندگی بھر کا ساتھ ہے۔" سارہ کا دل بھرنے لگا۔ ایک حسین مرد کا تصور۔

"ہو سکتا ہے تو بھی عثمان کا آئیڈیل نہ ہو۔ اس نے اپنے رویّے سے تجھے جتایا؟" سارہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

"تو...... تو اپنے رویّے سے اسے کیا بتانا چاہتی ہے۔ ہم نے تجھ پر ظلم کیا ہے؟ ایک بات یاد رکھنا سارہ...... شوہر کو اگر بیوی کی ناپسندیدگی، اس کے گریز کا احساس ہو جائے تو وہ بدل جاتا ہے۔ تعلق مضبوط نہیں رہتا اور میاں بیوی کے تعلقات میں جھول نہیں آنا چاہیے اور تو جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے وہاں طلاقیں نہیں ہوتیں...... بعد کے سمجھوتے سے بہتر ہے کہ تو آج اپنے مرد سے سمجھوتا کر اس کے پیار کو سمجھ۔"

"امو جان۔" اس کا لہجہ بھیگنے لگا۔

"میں تیرا دکھ جان گئی ہوں لیکن تو نے ابھی دکھ دیکھے نہیں ہیں اور نہ تو نے حبشی دیکھے ہیں۔ عثمان کالے توے جیسا ہے کیا یا اس کالے دوپٹے جیسا ہے۔" اس کے شانوں کے دوپٹے کی جانب اشارہ کیا۔ "عثمان میں کوئی برائی نہیں ہے اگر ہے تو اسے نظر انداز کر کے اس کی اچھائیوں پر نظر رکھ۔ کبھی کسی وجہ سے تجھے پریشان کیا؟" سارہ نے سر جھکا لیا۔

"صرف اس کا رنگ تھوڑا سا دبتا ہوا سا ہے...... یہ خامی ہے کیا۔ شکل، رنگ روپ تو اللہ دیتا ہے...... بندے کو قناعت پسند ہونا چاہیے۔" دھیرے سے ہاتھ دبایا۔ سارہ گم صم بیٹھی رہی۔

"تیرے باوا کو پتا چلے گا کہ بیٹی کیا سوچ رہی ہے تو کیا گزرے گی اس پر؟"

"امو جان!" سارہ اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"میرا دل...... میرے خواب!"

"خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت پسند بنو...... امید بھرے خواب زندگی ہوتے ہیں، زندگی کی حرارت...... ایسے فضول خواب زندگی کو بجھا دیتے ہیں۔ تیرا کوئی بھی انتہائی قدم خود تجھے اپنی زندگی میں رسوا کر دے گا۔" دھیرے دھیرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"ہم کس کس کو بتائیں گے کہ سارہ نے اپنے مرد کی کم خوب صورتی کی وجہ سے، اس کے دبے ہوئے رنگ کی وجہ سے طلاق لی ہے کتنی جگ ہنسائی ہو گی اس گھر کی۔" سارہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"میں نے ایسا کب کہا ہے؟"

"مگر...... تیرا رویّہ، تیرا لہجہ، تیرے تعلقات عثمان سے، بیٹا تعلقات اور ازدواجی تعلقات کے درمیان بیوی کی سرد مزاجی مرد کے دل میں اتر جاتی ہے اور مرد کا دل برا ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت مرد کا دل نہیں بدل سکتی اور مرد بھی وہ جس کے ہاتھوں میں زندگی کی کامیابی کے باون پتے ہوں۔ وہ قناعت پسند بنے گا نہ سمجھوتا کرے گا۔" امو جان واشگاف الفاظ میں اسے سمجھا رہی تھیں۔

"ثنا کو دیکھو شوہر کے غصے سے سمجھوتا کر رہی ہے، ماہین شوہر کی شکی طبیعت کے ساتھ۔ آپا جان کی لبنیٰ کا شوہر دیکھا تھا نا کتنا خوب صورت تھا مگر اتنا کنجوس، تنگ نظر، وہمی، غصے والا...... لبنیٰ نے سمجھوتا کیا مگر ظہیر اسے طلاق دے گیا۔" سارہ نے دل پر ہاتھ رکھا۔

"سنو سارہ...... گلفام صرف خوب صورت شکل صورت کا مرد نہیں ہوتا۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ روایات بدل گئی ہیں۔ گلفام کا مطلب بھی بدل جانا ہے۔"

"گلفام کا مطلب ہوتا ہے خوب صورت...... اور خوب صورتی ظاہری نہیں باطنی ہونی چاہیے۔ حیا، پاکیزگی عورت کی نہیں مرد کی بھی ہوتی ہے۔ وسیع النظر، قناعت پسند، محبت کرنے والا، گھر، بچے، بیوی کے لیے کھلا خرچ کرنے والا، بنا کسی غرور و تکبر کے ساتھ رہنے والا...... میں نہیں ہم کہنے والا...... یعنی بیوی کو ساتھ لے کر چلنے والا مرد خوب صورت ہو گا اور وہی عورت کا گلفام ہوتا ہے۔" امو جان کا ہاتھ دھیرے دھیرے سارہ کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے اک نئی تحریک اس کے دل میں پیدا کر رہا تھا۔

"آئیڈیل کبھی بنے بنائے نہیں ملتے، انہیں ہمیں بنانا پڑتا ہے۔ انسان شکل صورت سے خوب صورت نہیں ہوتا۔ اپنی عادتوں سے، رویّے سے، لہجے سے، اندر کی پاکیزگی سے خوب صورت ہوتا ہے۔" دھیرے سے اس کا رخسار چھوا۔

"تجھے کوئی شکایت ہے تو بتا...... عثمان کو کوئی شکایت ہو گی تو ہم پوچھ لیں گے تجھ سے۔" سارہ نے سر جھکا لیا، امو جان کی باتوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"امو جان! میرا دل......"

"دل نہیں...... دماغ کی سن اور نہیں سن سکتی تو اپنے مرد کی آنکھوں کی محبت دیکھ۔"

"محبت!" دھیرے سے آنکھیں بند کیں۔ عثمان کی لو دیتی آنکھیں، وہ گجرے پہناتے ہاتھ، انگلیوں کا حدت دیتا لمس، وہ خیال دھیان......

رمضان میں اے کاش

صیام کی پُرنور ساعتیں مبارک ہوں
میرے دوستو! خوشبو کی یہ گھڑیاں مبارک ہوں

رحمتیں اور برکتیں لاتا ہے اپنے ساتھ
شیطان کے حربوں کو دیتا ہے یہ مات

تقوے سے بھرے اس میں ہر شخص اپنا جام
ملتے ہیں یہاں نیکیوں پر خاص انعام

رمضان میں تھکن کا تو کوئی نام نہیں ہے
یہ مہینہ بڑا خاص ہے عام نہیں ہے

جو خوش نصیب رمضان میں سیدھے راستے پر چلا ہے
اللہ کا اسے تو خاص انعام ملا ہے

کعبے کے انوار سے پُر ہو میرا سینہ
رمضان میں اے کاش شگفتہ جائے مدینہ

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

آفس سے بار بار فون کرنا...... اپنی پسند کے رنگ پہننے کی فرمائش کرنا، فرطِ مسرت سے تکنا اور پھر......

"جواب میں تم کیا دیتی ہو؟" اس کے اندر کی لڑکی نے سچ بولا۔ "بے اعتنائی، گریز، ناپسندیدگی...... صرف اس لیے کہ اس کا رنگ کم ہے اسے تم کالا...... حبشی کہتی ہو...... ابھی کل ہی تو بھابی تمہاری زندگی پر فخر کر رہی تھیں اگر یہ فخر تم سے چھن جائے تو......" اس کا دل دہل گیا۔

"سارہ...... سارہ!" باہر سے آمنہ پکار رہی تھی۔

"عثمان بھائی کا فون ہے، تمہارا سیل فون کیوں بند ہے؟" اس کے اندر اک محرکانہ سا انداز پیدا ہوا۔ باہر بھاگی...... اموجان مسکرا دیں۔

"تیرے لیے تو ہم نے سرمد کو پسند کیا تھا مگر تو سرمد کے ساتھ بھی خوش نہ رہتی...... تیرے اندر قناعت نہیں ہے سارہ...... پھر تو سرمد کی کم تنخواہ کا رونا روتی۔" وہ دھیرے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"ہیلو!" بے تاب دل کو تھام کر ہیلو کہا۔ چہرے کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ "وہ یقیناً لینے آ رہے ہوں گے میں بھی سارے خوابوں کو جھٹک کر ساتھ لے جاؤں گی اور زندگی کو گرم جوشی، محبت کے ساتھ ایک بار پھر شروع کروں گی۔"

"ہیلو!" عثمان کی گمبھیر بھاری آواز ابھری جس نے سماعتوں میں ہلچل سی مچا دی۔ جانے کیوں آنکھ بھر آئی۔ غلطی کا احساس تھا، اموجان کا سمجھانا تھا، اتنے دنوں کی دوری تھی یا پھر...... عثمان دھیرے دھیرے بول رہے تھے اور جو بول رہے تھے اس نے دھڑکنوں کو منتشر کر دیا۔

دل رکنے لگا۔ سانس سمٹنے لگی۔ ہوائیں ساکت ہو گئیں۔ آنکھ تو آنے والے لمحے کے احساس سے بھر آئی تھی۔ فون بند ہو گیا۔ سانسوں کو منتشر کرتی آواز بند ہو گئی۔ سارہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

"ابھی تو اموجان سمجھا رہی تھیں...... ابھی تو ان کی باتیں دل میں ترازو ہو رہی تھیں اور ابھی......" فون کی جانب دیکھا۔ ابھی عثمان کیا کہہ رہے تھے۔

"میں آفس وزٹ پر جا رہا ہوں، تم جتنے دن مرضی یہاں رہو۔ ماما اسلام آباد چلی گئیں ہیں، میں کب آؤں گا کچھ پتا نہیں، ماہا بھابی، بھائی کی شادی میں مصروف ہیں اور صبا کے پیپر ہو رہے ہیں وہ تایا ابو کے گھر زارا کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کر رہی ہے۔" عثمان نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ گھر میں اس کی جگہ نہیں۔ اس کا گریز...... اس کا فرار...... اس کی سرد مزاجی عثمان نے پڑھ لی ہے۔ ابھی تو اموجان اسے سمجھا رہی تھیں۔ ازدواجی تعلقات کی سرد مزاجی اگر مرد کے دل میں اتر جائے تو مرد کا دل برا ہو جاتا ہے اور پھر مرد کے دل کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ ابھی تو ان کی باتیں دل میں ترازو ہو کر اسے غلط کہہ رہی تھیں اور ابھی...... ابھی عثمان نے فون پر کیا کہہ دیا۔ دل...... دھک...... دھک کرتا رہ گیا۔ دھیرے سے چیئر پر گر گئی۔

"کیا ہوا...... سارہ...... سب ٹھیک ہے نا؟" اُدھر آتی آمنہ نے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھیک۔" سر اٹھایا۔

"آں...... ہاں...... ہاں...... سب ٹھیک ہے۔"

"کب آ رہے ہیں تمہارے رائٹ مین؟" غائب دماغی سے متحرک مسکراتی آمنہ کو دیکھے گئی۔

"ابھی نہیں، ابھی ایک کورس کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔" جاتے جاتے آمنہ نے سر گھما کر دیکھا اور شانے اچکا کر چلی گئی۔ اس کا بدلا ہوا دل

اور عثمان کا بدلا ہوا لہجہ۔ بے چینی دل سے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "کہیں...... کہیں......" وسوسہ دل میں اٹھا۔ اندیشے نے شور مچایا...... "اب کیا ہوگا؟" تفکر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

☆☆☆

چپ، خاموش، لیے دیے رہنے والا انداز اب بھی تھا مگر اب نوعیت بدل گئی تھی۔ جس مرد کے ہاتھ میں کامیابی کے باون پتے ہوں وہ کیونکر سمجھوتا کرے گا۔ خدشات ڈرانے لگے۔ امی مکمل طور پر ناراض تھیں۔

اموجان نے گہرے لفظوں میں سمجھا کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ گھر کی روٹین وہی تھی۔ ہنسی مذاق...... وہاب کی چہلیں...... بھائی بھابی کے مذاق...... بچوں کی چہلیں اور مٹھو کی پکار...... میاں مٹھو چوری کھائے گا...... کہو سبحان اللہ...... کہو بسم اللہ...... اموجان...... اس کے آگے چوری رکھ دیتیں۔ اس کا دل و دماغ بدل رہا تھا۔ وہ جھک رہی تھی تو عثمان نے اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ اس کا فون بند تھا۔ میکے آتی تو وہی فون کرتے تھے۔ بہت کم ضرورتاً...... دکھانے کے لیے فون کرتی تھی۔

اور اب...... اب...... طویل دنوں کے سلسلے تھے اور گہری خاموشی تھی۔ وجود کے اندر فکریں، اندیشے اور وسوسے تھے۔ کیا آئیڈیل...... کیسے خواب...... جگ ہنسائی...... جواب دہی کی فکر نے گھیر لیا تھا۔

"کیا بات ہے سارہ، عثمان آیا...... نہ اس کا فون...... سب ٹھیک ہے نا؟" اس روز ابو نے اخبار پڑھتے ہوئے پوچھ لیا۔ نجمہ بیگم نے کاٹ دار نگاہ ڈالی...... اموجان چائے پیتی رہیں۔

"ابو عثمان بھائی کورس کے سلسلے میں گئے ہیں، اس لیے سارہ اِدھر ہے۔" آمنہ نے ناشتا کرتے ہوئے اپنی دُھن میں بتایا۔ سب نے ایک ساتھ اسے دیکھا۔ اموجان کی نظر گہری تھی۔ سارہ نے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"اچھا! کب تک آئے گا؟" طلعت مرزا کو اپنے اس داماد پر فخر تھا۔

"یہ تو نہیں بتایا۔" سارہ نے دھیرے سے کہا۔

"ارے تم کیسی بیوی ہو کہ تمہیں یہ نہیں پتا...... عدیل کہیں جاتے ہیں تو میں تو دنوں کا حساب رکھتی ہوں۔" بھاوج تھیں تا ہنسی ہنسی میں بات کر گئیں۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے یہاں آئے اور ابھی شادی کو سال تک نہیں ہوا تھا۔ دیکھنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ سارہ کی چپ گہری ہو گئی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا اور وہ موسم کے سارے مزے چھت پر لیتی تھی شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی...... کبھار سس الگ۔

"اب کیا ہوگا؟" دل ڈراتا۔

"وہی ہوگا جو تمہارے دل میں ہے۔ عثمان سے پیچھا چھٹ جائے گا۔"

"ہائے...... اللہ نہ کرے۔" دل پر ہاتھ رکھا۔ بھرے بادلوں کے ساتھ آنکھ بھر آئی۔

"میں نے یہ کب چاہا تھا؟"

"تم نے جو سوچا...... عثمان نے نتیجہ اخذ کیا تو حاصل تو یہی آنا تھا۔ محبت...... محبت سے مشروط ہوتی ہے۔ توازن زندگی میں اعتدال رکھتا ہے۔"

"ارے...... سارہ...... تم اِدھر...... خوب موسم کا مزہ لیا جا رہا ہے۔ بارش برسنے کو ہے۔" برابر کی دیوار سے بھابی نے سر نکالا۔

''خیریت اس بار کچھ زیادہ دن نہیں رہ لیں؟'' سارہ بہ مشکل مسکرائی۔

''یہ موسم...... یہ مست نظارے۔'' کہتے ہوئے بھابی نے معنی خیزی سے آنکھ دبائی۔

''تمہارا تو پہلا ساون ہے نا...... کیسے چھوڑ دیا ساجن نے؟'' سارہ کے دل میں جل تھل سی ہونے لگی۔

''تمہارے بھائی آ گئے ہیں گھر میں' کہہ رہے ہیں پکوڑے اور حلوہ بنا لو......'' وہ ہنسیں...... ''یہ تو آج بھی اتنے رومینٹک ہیں۔'' سارہ بھرم والی ہنسی ہنس دی۔

''تمہارے ساجن کتنے رومینٹک ہیں، بندہ تو بڑا ہی ڈیشنگ ہے۔ کتنا خیال رکھتا ہوگا تمہارا؟'' بھابی کو باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا۔

''جاؤ...... جلدی سے گھر جاؤ...... ساون مناؤ...... مجھے تو لگتا ہے جمعرات کی جھڑی ہوگی...... پورے ہفتے جھڑے گی......'' سر اٹھا کر بھرے بھرے بادلوں کو دیکھا جو ابھی برسے نہیں تھے۔

''ارے...... ہماری نند کا تو یہ پورا ساون ہی اداس، بے قرار گزرے گا۔'' ہما بھابی جانے کب سیڑھیاں چڑھ کر عقب سے نکل کر سامنے آ گئیں۔

''کیوں بھئی؟'' تعجب سے دیکھا تھا برابر والی بھابی نے۔

''سارہ...... گا کر بتاؤ نا۔ ساجن میرا اس پار ہے۔'' ہما بھابی نے شانے سے شانے کو ٹھوکا دیا۔ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیں۔ سارہ اندر ہی اندر جل تھل ہو گئی۔

''موصوف کورس کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔ موصوفہ تو اداس ہوں گی ہی۔'' بھابی کے انداز میں معنی خیزی تھی۔ بہ مشکل دل پر قابو رکھے ہوئے تھی۔

''پھر بھی بڑی بات ہے ساس صاحبہ کی مہربانی کہ انہوں نے میکے میں چھوڑ دیا...... ورنہ کب ساسیں اتنی مہربان ہوتی ہیں۔'' ایک اور تیر دل پہ لگا۔ مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر بادلوں بھرے آسمان کو دیکھا۔

''بہت لکی ہے سارہ۔''

''ایسی ویسی۔'' یہ ہما بھابی تھیں۔

''جیسی چاہتی تھی ویسی ہی آئیڈیل زندگی ملی۔''

''اور کیا۔''

''اللہ ایسا سسرال ہر لڑکی کو دے۔'' دونوں بھابیاں باتیں کر رہی تھیں اور اس کا دل کٹ رہا تھا۔

بعض اوقات انسان نا سمجھی میں کیا کر دیتا تھا۔ اب اس کی تو زندگی ہی داؤ پر لگ گئی تھی۔

عثمان کا گمبھیر لہجہ، اس کی حدت۔ اب شوہر والی ہوئی تھی تو سمجھ آ رہی تھی۔ دھیرے سے اٹھی منڈیر تک پہنچ کر نیچے جھانکنے لگی ساتھ ہی آنسو رخساروں سے پھسل گئے۔ پیچھے دونوں بھابیاں کسی بات پر قہقہہ مار کر ہنس رہی تھیں، انداز ذو معنی تھے اور ذو معنی انداز سمجھ آنے لگے تو دل دکھ سے بھرنے لگتا ہے۔

☆☆☆

ابو آفس سے آئے تو قدرے چپ چپ سے تھے۔ لاؤنج سے اٹھ کر اندر جاتے جاتے نوٹ کیا تھا سارہ نے۔

''سارہ ایک کپ چائے لے کر آؤ۔''

''جی۔'' ان کے لہجے میں کچھ تھا کہ سارہ ٹھٹک گئی۔ باہر نکل گئی۔ امو جان نے دونوں کے انداز نوٹ کیے۔

''آج میں نے عثمان کو فون کیا تھا خیریت کا۔'' سارہ کا دل دھڑ کا۔ ''سب ٹھیک ہے' کورس مکمل ہونے والا ہے پھر آ جائے گا۔'' شال شانوں پر لپیٹ کر ابو کو دیکھا۔

''تم نے اسے فون نہیں کیا؟'' اچانک انہوں نے کہا۔

''جی...... میں فون کر رہی تھی مگر نمبر بند تھا۔''

انہوں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

ابو کی نگاہ کا ارتکاز اس پر تھا۔ تذبذب سے پہلو بدلا۔

''کچھ اختلافات ہیں تمہارے درمیان؟'' اس کی جانب دیکھا۔

''نا...... نہیں تو ابو۔''

''اگر ہیں بھی تو بڑھنے مت دینا بیٹا...... جھکنے میں ندامت نہیں ہوتی بلکہ عزت ہوتی ہے بیٹا...... اور اختلافات تو ہر جگہ ہوتے ہیں بلکہ یہ تو زندگی کا حسن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات محض ایک فون الجھاؤ سلجھا دیتا ہے اور تم میری اچھی بیٹی ہو۔'' اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ہم تمہیں ساری عمر تو نہیں رکھ سکتے نا!'' ان کی نگاہیں ٹیلی ویژن پر تھیں۔ ''لڑکیاں میکے میں اچھی نہیں لگتیں۔'' سارہ کا سر جھک گیا۔

''کوئی مسئلہ ہو۔ تو بتا دینا۔'' نجمہ کی الجھی سلجھی باتیں، امو جان کا انداز، سارہ کی چپ اور میکے میں رہنا اور عثمان کا گریز اور لیے دیے رہنے والا لہجہ...... طلعت مرزا جہاندیدہ آدمی تھے۔

''جی...... مگر کوئی بھی بات نہیں ہے۔''

''ہوں۔'' ان کے درمیان خاموشی کا وقفہ طویل ہوا۔ سارہ کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

''امو جان کوئی بات کوئی جھگڑا ضرور ہے آپ جاننے کی کوشش کریں عثمان بہت نائس آدمی ہے۔''

''اچھا۔'' امو جان نے گہری سانس لی۔ طلعت مرزا نے بغور دیکھا...... کوئی بات تھی ضرور۔

☆☆☆

تخت کی چادر درست کر کے گول تکیہ ٹھیک کیا۔ مٹھو کرسی پر بیٹھا بسم اللہ پڑھ رہا تھا۔

''کلمو ہے تجھے تو بھوک لگتی رہتی ہے ہر وقت......'' امو جان نے ہاتھ سے ہنکارا.... آمنہ کچن میں مصروف تھی پانی پھینک کر سارہ وائپر پھیرنے لگی۔ تبھی گیٹ بجا تو مڑ کر داخلی دروازہ کھول دیا۔ نصیبن آپا رشیدہ کے ساتھ کھڑی تھی۔

''کیسی ہو رشیدہ؟''

''بالکل ٹھیک...... آمنہ کدھر ہے؟''

''میں کچن میں ہوں، اِدھر آ جاؤ اور آج میری شرٹ مکمل کر کے جانا۔'' کچن سے آمنہ نے جھانکا۔

''ٹھیک ہو سارہ......'' رشیدہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ نصیبن آپا تخت پر امو جان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''تم ابھی اِدھر ہی ہو سارہ سسرال نہیں گئیں، خیریت تو ہے نا؟'' وائپر پھیرتے ہاتھ ٹھٹکے۔ امو جان اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

''اس کا میاں کورس کے سلسلے میں باہر گیا ہے خود ہی چھوڑ کر گیا ہے۔'' امو جان ڈھال بن گئیں۔ وائپر پھر چلنے لگا۔

''ساس نے حد نہیں لگائی کہ اُدھر ہی رہے؟'' نصیبن نے پاؤں سمیٹ کر اوپر کیے اور پاندان کھنگالنے لگیں۔ سارہ انہیں دیکھنے لگی۔

''یہ ہی تو اچھائی ہے، کون سے بچے ہیں ابھی پھر تو کہاں میکے کے چکر لگیں گے۔'' پھر اس کی ڈھال بنی تھیں امو جان۔ وائپر سائڈ پر رکھ کر واش بیسن میں منہ دھونے لگی۔

"تین چار ماہ ہوگئے ہیں سارہ کو آئے کل ہی تو فاطمہ حساب لگا رہی تھی۔" سارہ کے ہاتھ رکے چہرے پر صابن لگا رہ گیا۔ حساب تو لگایا ہی نہیں تھا۔ ابھی تو کتاب ہاتھ میں تھی کہ لوگ حساب کتاب کرنے لگے تھے۔ نل کھول کر پانی گرانے لگی۔ اس کا آئیڈیل آنسو بن کر بہنے لگا صابن اور پانی کے ساتھ ساتھ۔ اموجان نے آگے جانے کیا کہا کیسے مطمئن کیا دھیرے سے پلٹ کر کمرے میں آگئی۔ شامت منتظر تھی، نجمہ بیگم الماری ٹھیک کر رہی تھیں۔ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگیں۔ جگ ہنسائی کا احساس اسے ڈرانے لگا۔

☆☆☆

خاموشی اس کے گرد جال بننے لگی۔ اندرونی احساس ڈرانے لگا موسم کے تیور بھی خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ موسم اور مون سون ہواؤں کا اثر وجود پر ہونے لگا۔ عثمان کا فون بھی خاموش تھا۔ اس کی کال اٹینڈ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ پاؤں میں بھنور اور وجود میں بادل برسنے لگے تھے۔

ابو آتے جاتے گہری نظر ڈالتے تو چور سی بن جاتی۔ عدیل بھائی اور بھابی ہنستے تو دل عجیب سا ہونے لگتا۔ آمنہ، سرمد کے ساتھ باتیں کرتی...... خواب آنکھوں میں مچلنے لگتے۔ جانے کس گمان، کس جلن، کس حد نے عثمان کی جانب بڑھنے ہی نہیں دیا۔

آئیڈیل دل جلاتا رہا۔ خواب تعبیر کے لیے مچلتا رہا۔ دوریاں بڑھتی گئیں اور اب سرد مزاجی کا احساس شاید عثمان کو ہو گیا تھا آنکھیں بار بار بھیگنے لگتیں۔ اپنی کامیابی، پارسائی کے باون پتے کیش کرنے کا حق رکھتا تھا۔ اسے شادی نے کیا دیا تھا۔ حقیقت کی آنکھ کھلی تو سینہ کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ دل جکڑنے لگا۔ پاؤں جل بن مچھلی بن گئے۔ سیمابیاں وجود میں آبسیں۔ اموجان کے لفظ اسے پچھتاوا بن کر ڈرانے لگے لوگوں کی نظریں، جگ ہنسائی۔

اس روز ہلکا ہلکا مینہ برس رہا تھا، آنگن میں سوجی کی خوشبو پھیلی تھی۔ اوپر جانے لگی کہ اموجان نے ہاتھ پکڑ کر پہلو میں بٹھالیا۔ مٹھو لپک کر گھٹنے پر آبیٹھا۔

"مٹھو چوری کھائے گا۔ کہو بسم اللہ......"

"تجھے ڈھیر ساری چوری کھلاؤں گی دعا مانگ وہ آجائیں۔" طوطے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کہو بسم اللہ......" طوطا گا رہا تھا۔ سارہ کی آنکھ چھلک گئی۔ اموجان نے ساتھ لگایا۔

"وقت ابھی گزرا نہیں ہے تیری مٹھی میں ہے۔" سرگوشی کی۔ "اسے فون کیا؟"

"ہاں، بند ہے۔"

"گھر فون کرو...... سب آگئے ہوں گے۔" پوروں سے بھیگے رخسار خشک کیے۔

"ہر رستہ بند نہیں ہوتا۔ کوئی در کھلا رہتا ہے۔ وہ ناراض ہے خفا نہیں۔ جانے تیری کس بات نے اسے ہرٹ کر دیا ہے۔ منالینے میں بھلائی بھی ہے اور بڑائی بھی۔ اگر ہم خود چاہیں تو......" سارہ سیدھی ہوئی۔

"اپنی نند کو فون کرو اور نہیں تو بہانے سے گھر چلی جاؤ۔ کپڑے لینے ہیں اگر سامنے والا اچھا ہو تو ہمیں بہت اچھا بننا چاہیے۔ انہیں بھی تم سے توقعات ہوں گی...... اور اگر کوئی توقع باندھتا ہے تو اسے بہت اچھے طریقے سے پورا اترنا چاہیے۔"

"اموجان! مجھے ڈر لگتا ہے۔" دل کی بات پہلی بار کہی۔

"کس سے؟"

"عثمان سے۔"

"انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ ہر زمین پر سوچ سمجھ کر کاشت کرنا چاہیے اور اب تمہیں ہی زمین ہموار کرنی ہے اور اس پر محبت کی فصل بھی تمہیں ہی کاشت کرنی ہے بوائی جتنی اچھی ہوگی فصل پر اتنی ہی بہار آئے گی۔ اس سے ڈرو نہیں اسے سمجھو...... وہ ایک بہت اچھا انسان ہے۔" اموجان سمجھا رہی تھیں اور عقل کے دروازے کھل رہے تھے۔

"برستی بارش میں اسے فون کرنا، دیکھنا آجائے گا۔ یہ ساون تو اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔" اموجان ہنس رہی تھیں۔ وہ بھی ہنس رہی تھی اموجان کی بات سن کر۔ وہاب حلوہ لے آیا تھا پلیٹ میں اور گا رہا تھا مٹھو حلوہ کھائے گا۔ کہو بسم اللہ...... طوطا بھی گنگنانے لگا۔

☆☆☆

"سارہ...... عثمان واپس آگیا تم نے بتایا نہیں؟" رات ابو نے اسے بتایا تو وہ کھڑی رہ گئی۔ وہ تو سیل فون ہی ملاتی رہی اور نیٹ ورک کو مصروف پاتی رہی۔

"جی۔" تحیر آمیز انداز میں دیکھا۔

"ایک ہفتہ ہو گیا اسے آئے ہوئے۔" جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"ایسا کیا ہوا ہے تم لوگوں کے درمیان کہ وہ گھر نہیں آیا؟" ابو سنجیدگی سے جواب پرسی کر رہے تھے۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے، چاند چڑھانے کے چکر میں ہیں آپ کی لاڈلی...... وہ کریں گی جو اس خاندان میں ہوا نہ ہو۔" نجمہ بیگم پھٹ کر برس پڑیں۔ طلعت مرزا سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگے اور سارہ نے یوں سر جھکا لیا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ امی کے آگے بول، لفظ،

جملے سب کی موجودگی اسے بھسم کرنے کے لیے کافی تھی۔ آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ نجمہ بیگم بولتی چلی گئیں۔ سب نے تحیر بھرے انداز میں منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ ابو تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھ رہے تھے امو جان تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

کمرے میں غیر معمولی سناٹا پھیل گیا۔ طلعت مرزا اٹھ کر اندر چلے گئے۔ یہ خاموشی...... سارہ کا دل رکنے لگا...... بے معنی نہیں تھی۔ ابو زندگی میں بہت کم ہرٹ ہوتے تھے تو یوں خاموش ہو جاتے تھے۔ آنچل سے آنسو سمیٹے۔ دھیرے سے اٹھ کر ابو کے بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔

”آئی ایم ساری ابو۔“

”سارہ مجھے تم سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ شکل صورت کا انسان ذمے دار نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کی دین ہے، کردار اور اس کی اصلاح بندے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس شخص کو یہ علم ہو کہ محض رنگ کی وجہ سے اسے اگنور کیا جا رہا ہے تو اسے تو واقعی چھوڑ دینا چاہیے۔“ طلعت مرزا انصاف پسند تھے۔

دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”تم نے حبشی نہیں دیکھے، سیاہ رنگ نہیں دیکھا۔ کالے رنگ کی بدکرداری نہیں دیکھی۔ ہم نے تمہارے لیے ایک بہترین شخص کا انتخاب کیا تھا، کیا والدین اولاد کا برا چاہیں گے؟ کردار سازی انسان کو خوب صورت بناتی ہے تم کیا ہو؟“ ابو اس کی جانب گھومے۔ ان کا لہجہ سخت تھا چہرے پر دکھ رقم تھا۔

”تمہاری خوب صورتی اس کے سامنے گہنا گئی جب اسے احساس ہوا ہوگا کہ تم اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو...... تم خود سوچو تم اس کے ساتھ رہ سکتی ہو؟“ طلعت مرزا اچھی طرح سے اس کا دماغ درست کر رہے تھے۔ ”وہ تو اس کے اندر انسانیت ہے کہ ہم سے سیدھے منہ بات کر رہا ہے۔“ سارہ کا سر جھک گیا۔ ان سب باتوں کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”اور وہ طلاق بھجوا دے پھر؟“ اس کا دل رک گیا۔

”دنیا والوں کو کیا وجہ بتائیں گے اس رسوائی اور جگ ہنسائی کی۔ ہم نے تمہاری ایسی تربیت تو نہیں کی تھی۔“ زمین پھٹے اور سارہ اس میں سما جائے۔

”عثمان کے کردار میں جھول ہوتا، ہم خود تمہارا ساتھ دیتے اس صورت میں بالکل نہیں۔“ قطعیت بھرے انداز میں کہا۔

”تم نے اپنے بہنوئیوں کی خوب صورتی، وجاہت اور اس کا ردِعمل دیکھا ہے...... کالوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ انسان کے وجود پر کردار کی کلونج برائی پھیلاتی ہے اور تم......“ گہری نگاہ ڈالی۔

”آئی ایم ساری ابو، میں انہیں فون کر لیتی ہوں۔“

”ہاں...... اگر جواب دے دے تو......“

طلعت مرزا نے منہ پھیر لیا، وہ ان پر نگاہ ڈال کر باہر نکل آئی۔

اس رات ساون کے ساتھ اس کا دل بھی خوب برسا۔ ابو نے آنکھیں کھول دیں۔ امو جان تھپکتی رہیں۔

”کردار کے مضبوط لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اسے فون کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ صبح ناشتا کرتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھیں۔ باہر صحن میں بارش برس رہی تھی ساری رات چھاجوں مینہ برسا تھا۔ اس نے عثمان کے سیل پر رنگ کیا۔ خلافِ توقع اٹھا لیا گیا۔

”آپ واپس آ گئے نہ فون کیا نہ بتایا...... نہ لینے آئے؟“ ایک دم سے جانے کیسے گلہ لہجے میں در آیا...... لہجہ بھیگ گیا۔ دوسری جانب چپ تھی۔

”ہیلو!“

”کیا کرتا آ کر...... تعلقات میں محبت نہ ہو تو......“

”تو بجائے ٹھیک کرنے کے وجہ جاننے کے توڑ دینے چاہئیں۔“ بے ساختہ کہا اور رخسار بھیگنے لگے۔

”میں نے ایسا کب کہا؟“ بے ساختگی اُدھر بھی نمایاں تھی۔

”کیا تو ہے...... مطلب کیا تھا پھر اس سارے قصے کا؟“ سارہ کے وجود میں استحقاق بھرنے لگا۔

”تم ناراض جو تھیں۔“ گہرا لہجہ تھا۔

”میں خود سے ناراض تھی آپ سے تو نہیں۔“

”نہیں......!“ وہ حیرانی سے چیخا۔

”خود سے ناراض تھیں جبکہ میں سمجھا......“ عثمان کہتے کہتے رکا۔

”خود سے کیوں ناراض تھیں؟“

”یہ بھی میں ہی بتاؤں۔“ لہجے میں بھیگے موسم کی آمیزش آنے لگی۔

”تم رو رہی ہو؟“

”اب میں آپ کی اس بے اعتنائی پر رو بھی نہیں سکتی؟“

”سارہ...... سارہ...... پلیز...... آئی ایم ساری...... میں کیا سمجھتا رہا اور تم۔“

”آپ نے کتنی انسلٹ کی ہے میری۔ ابو کتنے ہرٹ ہوئے ہیں۔“

”میں آ رہا ہوں، منا لیتا ہوں تم سمیت سب کو۔“ لہجے میں خوشی کی چہکار کی ساتھ بے قراری بھی سمٹ آئی۔

ساون یادیں

جب بھی
یادوں کے دریچوں سے
ہوا
صحنِ دل سے گزرتی ہے
تو اداسی سے دل
بھر جاتا ہے
آنکھوں میں ساون کا
موسم ٹھہر جاتا ہے
کاجل بکھر جاتا ہے

مرسلہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

”نا...... نہیں آئیں۔ موسم ٹوٹ کر برس رہا ہے۔ بارش بہت تیز اور راستے خراب ہیں ذرا ٹھہرنے کا انتظار کر لیں۔“ سرعت سے کہا۔

”یار...... میرے ساتھ تمہارا ابھی تو پہلا ساون ہے ٹوٹ کر برسنے دو یہ ساون۔ پھول...... بادل...... یخ ہوائیں...... چاندنی راتیں میری کمزوری ہیں۔ میں جانے کس گمان میں رہا کہ اظہار ہی نہیں کر سکا۔“ عثمان جذب سے کہہ رہا تھا۔

”میں بھی۔“ سارہ نے اظہار کرنے میں دیر نہ لگائی۔

”کیا میں بھی۔“ عثمان شوخ ہوا...... گمبھیر لہجہ اس کے دل کو چھو گیا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے ہنس دی۔

”میں آ رہا ہوں...... تیار رہنا۔“ فون بند ہو گیا اور سیل فون ہاتھ میں تھام کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''سارہ...... سارہ تو کیسی ہے نا...... ایسے پیارے معصوم شخص کو کھونے جارہی تھی...... شرم کر...... اب چاہت بھی اسے اتنی دوں گی کہ خود کو بھول جائیں گے۔'' خود سے وعدہ کیا۔

آسمان پر بادل زور سے ٹکرائے اور بارش جوش کے ساتھ زور سے برسنے لگی۔ آنگن میں سب نہانے لگے۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہاب کے پیچھے سب چھت پر جارہے تھے مٹھو وہاب کے کندھے پر بیٹھا تھا اور گا رہا تھا کہو بسم اللہ صحن خالی ہوگیا۔ سب اوپر تھے۔ امو جان بھی اوپر جانے لگیں اسے دیکھ کر رک گئیں۔

''سارہ فون ملا؟'' سارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کے گلے لگ گئی۔

''وہ آرہے ہیں۔''

''سچ۔'' امو جان نے منہ چوم لیا۔ ''کیا وجہ بتائی ناراضی کی؟''

''بتاؤں گی کہ میں پڑھنا چاہتی تھی بس اس لیے ایسے رہتی تھی۔'' شرارت سے ہنسی۔ امو جان بھی ہنس دیں۔

''اچھا، میں چھت پر جارہی ہوں...... تو تیار ہوجا۔'' امو جان چھت کی جانب بڑھیں۔ وہ صحن میں آئی اور ایک دم سے برستے ساون نے اسے بھگو دیا۔ کسی اپنے کو منا کر وجود میں کیسا سکون دوڑتا ہے کوئی اس سے پوچھتا۔ بازو پھیلا کر...... گول گول گھومتے ہوئے وہ منہ اٹھائے بھیگتی گاتی رہی۔ تبھی دروازہ زور سے بجا۔ بھاگ کر دروازہ کھولا...... اور ساکت ہوگئی۔ گیٹ پر ہاتھ رکھے عثمان کھڑے تھے۔ پس منظر میں ان کی وائٹ گاڑی اور اس کے پیچھے سامنے والے گھر میں کھڑی فاطمہ، حنا اور خالہ نصیبن ان کی آنکھوں کا رشک۔ دو قدم آگے آکر عثمان نے دروازہ بند کردیا۔

''یقین نہیں آرہا کہ میں آگیا ہوں۔'' قریب آکر اس کے سامنے جھکا۔ بارش زور سے برس رہی تھی۔ وہ تو ابھی تیار ہونے جارہی تھی۔ عثمان کے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر ٹھہرے اور شانوں پر تراز و ہو گئے۔ دوسرے لمحے عثمان کے شانے سے لگی تھی۔ ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا۔

''ہم تم ہوں گے بادل ہو گا
رقص میں سارا جنگل ہو گا''

کسی کے آجانے کے خیال سے سارہ جھجکی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ایسے میرا استقبال کرو گی، سچ پرسوں ہی آجاتا۔ ناراضی کی وجہ بھی دور کردوں گا۔ یار بس ذرا......'' اسے دیکھ کر شرارت سے ہنسا۔

''جی بھر کر ساون منا لینے دو۔'' اس کے بھیگے سراپا پر نگاہ کی۔ شانتی اس کے وجود میں بھی پھیل گئی۔

''خوانخواہ ہی خوابوں کے آئیڈیل کے پیچھے بھاگ رہی تھی جو چاہے، نبھاہے، سراہے اظہار کرے خیال دھیان رکھے وہی گلفام ہوتا ہے۔ میرا گلفام تو یہی ہے۔'' استحقاق بھرے انداز میں ہاتھ تھام لیا۔ عثمان اس کا بازو پکڑنا چاہتا تھا کہ ایک بڑا سا آم اوپر سے آکر عثمان کے شانے پر لگا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہاب چیخ رہا تھا سارہ محجوب سی ہوئی۔ عثمان نے اسے کھینچ کر قریب کیا شانے پر بازو پھیلایا اور وہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ بارش انہیں مسلسل بھگو رہی تھی، ناراضی کے بادل چھٹ رہے تھے۔

دیا اور ساون

بشریٰ نثار



''واٹ...... مما کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میں، دیا اور شادی اٹس امپاسبل، سوری۔'' سلمان احمد نے صبح صبح مما کے منہ سے دھماکا خیز خبر سنی تو سٹپٹا کر ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹا تم جانتے ہو، دیا میرے اکلوتے بھائی کی پہلی اولاد ہے اور میری تو اس میں جان ہے۔ میں اسے ہی اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔'' سلمیٰ بیگم نے نرم لہجے میں اپنا موقف اسے بتایا۔

"لیکن مما دیا مجھ سے سات سال چھوٹی ہے۔ پھر اُن کا کوئی بھائی نہیں ہے تو میں نے ہمیشہ انہیں بڑے بھائی کی طرح پیار دینے کی کوشش کی ہے اور وہ تینوں بہنیں بھی مجھے بھائی سمجھتی ہیں، آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں، میں دیا سے شادی نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

"اور میں دیا کے علاوہ کسی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی سمجھے تم۔ کل رات سب طے ہو چکا ہے۔ اسی ہفتے تمہاری اور دیا کی منگنی ہوگی اور ہاں ہم سب اپنی پہلی خوشی بہت دھوم دھام سے منائیں گے۔ آج رات جلدی گھر آجانا کچھ انتظامات کرنے ہیں۔" سلمٰی بیگم اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے کھڑی تحکمانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"مگر مما......" سلمان نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں...... سب طے ہو چکا ہے۔" سلمٰی بیگم کا لہجہ قطعی تھا۔ سلمان بوجھل قدموں سے ڈرائنگ روم سے باہر گیٹ کی طرف چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ مما اب اس کی ایک نہیں سنیں گی۔ وہ نہ صرف ایک با اصول خاتون تھیں بلکہ باپ کی طرح اس کی پرورش کی تھی انہوں نے ماں کے روپ میں وہ بہت کم نظر آتی تھیں کیونکہ وہ صرف ڈیڑھ سال کا تھا جب اس کے والد اس دنیا سے چلے گئے تھے تب سے اب تک انہوں نے اسے باپ بن کر پالا تھا۔ بچپن میں ان کی والدہ یعنی سنی کی نانی جان کا انتقال ہو گیا تھا۔ چار سال کا ایک بھائی، سات سالہ بہن اور خود وہ صرف گیارہ سال کی تھیں۔ تب انہوں نے بڑی بہن کے بجائے ماں بن کر ان دونوں کو پالا۔ بہت بہادر اور دُھن کی پکی خاتون تھیں اور اب یہ ان کی ہی خواہش تھی کہ دیا کو اپنی بہو بنائیں گی...... سو بھائی بھابی سے لے کر بیٹے تک کو ہارنا پڑا۔ سلمان احمد بہت سلجھا ہوا اور سمجھدار انسان تھا اور ماں میں تو اس کی جان تھی۔ ان کا کہا وہ ٹال نہیں سکتا تھا سو ماننا پڑا مگر دل سے نہیں۔

☆☆☆

فیضان ولا کے سرسبز درختوں اور مخملی ہری گھاس والے لان میں وہ لائٹ بلو کلر کے سوٹ میں ملبوس وہاں پڑی چیئر پر براجمان آسمان سے اتری کسی پری کے مانند معصوم اور دلکش نظر آ رہی تھی۔ بارش تو اسے تھی ہی بہت پسند پھر شام کا موسم ساون کا مہینہ، وہ آج کی بارش کے بعد قدرت کے حسین نظاروں کو اپنی آنکھوں میں زیادہ سے زیادہ سمونے کی کوشش میں محو تھی کہ اتنے میں عینا اسے پکارتی وہاں آگئی۔

"دیا کچھ پتا چلا تمہیں؟" عینا خاصی پُرجوش تھی۔

"کیا؟" اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جو اب اس کے سامنے والی چیئر پر بیٹھ چکی تھی۔

"یہی کہ سنی بھائی کی منگنی ہو رہی ہے، وہ بھی اسی ہفتے کی شام کو۔" عینا بہت خوش تھی۔

"رئیلی......؟ کس سے ہو رہی ہے، تمہیں کس نے بتایا؟" اس کا لہجہ ناقابلِ یقین تھا۔

"ابھی کل ہی تو ہو کر گئے ہیں...... سنی بھائی اور پھپھو جان ادھر سے۔ انہوں نے تو کوئی ایسی بات بھی نہیں کی۔" دیا کو الجھن میں ڈال دیا تھا عینا نے۔

"جی ہاں! مائی ڈیئر کزنز، سنی بھائی کی منگنی ہو رہی ہے وہ بھی اسی ہفتے اور کل ہی تو سب کچھ طے ہوا ہے۔" عقب سے آنے والی آواز پر ان دونوں نے پیچھے دیکھا تو نوید کھڑا انہیں شاید اپنے منہ سے نوید سنانے آیا تھا۔

"مگر کس سے؟" دیا نے سوال داغا۔

"یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا، فی الحال اتنا ہی بتایا گیا ہے۔" نوید نے کندھے اچکا کر کہا۔

"چلو یار کسی لڑکی سے ہی ہو رہی ہو گی، ہم تو خوب انجوئے کریں گے۔" عینا کا جوش کم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔

"جی ہاں بالکل، سارے ارمان پورے کریں گے ان کی منگنی اور شادی پر بھی۔" دیا کی خوشی دیدنی تھی۔ "ویسے تو سنی بھائی بہت بنتے ہیں کہ انہیں کوئی لڑکی پسند آئے گی یا وہ ایسا کچھ سوچیں گے بھی تو ہمیں ضرور بتائیں گے اور اب چپکے سے منگنی کا اعلان؟ آنے دو اُن کو میں تو اچھی طرح خبر لوں گی۔" دیا کو خواہ مخواہ غصہ آنے لگا کہ انہیں بے خبر رکھا گیا ہے۔

"ہاں تو اور کیا ہم بہنوں کو تو ہونے والی بھابی کا بھی نہیں بتایا گیا۔" عینا کا لہجہ بھی پُرشکوہ تھا...... جبکہ نوید کھڑا ان کی بنتی بگڑتی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

"چلو ایسا کرتے ہیں ابھی چلتے ہیں پھپھو جان کی طرف کہ ہمیں ہماری ہونے والی بھابی دکھا کر لائیں۔" دیا نے ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے، ارے رکو...... عینا آئینہ لاؤ...... ذرا دیا کو بھابی دکھائیں ہم۔" نوید نے شرارت بھرے لہجے میں عینا سے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم سے اچھی شکل ہے میری، تم جا کر دیکھو آئینہ، مجھے کیوں دکھا رہے ہو؟" دیا اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے تپ گئی۔

"ارے، میں تو کہہ رہا ہوں کہ ممانی جان سے اجازت لے لو، ذرا حلیہ سنوار لو پھر چلی جانا۔" نوید نے بھی بات بدلتے ہوئے کہا اس سے پہلے کہ وہ تینوں مزید اس بارے میں کچھ بات کرتے درخشاں بیگم یعنی دیا کی مما کے وہاں آجانے سے بات بدل گئی۔ انہوں نے آتے ہی دیا سے کہا۔

"تیار ہو جاؤ ہم سنی کی دلہن کے لیے کچھ خریدنے جا رہے ہیں۔" اس نے پوچھا بھی کہ کس سے ہو رہی ہے سنی بھائی کی منگنی اور کہاں لیکن ممی نے اسے کہا...... بتا دیں گے سب فی الحال جو کہا ہے وہ کرو اور وہ تیار ہو کر تھوڑی دیر میں ان کے سامنے تھی۔

ممی نے راستے میں جاتے ہوئے نوید کی مما یعنی اس کی چھوٹی پھپھو جان اور...... سنی بھائی کی مما یعنی بڑی پھپھو جان کو بھی لے لیا۔ ہر چیز اس کی پسند کی خریدی گئی رنگ، زیورات، ڈریسز، جوتے ایک، ایک چیز وہی خریدی گئی جو اس نے پسند کی۔ بڑی پھپھو جان آج اسے بار بار پیار اور وارفتگی کے انداز میں دیکھ رہی تھیں جس سے اسے ایک دو دفعہ الجھن سی بھی محسوس ہوئی۔ وہ بار بار کہے جا رہی تھی کہ یہ سب شاپنگ سنی بھائی کی دلہن کو ساتھ لے کر کرنی چاہیے تھی...... پتا نہیں انہیں یہ سب پسند بھی آئے یا نہیں مگر ممی اور دونوں پھپھو جان بس مسکرانے پر اکتفا کر رہی تھیں۔ رات کے دس بجے جب وہ شاپنگ سے فارغ ہو کر گھر آئیں تو اس نے اپنے روم میں جانے کے بعد سوچا سنی بھائی سے بات کرتی ہوں۔

"سنی بھائی کہاں ہیں آپ، آج تو گھر بھی نہیں آئے پتا ہے ہم بہت ساری شاپنگ کر کے آئے ہیں۔ آپ کی ہونے والی دلہن کے لیے۔" ان کا نمبر ملانے کے بعد جیسے ہی انہوں نے اٹھایا وہ شروع ہو گئی۔

"ویسے میں آپ سے ناراض ہوں، ویسے تو آپ ہم سے اتنا پیار جتاتے ہیں اور ہمیں بتایا تک نہیں کہ کون ہیں ہماری ہونے والی بھابی......؟"

دوسری طرف سے گمبھیر خاموشی کو نظر انداز کر کے وہ بولے جا رہی تھی اور سلمان کو اس کی باتوں سے ہی اندازہ ہوا کہ اسے نہیں بتایا گیا ابھی کچھ۔

''سنی بھائی آپ نے اپنی منگیتر کو دیکھا ہے؟ یعنی جس سے آپ کی منگنی ہونے جا رہی ہے؟'' دیا نے پھر اُن کی خاموشی پر سوال داغا۔

''نہیں......'' سلمان نے دھیرے سے کچھ توقف کے بعد جواب دیا اور کال کاٹ دی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کیا کہے اس سے۔ کتنا عجیب فیصلہ کیا تھا بڑوں نے...... وہ بہت پریشان تھا۔ دوسری طرف دیا کو بھی اس کا انداز اور رویّہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ سوچوں میں اُلجھے اُلجھے ہی سو گئی مگر سنی کو نیند بالکل نہیں آ رہی تھی اسے بے حد مشکل لگ رہا تھا یہ سب فیس کرنا کہ وہ لڑکی جس کو خود اس نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہو اور ہمیشہ چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھا ہو اس سے شادی کرے۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ سختی سے انکار کر دے مگر سلمٰی بیگم کے سامنے دم مارنے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی اُنہی سوچوں میں اُلجھے پتا نہیں کب اسے نیند آ گئی۔

صبح پھر ناشتے کی ٹیبل پر مما جان نے اس سے منگنی کی تقریب کے حوالے سے انتظامات کی بات کی کارڈز چھپوانے اور تقسیم کرنے وغیرہ کے بارے میں مگر وہ ضروری جوابات ہی بہ مشکل دے پایا اور آفس آ گیا وہاں آ کر بھی ایک ہی اُلجھن اس کے دماغ کو جکڑے ہوئے تھی آخر اس نے انہی اُلجھنوں میں اُلجھے اپنے اکلوتے دوست قیصر کو فون کر کے آفس بلا لیا، اسے اپنی ساری اُلجھن اور پریشانی بتائی۔

''تو کیا یار وہ لڑکی بدصورت ہے؟'' ساری بات سن کر قیصر نے سوال داغا۔ ''جو تو اس سے شادی نہیں کر سکتا؟'' اس کا لہجہ معمولی سا تھا۔

''میں ایک گھنٹے سے کیا سمجھا رہا ہوں تجھے؟'' سنی نے چڑ کر کہا۔ ''یار وہ مجھ سے پورے سات سال چھوٹی ہے،، بہن سمجھتا ہوں اسے۔ کزنز میں سب سے پیاری تھی وہ مجھے مگر بہن کی حیثیت سے اور مما جان کا یہ حکم؟ یار میں نہیں کر سکتا اس سے شادی...... تو کوئی حل بتا۔'' اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی، قیصر کچھ دیر سنجیدہ بیٹھا سوچتا رہا۔

''یار میں کیا حل بتاؤں؟ تو بتا رہا ہے کہ تین دن بعد منگنی کی رسم ہے دیکھ میری بات تو نے پہلے بھی مانی ہے جواب مانے گا لیکن میں کہوں گا یہی کہ اللہ دے اور بندہ لے...... تو چپ چاپ اپنی اس منی سی کزن سے منگنی کر لے۔'' قیصر کا لہجہ شرارتی سا تھا۔ سنی نے ٹیبل پر پڑا گلوب اٹھا کر اسے مارنا چاہا مگر پھر وہیں رکھ دیا۔

''یار تجھے اتنی لڑکیاں دکھاتا رہا میں کالج میں، یونیورسٹی میں مگر تجھے نہیں آئی تھی کوئی پسند شاید اسی لیے کہ تیری شادی تو تیری منی کزن سے ہونی تھی۔''

''خبردار، اب بکواس کی تو مارا جائے گا خوامخواہ میرے ہاتھوں سے۔'' سنی نے دانت کچکچاتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

''یار کتنی مرتبہ تجھے سمجھایا تھا کہ ایک آدھ تو اسٹوری ہونی چاہیے بندے کی لائف میں مگر تو، تو گھامڑ ہے نرا، اب بھگت خود ہی مجھے نہ ٹینشن دے خوامخواہ...... کوئی تو اسٹوری ہوتی تو آج کام آتی اور تجھے نہ کرنا پڑتی اس......'' قیصر بھی مصنوعی خفگی طاری کرتے ہوئے بولا اور سنی سر پکڑے بیٹھا رہا۔

''اب یوں سر نہ پکڑ کر بیٹھ چپ چاپ منگنی

کروا لے، منگنی کے بعد بھی کوئی حل ہو سکتا ہے میں تو چلا...... تیری ہونے والی بھابی کو ٹائم دیا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر قیصر اس کے آفس سے چلا گیا، یہی تسلی تو اسے بھی تھی کچھ حد تک کہ منگنی ہو رہی ہے شاید شادی تک کوئی حل نکل آئے۔ خیر اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چپ چاپ چھوڑ دیا اور کوئی بھی تو نہیں تھا اس کے پاس مگر اس کے دل و دماغ دیا کو کسی طور اپنی دلہن کے روپ میں دیکھنے کو تیار نہیں تھے۔

☆☆☆

فیضان ولا میں منگنی کی تیاریاں عروج پر تھیں، فیضان صاحب کی تین اولادیں تھیں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا، ان کی بیگم یعنی صفیہ بیگم کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب ان کی سب سے بڑی بیٹی سلمٰی گیارہ سال کی چھوٹی نزہت سات سال کی اور سب سے چھوٹا بیٹا نعمان صرف چار سال کا تھا انہوں نے بڑی بہادری اور استقامت کے ساتھ تینوں بچوں کی پرورش کی تھی، بڑی بیٹی سلمٰی میں اُن کی ساری خصوصیات تھیں اور ان کی وفات کے بعد وہی فیضان ولا کی سربراہ و بزرگوار کی حیثیت رکھتی تھیں، ان کا ایک ہی بیٹا تھا سلمان احمد۔ ان سے چھوٹی نزہت بیگم کی تین اولادیں افشاں، نوید اور رنیب اور نعمان احمد کی تین ہی بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی دیا پھر عینا اور پھر ارشا۔

نزہت بیگم اور سلمٰی بیگم کے گھر فیضان ولا سے کچھ ہی فاصلے پر ایک ہی لائن میں تھے تو سارا دن بلا تکلف و بے روک ٹوک آنا جانا لگا رہتا تھا۔ آبائی گھر ہونے کی وجہ سے منگنی کی رسم بھی اسی گھر میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ سو فیضان ولا کے بچوں کی پہلی خوشی ہونے کی وجہ سے بہت زور شور سے تیاریاں جاری تھیں۔ لڑکیاں، لڑکے سب خوب تیاریاں کر رہے تھے کہیں ان میں تجسس بھی تھا کہ آخر.... سنی بھائی کی منگنی ہو کس سے رہی ہے اور کسی کو جیسے سارا معاملہ پتا تھا جیسے نوید کو تو چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی۔ اگرچہ سلمان احمد، فیضان ولا کے بچوں کی پسندیدہ ترین شخصیت تھا مگر پھر بھی نعمان احمد اور ان کی بیگم اپنی بیٹیوں خاص طور پر دیا کے سامنے اس بات کا انکشاف کرنے سے ڈر رہے تھے کہ دیا ہی سلمان احمد کی ہونے والی منگیتر ہے کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ شاید دیا کا ردِ عمل شدید قسم کا ہو۔

اور پھر ہوا بھی یہی منگنی سے ایک دن پہلے اس نے عینا اور نوید کی باتیں سن لیں اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو نوید عینا کو بتا رہا تھا وہ سچ بھی ہو سکتا ہے' وہ چپ چاپ اپنے روم میں آ گئی اور سوچنے لگی۔

''نہیں، یہ نہیں ہو سکتا نوید کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اگر یہ سچ ہے تو کوئی مجھ سے رائے یا مرضی معلوم کرنے آئے گا کوئی اور بھی تو بات کرے گا۔'' لیکن وہ سارا دن گزر گیا وہ چپ چاپ ساری تیاریوں کو دیکھتی رہی کسی سے کچھ پوچھنے اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

آخر وہ شام بھی آ گئی جو اسے سلمان احمد کے نام منسوب کرنے جا رہی تھی۔ جب ممی عینا اور افشاں کو ساتھ لے کر اس کے روم میں کپڑے اور زیورات دینے آئیں تو ممی اس کے پاس آ کر سر پر ہاتھ رکھ کر ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئیں اور دھیرے دھیرے بولنے لگیں۔

''دیا بیٹا، ہم نے تم تینوں بہنوں کو بیٹیوں سے بڑھ کر لاڈ اور پیار سے پالا ہے اور ہم چاہتے ہیں تم تینوں اپنی اگلی زندگی میں بھی اتنا ہی پیار اور محبت پاؤ اس کے لیے ہم نے جو فیصلہ کیا وہ تمہارے حق میں

بہترین ثابت ہوگا۔ بیٹا تم نے پچھلے ہفتے میں کتنی دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ ممی بتائیں وہ خوش نصیب کون ہے جو سنی بھائی کی دلہن بننے جارہی ہے تو بیٹا وہ خوش نصیب تم ہی ہو۔ سنی بہت باسعادت بیٹا ہے وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔" ممی اس کا ماتھا چومنے لگیں ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرنے لگی۔ دیا چپ چاپ سب سنتی رہی۔ کچھ ری ایکٹ کرنے کا یا کہنے کا شاید وقت نہیں تھا۔

"اب تم جلدی سے اٹھو اور عینا اور افشاں کے ساتھ جا کر پارلر سے ہو آؤ۔ وقت کم ہے، مہمان آنا شروع ہوجائیں گے پھر۔" وہ یہ کہہ کر اس کے روم سے باہر چلی گئیں۔ دیا کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کررہی ہے، کیا ہورہا ہے اس کے گرد...... وہ پارلر گئی اور پھر جب واپس آئی تو فیضان ولا کے لان میں وہ چہل پہل تھی جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی، ہر طرف قہقہے تھے۔ سب بہت خوش تھے درخت جگمگا رہے تھے، دیواریں چمک رہی تھیں اور پھر مہمان زرق برق ملبوسات میں ملبوس تقریب کا حسن دوبالا کررہے تھے مگر اس ساری محفل میں سنی بہت چپ چاپ اسٹیج پر نظریں نیچی کیے بیٹھا نہ جانے کن الجھنوں میں الجھا ہوا تھا...... اُسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا عجیب سی بے چینی تھی لگتا تھا ابھی لوگوں کے ہجوم میں سے کہیں سے دیا نمودار ہوکر کہے گی۔

"سنی بھائی بتائیں میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا کر کہے گا۔

"ہماری گڑیا جیسا کوئی ہوسکتا ہے بھلا؟" وہ اسے گڑیا کہا کرتا تھا عجیب سی انسیت تھی اسے دیا سے...... سگے بھائیوں سے بڑھ کر پیار دیا تھا اس نے دیا کو ہمیشہ...... اس کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آج وہ کس طرح سامنا کرے گا دیا کا۔

دیا کی فیلنگز بھی کچھ اس سے مختلف نہیں تھی وہ اسے بہت مس کررہی تھی اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ بچپن سے اب تک اسے بچوں کی طرح پیار دینے والے سنی بھائی سے اس کا یہ رشتہ بھی بن سکتا تھا۔ وہ کتنا پیار کرتے تھے اس سے۔ ہر روز شام کو ملنے آتے ہوئے چھوٹا اور بڑے سے بڑا مسئلہ وہ ان سے شیئر کرتی، وہ ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی مگر آج اسے لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سب کچھ ختم ہونے جارہا ہو۔ وہ انہی سوچوں میں گم رہی پھر جب عینا اور افشاں اسے روم سے لان میں لے جانے لگیں تو نہ جانے اسے کیا ہوگیا وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔

"آپ لوگ مجھ سے میرا بھائی چھیننے جارہے ہیں؟ آخر کیوں؟ میں یہ سب نہیں کرسکتی، مجھے میرا بھائی چاہیے ایک ہی تو بھائی تھے میرے اب میں کہاں سے لوں گی بھائی مجھے میرا بھائی چاہیے پلیز میں یہ نہیں کرسکتی۔" وہ بری طرح رو رہی تھی۔ عینا اور افشاں کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگیں وہ چپ چاپ باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد نوید اس کے کمرے میں تھا۔ وہ کافی دیر اسے سمجھاتا رہا۔

"سنی بھائی اب ہمیشہ کے لیے تمہارے ہورہے ہیں پاگل لڑکی! کوئی اور بھابی آتیں تو وہ انہیں دور کردیتیں تم سے...... پھر ہم کیا کرتے؟ پھر میں ہوں نا تمہارا بھائی...... میں آج سے اپنی دیا بہنا سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی زندگی میں تمہیں بھائی کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا ٹھیک؟" اس نے بہت پیار بھرے لہجے میں کہہ کر دیا سے تائید چاہی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ نوید نے اس کے آنسو صاف کیے اور بچوں کی طرح کچھ دیر اور پچکارنے

کے بعد اسے لے کر روم سے باہر آگیا۔ وہ سی گرین کلر کی ہلکے کام والی فراک اور دوپٹے میں نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ گوری سفید رنگت، بہترین نقوش لائٹ براؤن آنکھیں اور اوپر سے لائٹ سا میک اپ اس کے فطرتی حسن کو چار چاند لگا رہا تھا سب مہمانوں کی نظریں مقناطیس کی طرح اس سے چمٹ گئیں، دونوں پھوپیوں نے آگے بڑھ کر اس کی بلائیں لے ڈالیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عینا اور افشاں دونوں اطراف سے اسے تھامے جب اسٹیج پر پہنچیں تو سنی اٹھ کھڑا ہوا اور پھر جب اس کی نظر اٹھی تو وہ آنکھ جھپکنا ہی بھول گیا آج کی دیا اسے وہ گڑیا بالکل نہیں لگ رہی تھی جسے بچپن میں اس نے اپنے ہاتھوں کھلایا تھا اسے اس کا یہ نیا روپ اس قدر پیارا لگا کہ وہ نظریں ہی نہ ہٹا پایا۔ اسے لگا یہی تو وہ چہرہ ہے جسے وہ اب تک ڈھونڈتا رہا ہے اور اسی وجہ سے تو اسے کبھی کوئی چہرہ بھایا ہی نہیں...... اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہوگیا۔ منگنی کی تمام رسمیں بہ حسن وخوبی ادا کی گئیں اس رات وہ دیر تک اپنی قسمت پر رشک کرتا رہا۔ دیا کا وہ روپ اس کی آنکھوں میں ہی کہیں محفوظ ہوکر رہ گیا۔

☆☆☆

عجیب بے کیف سے دن تھے وہ بی سی ایس کے امتحانات کے بعد فارغ تھی سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ ان کی منگنی ہوئے ہفتہ ہوگیا تھا مگر سنی ایک بھی دفعہ اس ہفتے میں ان کے گھر نہیں آیا تھا نہ وہ گئی تھی۔ حالانکہ ان کا گھر فیضان ولا سے کچھ ہی فاصلے پر تھا تو سارا دن آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ سنی بھی دن میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور آتا مگر اب صرف پھپو جان آتیں وہ بہت خوش تھیں کہ دیا ان کی بہو بنے گی اور اس وجہ سے بھی خوش تھیں کہ ان کے اکلوتے بیٹے نے کمال فرمانبرداری سے یہ سب قبول کرلیا تھا۔ وہ اس بات کا برملا اظہار بھی کرتیں جو کہ اسے خاصا ناگوار گزرتا تھا۔ اسے منگنی سے پہلے ہی نوید اور عینا کی باتوں سے اندازہ ہوچکا تھا کہ.... سنی بھائی اس منگنی سے خوش نہیں ہیں اور نہ ہی کرنے کو تیار ہیں مگر اب ان کی رضامندی پر محض پھپو جان کی فرمانبرداری کا لیبل لگا دیکھ کر وہ خود سے بہت الجھتی رہتی، گویا وہ ایک ایسے شخص کی شریکِ حیات بننے جارہی تھی جسے اس شخص نے محض اپنے بڑوں کی.... فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے قبول کیا تھا۔ وہ جتنا سوچتی الجھتی ہی جاتی۔

ایک شام وہ بہت زیادہ بور اور ڈپریس ہوئی تو سوچا پھپو جان کے گھر جاتی ہوں نوید اور افشاں بھی آج سارا دن نہیں آئے تھے۔ ساون کی بہت خوب صورت شام تھی۔ دوپہر میں ہلکی بارش بھی ہوئی تھی موسم بہت خوشگوار تھا۔ نوید کا گھر اُن کے گھر کے سامنے تھا تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں تھی، پھپو جان کچن میں مصروف تھیں افشاں، نوید، کوئی بھی گھر پر نہیں تھا وہ کچن میں پھپو جان کے پاس ہی چلی گئی۔

"بہت اچھا ہوا دیا بیٹا تم آگئیں۔" پھپو جان نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آج کام والی بھی نہیں آئی۔ افشاں بھی گھر پر نہیں اور مجھے ابھی شام کا کھانا بھی بنانا ہے اوپر سے منیب کا ٹیوٹر آیا ہے اسے چائے بنا کر دینی ہے۔" پھپو جان تیزی سے اِدھر اُدھر مسلسل ہاتھ بھی چلا رہی تھیں۔

"جی پھپو ضرور...... آپ مجھے بتائیں میں آپ کی ہیلپ کرتی ہوں۔" اس نے کچھ دھونے والے برتن سنک میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا سب سے پہلے یہ کرو، یہ چائے منیب کے ٹیوٹر ہیں ڈائنگ روم میں انہیں دے آؤ۔"

انہوں نے اسے ٹرے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''لیکن پھپھو جان یہ دوسرا کپ کیوں ساتھ میں......؟'' ٹرے میں چائے کے دو کپ تھے۔

''اوہ، میں یہ بتانا بھول گئی یہ سنی کے لیے ہے۔ وہ ڈرائنگ روم میں ہوگا یا لان میں...... اسے دے دینا۔'' پھپھو جان کا انداز ہنوز مصروف تھا۔ سنی کا نام سن کر وہ ایک لمحے کے لیے وہیں رک گئی۔ اس کا دل نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس کا سامنا کرے پھپھو جان کے ہاں تو کام والی بھی تھی نہیں آج اور نہ ہی افشاں گھر پر تھی اسے ہی کرنا تھا یہ وہ کچھ دیر سوچ کر کچن سے باہر آ گئی کہ چائے کا کپ ہی تو پکڑانا ہے اسے، ڈرائنگ روم میں صرف منیب کے ٹیوٹر تھے وہ شاید لان میں تھا وہ چائے کی ٹرے تھامے دھیرے دھیرے لان کی طرف چل دی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ایک درخت کے پاس کھڑا نہ جانے کن سوچوں میں تھا۔ دیا کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ کچھ دیر وہیں ٹرے ہاتھ میں لیے کھڑی سوچتی رہی کہ اسے کیسے متوجہ کرے اور چائے کا کپ پکڑا کر جائے، وہ بھی سوچوں میں زیادہ ہی محو تھا پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں ہار کر اس نے سوچا کہ نزدیک پڑی ٹیبل پر چائے کا کپ رکھ کر چلی جائے۔ ایک ہاتھ میں ٹرے پکڑے دوسرے ہاتھ سے وہ کپ اٹھا کر ٹیبل پر رکھنے لگی تو توازن برقرار نہ رکھ سکی اور کپ کی چائے اس کے ہاتھ پر اور کپ ٹیبل پر... گرما گرم چائے نے ہاتھ جھلسا دیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی ہلکی سی کراہ پر سنی نے جلدی سے پیچھے دیکھا اور اس کا جھلسا ہوا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگا' جلن کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سنی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جیب سے رومال نکال کر صاف کرنے لگا۔

''زیادہ جلن تو نہیں ہو رہی؟'' اس نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ لائٹ یلو کلر کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ بال کھلے تھے اور چہرے پر آ رہے تھے سنی کھو سا گیا اسے دیکھنے میں...... اور اس کی آنکھوں سے آنسو تو اتر سے بہہ رہے تھے جب سے ان کی منگنی ہوئی تھی سنی کو وہ پہلے والی گڑیا نہیں دیا ہی لگنے لگی تھی۔ ایسا دیا جس نے اس کی زندگی میں ہر طرف عجیب خوشیوں کی روشنی بکھیر دی تھی۔ اس کے خیالات و احساسات اس کے بارے میں بالکل بدل گئے تھے' وہ روزانہ گھنٹوں منگنی کی تصویر دیکھتا رہتا اور اب جب وہ سامنے تھی تو وہ نظریں ہی نہیں ہٹا پا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو اس کے لیے ہمیشہ سے ہی ناقابل برداشت ہوتے تھے وہ اسے روتا دیکھتا تو پاس بٹھا کر آنسو صاف کرتا اور سمجھاتا بھی۔ اس نے آج بھی ایسا کرنا چاہا مگر جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو صاف کرنا چاہے دیا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اور اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر دوسری طرف منہ کر لیا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر کی طرف جانے لگی۔ اس کا دل کر رہا تھا وہ کسی اکیلی جگہ پر جا کر جی بھر کر رو لے...... نہ جانے کیوں اسے بہت رونا آ رہا تھا سو وہ کچھ سوچ کر دوبارہ کچن میں پھپھو جان کے پاس جانے کے بجائے اوپر چھت پر چلی گئی۔ وہاں کھڑی کافی دیر روتی رہی۔ جلے ہوئے ہاتھ کی جلن اور تکلیف سے زیادہ اسے وہ لمحات تکلیف دے رہے تھے جب سنی اور اس کا ایک ہفتے بعد سامنا بھی ہوا تو وہ کوئی بات تک نہیں کر سکی تھی اور سنی کتنا بدلا بدلا محسوس ہوا تھا اسے...... پہلے وہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر بلبلا اٹھتا تھا اور آج صرف اس کے جلے ہوئے ہاتھ اور آنسوؤں کو دیکھتا رہا تھا۔ ان کا رشتہ کتنا بدل گیا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ پچھلا گزرا

ہوا ایک ہفتہ اس کی زندگی سے نکل جائے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ وہ اس سے بہت سی باتیں کرے، وہ روزانہ شام کو ان کے گھر آیا کرے اور اگر ان کا رشتہ اب بدل ہی گیا ہے تو کاش وہ اسے بخوشی قبول ہی کر چکا ہوتا مگر اس کی ناخوشی تو اسی بات سے عیاں ہو رہی تھی کہ وہ اب روزانہ نوید کے گھر آیا کرتا شام کو مگر اُن کے گھر نہیں آتا تھا۔

''شاید وہ کسی اور کو پسند کرتے ہوں؟'' یہ سوچتے ہی اس کے آنسوؤں میں اور روانی آ گئی۔ کافی دیر رو لینے کے بعد جب وہ جانے کے لیے مڑی تو پیچھے کھڑے سنی کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی۔ وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس نے نظریں جھکا لیں اور سائڈ سے ہو کر جانے کے لیے بڑھی تو سنی نے اس کا بازو پکڑ کر پھر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''کیوں رو رہی ہو تم اتنا؟'' سنی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ وہ چپ رہی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو، میں تمہاری آنکھوں میں آنسو کبھی بھی برداشت نہیں کر پایا۔ تو آج اتنا رونے کی وجہ؟'' اس کا لہجہ نرم تھا مگر وہ پھر بھی نظریں جھکائے چپ کھڑی رہی۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں دیا؟'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

''آپ مجھے دیا نہیں گڑیا کہا کرتے تھے۔'' اس نے ایک ہاتھ سے آنسو صاف کرتے اسی کی طرح اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو اس روپ میں نہیں دیکھ سکتی بالکل اسی طرح جس طرح آپ میری آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔'' اس کا لہجہ سنی کو چبھتا ہوا محسوس ہوا، نہ جانے اچانک دیا میں کیسے اتنی ہمت آ گئی تھی کہ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یہ بات کہی اور پھر کہنے کے بعد رکی نہیں تیز تیز قدم اٹھاتی سیڑھیاں اترنے لگی جب کہ وہ اسے جاتا دیکھتا رہا اس بار اس نے اسے روکا نہیں اس کے الفاظ اور انداز سے وہ یہی سمجھ پایا کہ وہ اس نئے بننے والے رشتے کو قبول نہیں کر پائی۔ وہ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد بغیر کسی کو بتائے گھر کی طرف چل دیا۔

''دیا کا رویہ غیر معمولی تھا جیسے وہ مجھ پر طنز کر رہی ہو یا کوئی طعنہ دے رہی ہو مگر کیوں؟'' وہ سوچتے سوچتے الجھ گیا۔ ''اگر وہ ابھی تک اس رشتے کو قبول نہیں کر پائی جبکہ میرے نام سے منسوب ہوئے بھی اسے ہفتہ گزر گیا تو آئندہ کیا ہوگا؟'' وہ انہی سوچوں میں الجھا رہا۔ رات کافی ہو گئی تھی مگر اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کس سے مشورہ کرے کس سے بات کرے اس بارے میں؟ نہ کوئی بہن نہ بھائی بات کرتا بھی تو کس سے؟ مما سے وہ اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس طرح بات بگڑ نہ جائے اور وہ اب اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتا تھا سو اس نے سوچا وہ ایک دفعہ خود دیا سے بات کرے گا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟

رات ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ اس نے دیا کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔ بار بار کال کرنے کے باوجود اس نے ریسیو نہیں کی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اب اس کی یہی روٹین ہوتی سارا سارا دن سوئی رہتی اور پھر رات کو کافی دیر تک اکیلی ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھتی رہتی۔ آج بھی وہ ایک نئی فلم دیکھ رہی تھی کہ موبائل بجنے لگا۔ اس نے

نمبر دیکھ کر پھر رکھ دیا اور مووی دیکھنے لگی موبائل کچھ دیر اور بجتا رہا اور وہ آرام سے صوفے پر نیم دراز مووی دیکھتی رہی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ٹی وی لاؤنج میں پڑے ٹیلی فون سیٹ پر کال آنے لگی۔ سب اپنے اپنے رومز میں سو رہے تھے اس نے یہ سوچ کر کہ کوئی ضروری اطلاع ہی نہ ہو۔ ریسیور اٹھالیا، دھیمی سی آواز میں کہے گئے ہیلو پر سنی کو یہ اندازہ کرنے میں مشکل نہ ہوئی کہ دوسری طرف کون تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے دیا۔ تم میری کال کیوں ریسیو نہیں کر رہی؟'' سنی کا لہجہ شاید کینشن کی وجہ سے کرخت ہوگیا۔

''سوری، وہ سیل سائلنٹ پر تھا۔'' اسے سنی کے لہجے کی گرمی کی وجہ سے جھوٹ بولنا پڑا۔ جواباً سنی کچھ دیر خاموش رہا۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوا۔

''جی کہیے......'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیا تم اس رشتے سے خوش نہیں؟'' سنی نے رکے رکے لہجے میں سوال کیا۔

''اور اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو......؟'' کچھ دیر سوچنے کے بعد جواباً اس نے بھی سوال داغا۔

''میری بات چھوڑو، تم اپنی بات کرو۔'' وہ جو پہلے ہی الجھا ہوا تھا الجھن بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

''اگر تم خوش نہیں تو ابھی بھی کوئی حل ہوسکتا ہے لیکن پلیز جو چاہتی ہو کھل کر بتادو۔'' اس کے لہجے میں نرمی در آئی۔

''اگر میں کہہ دوں کہ خوش نہیں تو آپ کیا کریں گے؟'' دیا کے لہجے سے معصومیت عیاں تھی

مگر ایک دم سنی کو لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دیا سے کہہ دے کہ وہ اب یہ رشتہ کبھی ختم نہیں کروانا چاہتا، وہ تو اس کی زندگی ہے اب مگر وہ ایسا کچھ بھی نہ کہہ پایا۔

''تو میں یہ رشتہ ختم کروادوں گا۔'' اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی میں سے آتی محسوس ہوئی۔ جواباً دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔

''تو یوں کہیے نا سلمان احمد صاحب! آپ کو اگر یہ رشتہ ختم ہی کروانا ہے تو اس کا جواز آپ میری ناخوشی میں کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟'' دیا نے غصیلے لہجے میں کہا تو اس کو یہ آواز ہتھوڑے کی طرح اسے اپنے دماغ پر برستی ہوئی محسوس ہوئی۔ کتنا طنز آمیز، اور غصیلہ لہجہ تھا اس کا۔ ابھی وہ اس کشمکش میں ہی تھا کہ کیا جواب دے اسے مگر وہ کھٹاک سے ریسیور پٹخ چکی تھی وہ جو الجھن سلجھانے نکلا تھا اور الجھ گیا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے...... مگر اس کی باتوں سے یہ بات واضح ہوگئی تھی اس پر کہ وہ سمجھ رہی ہے وہ بھی اس رشتے سے خوش نہیں ہے اور وہ اسے بتا بھی نہیں پایا تھا کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔

☆☆☆

''تو یار اس میں کیا تھا تو اسے بتادیتا کہ تم تو بہت خوش ہو اب اس رشتے سے۔'' دوسرے دن قیصر اسے آفس میں ملنے آیا تو ساری بات سن کر بولا۔

''کیا یار، تیرے خیال میں اسے یہ سب بتانا بہت آسان ہے؟'' اس کا لہجہ جھنجلایا ہوا تھا۔

''تو کیا بہت مشکل ہے؟ مجھے دیکھ کسی بھی لڑکی کے سامنے لے جاکر کھڑا کردے، آنکھیں بند کر کے جو تو کہے گا بول دوں گا۔ کیا سمجھے؟'' اس نے اپنی خوبی اس پر جتاتے ہوئے کہا۔

''ہاں سمجھ گیا...... تو نے تو پی ایچ ڈی کر رکھی ہے ان کاموں میں مگر میں نہیں کہہ سکتا اس سے ایسا کچھ۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

''تو پھر کیا کرنا ہے تجھے؟ یار اب ایسا کوئی میڈیکل ٹیسٹ بھی ایجاد نہیں ہوا کہ تو وہ کروالے اور رپورٹ میں آجائے کہ تجھے اس سے محبت ہوگئی ہے اور تو وہ رپورٹ بھجوادے اسے۔ یار کچھ تو کرنا پڑے گا تجھے؟'' قیصر نے چڑ کر اس سے کہا اور وہ بھی سوچنے لگا کہ واقعی کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

☆☆☆

ساون اپنے جوبن پر تھا بارشیں ہوتیں تو ہر طرف کا سماں نکھر سا جاتا اور سب کچھ سہانا لگنے لگتا مگر اب کی بار کا ساون دیا اور سنی کے لیے بہت بڑے امتحان سے کم نہ تھا۔ دونوں بہت الجھے ہوئے تھے۔ دیا ضرور اس رشتے کو قبول کر لیتی اگر اسے یقین ہوتا کہ سنی نے اسے دل سے قبول کرلیا ہے مگر اسے غصہ تھا تو اس بات پر کہ وہ خوش بھی نہیں ہے تب بھی صرف بڑوں کی فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی زندگی اور خوشیوں کو داؤ پر لگادیا تھا۔ سب کے سامنے تماشا بنا کر رکھ دیا تھا اسے اور اب اس کی ناخوشی میں انکار کا جواز ڈھونڈ رہا ہے اسے کبھی بھی اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ایسا بھی کرسکتا تھا اس کے ساتھ۔ روز بروز اس کی بدگمانیاں بڑھتی جارہی تھیں اور اسے نفرت سی محسوس ہورہی تھی اس سے۔ دوسری طرف سنی اس کی بدگمانیوں کی وجہ سے بہت الجھن میں تھا اور موقع کی تلاش میں تھا کہ اس سے بات کلیئر کرسکے کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ بظاہر ان کے گھر جانے پر اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی مگر وہ خود ہی نہیں جا پاتا عینا اور ارشا بھی کئی دفعہ کال کرچکی تھیں۔

''بھائی اب آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟'' مگر وہ ٹال جاتا اور اب جب اسے دیا سے بات کرنے کا کوئی چانس نظر نہیں آرہا تھا تو وہ ایک دن شام کو ان کے گھر چلا گیا۔ ماموں، ممانی، عینا اور ارشا سبھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر دیا سے بات کرنا تو در کنار اس کا سامنا بھی نہ ہوسکا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی دفعہ ان کے گھر گیا مگر اس کے جاتے ہی وہ اپنے روم میں بند ہوجاتی اور پھر جتنی دیر وہ بیٹھا رہتا وہ نظر نہ آتی تھک ہار کر اسے ایک دن پھر اس کو کال کرنا پڑی۔

''دیا مجھے نہیں اندازہ تمہیں میرا کال کرنا برا لگا ہے یا اچھا لیکن میں تم سے کلیئر بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے گلا صاف کر کے بات شروع کی۔ ''لاسٹ ٹائم جب تم سے بات ہوئی تھی تو تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری ناخوشی میں انکار کا جواز ڈھونڈ رہا ہوں، میں یہ بات تم پر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں ناخوش ہوں اور نہ مجھے انکار کا جواز ڈھونڈنے کی ضرورت ہے، اب تم کائنڈلی بتاؤ کیا چاہتی ہو؟ ہوگا وہی جو تم چاہوگی۔'' اتنا کہنے کے بعد وہ چپ ہوگیا۔ دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔

''تو کیا آپ خوش ہیں اس رشتے سے؟'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''جی ہاں! میں خوش ہوں۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''مگر مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے اور رہے گی۔'' کچھ توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''تو پھر آپ سن لیجیے کہ آپ اس رشتے سے خوش بھی ہوں تب بھی میں خوش نہیں، میں سمجھ سکتی ہوں آپ کی خوشی کو...... آسانی سے آپ دے سکتے ہیں کسی کے لیے بھی کوئی بھی قربانی لیکن میں یہ جھوٹا

ڈراما نہیں کرسکتی سوری، آئی ایم رئیلی ویری سوری......" اس نے یہ کہہ کر ایک مرتبہ پھر کال کینسل کردی اور سنی کا دل کہہ رہا تھا کہ سر پھوڑ لے آخر وہ اسے کیسے سمجھائے کہ یہ کوئی ڈراما نہیں اب اس کی خواہش ہے، زندگی کا حاصل ہے۔

دیا کو نہ جانے کیا ہوگیا وہ کچھ بھی سوچ سمجھ نہیں پا رہی تھی بس ایک ہی بات اس کے دل و دماغ پر سوار ہوچکی تھی کہ وہ یہ شادی کبھی نہیں کرے گی جس طرح سنی نے بڑوں کی مرضی پر سر جھکا کر یہ فیصلہ منظور کیا تھا اسے قابلِ قبول نہیں تھا مگر وہ کیا کرسکتی ہے یہ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اب جب بھی کبھی سنی سے بات ہوتی ہے تو اس کا لہجہ کیوں عجیب سا ہوجاتا ہے...... حالانکہ وہ اسے بہت عزیز تھا۔ اس جیسے کیئرنگ انسان کے ساتھ زندگی گزارنا تو کسی بھی لڑکی کا خواب ہوسکتا ہے پھر بھی نہ جانے کیوں وہ خود کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔

دل و دماغ میں ایک ہی بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کمپرومائز کررہا ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک دفعہ جب اس کی فرینڈز نے سنی کو اس کے گھر دیکھا تھا تو کتنی تعریفیں کی تھیں اس کی پرسنالٹی ہی ایسی تھی کہ جو دیکھتا تھا کھنچ سا جاتا پھر سب کی دلعزیز بھی۔ جب سے ان کی منگنی ہوئی تھی وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی کیونکہ اب بھی پہلے کی طرح سنی اور سب کزنز مل کر خوب ہلا گلا کرتے مگر وہ صرف اپنے روم میں بیٹھی رہتی۔ جس سے سنی کو اور الجھن محسوس ہوتی کہ پتا نہیں آخر اسے ہوا کیا ہے؟ اس کا اس کے ساتھ یہ رویّہ ناقابلِ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابلِ برداشت بھی تھا۔

آخر ایک دن اسے یہ موقع مل گیا کہ وہ اس سے بات کرسکے۔ حسبِ معمول وہ اس شام ان کے گھر گیا تو ممانی جان، عینا اور ارشا کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں اور ماموں جان آفس سے نہیں لوٹے تھے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی اور خلافِ توقع لان میں آنکھیں بند کیے چیئر پر جھول رہی تھی۔ اس کی گاڑی کے آنے کی آواز سن کر اٹھ کھڑی ہوئی چونکہ وہ گھر میں اکیلی تھی سو چائے کا بھی پوچھنا پڑا۔ وہ وہیں لان میں پڑی چیئر پر بیٹھ گیا پھر جب وہ چائے لے کر آئی اور پکڑا کر جانے لگی تو اس نے اسے آواز دے کر بیٹھنے کو کہا اور وہ وہیں بیٹھ گئی پھر کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد دیا نے اس پر واضح کردیا کہ وہ اس رشتے کو دل و دماغ سے قبول کرنے سے بالکل قاصر ہے مگر انکار بھی نہیں کرسکتی۔ شاید وہ اسے کچھ کہتا اور سمجھاتا بھی مگر اس کی رضا و رغبت اسے بے حد عزیز تھی۔ اس لیے مزید کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

ساری رات وہ بہت الجھا رہا انکار تو وہ بھی نہیں کرسکتا تھا اگر کرسکتا ہوتا تو شاید منگنی ہی نہ ہوتی۔ وہ ساری رات جاگتا رہا دیا کی منگنی کی تصویریں دیکھتا رہا۔ اسے اس کے بچپن کے واقعات یاد آرہے تھے کہ کس طرح آسانی سے وہ اس کی ہر بات ہنسی خوشی مان لیا کرتی تھی مگر اب وہ کتنا بدل گئی تھی۔ وہ واقعی وہ گڑیا نہیں رہی تھی آخر اس ساری رات جاگنے اور سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کرلیا اور پھر اس نے ناشتے کی ٹیبل پر ہی مما کو بتادیا کہ وہ تین ماہ کے لیے ملک سے باہر جارہا ہے بزنس کے سلسلے میں۔ مما جان اسے چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکیں وہ بہت چپ چاپ رہنے لگا تھا سنجیدہ سا اور پھر مما نے یہ خبر باری باری سب تک پہنچادی۔ جس جس کو پتا چلا حیران و

پریشان رہ جاتا کیونکہ سنی کبھی بھی اس سے پہلے اس طرح کے بزنس ٹور پر نہیں گیا تھا۔

نوید کے ساتھ سنی کی کافی بنتی تھی ان دونوں کی عمروں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا کہ دیا اور اس کی عمر میں۔ وہ دیا کا ہم عمر تھا دیا سے کافی دوستی بھی تھی اور سنی بھائی کے بھی سب کزنز سے زیادہ قریب تھا۔ اس کو سنی بھائی کی اس قدر اداسی اور یوں اچانک بزنس ٹور پلان کرنا عجیب لگ رہا تھا اور پھر سنی بھائی کی تیاریاں بھی عجیب سی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ تین ماہ نہیں تین سال کے لیے کہیں جارہے ہوں۔ بہت چپ چپ، اداس اور غمزدہ لہجے میں وہ اس سے باتیں کرتے کہ میرے بعد سب کا خیال کرنا، مما جان کو میری کمی محسوس نہ ہونے دینا اور ماموں اور ممانی جان کے ساتھ ساتھ ان کی تینوں بیٹیوں کو بھی کوئی کمی محسوس نہ ہونے دینا وہ ان کی اداسی دیکھ کر کھو سا جاتا مگر کچھ پوچھ یا کہہ نہ پاتا۔

☆☆☆

پھپھو جان نے جب سے سنا تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا انہیں تین ماہ کے لیے چھوڑ کر بزنس ٹور پر جارہا ہے تو ان کی طبیعت خراب تھی۔ شاید وہ یہ سوچ کر ٹینشن لے رہی تھیں کہ وہ یہ تین ماہ اس کے بغیر کیسے گزار پائیں گی۔ ان کی ناسازیِ طبیعت کا سن کر دیا کے گھر والے سب خبر گیری کے لیے گئے تو پھپھو جان نے دیا کے بابا سے کہا وہ کچھ دن کے لیے عینا کو ان کے پاس رہنے دیں، چاہتی تو وہ دیا کو تھیں اپنے پاس رکھنا مگر دیا کا انداز اور رویّہ دیکھ کر کہہ نہ پائیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے عینا فری تو تھی ہی مان بھی گئی۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی پھپھو جان بیمار ہوتیں تو وہ دیا کو کچھ دن اپنے پاس روک لیا کرتی تھیں دیا ان کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ دلجوئی بھی کرتی تو وہ چند ہی دنوں میں ٹھیک ٹھاک ہوجاتیں۔

اب یہی کام عینا کو کرنا تھا، وہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھتی۔ ٹائم پر میڈیسن دیتی کھانا تیار کرواتی، انہیں کھلاتی اور واقعی کچھ ہی دنوں میں پھپھو جان دوبارہ ہشاش بشاش نظر آنے لگیں۔

ایک دن دوپہر کو وہ میڈیسن لے کر آرام کررہی تھیں کہ عینا کو ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ سلمان احمد صاحب کے ایک دوست بیگم صاحبہ کی خیریت دریافت کرنے آئے ہیں اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا ہے سنی بھائی تو گھر پر تھے نہیں اور پھپھو جان آرام کررہی تھیں اس نے سوچا میں ہی جا کر دیکھ لیتی ہوں کہ کیا کام ہے۔ یہ سوچ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ آنے والا قیصر تھا۔ عینا نے انہیں بتایا۔

"پھپھو جان آرام کررہی ہیں اور سنی بھائی گھر پر نہیں ہیں۔" وہ چائے یا کافی پوچھ کر جانے لگی تو قیصر نے ایکسکیوزمی کہہ کر اسے روک لیا۔

"کہیں آپ وہی ظالم حسینہ تو نہیں ہیں جس کی وجہ سے میرا اکلوتا اور جگری دوست بزنس کا بہانہ کر کے ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر جارہا ہے؟" اس نے کھڑے ہوکر مودب لہجے میں عینا سے پوچھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ سنی بھائی ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر جارہے ہیں؟" عینا کو ڈرائنگ روم کی چھت گھومتی دکھائی۔

"جی ہاں، ہمیشہ کے لیے...... وہ جسٹ بزنس کا بہانہ کررہا ہے اگر وہ اب چلا گیا تو کبھی شاید ہی واپس آئے۔" قیصر کا یہ انکشاف عینا کا دل دہلا گیا اور وہ صوفے پر ڈھے گئی۔ قیصر نے جلدی سے پانی کا گلاس اسے دیا۔ دو گھونٹ پینے کے بعد اس نے دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا۔ قیصر نے اس سے

پوچھا کہ اس کا سنی سے کیا رشتہ ہے۔

''تو آپ براہِ کرم اپنی ہمشیرہ صاحبہ کو سمجھائیں کہ وہ میرے دوست کی حالتِ زار پر نظرِ کرم فرمائیں۔'' سنی سے اس کا رشتہ معلوم ہوجانے پر قیصر نے کہا پھر عینا کچھ سوالات کے بعد سارا معاملہ سمجھ گئی۔

قیصر نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ سنی کو نہیں بتائے گی کہ وہ سب بتا چکا ہے... اور نہ اس کی مما جان کو کچھ بتائے گی کیونکہ ان کی طبیعت پہلے ہی سے ناساز ہے۔ عینا کے یقین دلانے کے بعد وہ وہاں سے چل دیا مگر عینا تھی کہ سنبھل ہی نہیں پا رہی تھی۔

بھائی جان انہیں یوں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیسے کرسکتے ہیں؟ وہ سب کیسے رہ پائیں گے سنی بھائی کے بغیر؟ سوچ سوچ کر اس کا سر چکرانے لگا۔ بار بار کچھ سوچتے ہوئے آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ابھی وہ وہیں ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھی تھی کہ نوید اور افشاں آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا اپنے آپ کو سنبھالنا پھر جب نوید اور افشاں کو اس نے ساری بات بتائی تو ان کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ بھائی جان انہیں تھے ہی اتنے عزیز کہ ان کے بغیر رہنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان تینوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھائی جان سے اس معاملے میں بات ضرور کریں گے۔

اسی شام جب سنی بھائی گھر آئے تو ان تینوں نے ان سے بات کی مگر سنی بھائی ہنس کر ٹال گئے۔

''وہ قیصر تو ہے ہی پاگل، دماغ خراب ہے اس کا میں دیکھ لوں گا اسے مگر تم لوگ تسلی رکھو ایسی کوئی بات نہیں ہے میں بزنس کے سلسلے میں کچھ ہی مہینوں کے لیے جا رہا ہوں وہ بھی انتہائی ضرورت کے تحت... اس قیصر کی تو عادت ہے بے پر کی چھوڑ کر دوسروں کی پریشانی کو انجوائے کرنا۔'' سنی بھائی نے بہت نرم لہجے میں انہیں سمجھایا اور ساتھ میں کسی اور کو نہ بتانے کی درخواست بھی کی۔ ان تینوں کی تسلی تو نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی چپ رہے۔

پھپھو جان کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر تھی۔ ایک شام وہ سب پھپھو جان کے ہاں اکٹھے ہوئے تو باہر کھانا کھانے کا پلان بن گیا۔ عینا، ارشا، افشاں، نوید، منیب، سنی بھائی بھی تو تھے مگر دیا بدستور اپنے روم میں بند تھی۔ وہ پہلے بھی اکثر اکٹھے گھوما پھرا کرتے باہر کھانا کھاتے مگر منگنی کے بعد ان کا یہ پلان پہلی دفعہ بنا تھا۔ اچانک سنی... کو خیال آیا کہ آج وہ شاید نہ جائے تو اس کا بھی دل نہ کیا کہ وہ بھی جائے مگر باقی سب کی طرف دیکھ کر وہ جانے کے لیے تیار ہوگیا وہ سب جا کر دیا کو بھی لے آئے جبکہ سنی لان میں ٹہلتا رہا وہ سب گاڑی میں بیٹھ چکے تھے، سنی ذرا... ماموں جان سے کچھ بزنس کے بارے میں ڈسکس کر رہا تو لیٹ ہوگیا جب تک وہ آیا نوید ان کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور ساتھ میں دیا تھی۔ فرنٹ سیٹ پر باقی کچھ لوگ پیچھے والی گاڑی میں تھے۔ سنی کے آتے ہی نوید نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ دی۔

''آپ سنی بھائی اپنی گاڑی سنبھالیں، میں پیچھے والی آفات کو لے کر آتا ہوں۔'' وہ ایک جست میں گاڑی سے باہر تھا جبکہ دیا جو پہلے ہی بہت مشکل سے جانے کے لیے تیار ہوئی تھی اور زبردستی نوید نے اسے اس سیٹ پر بٹھا رکھا تھا۔ ایک دم اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ دل تو اس کا کیا کہ یہیں... اتر جائے یا نوید کو کچا کھا جائے مگر وہ شاید ہی کچھ کر پاتی۔ سب پیچھے والی گاڑی میں آ رہے تھے

اور وہ دونوں اس گاڑی میں اکیلے تھے۔ دیا کو عجیب سی گھٹن محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا۔ وہ ڈور کھولے باہر تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کرپایا نہ کہہ پایا۔ نوید جو کہ پیچھے والی گاڑی میں تھا اس کے پاس آ کر قہر آلود نظروں سے پہلے اسے گھورا اور پھر عینا اور افشاں سنی بھائی کی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ دیا نے تو یہ تک کہا کہ وہ جا ہی نہیں سکتی اس کے سر میں درد ہے مگر نوید نے زبردستی اپنے والی گاڑی میں بٹھا لیا۔ باقی وہ سب چپ چاپ رہے۔ سنی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے دیا کی اس حرکت نے اسے سب کے سامنے بہت چھوٹا کر دیا ہو۔

عینا، افشاں اور سب سے بڑھ کر نوید شرمندہ تھا کہ اس نے ہی تو اسے اس سیٹ پر بٹھایا تھا۔ ریسٹورنٹ پہنچ کر بھی وہ سب ایسے ہی چپ چاپ تھے جبکہ وہ جب پہلے آیا کرتے تو خوب ہلا گلا کرتے تھے اب وہ چپ چاپ عینا، افشاں، نوید اور دیا ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے جبکہ ارشا، منیب اور سنی بھائی دوسری ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے نوید سوچ رہا تھا کہ آج وہ گھر جا کر دیا سے خود دوٹوک بات کرے گا۔ عینا کے بھی یہی خیالات تھے۔ بہت غصہ تھا انہیں اس پر۔ ابھی وہ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ایک ماڈرن سی کیوٹ سی لڑکی سنی بھائی کی ٹیبل کے پاس آ کر پوچھنے لگی۔

''کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتی ہوں؟'' سنی بھائی کی ٹیبل پر ایک سیٹ خالی تھی۔ سنی نے ایک لمحے کے لیے کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی کیوں نہیں، بیٹھیے پلیز۔'' اور وہ سنی کے سامنے والی چیئر پر بیٹھ گئی۔

''مائی نیم از شزا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے

اپنا تعارف کروایا جواباً سنی نے بھی اپنا اور منیب، ارشا کا تعارف کروایا۔ اب ٹیبل کی ایک طرف منیب اور ارشا جبکہ دوسری طرف سنی اور وہ لڑکی آمنے سامنے بیٹھے تھے جبکہ دیا لوگوں کی ٹیبل ان کی ٹیبل سے پہلے والی تھی اور دیا اس سائڈ پر بیٹھی تھی کہ سنی والی ٹیبل بہ خوبی نظر آ رہی تھی کچھ ہی دیر میں وہ لڑکی اور سنی بھائی کافی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ ہر دو منٹ بعد ان کی ٹیبل پر زوردار قہقہہ نمودار ہوتا۔ جو دیا لوگوں کی ٹیبل پر پہنچتا تو اس کا رنگ فق ہو جاتا۔ سنی اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی برت رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ دیا نے کھانا چھوڑ دیا اس کی نظریں ان کی ہی ٹیبل پر جم گئی تھیں جبکہ سنی بالکل بھی اردگرد نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا وہ اس لڑکی کو بازو سے پکڑ کر ریسٹورنٹ سے ہی باہر نکال دے۔ زہر لگ رہا تھا اسے سنی بھائی کا اس طرح بے تکلفی سے اس سے پیش آنا۔ پتا نہیں ہو کیا گیا تھا پہلے تو کبھی بھی کسی لڑکی سے یوں باتیں کرتے انہیں نہیں دیکھا تھا کسی نے اور آج تو وہ حد کر رہے تھے۔ دیا جو سب کچھ دیکھ رہی تھی عجیب سا محسوس ہو رہا تھا جو کہ اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیوں ہو رہا ہے۔ وہ کھانا چھوڑ کر ویسے ہی ہاتھ میں چمچ پکڑے اُدھر دیکھے جا رہی تھی۔ ایک اور بہ آواز بلند قہقہہ جو اس کی ٹیبل پر پہنچا تو اس نے چمچ بھی پلیٹ پر پٹخ دیا۔

"میرے سر میں درد ہے، مجھے گھر جانا ہے۔" اس نے نوید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو آئے ہیں کھانا تو کھانے دو۔" عینا نے نوید کی جگہ اسے جواب دیا اور دونوں نے ایک ہی وقت میں کھلکھلا کر باتیں کرتے سنی بھائی اور اس لڑکی کی طرف دیکھا پھر عینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھو افشاں کیسے لٹو ہو رہی ہے سنی بھائی پر۔"

"وہ لٹو ہو رہی ہے یا سنی بھائی۔" دیا نے زیرِ لب کہا جسے کوئی سن نہ سکا۔

"ہمارے سنی بھائی کی پرسنالٹی ہی ایسی ہے جو دیکھتا ہے یا ملتا ہے انہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔" افشاں نے بھی جلتی پر تیل ڈالا۔

"میں نے کہا مجھے گھر جانا ہے۔" دیا نے کم و بیش چیخنے کے انداز میں کہا جسے دوسری ٹیبل پر بیٹھے سنی نے بھی سنا ایک سنجیدہ نظر اس پر ڈال کر وہ دوبارہ کھانے اور باتوں میں لگ گیا اور دیا چپ کر کے بیٹھی رہی پھر کچھ دیر بعد دیا نے وہی جملہ دُہرایا کہ اس کے سر میں شدید درد ہے۔ اسے گھر جانا ہے۔ نوید نے اس دفعہ سنی بھائی کی ٹیبل کی طرف مڑتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"سنی بھائی کتنی دیر ہے؟"

"بس دس پندرہ منٹ تک۔" انہوں نے کہا اور دوبارہ خوب کھلکھلاتے ہوئے باتوں میں لگ گئے۔ دیا کو شدید غصہ تھا کہ وہ اسے کتنا اگنور کر رہے ہیں۔ کبھی کہا کرتے تھے کہ وہ سنی بھائی کی چہیتی ہے۔ سنی بھائی اس کی کوئی بات ٹال جائیں ممکن ہی نہیں ہوتا تھا مگر اب...... اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ انتظار کے بعد وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس کے ساتھ عینا، افشاں اور نوید کو بھی اٹھنا پڑا مگر سنی بھائی اب بھی اس لڑکی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف اپنی ٹیبل پر بیٹھے رہے۔ وہ تینوں ان کی ٹیبل کے پاس جا کر کھڑے ہوئے تو سنی بھائی کو بھی چارو ناچار اٹھنا پڑا۔ انہوں نے اٹھنے کے بعد سب کا اس سے تعارف کروایا۔ سب کے نام بتائے اس لڑکی کو اور رشتے بھی مگر وہ جو کہ پیچھے کھڑی تھی شاید

سنی بھائی کو نظر ہی نہیں آئی۔

"اور یہ ہیں دیا مری سسٹر اور ان کی فیانسی۔" آخر عینا نے اس کا تعارف کروایا۔

"اوہ، سنی آپ کی فیانسی تو بہت پیاری ہیں اور خوش قسمت بھی کہ آپ ان کے فیانسی ہیں۔" اس لڑکی نے سنی بھائی اور دیا کو خوب گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی جوڑی بہت شاندار ہے۔ بہت چارمنگ پرسنالٹی ہے آپ کے فیانسی کی۔" اس لڑکی نے دیا سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو وہ بہ مشکل ہی مسکرائی اس کے بعد کچھ دیر اور وہ سب باتیں کرتے رہے اور پھر وہ آ کر سب سے پہلے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے بعد باقی سب آ گئے مگر سنی بھائی اور وہ لڑکی ابھی بھی شاید الوداعی کلمات ادا کرنے میں بزی تھے۔ سنی بھائی نے اسے اپنا وزٹنگ کارڈ دیا جواباً اس نے بھی انہیں شاید اپنا کنٹیکٹ نمبر دیا پھر کچھ دیر بعد سنی بھائی بھی آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور وہ لڑکی وہیں کھڑی کافی دیر ہاتھ ہلاتی رہی۔ دیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کرے کیا۔ وہ چپ چاپ بظاہر بیٹھی تھی مگر اندر کہیں عجیب سا طوفان تھا۔ گھر جاتے ہی اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اپنا کمرا لاک کر کے جی بھر کے روئے مگر عینا، افشاں اور نوید نے اسے پکڑ لیا کہ انہیں اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

"دیا تم چاہتی کیا ہو، آج تم نے کیا کیا سنی بھائی کے ساتھ؟" سب سے پہلے نوید نے بات شروع کی۔

"تمہارا کیا خیال ہے سنی بھائی کو لڑکیوں کی کمی ہے کوئی، ایک سے بڑھ ایک لڑکی مل سکتی ہے انہیں۔" عینا کو بھی شدید غصہ تھا۔

"اور تمہارا یہ رویّہ...... ہماری برداشت سے باہر ہے ان کے ساتھ... تم آج بتا دو کہ آخر چاہتی کیا ہو؟" افشاں نے آخری بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ چپ چاپ سب کی سنتی رہی۔

"میں ان سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی۔ اگر آج تم لوگ یہی معلوم کرنے آئے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں تو سن لو سب۔ میں انہیں اسے رشتے میں دل و دماغ سے قبول کر ہی نہیں سکتی۔" کچھ دیر بعد اس نے جواب دیا۔

"آخر کیوں، کوئی وجہ؟" نوید نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وجہ ان سے پوچھ سکتے ہیں آپ لوگ۔" اس نے تڑخ کر جواب دیا۔

"کیا پوچھیں ان سے...... ہاں بتاؤ، کیا بات کریں ان سے ہم؟ تمہاری انہی باتوں اور حرکتوں

کی وجہ سے ملک تک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا انہوں نے اور تم کیا کروانا چاہتی ہو۔" عینا کا لہجہ درشت تھا۔

"اور ایک بات تم یاد رکھنا دیا اگر ہمارے سنی بھائی تمہاری وجہ سے ہم سے دور ہوگئے تو ہم سب تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ تم اکیلی ہو اور مزید رہ جاؤ گی اگر سنی بھائی ہمیں چھوڑ کر ملک سے باہر چلے گئے تو سمجھیں تم!" نوید نے ایک ایک بات پر زور دیتے ہوئے کہا اور اس کے بعد وہ سب اسے چھوڑ کر چلے گئے صرف عینا کھڑی رہی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد دیا صوفے پر ڈھے کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ عینا اس کے پاس بیٹھی رہی۔

"دیا پلیز روؤ نہیں۔ مجھے بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" عینا اس کے چہرے سے اس کے ہاتھ الگ کرتے ہوئے بولی وہ کچھ دیر اور روتی رہی پھر دھیرے سے گویا ہوئی۔

"عینا مجھے بھی وہ اتنے ہی عزیز ہیں جتنے تم سب کو ہیں۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہے میں ان کے بغیر رہ لوں گی۔ میں منگنی کے بعد سے کیسے رہ رہی ہوں شاید تم لوگ سمجھ ہی نہ پاؤ۔ کیا تمہیں نہیں پتا کہ میں تو ان کا نام لے کر جیتی تھی مگر اب نہ وہ میرے سنی بھائی رہے نہ کچھ اور بن سکے میں......" وہ کچھ دیر کے لیے رکی۔ "میں کیسے برداشت کرلوں کہ کوئی بھی شخص مجھے محض اس لیے قبول کرلے کہ یہ اس کے بڑوں کا وہ حکم ہے جسے وہ ٹال نہیں سکتا۔ تم سب لوگوں کو باقی سب کچھ نظر آرہا ہے مگر مجھے کوئی نہیں سمجھ رہا۔" خوب رو لینے کے بعد اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

پھر عینا کو سمجھ میں آگیا اس کا مسئلہ۔ اس نے دیا کو اپنی اور سنی بھائی کے دوست قیصر سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا اور وہ سب بھی جو قیصر نے اسے بتایا تھا کہ سنی بھائی تو خوش ہیں انہیں اب اسے بے حد چاہنے لگے ہیں اور وہ بھی جو اس نے ایک دن سنی بھائی کے روم کی صفائی کرتے ہوئے ان کی ڈائری سے پڑھا تھا اور اس لیٹر کے بارے میں بھی بتایا جو سنی بھائی نے اس کے نام لکھ کر رکھا ہوا تھا اور ملک چھوڑتے وقت اسے دے کر جانا ہے۔ سب بتادینے کے بعد عینا نے اس سے درخواست کی کہ وہ سنی بھائی کو ملک سے باہر جانے سے روک لے کیونکہ قیصر انہیں یقین دلا چکا تھا کہ اگر اب وہ چلے گئے تو شاید ہی کبھی واپس آسکیں اور یہ بھی کہ انہیں اگر کوئی روک سکتا ہے تو وہ صرف دیا ہی ہوسکتی ہے۔ یہ سب سن لینے کے بعد دیا دل ہی دل میں خوش بھی تھی کہ اس کی گستاخیوں اور غلطیوں کے باوجود بھی سنی اس کو ایسے ہی عزیز رکھتے ہیں جیسے وہ کبھی تھی ان کے لیے اور پریشان بھی تھی کہ انہوں نے کتنا بڑا فیصلہ کرلیا ہے اور الجھ بھی گئی کہ وہ انہیں روکے کیسے۔

ان کے جانے میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ افشاں، نوید اور عینا سب بار بار اس کی منتیں کررہے تھے کہ وہ کچھ کرے اور دھمکا بھی رہے تھے کہ اگر سنی بھائی چلے گئے تو وہ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ پھپھو جان کی طبیعت الگ خراب تھی مگر وہ تھی کہ سمجھ ہی نہیں پارہی تھی کہ کیا کرے، کس طرح ان سے بات کرے؟ اسی سوچ بچار میں ایک دن اور گزر گیا۔ عینا اور نوید لوگوں نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی۔ وہ سنی بھائی کو خود بھی روکنے کی کوشش میں تھے مگر سنی بھائی مسلسل ٹال رہے تھے۔

اس شام بھی جب سنی بھائی ان کے گھر آئے تو وہ سب ان سے بہت کہتے رہے مگر وہ بضد تھے کہ جائیں گے۔ کل ہی تو ان کی فلائٹ ہے وہ اب نہیں رک سکتے مگر دلاسے ضرور دے رہے تھے کہ وہ جلد واپس آجائیں گے۔

دیا اب بھی ان میں نہیں تھی۔ وہ رات گئے تک باتوں میں لگے رہے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ جانے لگے تو باہر بارش شروع ہوگئی۔ افشاں، نوید اور منیب نے تو ماموں جان کے ہاں ہی رات ٹھہرنے کا پلان بنالیا مگر وہ مماجان کی وجہ سے نہیں رک سکتے تھے۔ انہیں اپنے گھر جانا ہی تھا مگر وہ جب جانے کے لیے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ لان میں بیٹھا کوئی رو رہا ہے۔ وہ اس سمت...... گئے جہاں سے سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں آرہی تھی تو دیکھا کہ بارش میں بیٹھی دیا آنکھیں موندے چیئر پر بیٹھی...... روئے جارہی تھی۔ وہ دھیرے سے اس کے پاس جاکر رک گئے۔ گیلے بالوں نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ کھڑے اسے دیکھتے رہے۔

"دیا۔" بہت دھیمے لہجے میں انہوں نے اس کا نام پکارا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"آپ...... آپ چھوڑ کر جارہے ہیں مجھے؟" وہ ایک دم کھڑی ہوئی تھی۔ "آپ کو ذرا بھی خیال نہیں میرا کہ میں کیا کروں گی آپ کے بغیر......؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں مجھے پھر بھی آپ کب سے اتنے بے حس ہوگئے، بولیں؟" وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر پھٹ پڑی۔ آنسو مسلسل جاری تھے۔ ہچکیوں میں کہے گئے اس کے الفاظ سن کر سنی کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

"آپ نہیں چھوڑ کر جاسکتے مجھے۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گی کبھی نہیں۔" شاید اسے خود سمجھ نہیں تھی کہ وہ کیا بول رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ چکرا کر چیئر پر گری تھی اور جیسے ہی سنی نے اسے تھامنے کے لیے ہاتھ پکڑنا چاہا تو اسے لگا جیسے اس نے کوئی انگارہ چھولیا ہو۔ شاید اسے تیز بخار تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوا۔

اگلے دن شام کو جب اس کو اچھی طرح ہوش آیا اور کچھ طبیعت سنبھلی تو وہ اپنے روم میں تھی۔ عینا اور نوید بھی اس کے روم میں تھے۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی بیڈ سے نیچے اتر کر عینا سے پوچھا۔

"سنی چلے گئے؟" کیونکہ آج ان کی فلائٹ تھی۔ جواباً عینا کچھ دیر چپ رہی۔ پانچ بجے کی فلائٹ تھی اور اب چھ بج رہے تھے۔ اس نے عینا کے سامنے کھڑے ہوکر دوبارہ اسے بازو جھنجوڑتے ہوئے وہی سوال کیا۔

"ہم نے بہت روکا مگر......" عینا کے بجائے نوید نے دھیمے لہجے میں کہا اتنا سننا تھا کہ وہ دوبارہ چکرا کر بیڈ پر گر گئی۔

☆☆☆

"دیا آنکھیں کھولو۔" بہت دھیمے لہجے میں کسی کی آواز پر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک دم سیدھی ہوکر اٹھ بیٹھی۔ سامنے والے شخص کو دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ بے یقینی کی حالت میں انہیں دیکھے جارہی تھی۔

"آپ......؟" اس نے بہت مدھم لہجے میں کہا تو سنی نے اس کے چہرے پر آنے والے کھلے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"جی میں...... میں اپنی دیا کو چھوڑ کر بھلا کیسے اور کہاں جاسکتا تھا؟" اس نے بہت نرم لہجے میں کہا اور دیا کی آنکھوں سے ایک دم بہت سے آنسو پھسل گئے۔ کچھ دیر بعد دروازے پہ دستک ہوئی اندر آنے والا منیب تھا جس نے انہیں اطلاع دی کہ رمضان کا چاند نظر آگیا ہے اور پھر تیسرے روزے ہی کو ان کی شادی کی تاریخ طے کردی گئی اب ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔



خوشیوں کے لمحے

اصفا فیصل

''ہاں بھئی عروہ ساری تیاری ہوگئی کیا؟'' فریحہ نے دھم سے صوفے پر گرتے ہوئے پوچھا۔

''ہا..... ہوں.....؟'' عروہ نے میگزین پر ہی نظر جمائے رکھی۔

''ارے واہ بھئی واہ'' ابھی سیاں کو پیاری ہوئی نہیں اور یہ کھویا کھویا انداز۔''

''نہیں بولو تم کیا کہہ رہی ہو؟'' عروہ نے میگزین سائڈ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا تمہارے موڈ کو؟''

''کیا ہونا ہے میرے موڈ کو؟''

''اتنا اکھڑا اکھڑا انداز۔''

''تم سب لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔'' عروہ غصے میں کمرے سے نکل گئی۔ اسی لمحے نازیہ اندر داخل ہوئی۔ فریحہ نے حیرت سے پوچھا۔

''اسے کیا ہوا؟''

''کیا ہونا ہے' دماغ خراب ہوگیا ہے۔ کہتی ہے ڈیزائنر کا برائیڈل ڈریس لے گی۔''

''کیا اسے پتا بھی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے ڈیزائنر کا برائیڈل ڈریس دو تین لاکھ سے کم نہیں ہوتا۔''

''سب پتا ہے اسے پھر بھی بضد ہے..... ا جونتی سے لینا ہے اور اسی پر بس نہیں..... میچنگ جیولری بھی ڈیزائن کروائیں گی محترمہ۔''

''ٹھہرو ذرا میں اس کا دماغ درست کرتی ہوں۔''

''ہاں بھئی کیا سن رہی ہوں؟'' فریحہ نے عروہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہے بھئی صاف صاف کہو..... میرا موڈ پہلے ہی آف ہے۔'' عروہ نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''میڈم آپ کو پتا ہے آپ کے والد ایک سیلف میڈ انسان ہیں اور تمہارے بعد ان کو نازیہ کی شادی بھی کرنی ہے اور آج کل کے حالات میں تمہاری ڈیمانڈز اور یہ بھی سوچو سب انہیں کرنا ہے۔ تمہارا کوئی بھائی بھی نہیں ہے جو انہیں سپورٹ کرے۔'' عروہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''نازو یہاں بیٹھو میرے پاس، بتاؤ مجھے کیا مطالبات ہیں میرے کہ ایونٹ مینجمنٹ سے میری مہندی، برات کا اہتمام کروائیں یا ڈائمنڈ جیولری دیں یا جہیز میں گاڑی، بنگلا فلیٹ دیں، کیا مطالبات ہیں۔ صرف اپنی شادی کا سوٹ اور جیولری ہی اپنی مرضی سے لینے کا کہہ رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے یہ دن کتنا خاص ہوتا ہے اور اس دن ہر لڑکی سب سے خوب صورت لگنا چاہتی ہے تو اگر میں بھی ایسا چاہتی ہوں تو کیا برائی ہے۔''

''برائی نہیں ہے میری جان۔'' نازو نے عروہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اپنے گھر کے مالی حالات سے واقف نہیں ہو کہ ہم یہ سب کچھ افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''افورڈ نہیں کر سکتے تو نہ کریں شادی۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ شکر کرو شادی ہو رہی

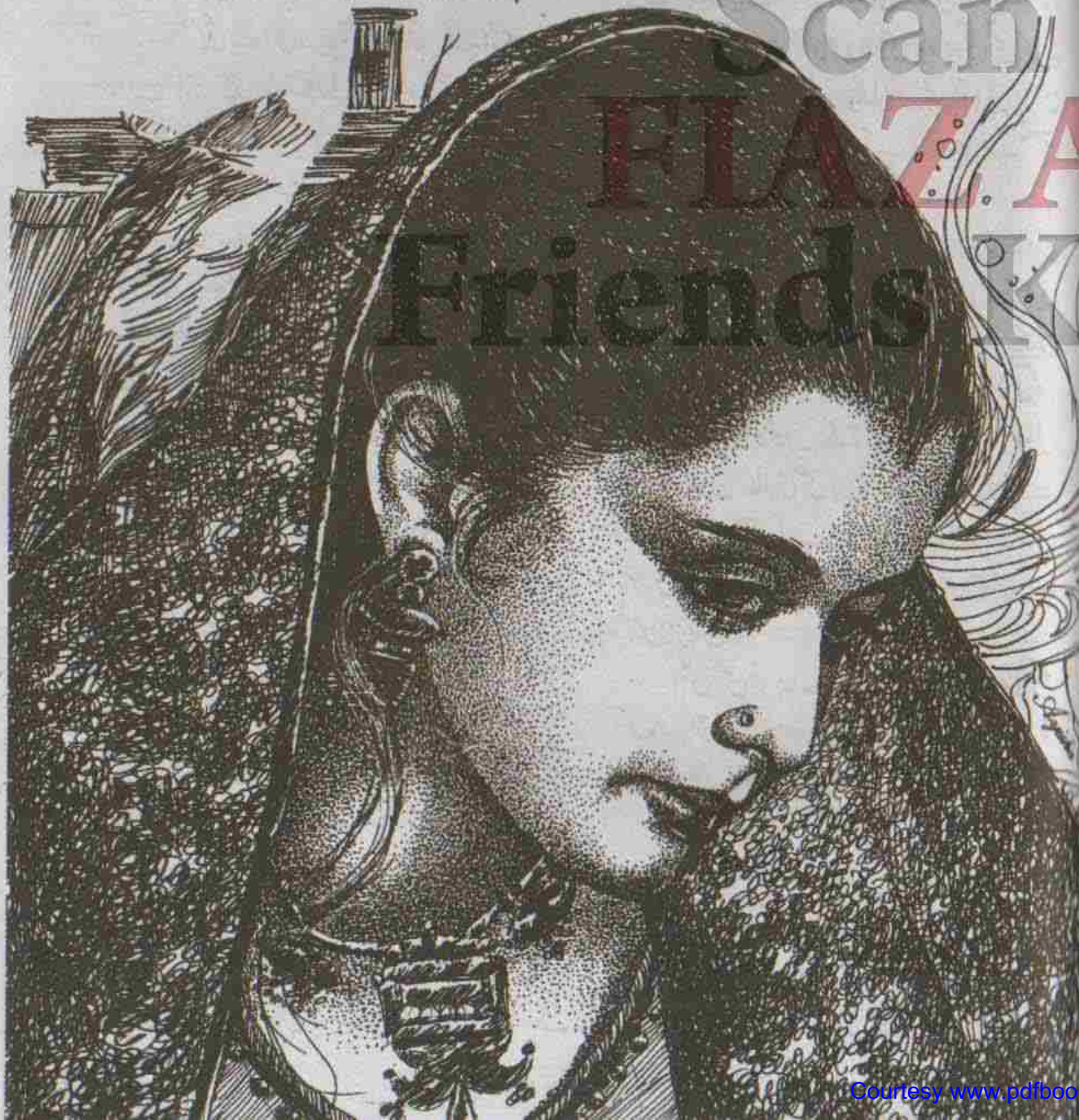
ہے ورنہ کتنی لڑکیاں صرف جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ... ی ہیں۔ مجھے ہی دیکھ لو، سگی پھپھو ہیں مگر جب تک ... ن کی مطلوبہ لسٹ مکمل نہیں ہوگی وہ برات نہیں لائیں ... ی اور زوار کے گھر والوں نے تو دیکھو ایسی کوئی ... ائش ہی نہیں کی، زوار کو تو صرف تمہارا ساتھ ... ہیے۔ تم خوش قسمت ہو لڑکی۔'' آخر میں نازو نے ... پنا موڈ خوشگوار کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔ عروہ نے ... بھی پھیکی سی مسکراہٹ سے اس کا ساتھ دیا۔

☆☆☆

''عروہ یہ دیکھو سی گرین کتنا خوب صورت لہنگا ہے۔''

''امی پلیز' آپ نے زرینہ کی شادی میں دیکھا تھا نا کس قدر خوب صورت برائیڈل ڈریس پہنا تھا۔ امی پلیز یہ سب بیکار ہیں آپ ایک دفعہ لا جونتی چلیں نا پلیز امی۔'' امی نے ایک لمبی سانس بھری اور اٹھ گئیں۔ عروہ کو اندازہ ہو چکا تھا، ان کا موڈ آف ہو گیا ہے۔ اب شاپنگ کا کوئی فائدہ نہیں۔

''ہاں بھئی کیا کیا شاپنگ کی ماں بیٹی نے؟''



اویس صاحب نے چائے کا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔عروہ سلام کرکے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کیا ہوا اس کو؟''

''کیا ہونا ہے، نازیہ ایک گلاس پانی پلاؤ بیٹا۔''

''جی اچھا امی ابھی لائی۔''

''بس وہی ضد ہے۔''

''ہوں......ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔''

''آپ کا دماغ تو صحیح ہے وہ تو بچی ہے آپ تو سمجھدار ہیں۔''

''بچی ہے اسی لیے تو کلیجا کٹتا ہے کیسا مجبور باپ ہوں اپنی بچی کی چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کرسکتا۔''

''کیا ہوگیا ہے آپ کو خدانخواستہ ہم نے کون سی کمی کی ہے۔ جتنے میں لہنگا اور جیولری لے گی ڈیزائنر سے اتنے میں مہندی، برات کا کھانا اور جگہ نمٹ جائے گی۔ ابھی بھی پچاس ہزار دیے ہیں لہنگے کے لیے اور جیولری تو میں نے اپنی شروع سے آدھی عروہ اور آدھی نازیہ کے لیے رکھی ہے، وہ پالش بھی کروالی ہے۔اب یہ نیا چکر نہیں بھئی......مجھ میں ہمت نہیں اور آپ نے ابھی کہہ دیا اس کے سامنے ہرگز نہ کہیے گا، وہ سر پر چڑھ جائے گی۔صحیح سمجھے گی اپنے آپ کو۔'' نازیہ کمرے میں داخل ہوئی تو عروہ موبائل میں مصروف تھی۔

''کیا کررہی ہو؟''

''زرینہ کی شادی کی تصویریں دیکھ رہی ہوں۔''

''ہاں بس زوم کرکے وہی دیکھتی رہنا حد ہے پاگل پن کی اگر دوسرے کا منہ لال ہو تو اپنا منہ تھپڑ مار کر لال نہیں کرتے۔'' عروہ نے بات سنی ان سنی کردی اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔نازیہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

☆☆☆

یوں تو عروہ میں ضد کی عادت نہیں تھی مگر کچھ ہی مہینوں پہلے اس کی کزن زرینہ کی شادی ہوئی جس میں اس کے سارے ڈریسز ڈیزائنر نے تیار کیے تھے۔ جیولری بھی میچنگ کی تھی، اپنا برائیڈل شوٹ بھی مشہور فوٹوگرافر سے کروایا تھا۔ شادی کا سارا انتظام ایک اچھی جگہ سے کروایا تھا اور اب جب بھی سب مل کر بیٹھتے تو بس زرینہ کی شادی کا ہی تذکرہ ہوتا بس اس کو دیکھ کر ہی عروہ کو بھی ضد ہوگئی تھی کہ یہ سب نہ سہی......کم از کم برائیڈل ڈریس تو اپنی مرضی کا لوں اور وہ اس میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی تھی۔

آخر کار اسی ضد بحث میں اس کی مہندی کا دن آ گیا۔ برائیڈل ڈریس بھی نازیہ اور امی نے اپنی پسند کا لیا۔عروہ نے ناراضی کے اظہار کے طور پر اس کو دیکھنا تک پسند نہیں کیا۔اسے لگتا تھا کہ اس کے گھر والے اس کی خوشیوں کے قاتل ہیں۔دل ہی دل میں وہ پلان بنا رہی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں سے ملنے بھی نہیں آیا کرے گی۔ وہ متوسط گھرانے کی مشرقی لڑکی تھی، اس سے زیادہ اس کی سوچ کہیں جا نہیں سکتی تھی۔

ابھی بھی فریحہ اسے سمجھا رہی تھی۔''اپنا موڈ صحیح کرو اور کتنا خوب صورت مہندی کا سوٹ ہے۔'' تو اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

''ہاں بہت۔''

''دیکھو عروہ حقیقی خوشیاں ان مادی چیزوں میں نہیں ہیں۔میری جان جب تم چلی جاؤ گی تو یہ دن یاد کرو گی جو تم نے اپنی بلاوجہ کی ناراضی میں ضائع کیے اور تمہیں پتا ہے لوگ باتیں بنا رہے ہیں کہ تم اس

شادی سے خوش نہیں ہو۔خدا کے واسطے دنیا کو تماشا مت دکھاؤ۔''

''ارے لڑکیوں جلدی نیچے آؤ، مہندی آ گئی ہے۔'' کہیں سے آواز آئی۔سب لڑکیاں پھولوں کی تھالیاں اٹھائے نیچے لپکیں۔عروہ نے گہری سانس لے کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''اے خدا! اتنی سی خواہش پوری نہیں کرسکتا تو.... تو تو کہتا ہے مانگ مجھ سے میں دوں گا پھر ساری عمر تیری عبادت کی کبھی ماں باپ کا سر جھکنے نہیں دیا۔ جہاں رشتہ کیا سر جھکا دیا جو کھلایا کھالیا بس ایک ہی خواہش تھی۔'' کلک کی آواز سے دروازہ کھلا وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' زرینہ نے اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔اس نے نظر اٹھا کر دیکھا مگر یہ وہ زرینہ تو نہیں تھی جس کو وہ جانتی تھی بلکہ یہ تو کوئی اور تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''یہ تمہارے ماتھے پر کیا ہوا اور تمہاری آنکھیں کیوں اتنی سوجی ہوئی ہیں؟''

''ارے آرام سے بھئی اتنے سوال......دیکھو عروہ میں تو تمہیں بڑی سمجھدار سمجھتی تھی دراصل مجھے نازیہ نے بلایا ورنہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں نہیں آتی۔''

''نازیہ نے......؟''

''ہاں مجھے نازیہ نے سب بتایا۔''

''یہ نازیہ کی بچی۔'' عروہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔

''میری بات غور سے سنو......یہ ڈیزائنر سوٹ اور یہ چمک دمک آپ کو حقیقی خوشیاں دے سکتے تو میں تمہیں خود ڈیزائنر کے پاس لے جاتی میری جان مگر نہیں یہ سب دکھاوا ہوتا ہے اور دکھاوے پر کبھی مت جانا۔دکھاوا ایک دھوکا ہے سراب ہے۔میں نے اشفاق کے دکھاوے پر یقین کیا اور میرے باپ نے بھی میری شادی پر اتنا دکھاوا کیا کہ اس سے دس لڑکیوں کی شادی آرام سے ہوسکتی تھی۔کاش میرے باپ نے دس لڑکیوں کی شادی ہی کروادی ہوتی تو شاید ان کی دعاؤں کے طفیل آج میں کامیاب زندگی گزار رہی ہوتی۔''

''کیا کہہ رہی ہو...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''

عروہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔زرینہ نے عروہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری شادی کو دیکھ کر رشک نہ کرو......شاید ہوسکتا ہے کہ اتنی دھوم دھام سے کوئی نظر ہی لگ گئی ہو۔'' زرینہ کافی بہکی بہکی لگ رہی تھی۔''بس میں تمہیں سمجھانے آئی ہوں کہ یہ موقع ہر لڑکی پر ایک ہی دفعہ آتا ہے......اس کو فضول سی ضد کے لیے ضائع نہ کرو۔مجھے ہی دیکھو اور یہ سب چیزیں مجھے خوشیاں نہ دے سکیں...... کہیں تمہارے رویے سے تمہاری خوشیاں نہ چھن جائیں اس سے پہلے اپنے نفس کو لگام دے دو۔بس یہی کہنے آئی تھی۔'' زرینہ ہاتھ چھڑا کر جلدی سے کمرے سے نکل گئی اور عروہ اس کو تو بے چینی ہوگئی کہ کیا ہوا ہے۔

جب اس کو رسموں کے لیے لے جایا گیا اور زوار کے پہلو میں بٹھایا گیا تو زوار بھی کچھا کھچا کھڑا سا لگا۔نہ اس نے کوئی سرگوشی کی اور نہ ہی کوئی پیار بھری بات۔رات کو جب سارے کام نمٹا کر نازیہ کمرے میں آئی۔

''نازیہ میری بات سنو۔''

''ہاں بولو۔''

''نازیہ، یہ زرینہ کو کیا ہوا؟''

"کیا ہونا تھا۔ اس کے سسرال والے لالچی نکلے، روز کوئی فرمائش اس کے کپڑے، جیولری نندوں اور ساس نے رکھ لیے ہیں۔ اس کا بیڈ سیٹ دیور نے اپنے کمرے میں سیٹ کروالیا ہے اور کہا کہ آپ تو اور بھی لے سکتی ہیں اور تو اور اس کے شوہر نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ وہ تو الٹا زرینہ کو ہی برا بھلا کہتا ہے۔"

"او خدایا کسی کے ساتھ ایسا نہ ہو۔"

"کیوں، کل تک تو تم کہتی تھی کہ سب کی شادی زرینہ جیسی ہو۔"

"وہ میری بھول تھی۔" عروہ نے کھسیا کر کہا۔ "اچھا بات سنو وہ زوار اتنا اکھڑا اکھڑا سا کیوں تھا؟"

"لو مجھے کیا پتا تمہارا منگیتر ہے تمہیں پتا ہوگا۔"

"وہ دراصل میں نے غصے میں چند دنوں سے موبائل آف کیا ہوا تھا۔"

"فوراً کال کرو اس کو۔ ان رشتوں میں غلط فہمی کو پروان چڑھنے نہیں دیتے۔ آج زوار کی بہنیں مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ اس شادی سے لگتا ہے عروہ خوش نہیں ہے۔ آپ نے لگتا ہے اس کی مرضی نہیں پوچھی۔"

"کیا......؟"

"جی ہاں، بھئی تم مزید ماتمی کیفیت جاری رکھتیں اسی لیے میں نے زرینہ کو بلایا تھا۔"

"اوہو! میں ابھی فون کرتی ہوں۔" کافی دیر تک کال ملانے کے بعد آخر کار کال ریسیو کر ہی لی گئی۔

"ہیلو۔" عروہ نے کہا۔

"جی کہیں، میں سن رہا ہوں۔" زوار نے جواب دیا۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟"

"اگر یہی سوال میں آپ سے پوچھوں؟"

"میں...... وہ تو...... نہیں، نہیں تو۔"

"پھر آپ اتنے دنوں سے میری کال کیوں نہیں ریسیو کر رہی تھیں بلکہ میں نے سنا ہے کہ آپ اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔ امی بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ نے ان کے ساتھ شاپنگ نہیں کی۔"

"نہیں، وہ دراصل وہ تو میری بیٹری خراب تھی اور میں آخر مشرقی لڑکی ہوں کیسے اپنی ساس کے ساتھ شاپنگ کر سکتی ہوں۔" عروہ کی بات سن کر زوار کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔

"قسم سے عروہ میں ڈر گیا تھا کہ اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں کیا کروں گا......"

"بس بس زیادہ باتیں نہیں۔" عروہ نے بات کاٹی۔

"اچھا بتاؤ ذرا کیا کہہ رہی تھیں کہ تمہاری بیٹری خراب تھی یا موبائل کی؟"

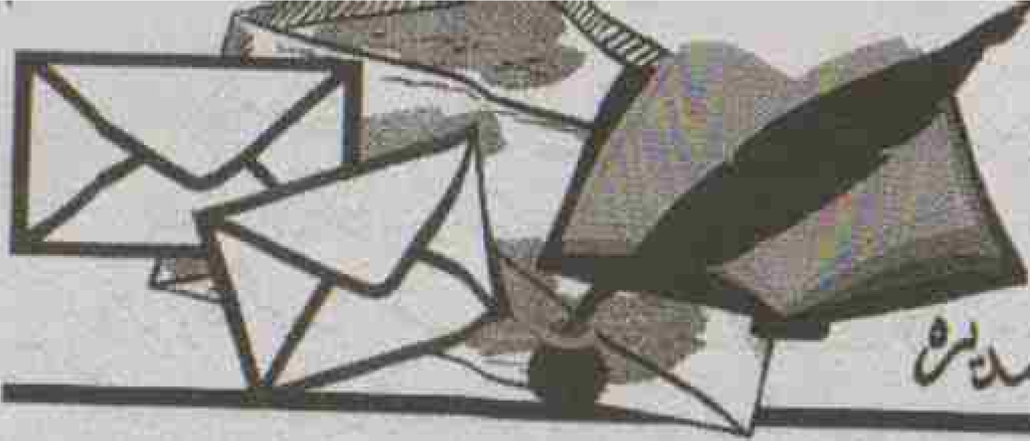
"زیادہ فری نہ ہوں اور تا زیہ آ رہی ہے۔"

"اچھا بتاؤ کب کال کروں؟"

"کوئی کال وال نہیں بس اب شادی والے دن کا انتظار کریں۔"

"یہ ظلم ہے۔"

"کوئی ظلم نہیں۔" عروہ نے ہنستے ہوئے لائن کاٹ دی۔ "ہائے یہ میں کیا کرنے چلی تھی۔ اپنی خوشیاں اپنے ہاتھوں برباد کرنے۔" عروہ نے پرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی کل اسے اپنی امی اور ابو سے بھی معافی مانگنی تھی اور یہ سوچ کر ہی کہ پرسوں اس کی شادی ہے اور یہ گھر پرایا ہو جائے گا اس کی بند آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ نیکیوں کا موسم بہار...... یعنی رمضان المبارک بس شروع ہونے والا ہے۔ اس کی تیاریاں یقیناً آپ پہلے سے ہی کر رہی ہوں گی۔ چاٹ مسالا بنا کر رکھنا ہے۔ دہی بڑوں کے لیے املی چٹنی پہلے سے بنا کر رکھنی ہے۔ رول اور سموسے تیار کر کے فریزر میں رکھنے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رمضان میں پہننے کے لیے کپڑے، افطار پارٹیز، روزہ کشائیوں میں جانے کی تیاری وغیرہ وغیرہ...... مگر ایک بات کی تیاری کرنا شاید آپ بھول گئی ہیں...... وہ یہ کہ عزیز و اقارب جو کسی بھی وجہ سے آپ سے روٹھ گئے ہیں، بے شک غلطی بھی ان ہی کی ہے، زیادتی بھی انہوں نے ہی کی ہے کہ یہ کہہ دیا یا وہ کہہ دیا...... آپ صرف اللہ کی رضا کے لیے سب بھول جائیں اور رمضان سے پہلے باہم اپنا دل صاف کر لیں۔ معاف کرنا یقیناً ایک مشکل کام ہے جس کی شکل کو دیکھنے کو دل نہ چاہے اس سے کیسے بات کی جائے مگر یہ اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے ہم نے اس ماہ ایسی کوئی بات نہیں کرنی جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو تو آئیں اپنے روٹھے ہوئے رشتے داروں کو منا لیتے ہیں اور یقین کیجیے آپ کو جو طمانیت محسوس ہوگی اس کا مزہ علیحدہ ہی ہوگا۔ مجھ سے اگر کوئی قاری بہن کسی وجہ سے بھی ناراض ہے۔ میں اس سے معافی مانگتی ہوں اور وہ مجھ سے فوری رابطہ کرے کہ ایڈیٹر ہونے کے ناتے بعض ناراضیاں ایسی بھی ہو جاتی ہیں جس سے دوسرا لاعلم رہتا ہے مگر رمضان کے اس مقدس مہینے میں، میں ہرگز نہیں چاہوں گی کہ آپ مجھے اپنی دعاؤں میں شامل نہ کریں۔ مجھے آپ سب کی بہت بہت دعائیں چاہئیں۔ ہمارے بے شمار قارئین اپنا رمضان مکے اور مدینے میں گزارتے ہیں ان سے تو بطورِ خاص دعا کے لیے التماس ہے۔

☆ ☆ ☆

اور آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ ابھی پڑھ لیں۔

آیت کریمہ یہ ہے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

ہماری پیاری مصنفہ عالیہ بخاری اپنی علالت کی وجہ سے اس ماہ اپنے ناول خوشبو کا سفر کی قسط نہیں لکھ سکیں جس کے لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ یہ ناول اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ خوشبو کا سفر کی قسط اب آپ پاکیزہ کے آئندہ شمارے میں پڑھیں گی۔

﴿ مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں ﴾

☆ محسن پاکستان ڈاکٹر قدیر خان کی اور ان کی فیملی کی نادر تصاویر، ان کے منفرد دیباچے اور ان کے عکسِ تحریر کا مجموعہ عراضہ کے نام سے جبار مرزا نے ترتیب دیا ہے۔ جو ہر قاری کے لیے کسی انمول تحفے سے کم نہیں ہے۔ ساٹن جیسے صفحات اور موتی ٹنکے حروف دیکھ کر آپ اس کتاب کو بار بار بھی پڑھیں گے تو آپ کا دل نہیں بھرے گا۔ اس کتاب کے ناشر علامہ عبدالستار عاصم ہیں۔ کتاب کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ملنے کا پتا: عمدۃ البیان پبلیشرز، رضویہ ٹرسٹ، سینٹرل کمرشل مارکیٹ ماڈل ٹاؤن، لاہور یا مقبول اکیڈمی لاہور۔ فون نمبر: 042-35855537 یا (0323-4393422)

☆ محترمہ عذرا رسول کی ماموں زاد بہن فرح ناز کا شعری مجموعہ خزاں میں پھول شائع ہوگیا ہے۔ قیمت سو روپے صفحات 93 کتاب اشرف نیوز ایجنسی راول پنڈی۔ احمد حسین نیوز ایجنسی، کراچی، لاہور سے حاصل کریں۔

☆ ہماری بے حد پیاری اور معروف ناول نگار قیصرہ حیات کا نیا منفرد اور ادبی شاہکار ناول الف اللہ اور انسان شائع ہوگیا ہے۔ قیمت سات سو روپے اور صفحات 816 ہیں۔ اپنے قریبی بک سینٹر سے خریدیں یا علم و عرفان پبلیشرز لاہور سے منگوائیں۔ فون نمبر: 042-37352332

☆ ہمارا ناول محبت ہم سفر میری ان دنوں القریش پبلی کیشنز لاہور میں زیرِ طبع ہے۔ آپ اپنی کاپی بک کروانے کے لیے رابطہ کریں۔ 042-37652549

☆ ہماری نئی کتاب انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ ٹوٹکے اور علاج شائع ہوگئی ہے۔ کتاب منگوانے کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔ 021-36981952

☆ پاکیزہ کی معروف شاعرہ نوشین اقبال نوشی کا پہلا مجموعۂ کلام وجہ ہے محبت ان دنوں زیرِ طبع ہے۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ آپ کی پاکیزہ ڈائری کی انچارج عظمیٰ آفاق سعید اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب روانہ ہوگئی ہیں۔ واپسی پر وہ دس دن دبئی میں مقیم رہیں گی۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رخسانہ شہناز صدیقی اپنی بیٹی عمرانہ صدیقی کے ساتھ اپنے کزن کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی سے اسلام آباد گئی ہوئی ہیں۔

☆ مصنفہ مہناز عرفان سیر و سیاحت کے لیے گزشتہ دنوں لندن گئیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ ہماری ایک بے حد پیاری مصنفہ ثانیہ رحمان، لندن ان دنوں اپنا افسانوی مجموعہ ترتیب دے رہی ہیں۔ جو جلد آنے والا ہے۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ ہماری مستقل قاری عذرا خالد جیلانی، کراچی اپنی بڑی بیٹی ثروت جبیں کے پاس جدہ جا رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ ہماری مستقل قاری آرزو شاہد اپنی فیملی کے ساتھ موسمِ گرما کی تعطیلات گزارنے اور عزیز و اقارب کی شادیوں میں شرکت کے لیے اسلام آباد اور مری جا رہی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ ہماری طنز و مزاح کی نئی کتاب، کھری کھری ان دنوں زیرِ طبع ہے۔ آپ اپنی کاپی اس نمبر پر بک کروا سکتی ہیں۔ 042-34393422۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ رفعت سراج ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز سے وابستہ معروف شاعرہ اور افسانہ نگار یمنیٰ احمد کی شادی گزشتہ دنوں ہوئی، میری اور ادارے کی جانب سے ڈھیر ساری مبارک باد اور دعائیں۔

☆ گزشتہ دنوں ہماری مایہ ناز افسانہ نگار اور شاعرہ ناہید فاطمہ حسنین کا میٹرو ٹی وی پر بزمِ شاعری میں ایک طویل انٹرویو ہوا جس کی میزبان نصرت زہرا تھیں۔ ناہید کی شاعری کئی گھنٹے تک سنی گئی۔ (مبارک باد)

☆ میری پیاری سی بھتیجی عائشہ سہیل کی رخصتی 2 جولائی کو اسلام آباد میں ہوئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد وہ اپنے شوہر بابر محمد احمد کے ساتھ امریکا روانہ ہوگئی۔ (اللہ تعالیٰ اس نئے جوڑے کو ہمیشہ خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے، آمین)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار نرگس نسیم، صابہ موہڑہ کے والد ایک طویل عرصے کے بعد اپنے گھر واپس آگئے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی ایک معروف مصنفہ ان دنوں ٹی وی کے لیے ایک دلچسپ سوپ لکھ رہی ہیں۔ جسے جواں سال اور ٹیلنٹڈ ڈائریکٹر کاشف سلیم ڈائریکٹ کر رہے ہیں۔ یہ سوپ جلد آن ائر جائے گا جس میں محمود اسلم، شہناز پرویز، اظفر سعید، فضائلہ لاشاری، عائشہ خان، روبینہ اشرف اور بہت سارے معروف اداکار کام کر رہے ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار نسیم نیازی، لاہور اس ماہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے جا رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ ممتاز خانم، کراچی کی بیٹی کومل کی شادی اس ماہ ہو رہی ہے۔ (مبارک باد اور ڈھیر ساری دعائیں)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار سیدہ صائمہ، کراچی کے بھائی سید عامر اعجاز، بھابی ندا عامر اپنی بچی کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کر کے آگئے ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی کے پوتے فیضان کا آپریشن بفضلِ خدا کامیاب رہا ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ فیضان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ معروف و مقبول مصنف جناب ایم اے راحت نے اپنی قیام گاہ پر ہماری پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری کی صحت یابی پر ایک تقریب منعقد کی جس میں غزالہ جلیل راؤ، عطیہ زہرہ، نسیم نیازی اور نگہت اکرم نے بھی شرکت کی۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ارم احتشام موسمِ گرما کی تعطیلات میں بچوں کے ساتھ اپنے میکے کراچی آئیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری راحت کے بیٹے کی اسلام آباد میں شادی ہو رہی ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری انیلہ ناہید، لیہ نے ایک این جی او جوائن کر لی ہے جس میں وہ اہم خدمات انجام دے رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار منیرہ عادل، کراچی کے بیٹے عمیر کو اسٹار ایوارڈ ان کی کسی کتاب کے سلسلے میں ملا ہے۔ (مبارک باد)

افسانے اور ناول تو ہوتے ہی لاجواب ہیں اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا۔ سیما بنت عاصم کے خط نے محفل میں گرم جوشی پیدا کردی ہے۔" (ارے بیٹا میری تو یہ دلی خواہش ہے کہ تم سمیت میری ہر رائٹر مجھ سے آگے جائے اور بہت آگے جائے تاکہ میں تم سب پر فخر کروں بلکہ اکثر پر تو میں فخر بھی کررہی ہوں کہ یہ عمیرہ احمد ہماری رائٹر ہیں، یہ سمیرا مناف ہماری رائٹر ہیں، ارے یہ قیصرہ حیات بھی ہماری رائٹر ہیں اور اقبال بانو وغیرہ وغیرہ)

✍ مسز شمع حسین، ٹورنٹو سے۔ "دلہن نمبر میں اتنی زیادہ دلہنیں دیکھ کر خوب لطف آیا۔ اس بار دلہنوں کا البم بالکل نئے انداز میں تھا۔ پاکیزہ تنوع کے لحاظ سے واقعی منفرد ماہنامہ ہے کہ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ورنہ اکثر ڈائجسٹ تو لکیر کے فقیر نظر آتے ہیں۔ ندا کی شادی کا حال اچھا لگا اور تمام تصویریں بھی پسند آئیں۔ آپ کے بھائی بھاوج کی تصویریں بھی پسند آئیں۔ عظمیٰ آفاق مزاحیہ افسانے بہت اچھے لکھ سکتی ہیں، اس کا اندازہ مجھے اسی وقت ہوگیا تھا جب میں نے عظمیٰ کا امریکا کا سفر نامہ ایک میگزین میں پڑھا تھا۔ دیر سے ہی سہی مگر میری یہ رائے عذرا رسول کو پہنچادیں کہ ان کی تصویر اور ان کا انٹرویو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ مسز رفاقت جاوید قاضی، اسلام آباد سے۔ "میری نظر میں پاکیزہ ایک بہترین ماہنامہ ہے۔ عذرا رسول مبارک باد کی مستحق ہیں جنہیں اپنی ٹیم کی بہترین کیپٹن میسر ہے اور بلاشبہ ان کی پوری ٹیم کی دیانت دارانہ محنت ہر صفحے پر نظر آتی ہے۔ عذرا رسول کا انٹرویو ہر شخص کو ماضی کی یادوں میں لے گیا، ان کی سوچ اور فکر کے مثبت انداز پسند آئے۔ پاکیزہ کا اداریہ ایک ایسی تحریر ہے جو ہر ماہ سوچ کے نئے زاویے رقم کرتا ہے اور لکھنے والے کی شخصیت اس آئینے میں صاف نظر آتی ہے۔ مجھے پاکیزہ میں لکھنے والی ہر رائٹر اور ہر تبصرہ نگار کی تحریر پسند ہے۔ اس لیے کسی ایک کا نام لے کر دوسرے کی حق تلفی نہیں کروں گی۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل کا خصوصی طور پر تذکرہ کروں گی کہ یہ محفل ایسی ہے، جس میں شریک ہوکر ایک اپنے پن کا احساس اجاگر ہوتا ہے، یہ لطف، یہ مزہ مجھے کہیں کسی محفل میں نظر نہیں آیا۔ اس محفل میں شریک تمام بہنوں کو میرا اسلام پہنچادیجیے۔" (رفاقت بہن پسندیدگی کا شکریہ...... ہاں اس محفل میں اب آپ کی دائمی رفاقت کی خواہش مند ہوں)

✍ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور سے۔ "اس مہینے کا پاکیزہ پڑھا، میں بھی نسیم نیازی کی تائید کرتی ہوں کہ انڈین ڈرامے اور پروگرامز ہمارے ٹی وی پر نہیں ہونے چاہئیں۔ عذرا رسول کا انٹرویو بار بار پڑھ رہی ہوں اور ان کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔ ذکیہ بلگرامی کے ناول کا اختتام بہت پسند آیا۔ انہوں نے خواہ مخواہ کی طوالت نہیں دی۔ شیریں حیدر کا ناول مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ کردار زیادہ ضرور ہیں مگر ہر کہانی نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھ میں بھی آرہی ہے۔ جلترنگ اچھا لگتا ہے مگر بہنوں کی محفل کی کیا بات ہے۔ اس کے خط پڑھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے بالمشافہ ملاقات ہورہی ہے۔ ہاں عظمیٰ کا دلہنوں کا سروے بے حد پسند آیا تھا۔" (پیاری شیریں! اس محفل کی دلچسپی اور محبت آپ سب بہنوں کے دم سے قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور خوش وخرم رکھے، آمین ثم آمین)

✍ صبا نور، لیہ سے۔ "مجھے پاکیزہ کی تمام رائٹرز بہت پسند ہیں اور میں سب کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں کہ وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ باجی میں یہ بات آپ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ میں دو دن میں پورا پاکیزہ پڑھ لیتی ہوں اور پھر سارا مہینہ اس کو بار بار پڑھتی رہتی ہوں۔" (پیاری صبا! اللہ تعالیٰ آپ کو بھی ہمیشہ

☆ شاعرہ فریدہ خانم، لاہور کے پہلے مجموعۂ کلام مختلف کی بے حد تعریف ہورہی ہے۔ معروف ادیب اجمل نیازی اور سہیل وڑائچ نے بھی ان کی شاعری کو بے حد سراہا ہے اور اجمل نیازی نے اپنے کالم میں بھی ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ (مبارک باد)

انتقالِ پُرملال

☆ میری پیاری بی بی پھپھو مسز زمرد سلطان مختصر علالت کے بعد انتقال کرگئیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز فرخ، کراچی میں انتقال کرگئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

✍ پروفیسر عابدہ خان، ایبٹ آباد سے۔ "بہت عرصے بعد مخاطب ہوں دراصل ریٹائرڈ اور تنہا زندگی گزار رہی ہوں۔ تینوں بیٹیاں ماشاء اللہ اپنے اپنے گھروں اور خاندان میں مصروف ہیں۔ تمہیں پوتا بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ عمرِ دراز اور دین و دنیا کی دولت عطا فرمائے، آمین۔ صائمہ اکرم کا خط محرک بنا۔ پاکیزہ ماہ جون، بیٹی صائمہ تمہیں پاکیزہ کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ تمہاری تحریریں مجھے بہت پسند ہوتی تھیں۔ شاید کبھی کبھار میرے تبصروں کی زد میں بھی آئی ہوں۔ افسوس ہوا کہ تم ایبٹ آباد آئیں اور پاس سے ہی گزر گئیں۔ یہی ہوتا ہے اکیلے اکیلے شادی کرلینے کا انجام اگر مجھے بلاتیں تو میرا پتا بھی معلوم ہوتا جو کہ تم انجم سے پوچھ لو۔ یہاں آتیں تو کچھ دن میرے پاس بھی گزارتیں آئندہ احتیاط...... تمہارا تبصرہ خوشبو کے سفر پر اچھا تھا۔ اس بار شیریں حیدر نے بہت مایوس کیا۔ ان کا شیشوں کا مسیحا عجیب ملغوبہ ہے، بے گنتی کردار عجیب و غریب نام اس سے زیادہ عجیب ان کا interaction ہے کہاں وہ امربیل والی شیریں حیدر اور کہاں یہ ایک jigsaw puzzle جس میں ہر صفحے کو پڑھتے ہوئے بار بار پیچھے کے صفحے الٹنے پڑتے ہیں۔" (پیاری عابدہ آپا! اتنا مختصر تبصرہ...... پلیز آئندہ خط میں ہر تحریر کے بارے میں آپ اپنی رائے دیجیے)

✍ راحت وفا راجپوت، ملتان سے۔ "اس ماہ کا پاکیزہ دلہن نمبر آپ کی شبانہ روز محنت اور کاوش سے سجا سنورا ملا۔ سب سلسلے پسند آئے۔ خاص کر ڈاکٹر ندا کی شادی کا احوال جو آپ کے قلم کا جادو ہے۔ بہت خوب صورت تصاویر ہیں۔ ان سب قارئین کا شکریہ جنہیں میری تحریر پسند آرہی ہے۔ مزید امید ہے کہ سب کو ناول پسند آئے گا۔ تاہم تنقید برائے تعمیر کا عمل صحت مند رجحان کو فروغ دیتا ہے۔ ہر لکھنے والا لکھنے سے پہلے تمام پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ معذرت کے ساتھ اپنی قابلِ احترام بہن عالیہ حرا کے سوال کا فقط اتنا سا جواب ہے کاش! ابن صفی مرحوم زندہ ہوتے تو مقصد بیان کرتے۔ بجیا اراکینِ پاکیزہ کو سلام پہنچادیجیے۔" (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ عظمیٰ آفاق سعید، کراچی سے۔ "اس ماہ کا پاکیزہ تو مجھے دلہن پیلس لگ رہا ہے۔ ہر جانب دلہنیں شرماتی، لجاتی، ہنستی، مسکراتی نظر آرہی ہیں۔ جن بہنوں نے میرے افسانے کی تعریف کی ان کا شکریہ جنہوں نے کوئی رائے نہیں دی ان کا بھی شکریہ۔ نسیم نیازی آپ نے تو بہت بڑی بات کہہ دی کہ مستقبل کی دوسری انجم انصار تو اس بارے میں کہوں گی کہ انجم انصار تو صرف ایک ہی ہیں، میرے قلم کی ایسی سکت کہاں...... اس ماہ سب سے اچھا میرا سروے رہا، سب سے اچھی میری پاکیزہ ڈائری رہی۔ میں اکثر گنگناتی ہوں کے اشعار سب زبردست رہے۔

خوش وخرم رکھے اور آپ ہمارے مستقل سلسلوں میں بھرپور انداز میں شرکت کرتی رہیں)

✍ سیما یا سمین مجتبیٰ، کراچی سے۔ ”جداگانہ اور منفرد اسٹائل لیے ہوئے دلہن نمبر پسند آیا۔ عظمیٰ کا سروے بہت اچھا تھا سب کے جوابات اچھے لگے۔ پاکیزہ ڈائری، میرا انتخاب، غزلیں، تمام مستقل سلسلے بہت خوب تھے۔ عذرا رسول کا انٹرویو تو بہت ہی عمدہ تھا ابھی تک ان کی خوب صورت تصاویر نظروں میں گھوم رہی ہیں۔ بہنوں کی محفل تو ہوتی ہی اچھی ہے۔“ (نوازش)

✍ زاہدہ عالم، کراچی سے۔ ”دلہن نمبر میں اپنی تصویر اور شادی کا احوال پڑھ کر بہت خوشی ہوئی مگر ہمارے بچوں نے پڑھا تو انہوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ شادی کے احوال کے مطابق جو آپ نے شائع کیا ہے، میری شادی کو صرف چار سال ہوئے جبکہ میرے دو جڑواں بچے جو پہل کے ہیں وہ دس سال کے ہیں۔“ (پیاری زاہدہ! آج کل ہنسنا مسکرانا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ دعا دیجیے آپ ہمارے کاتب صاحب کو جن کی ذرا سی غلطی کی وجہ سے آپ بھی خوب ہنسیں، آپ کے بچے بھی اور نئی توانائی علیحدہ محسوس کی ہوگی کہ ابھی تو میں نئی دلہن ہوں چار سال ہی تو ہوئے ہیں شادی کو...... ہے ناں؟)

✍ نسرین زبیری، کراچی سے۔ ”انجم باجی میں پاکیزہ صرف آپ کے روحانی مشوروں کی وجہ سے پڑھتی ہوں۔ اتنی اچھی قرآنی دعائیں، اتنے عام فہم انداز میں آپ بتاتی ہیں کہ بے اختیار آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ پاکیزہ میں بہنوں کی محفل کا سلسلہ بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ سکھ اور دکھ بہنیں اس طرح بیان کرتی ہیں جیسے وہ اپنے قریبی رشتے داروں کو بتا رہی ہوں۔ ہاں جلترنگ ٹینشن میں بھی مسکراہٹ عطا فرماتا ہے۔“ (پیاری نسرین پسندیدگی کا شکریہ)

✍ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے میں نے عظمیٰ آفاق کا سروے پڑھا۔ عائشہ، امبر اور عنبرین کے جوابات خصوصی طور پر پڑھے۔ بقیہ سروے کے جوابات بھی ہر ایک نے بے حد دلچسپ دیے ہیں اور میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ اب تک دلہنوں کے شائع ہونے والے سروے میں یہ سب سے بہترین تھا۔ ذکیہ بلگرامی کو مبارک بادان کا ناول کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ رضوانہ پرنس کا دوسرے درجے کا ناولٹ ہے۔ شیریں حیدر کا بھی درجۂ اول سے کچھ کم ہے۔ دعا ہے کہ یہ درجۂ اول تک پہنچ جائے۔ راحت وفا کے ناول کی گرہیں ابھی تک کھل نہیں پائی ہیں یا وہ کھول نہیں سکی ہیں۔ عالیہ بخاری کا ناول بہت عرصے تک درجہ اول پر رہا مگر اب کیا کہیں کہ وہ خود بہتر جان سکتی ہیں کہ بے وجہ کی طوالت تحریر کو نقصان پہنچایا کرتی ہے، ہاں عطیہ عمر کی تحریر اچھی لگی۔ میمونہ خورشید سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ ایسی مائیں کہاں ہوتی ہیں؟“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس سے۔ ”بہنوں کی محفل میں بے شک کتنی ڈھیر ساری بہنیں ہوں مگر مختصر ہی لگتی ہے۔ دلہن نمبر کی یہ ڈھیر ساری دلہنیں اگر رنگین صفحات پر شائع ہوتیں تو پاکیزہ کا یہ شمارہ بار بار پڑھا جاتا ہے...... ابھی بھی یہ دلہنیں دیکھ کر بہت انجوائے کیا۔ عظمیٰ کا سروے سب سے دلچسپ رہا بلکہ مجھے تو وہ کہیں کہیں جلترنگ بھی لگا۔ شرماتی ہوئی اور آنکھیں بند کرنے والی دلہنوں کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی۔ ذکیہ بلگرامی کا ناول کا اختتام پسند آیا۔ شیریں حیدر میری فیورٹ رائٹر ہیں ان کے ناول کی قسط بھی پسند آئی۔“ (پسندیدگی کا

شکریہ۔ ہمارے دیگر ناول بھی بڑی محنت سے لکھے جا رہے ہیں۔ آپ ان کو بھی پڑھ کر اپنی رائے دیجیے)

✍ فرزانہ جمالی، نواب شاہ سے۔ ”انجم آنٹی آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے جولائی کے پاکیزہ میں میرا خط شائع کیا۔ میں آپ کی اور پاکیزہ کی سب سے بڑی فین ہوں۔ عذرا آنٹی کا انٹرویو بے حد پسند آیا تھا۔ جولائی کے شمارے میں ڈھیر ساری دلہنیں دیکھ کر مزہ آیا اور آپ نے آج کے حساب سے دلہنوں کے فیشن کے بارے میں بھی بتایا جس سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ عظمیٰ آفاق کا دلہنوں والا سروے تو معلومات کا خزانہ رہا۔ شادی سے پہلے ہر لڑکی کو پاکیزہ کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔“ (نوازش)

✍ ماریہ طارق، گوجرانوالہ سے۔ ”جولائی کا پاکیزہ شاندار تھا۔ ذکیہ بلگرامی کو بے حد مبارک باد ان کا ناول مجھے بے حد پسند آیا۔ شیریں آنٹی کا ناول بھی اچھا لگ رہا ہے اب عمیرہ باجی کا ناول شروع ہونے والا ہے پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ہاں دلہنیں ساری اچھی تھیں۔ کارنرز کے انٹرویو بھی اچھے لگے۔ کون کیا کر رہا ہے میں دلچسپی کی کمی ہے۔ سند لیے مزیدار ہے کیا اس کو ہم آپ کو کاپی کے صفحات پر لکھ کر بھیجیں۔“ (جی ہاں)

✍ رخسانہ امجد، ملکوال سے۔ ”جولائی کا پاکیزہ پسند آیا۔ اس ماہ میری بیٹی کا عقیقہ بھی ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نہیں آئیں۔ میری اور میری بیٹی کی تصویر آپ تک پہنچ چکی ہوگی۔ مجھے خوشی ہوگی کہ آپ اسے پاکیزہ میں شائع کریں۔“ (ہم کوشش کریں گے کہ اس کو لگالیں)

✍ منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ ”میں پاکیزہ کی کیا تعریف کروں، اس کی سطر سطر پڑھتی ہوں اور بہت اچھا لگتا ہے۔ جلترنگ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اس کو کتنی بھی بار پڑھوں مزہ آتا ہے۔ ذکیہ بلگرامی کو میری مبارک باد پہنچا دیں کہ ان کا ناول بہت شاندار رہا ہے۔ ہر دلہن حسین تھی کس کس کی تعریف کروں۔ عظمیٰ آفاق کا سروے جلترنگ کے اسٹم جیسا لگا، میں تو پڑھ پڑھ کر ہنستی رہی۔ آپ سب لوگوں کو بے حد دعائیں کہ ہمیں مسکرانے کا موقع دیتے ہیں سارے ناول اچھے جا رہے ہیں۔ میری مبارک باد پہنچا دیں۔“ (پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں)

✉ حسن انگیز صدیقہ، کویت۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ اپریل کے شمارے میں روحانی مشورے کے کالم میں کتابت کی ذرا سی غلطی نے مفہوم بدل دیا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق کے عنوان میں، میں نے لکھا تھا سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 179 اول و آخر درود ابراہیمی کے ساتھ عشا کی نماز کے بعد 101 مرتبہ پڑھیں اور کم سے کم آپ اس آیت کو گیارہ مرتبہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ بے حد آزمودہ طریقہ ہے۔ آپ جس طرح چاہیں پڑھ لیں۔ گیارہ مرتبہ بھی پڑھ سکتی ہیں اور 101 مرتبہ بھی۔

✍ سمیرا مجاہد، صادق آباد سے۔ ”پاکیزہ پہلے میری امی کے پاس آتا ہے اور وہاں سے میرے پاس...... اس لیے اپنی رائے دینے میں مجھے تاخیر ہو جاتی ہے۔ عذرا باجی کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا تھا۔ ایسی خدمت گزار بیویاں اب کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ مجھے سارے ناول اور سب افسانے بے حد پسند آئے۔“ (شکریہ)

✍ شبانہ وحید، پنجاب سے۔ ”باجی آپ کی انمول خزانے کی دعاؤں کی کتاب ہمیں نہ لاہور میں مل رہی ہے اور نہ پنڈی میں۔ اسے ہم کہاں سے لے سکتے ہیں؟“ (پیاری شبانہ! ہماری یہ کتاب ختم ہو چکی تھی، اس لیے ہم نے دوسری کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام ہے انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ وظائف اور علاج جو آپ لاہور سے بھی لے سکتی ہیں۔ اس نمبر پر رابطہ کریں 042-37668958 اور آپ ہم سے بھی

شوق سے پڑھتی ہوں۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا فرمائے، آمین)

✍ نسرین لغاری، ٹنڈو باگو سے۔ "نایاب عروج کی شادی کا حال بہت اچھا لگا، وہ خود بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ زاہدہ عاصم کی شادی کا احوال پڑھ کر ہنسی بھی آئی کہ دلہن خود کہہ رہی ہے کہ شادی میں مزہ نہیں آیا۔ عظمیٰ آفاق کی دلہن بنی تصویر ان کے سروے میں شامل ہونی چاہیے تھی آپ ہماری شکایت ان تک پہنچا دیں۔" (عظمیٰ کہتی ہیں کہ ان کی تصویر دو مرتبہ پاکیزہ کے ٹائٹل پر شائع ہو چکی ہے۔ اب دوسری بہنوں کا حق زیادہ ہے کہ ان کی تصاویر شائع ہوں)

✍ صاعقہ ریاض، حیدرآباد سے۔ "دلہن نمبر میں میری شرکت نہیں ہوئی۔ اس لیے مجھے بالکل مزہ نہیں آیا۔ انجم باجی میں ناراض ہوں۔ فصیحہ آصف خان جب اپنی نظم میں یہ لکھتی ہیں کہ زندگی ایک بار ملتی ہے تو انہوں نے یہ کیوں لکھا کہ میں ہر جنم میں تیری دلہن بنوں، یہ تو غلط بات ہے بھئی۔ ساری دلہنیں بہت پیاری لگیں مگر آپ نے انہیں رونمائی میں کیا دیا؟" (پیاری صاعقہ! مجھے معلوم ہے کہ تم ناراض ہو جب ہی تو تمہیں منا رہے ہیں اور بھئی دلہنوں کو ہم نے خوب ڈھیر ساری دعائیں دی ہیں۔ اگر کسی کے لفافے دینے پڑتے تو اس کے لیے تو کوئی لون وغیرہ لینا پڑتا)

✉ خاکِ مدینہ، پنجاب۔ کہاں ہو بھئی۔ تمہارے موبائل پر کئی مرتبہ فون بھی کر چکی ہوں شاید بند پڑا ہے، رابطہ کرو۔

✍ فرخ وسیم فری، ملتان سے۔ "شیریں حیدر صاحبہ کا ناول زبردست ہے۔ ہمیشہ کی طرح ان کی تحریر دل کو چھو لینے والی ہے، گاؤں کی زندگی کا زبردست نقشہ کھینچا ہے۔ قربتوں کی دوری بھی اچھا لگا۔ اس میں چندا کا ایک دم باغی ہو جانا دکھ ہوا۔ اکثر کام کرنے والی ماسیوں کے بچوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید وہ ان کی تربیت صحیح نہیں کر پاتیں پھر تعلیم کا فقدان.... شازیہ چوہدری کا افسانہ عکاسی کر رہا تھا ان گھرانوں کی جن کے پاس نئی نئی دولت آتی ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے بار بار شازیہ چوہدری کی یاد آتی رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ اگر ملنا نہیں ہمدم میں بڑا انتظار تھا کہ رافع کب ارسلہ سے ملے گا اب اگر ملاقات ہو ہی گئی ہے تو شادی کرنا تو بنتا ہی ہے۔ لبنیٰ عروج کا ناولٹ کیا خوب تھا۔ پریشے نے بہت اچھا کیا جو علی رضا کو چھوڑ کر چلی گئی خیر اینڈ اچھا ہو گیا مگر پسند کی شادی کرنے پر اس قدر سزا تو نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس کی اجازت تو ہمارا اسلام بھی دیتا ہے۔ دین کی باتیں، پاکیزہ ڈائری اور باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔" (شکریہ)

✍ ہما شاہ، ہارون آباد سے۔ "فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ، رضوانہ بہت خوب' واہ تصاویر کا انتخاب لاجواب تھا خاص طور پر یہ سب سے پہلی اور بڑے بھائی کے گھر دعوت میں لی گئی تصویر بہت ہی پسند آئی۔ ذیشان کا واقعی بچپن سے لڑکپن تک اسٹڈی اسٹائل ایک ہے۔ ان کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا اور رضوانہ نے بھی جس طرح ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا، قابلِ ستائش ہے۔ بہت مبارک ہو۔ کبھی کبھی عطیہ عمر کے افسانے کا اینڈ کچھ اچھا نہیں لگا نہ ہی آخری لفظ اچھے لگے۔ انسان کو نیکی کرتے دیکھ کر اور دوسروں کو نیکی کے راستے پر دیکھ کر تو انسان کا ضمیر اسے ضرور اس راہ پر چلنے کے لیے اکساتا ہے مگر شاید ناگن عورت کا ایک گھناؤنا روپ ہر جگہ اپنی من مانی اور من چاہی شے کے حصول کے لیے دوسروں کی زندگی تک داؤ پر لگا دینا پڑھ کر عجیب سا احساس ہوا شاید عورت کی

اصل یہ نہیں' عورت تو محبت اور چاہت کا بدل ہے، وفا کی دیوی ہے اور اگر کوئی ایک آدھ کردار ایسا آتا ہے تو وہ قابلِ نفرین ہے۔ ایسی کی تیسی وفادار بیویوں کی ایک مثال...... بہت خوب صورت تحریر ہے۔ گھر واقعی اسی وقت جنت بنتا ہے جب مرد کا کنٹرول ہو اور عورت پر واقعی اسلامی لحاظ سے بھی اس بات کی پابندی ہے کہ وہ شوہر کی منشا کے بغیر کبھی بھی کوئی کام نہ کرے اور جس بات کی شوہر ہنسی خوشی اجازت دے وہ کام کرے۔ بہت شاندار تحریر تھی۔ ہیپی برتھ ڈے سالگرہ نمبر کے حوالے سے اچھی تحریر رہی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں مل کر گھر کے آنگن کو مہکاتی ہیں دلوں کو فرحت و تازگی کے مشک خرام جھونکوں سے نوازتی ہیں۔ چاند ہرجائی ہے اچھی تحریر رہی۔ ایک تھی نیناں نہ جانے کیوں خاص متاثر نہیں کر رہی خوشبو کا سفر بہترین ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ خالدہ نسیم، یو کے سے۔ "سب سے پہلے رضوانہ کا بیان اور عذرا رسول کی زندگی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ جب رسالہ کھولتی تھی اسی کو پڑھنا شروع کر دیتی تھی۔ ہر بار آخر تک آتے آتے آنکھ میں پانی بھر جاتا تھا۔ دونوں کے لیے دل سے دعا نکلتی تھی۔ عذرا رسول کے لیے اور معراج رسول صاحب کے لیے اور عذرا رسول کے لیے ایک شعر۔ محبت کے اک لمحے میں، بتا دی زندگی ہم نے...... عظمیٰ نے بھی کمال کا لکھا ہے مگر سبق خطرناک ہے۔ ایک بات اور کہنی ہے چھ کہانیاں سلسلے وار چھپیں تو باقی آئندہ زیادہ آئندہ ہو جاتا ہے۔ ایک کو روک کر دوسری کو پورا کر دیں۔ انتظار میں کمی ہو جائے گی۔" (بہت بہتر)

✍ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی سے۔ "اس مہینے میں چھپنے والی اپنی نظم کو دیکھ کر تو یقین کریں میرا سیروں کے حساب سے خون بڑھ گیا۔ عظمیٰ کی اصلاح نے میری نظم میں چار چاند لگا دیے۔ نظم کے چھپنے سے ایک ہفتے قبل ہی اسکول کی میٹرک کی فیرول میں لڑکیوں نے اس پر خاکہ تیار کیا تھا۔ مجھے بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ اب آتے ہیں ماہنامے کی طرف تمام لگاتار ناولز بہت اچھے جا رہے ہیں۔ خاص طور سے شیریں حیدر جو روز بروز ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اللہ انہیں اور زورِ قلم عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ عالیہ بخاری اب طوالت کے باعث کچھ مزہ نہیں آ رہا ہے جلد از جلد روما کو سمعیہ کا اصل چہرہ کروا ہی دینا چاہیے۔ بے چاری زارا خواہ مخواہ میں پس رہی ہے۔ اب آتے ہیں شاندار لو اسٹوری کی طرف جس کے ہیرو اور ہیروئن نے واقعی اپنی محبت کو امر کر دیا۔ جی ہاں، عذرا رسول اور معراج صاحب...... اللہ تعالیٰ ان دونوں کی جوڑی کو یونہی سلامت رکھے اور معراج صاحب کو صحت عطا فرمائے۔ واقعی محبتوں کا بار بے حد بھاری ہوتا ہے مگر عذرا صاحبہ نے واقعی محبتوں کا حق ادا کر دیا۔ خدا عذرا کے سر کے سائیں کو سلامت رکھے اور انہیں بھی ایسی ہی بہو عطا فرمائے جو اُن کے باغیچے کا پھول ثابت ہو۔ بہنوں کی محفل پڑھ کر سب کی خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ اس دفعہ عظمیٰ صاحبہ کا مختصر افسانہ پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ عظمیٰ کو میری طرف سے بے حد مبارک باد۔ باقی تمام سلسلے بھی حسبِ روایت شاندار تھے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ یاسمین چوہدری، سیالکوٹ سے۔ "سرورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ باقی مستقل سلسلے اپنی مثال آپ تھے۔ جن میں سے جلترنگ ہمارا موسٹ فیورٹ ہے۔ انجم آنٹی محبت ہم سفر میری کا اختتام دل خوش کر گیا۔ پلیز آنٹی جی یہ جملہ لکھنے کو ہم بہت ہی بے تاب ہو رہے ہیں۔ عالیہ جی کو سمعیہ کی اصلیت جلد ہی ہارون اور روما کے سامنے لے آنی چاہیے۔ شہوار کو تو تنویر کی اصلیت جان کر جو صدمہ ہوا اسے پڑھ کر ہمیں در شہوار سے بہت ہمدردی ہوتی ہے۔ تہمینہ کی نیا کو بھی پار لگا دیجیے۔ ایک تھی نیناں میں ہمیں سب سے زیادہ متاثر یہ راجا صاحب،

ڈاکٹر اور سکھاں کے کردار کر رہے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ ہی نیناں کی دادی مرحومہ ہیں۔ باقی رائٹر صاحبہ ہی بہتر جانتی ہیں۔ شیریں آنٹی کا ناول تو ہمیں لگتا ہے کہ امر بیل کا ریکارڈ توڑ دے گا، انشاء اللہ۔ آنٹی جی نوخیز انجم صاحبہ تو لندن جانے کے بعد ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔ عظمیٰ آفاق سعید کا ایسی کی تیسی اچھا لگا۔ آنٹی عذرا رسول صاحبہ کے انٹرویو کے تو کیا ہی کہنے۔ رضوانہ آنٹی نے تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ عذرا جی کی گلابی رنگت کا راز بادام اور دودھ اور اس سے بھی زیادہ معراج انکل صاحب کی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی جوڑی کو سلامت رکھے۔ آنٹی جی آپ کی دعاؤں میں اب ہماری بھی دعائیں شامل ہیں۔ ذیشان تو بالکل ہمارے بھائی محمد قاسم جیسا ہے۔ ماشاء اللہ ویسا ہی قد کاٹھ، ویسا ہی بالوں کا ہیر اسٹائل۔ ہمارا بھائی دو ماہ قبل ہی پڑھائی کے سلسلے میں انگلینڈ گیا ہے اور ہم اسے بہت مس کرتے ہیں۔ اس لیے ہم عذرا آنٹی کی اداسی کو محسوس کر سکتے ہیں۔" (ہاں پردیس جانے والے تو یاد آتے ہی ہیں اور آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہے)

جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ "دعائیں کتنی جلدی قبول ہوتی ہیں۔ یہ اگر ملنا نہیں ہمدم کو پڑھ کر معلوم ہوا۔ یہی تو چاہ رہے تھے کہ اب رافع کی ارسلہ سے ملاقات ہو جانی چاہیے سو اس قسط میں ہوگئی مطلب دونوں کے ملنے کے چانس بن گئے۔ دل بے تاب پڑھ کر تو دل بہت اداس ہو گیا۔ اپنی اولاد کسی کے حوالے کرنا بڑا مشکل ہے جی۔ محبت میں واقعی تڑپ ہی ملتی ہے۔ ناول اچھا تھا باقی ناول، افسانے سب ہی زبردست تھے سب رائٹرز تعریف کے قابل ہیں۔ جلترنگ میں چھوٹے بڑے خواب نے ڈیڑھ پاؤ خون بڑھا دیا۔ جب انجم آپی کے پاس جاتے ہیں تو ایک دم فریش ہو جاتے ہیں۔ فرح غفار کی غزل پسند آئی۔ سندیسے میں صبا نور کا ڈر سندیسہ پسند آیا۔" (شکریہ)

رفعت مبین رفی، کراچی سے۔ "مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب ہیں۔ ثنا منظر کا افسانہ غرورِ حسن کے غرور میں چور لڑکیوں کے لیے بہت اچھا سبق ہے۔ خوشبو کا سفر بہت اچھا جا رہا ہے۔ سمیعہ اور شہوار دونوں کو سزا ملنی چاہیے۔ اسما علی سید کا افسانہ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ میں چاندی بہت مزیدار ہے پڑھ کر مزہ آ رہا ہے اور اختتام کا انتظار ہے۔ شیریں حیدر کیا خوب لکھتی ہیں۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ قربتوں کی دوری پڑھ کر دل کانپ گیا اور یہی تو رائٹر کا کمال ہے۔ اگر ملنا نہیں ہمدم کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی ایک قسط پڑھ کر اگلی کا بے چینی سے انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ لبنیٰ عروج کا ناولٹ ایک منفرد تحریر لگی، گھنٹوں اس کے حصار سے باہر نہیں آ سکی۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ ہاں اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟)

طاہرہ پروین آرائیں، فیصل آباد سے۔ "سب سے پہلے معذرت خواہ ہوں کہ میں چند ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے آپ کو خط لکھنے کی باقاعدگی کے عزم پر قائم نہ رہ سکی لیکن میں پاکیزہ کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتی رہی۔ تازہ شمارے میں آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح جاندار اور بے حد اہم ہے۔ آپ نے انسانی زندگی میں کام کی اہمیت کو بڑے اچھوتے پیرائے میں مختصر آرا، جامع الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ یہ مختصر تحریر بار بار پڑھنے اور پھر عمل کرنے کے لائق ہے۔ محترمہ عذرا کے انٹرویو کی دونوں قسطیں غور و توجہ سے پڑھیں۔ عذرا صاحبہ جس صبر و تحمل اور اخلاص و محبت سے اپنے میاں معراج رسول صاحب کی حسین و دلآویز یادوں کو قلب و نظر میں بسا کر ان کی خدمت کر رہی ہیں وہ دنیاوی لحاظ سے لائقِ تحسین اور حیاتِ اُخروی کے لحاظ سے مستحق

اجرِ کریم ہے۔ جو انشاء اللہ بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پا کر ان کو فائز المرام ٹھہرائے گا۔ انہوں نے بذلہ سنجی، متانت اور حوصلے سے اپنی ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کا تذکرہ کیا اور خوب کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے جذبۂ ایثار کو قائم و دائم رکھے۔ ایک اور بات جس سے جی خوش ہوا وہ محترمہ مدیرہ انجم انصار صاحبہ کی ادارے کے لیے خدمات کو محترمہ عذرا صاحبہ کا بھرپور انداز سے خراجِ تحسین پیش کرنا ہے۔ جو اُن کی گوہر شناسی کی عمدہ صفت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ ان کی وسعتِ قلبی اور بالغ نظری قابلِ داد ہے۔ مجموعی طور پر پاکیزہ خوب سے خوب تر کی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور ہم اس کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔" (شکریہ)

عارفہ مسعود، لاہور کینٹ سے۔ "جون کے پاکیزہ میں اتنے خلوص سے خوش آمدید کہا گیا کہ میں پشیمان ہو گئی کہ مجھے تو لگا تھا شاید میرا خط پڑھا بھی نہ ہو مگر آپ کے خلوص نے قریب آنے کا موقع فراہم کیا۔ جون کا شمارہ حسبِ معمول دلکشی سمیٹے ہوئے تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ناگن بلقیس جہاں کی کاوش نے مجھے حقیقت میں ایسا کردار یاد دلا دیا۔ یہ امریکا کی خواتین پر ہی صادق نہیں، ہمارے ارد گرد بھی بہت ساری ناگنیں ہیں۔ عطیہ عمر کا بھی کبھی شدت سے پختگی دلا گیا کہ قسمت اور نصیب اوپر والے کے ہاتھ میں ہے صرف نیت اچھی ہونی چاہیے۔ سلسلے وار ناول بہت اچھے ہیں ان کے کردار زندگی کے دائرے میں جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ عظمیٰ آفاق سعید کی کہانی پڑھ کر دل نے بے اختیار کہا ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات یا پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔ انجم جی یہ ضرور بتایئے گا کہ دکھوں، غموں، تکلیفوں سے بھری زندگی میں آپ ان کو مزاح کا روپ کیسے دے دیتی ہیں۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کیا چیز بہت ضروری ہے؟ (درگزر اور برداشت) عذرا رسول کی بے حد دلچسپ کہانی پڑھی اور دلکش تصاویر دیکھیں۔ میں کسی زمانے میں جذبۂ محبت کو نہیں مانتی تھی مگر یہ جذبہ پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں موجود ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ تو اللہ کی خاص رحمت ہے۔ اگر میں نے خود اس جذبے کی حقیقت کو نہ جانا ہوتا تو شاید مجھے گپ بازی لگتی مگر عذرا بے حد خوش قسمت ہیں اور میرے دل سے دعا نکلی کہ اللہ آپ کو صبر، حوصلہ، ہمت دے، باغباں اپنی کیاری کو محبت سے سینچتا رہا اور وہی چمک اُن کے چہرے کو الوہی روپ دے رہی تھی۔" (بے شک)

رقیہ مہر اعوان، راول پنڈی سے۔ "سالگرہ نمبر 3 میں عذرا رسول صاحبہ کی خوب صورت یادگار تصویروں اور دلچسپ باتوں کے ساتھ جون کا پاکیزہ دلکش لگا۔ وہاں ان کی خوب صورت یادوں نے موڑ پلٹا اور گردشِ ایام نے چاند سے جوڑے کو آزمائش میں ڈال دیا۔ وہاں دکھ ہوا لیکن ہمت اور بہادری نے دعاؤں کا سہارا لیے عذرا رسول صاحبہ کو پہلے کی طرح ہی چاق و چوبند کر دیا اور انہی دعاؤں کا ثمر ہے کہ محبتوں کے بے لوث ثمر نے خلوص کی تمام حدیں عبور کیں۔ معراج رسول صاحب کو تندرستی عطا فرمائی۔ وہاں ہی ایک بات یاد آئی کہ خاردار راستوں سے گزر کے ہی چہرے گلاب بنتے ہیں۔ ناول اور ناولٹ سارے ہی اچھے ہیں۔ میں چاندی اچھا لگا اور عظمیٰ آفاق کا افسانہ بھی عمدہ لگا۔" (شکریہ، ہاں ابھی آپ کا افسانہ پڑھا نہیں گیا ہے)

سیدہ صائمہ، کراچی سے۔ "انجم آنٹی معذرت کے ساتھ میں نے پاکیزہ کے ہی کسی شمارے میں ایک بات پڑھی تھی کہ کسی بھی تحریر کا اختصار اس کی خوبی ہوتا ہے یہ بات عالیہ بخاری جی کو سمجھنی چاہیے..... خوشبو کا سفر اور اس کی طوالت اب دونوں ہی بور کر رہے ہیں۔ ہاں شیریں آنٹی کو مبارک یا دوہ اپنے ناول کو بالکل اسی طرح

لے کر چل رہی ہیں جس طرح تیزی کے ساتھ آپ نے اپنا ناول محبت ہم سفر میری لکھا تھا نہ تو کہیں بوریت محسوس ہوئی اور نہ ہی ناول غیر ضروری طوالت کا شکار ہوا باقی راحت وفا اور رضوانہ پرنس بھی کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں ہاں مگر میمونہ خورشید کا میں چاندی واقعی ہٹ جا رہا ہے۔ آنٹی آپ اپنے جلترنگ کے خاکے ٹی وی پر کیوں نہیں دیتیں جس طرح پرانا پروگرام آتا ہے پی ٹی وی سے ففٹی ففٹی نام ہے اس کا اس میں صرف مزاحیہ خاکے دکھائے جاتے ہیں۔ آنٹی ایک بات تو بتائیں اگر بے تحاشا دعاؤں وظیفوں کے باوجود بھی اگر آپ کی کوئی جائز مراد پوری ہونے میں نہیں آ رہی تو اس کا کیا مطلب ہے، کیا دعا کرنے والا بے حد گناہ گار ہے یا پھر ہمارے مانگنے میں ہی کوئی کمی رہ گئی ہے؟'' (اگر ہماری کوئی دعا پوری نہیں ہوتی تو اس میں یقیناً اللہ کی کوئی مصلحت ہے مگر ہمیں اللہ کی ذات سے ہرگز مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اس سے مسلسل مانگتے رہنا چاہیے کہ وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے)

زینت عبدالصمد، میرپور ساکرو سے۔ ''سب سے پہلے تو بات ہو جائے سرورق کی...... خوب صورت نینوں والی دوشیزہ بھی شاید گرمی سے بیزار تھیں جو نیکلس تو ندارد جھمکوں کے سہارے بھی لڑکے پھر رہے تھے۔ ہاں میک اپ غضب کا تھا۔ آخر سالگرہ نمبر 3 کا شمارہ تھا کوئی ایویں شیویں تو نہیں۔ خیر بے تابی سے اندرونی صفحات پلٹے اور فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ تک پہنچے۔ پہلے حصے میں عذرا رسول کی داستان تو داقعی شہزادیوں کی سی محسوس ہو رہی تھی مگر اس حصے میں جب انہوں نے اپنی تکلیف دہ یادوں کا تذکرہ کیا تو آنکھ نم ہو گئی۔ ثنا کی دائمی جدائی، معراج صاحب کی علالت اور عذرا کی ثابت قدمی بے شک اللہ پاک انسان کی آزمائش اسی طرح کرتا ہے اور یہ حوصلہ بھی کسی کسی میں ہوتا ہے کہ آزمائش سے گزر سکے۔ اللہ پاک عذرا کو سرخرو کرے اور معراج صاحب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ عالیہ بخاری کا خوشبو کا سفر تیک روی سے اختتام کی جانب گامزن ہے وہ بڑی تسلی سے تمام کرداروں کو سمیٹ رہی ہیں۔ سمیعہ کی شدت پسندی، زارا کی اعلیٰ ظرفی، شہوار کی پشیمانی، روما کی تشویش، تہمینہ کی پیش بندی ان سب نے مل کر اس ناول کو معاشرے میں پائے جانے والے ہر طبقے کے احساسات و جذبات سے مزین کر دیا ہے۔ مینا کی پیش قدمی اور تہمینہ سے کیے گئے مکالمے نے ثابت کیا کہ ہر گزرا لمحہ ماضی ہے اور ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ روما کے لیے بھی راہیں روشن ہوتی نظر آ رہی ہیں آخر سیف کا زارا سے ٹکرانا یقیناً کہانی میں ٹوئسٹ آ رہا ہے۔ شیریں حیدر نے ایک دفعہ پھر شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں میں اپنی تیکھی اور تند تحریر کے ذریعے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ تانا بانا عمدگی سے بنا ہے اس دفعہ چوہدرانی کے ظالمانہ فیصلے نے دل و دماغ کو ہلا ڈالا۔ کیا انسان اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ بے شک مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ ناگن بلقیس جہاں نے عورت کے ایک کریہہ روپ کی منظر کشی کی۔ راحت وفا کی ایک تھی نیناں کے سب ہی کردار کچھ الجھے الجھے سے نظر آ رہے ہیں۔ ابھی تو آغاز ہے آگے چل کر یہ گتھیاں سلجھنے لگیں گی۔ میمونہ خورشید...... میں چاندی میں ارسہ کا کردار تو یوں لگتا ہے جیسے اسٹار پلس کی کوئی ہیروئن ہو کیونکہ ہر مسئلے اور مشکل کو شاطرانہ انداز میں اس طرح حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔''
(تبصرے کا شکریہ میمونہ علی کے اس ناولٹ کو سب بہنیں پسند کر رہی ہیں)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال کراچی سے۔ ''جولائی کا پاکیزہ اتنی جلد پڑھ لیا اب کیا کریں؟ شمارہ ماہ میں دو مرتبہ شائع کیا کرو۔ پچھلے ماہ ملاقات تو ہوئی مگر بات نہ ہو سکی سو کچھ جون کے شمارے کے بارے

...ں۔ عذرا کا انٹرویو رسالے کی جان تھا دل تو چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ ابھی اور چلتا مگر ان حالات میں جو عذرا کو درپیش ہیں ان کا اتنا وقت نکالنا ہی بہت ہے۔ جس طرح سے انہوں نے پاکیزہ سے وابستہ افراد کو اپنا جان کر کھلے دل سے اپنی خوشیاں اور دکھ شیئر کیے وہ بہت اچھا لگا اور انٹرویو کو چار چاند لگا گیا۔ دل سے دعائیں نکلی ہیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین) عظمیٰ کا ایسی کی تیسی ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر تھی مجموعی طور پر شمارہ اچھا تھا، اب بات کریں جولائی کے شمارے کی۔ دین کی باتیں ایمان افروز ہیں۔ ذکیہ نے اپنے ناول کا صحیح وقت پر اختتام کر دیا اور ارسلہ نے شہاب کے حق میں فیصلہ بہت مناسب کیا۔ اس سے بہتر اختتام نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی گمان بھی نہیں میں تحسین اختر نے بے سہارا عورتوں کی مجبوریوں...... اور ان کے احساسات کی بہت خوب صورت انداز میں ترجمانی کی ہے۔ میمونہ خورشید کی میں چاندی دلچسپ اور سبق آموز ہے ارسہ اور ان کی والدہ تے تو اسٹار پلس کے خواتین کرداروں کو مات دے دی۔ شیریں حیدر کی شیشوں کا مسیحا اور بھی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ تجسس بھی بڑھ رہا ہے۔ راحت راجپوت کی شادی کی مووی اچھی تحریر ہے بعض دفعہ فضول سے شوق بھی کتنے کارآمد ہوتے ہیں۔ قربتوں کی دوری، رضوانہ پرنس کی بھی اچھا رنگ جما رہی ہے۔ روبی اب کیا کرتی ہے انتظار ہے جاننے کا۔ عالیہ حرا کی دستِ آئینہ گر اچھی لگی۔ ایک تھی نیناں تو ایسا لگتا ہے یادداشت اور عقل کا امتحان ہو رہا ہے۔ پیاری انجم تم نے صحیح کہا نئی مصنفات کو پہلے مختصر تحریروں کے ذریعے قدم جمانے چاہئیں۔ لطیفہ قمر کی رابطہ، سلمیٰ غزل کی موسم کی دستک بھی اچھی تحریریں ہیں۔ خوشبو کا سفر طوالت کے باوجود پڑھتے وقت اپنے میں جذب کر لیتی ہے بہرحال اگر اختتام ہو جائے تو ناول زیادہ اچھا اثر چھوڑے گا...... بہنوں کی محفل حسبِ معمول خوب بجی ہے، تمہیں پوتا اور بھتیجی کی شادی مبارک...... بہنوں کو تم نے تحریروں کے موضوعات کے بارے میں بہت معقول رائے دی ہے۔ جن بہنوں کو خوشیاں ملیں انہیں بہت مبارک ہو اور جو لوگ پریشان یا بیمار ہے ان کے لیے بہتری کی دعائیں۔ یسما بنت عاصم نے اپنے بارہ سالہ دور میں پہلی بار تنقید کا سامنا کیا اور اس قدر بھرپور وضاحت کی ضرورت محسوس کی یہ ہی کہہ سکتے ہیں...... خیال اپنا اپنا۔ عظمیٰ نے سروے دلہن بنتی ہیں نصیبوں والیاں بہت محنت اور لگن سے سجایا ہے۔ تمام تجربے کار دلہنوں نے اچھے مشورے ہی دیے ہیں۔''

آصفہ سحر، لاہور سے۔ ''سرورق بہت خوب صورت لگا فلمی ہیروئن سی نازک سی لڑکی بہت اچھی لگی۔ اب نئے ناول شروع ہو گئے ہیں مگر اب جو تین سال سے چل رہا ہے اسے بند کریں...... سہیلی لفظ سے نفرت سی ہونے لگی ہے پڑھ کر۔ عذرا رسول سے ملاقات اچھی لگی۔ جلترنگ نے حسبِ معمول مزہ دیا۔ آپ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہیں میں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

آئندہ شمارہ عید کے حوالے سے ہوگا عید کی مناسبت سے اپنی تحریریں جلد از جلد ارسال کر دیں اور اب اجازت دیجیے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی و سماوی آفات، تمام پریشانیوں اور شیطانوں کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے، آمین ثم آمین۔

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

اللہ کے مہمانوں کی ذمے داریاں

قیصرہ حیات

مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور ہر میزبان اپنی بساط کے مطابق اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ وہ اس کے گھر سے خوشگوار یادوں اور اچھے احساس سے واپس جائے۔ اس کے دل میں میزبان کی قدر و منزلت بڑھے اور اس کے اندر تشکر کا احساس پیدا ہو۔ جہاں میزبان پر یہ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں وہیں مہمان کو بھی اپنے فرائض سے بری الذمہ نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کے گھر مہمان بن کر جانے سے پہلے وہ اپنے لباس کا خاص اہتمام کرتا ہے سوچتا ہے کہ ایسا لباس پہن کر جائے کہ میزبان اسے دیکھ کر خوش ہو جائے۔ اسے احساس ہو کہ مہمان اس کے گھر بہت محبت اور شوق سے آیا ہے۔ مہمان کی دوسری ذمے داری یہی ہے کہ وہ میزبان کے لیے واقعی رحمت ثابت ہو نہ کہ زحمت...... اس کے گھر کو صاف ستھرا رکھے اور اتنا شور شرابہ نہ کرے کہ میزبان یہ خواہش کرنے لگے کہ ایسا مہمان جلد از جلد واپس چلا جائے تو بہتر ہے۔

اس دنیا میں اللہ رب العزت اور اس کے حبیب ﷺ سے بڑھ کر عظیم المرتبت میزبان اور مہمان نواز کوئی نہیں اور ان کی اس عظمت کا مشاہدہ تمام زائرینِ عمرہ و حج کرتے ہیں کہ دنیا کے ہر ہر کونے سے دن اور رات کے ہر پہر میں قافلوں کے قافلے اللہ کے گھر مہمان بن کر آتے ہیں۔ ایسی ایسی اقوام اور رنگ و نسل کے لوگ دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں کو اپنی محبت سے کیسے سرشار کر رکھا ہے کہ وہ اس کی خاطر دور دراز کا سفر طے کر کے آنکھوں میں اشکوں کے جام لیے لبوں پر اس کی حمد و ثنا اور لبیک اللھمہ لبیک پڑھتے اس کے دربار میں پورے خلوص اور عقیدت سے حاضری دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا روح پرور منظر کسی معجزے سے کم دکھائی نہیں دیتا اور انسان حیران رہ جاتا ہے کہ پروردگار کے دامن میں کتنی وسعت ہے کہ ہر آنے والے کو وہ ان کی خواہشات کے مطابق خوش کر کے بھیجتا ہے اور ہر کوئی وہاں سے لوٹنے والا بہت پُرکیف اور اپنائیت کے احساس سے لوٹتا ہے۔ یہ اللہ رب العزت کا کرم خاص ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کو وہ اپنے گھر بلاتا ہے اور انہیں اپنا مہمان بناتا ہے۔ مجھ گنہگار کو بھی عمرے کی سعادت نصیب ہوئی اور میں یہ مضمون اس لیے نہیں لکھ رہی کہ ان مقدس مقامات کے بارے میں تفصیلات بتاؤں بلکہ بہت افسوس اور دکھ سے لکھ رہی ہوں کہ وہاں پاکستانی قوم اور خصوصی طور پر پاکستانی خواتین کے رویوں کے بارے میں لکھوں کہ اقوام عالم میں پاکستانیوں کا کیا مقام ہے اور پاکستانی اپنے وقار کو کس طرح خود داغدار کرتے ہیں۔ ان لمحات میں اس قدر شرمندگی ہوتی ہے کہ ہمارے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اکثریت کو اخلاق و ادب اور مینرز کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اس لیے سوچا ہے کہ لوگوں کو اس بارے میں آگہی دے کر میں تو اپنا فرض پورا کر دوں۔ ممکن ہے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کر سکوں۔

سب سے پہلے میں لباس کے بارے میں ذکر کروں گی، پاکستان سے جانے والی خواتین و مرد کی اکثریت عمر رسیدہ لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس عمر کی خواتین اپنے لباس کے پردے کا نہ تو یہاں اتنا خیال کرتی ہیں اور نہ ہی بیت اللہ شریف میں اور مسجد نبوی ﷺ میں۔ یہاں سے خصوصی طور پر لان اور چکن کے سوٹ سلوائے جاتے ہیں اور چکن کے آف وہائٹ اور لائٹ کلرز کے۔ جن کے نیچے شمیزیں پہننے کی زحمت بھی نہیں کی جاتی اور ویسے ہی لان کے چر مر دوپٹے، جو نہ تو سینوں کو اچھے طریقے سے ڈھانپتے ہیں نہ جسموں کو۔ تمام عرب خواتین کے علاوہ امریکا، انڈونیشیا اور تقریباً دور دراز ممالک کی خواتین نے اپنے اپنے انداز سے اپنے لباسوں کے اوپر عبائے، کوٹ، اسکارف اور رومال اس خوب صورت انداز سے لیے ہوتے ہیں کہ ذرا سی بے پردگی دکھائی نہیں دیتی اور وہ اس متبرک ماحول کے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے ملک کی بھی کچھ خواتین نے برقع اور عبائے پہنے ہوتے ہیں مگر ایک نوجوان لڑکی پر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ عمرے سے واپسی کے بعد ہوٹل میں آ کر کھلے بالوں اور گلے میں دوپٹے کے ساتھ وہ بنگالی ملازم کے ساتھ کسی مسئلے پر بحث کر رہی اور اسے ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس کے دربار سے لوٹی ہے.... اور کیا وہاں کا اثر اتنا تھوڑا ہوتا ہے کہ انسان فوراً بدل جاتا ہے۔ بات صرف محسوس کرنے کی ہے کہ ہم کہاں آئے ہیں اور ہماری ذمے داری کیا ہے۔ روضہ رسول ﷺ کی زیارت کے لیے تمام ممالک کی خواتین کے گروپ بنائے جاتے ہیں۔ پاکستانی اور انڈین خواتین کا علیحدہ گروپ ہوتا ہے اور ایک نقاب پوش معلمہ (گائیڈ) بتاتی ہے کہ کس طرح حاضری دینی چاہیے اور تمام ضروری ہدایات دیتی ہے۔ اس معلمہ نے پاکستانی خواتین کے بارے میں جو کہا۔ وہ قارئین کی نذر ہے۔

”تمام ممالک کی خواتین میں سب سے زیادہ برا لباس پاکستانی خواتین کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ باریک لباس پہنتی ہیں اور دوسرے پردے کا کوئی خیال نہیں رکھتیں۔ روضۂ اقدس پر صرف حاضری ہی ضروری نہیں، ادب و احترام اور اخلاقیات بھی بہت ضروری ہیں اور پاکستانی خواتین کی اکثریت ان باتوں کا بالکل خیال نہیں رکھتی۔“

اس کے بعد جب روضۂ اقدس پر حاضری کے لیے دروازے کھلتے ہیں تو میں نے خود ایک دراز قد دیہاتی عورت کو دوسری کا بازو کھینچ کر اچھلتے ہوئے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ ”چل چل جلدی کر، جگہ نہیں ملنی۔“ اور ریاض الجنۃ میں وہ دھکم پیل ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ..... ظاہر ہے ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں نوافل ادا کرے مگر وہاں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں ملتی جس جس کو جگہ ملتی ہے وہ نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری خواتین بنا نیچے دیکھے اوپر سے پھلانگنے کی کوشش کرتی ہیں جبکہ دوسرے ممالک کی خواتین (خصوصاً ترک، شام وغیرہ) جب نوافل ادا کرتی ہیں تو ان کی ہم قوم ہاتھوں سے ان کے گرد حلقہ باندھ کر ہجوم کو روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ مسجد نبوی ﷺ سے باہر صحن میں دیواروں کے ساتھ اکثریت پاکستانی مرد و خواتین کی ہوتی ہے۔ جو نمازوں کے اوقات میں فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہو کر خوش گپیوں اور کھانے پینے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور کھانا کھا کر وہیں کچرا پھینک دیتے ہیں۔ بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی ﷺ میں صفائی ستھرائی کا

قابلِ رشک انتظام ہے۔ وہاں زیادہ دیر تک کچرا اور گندگی دکھائی نہیں دے سکتی مگر بحیثیت مہمان ہم اپنی ذمّے داریاں پوری نہیں کرتے۔ یہاں پر عقیدت اور جوش وخروش سے نعتیں پڑھی جاتی ہیں جن میں دعا کی جاتی ہے کہ اللہ انہیں اپنے اور اپنے حبیب کے در پر بلائے اور جب وہاں جاتے ہیں تو عملی طور پر سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے یوں لگتا ہے جیسے پکنک منائی جارہی ہو۔

ایک اور بات جو بہت شرمندہ کرتی ہے وہ یہ کہ جیسے ہی کوئی کھجوریں، ٹافیاں اور کھانے پینے کی چیزیں بانٹی جاتی ہیں پاکستانی خواتین دھکے دے کر نبی ﷺ کے در کا لنگر لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کہ انہیں ایک ٹافی یا کھجور ملے۔ اپنے ہمراہ وہ بہت سی دوسری خواتین کے حصے مانگتی ہیں۔ یہ فرق میں نے خود دیکھا ہے۔ دوسرے ملک کی خواتین کو جیسے ہی کوئی چیز دی جاتی تھی وہ مشکوراً، جزاک اللہ، بالخیر وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ مسکرا کر شکریہ ادا کر کے جاتی تھیں اور ہماری خواتین اپنا حصہ لینے کے بعد میری بہن اور اس کے بچوں کا بھی حصہ دیں۔ بانٹنے والا تو بانٹنے آیا ہے مگر لینے والا بھی اپنے اخلاق کا مظاہرہ کررہا ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں اپنی جگہ بنا رہا ہوتا ہے اور ایک سب سے افسوسناک بات جو میں نے وہاں دیکھی اور میرا سر شرم سے جھک گیا، وہ میں قارئین کے گوش گزار کرنا چاہوں گی ترک، مصر، شام اور دوسرے عرب ممالک کی خواتین پاکستانی تعارف سن کر اکثر خوش ہوتی ہیں۔

میں مسجد نبوی ﷺ کے صحن میں ایک ستون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مجھ سے اگلی صف میں کچھ ترک خواتین نماز پڑھ رہی تھیں، وہ نماز سے فارغ ہوئیں تو کراچی کی ایک دبلی پتلی، قدرے ادھیڑ عمر عورت ہاتھ میں ایک کارڈ جس پر درود لکھا تھا وہ لے کر ان ترکی خواتین کے پاس بیٹھی۔ ان کو کارڈ دکھا کر اپنا تعارف پاکستانی کہہ کر کرایا تو ترک خواتین نے مسکرا کر اس کو دیکھا۔ اس کے بعد اس نے ان سے کچھ کہا تو اُن کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے جیسے ہی اپنا بیگ کھولا تو یہ ندیدوں کی طرح بیگ کے اندر جھانکنے لگی اور ترک خاتون نے پاکستانی عورت کو دس ریال دیے اور وہ پھر منہ بناتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ میں نے اس پاکستانی عورت کو بلایا اور پوچھا کہ اس نے ان سے پیسے کیوں لیے ہیں اور اس نے جو جواب دیا وہ بالکل جھوٹ پر مبنی تھا اور اس کو ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا کہ وہ کس ہستی کے دربار میں کھڑی ہے۔ کہنے لگی۔ ”ان ترک خواتین نے مجھے یہ ریال اس لیے دیے ہیں کہ میں اندر ڈال دوں۔“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا روضۂ پاک پر؟“ وہ بوکھلا گئی ہاتھ میں پکڑا کارڈ دکھا کر کہنے لگی۔ ”انہوں نے کہا تھا۔ ہمیں بھی یہ لا دو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا وہ خود آپ کے پاس یہ دیکھنے گئی تھیں۔ جبکہ میں نے تو دیکھا ہے کہ آپ خود چل کر ان کے پاس آئی ہیں۔ آپ کیوں ایسی حرکتیں کر کے پاکستان کو بدنام کررہی ہیں۔“ اس پر وہ عورت کہنے لگی۔ ”اللہ نے اپنے کو بھی بہت دیا ہے۔ ان اپنے کو بھی دیا ہے۔“ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ یہ صرف ایک مثال ہے ایسی بہت سی مثالیں وہاں آپ کو ملیں گی جو بحیثیت پاکستانی آپ کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

حرم پاک اور مسجد نبوی ﷺ میں نماز کی جگہ کے بارے میں سب لوگ پوزیسو ہوتے ہیں مگر دوسرے ممالک کی خواتین پھر بھی دوسروں کو نماز کے لیے جگہ دے دیتی ہیں مگر ہماری پاکستانی خواتین خود اپنی پاکستانی خواتین کو جگہ نہیں دیتیں۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ ہم سب ان ہستیوں کے دربار.... میں کھڑے ہیں جو کمزوروں، دھتکارے ہوؤں کو گلے سے لگاتے ہیں، یہ کیا معلوم کہ صف میں کھڑے ہونے والے کی نماز قبول بھی ہوتی ہوگی یا نہیں۔

ہوٹلز میں جب ایک روم چار پانچ لوگوں میں شیئر کیا جاتا ہے تو ہر کوئی اتنا پوزیسو ہوتا ہے کہ دوسرے کے آرام کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ کوئی رات گئے تک ٹی وی بلند آواز میں دیکھ رہا ہے کوئی واش روم اتنا استعمال کرتا ہے کہ دوسرے کی باری نہیں آتی۔ میں نے اکثر لوگوں کو یہ شکایت کرتے سنا ہے۔ ہوٹلز میں جب کھانا کھانے کے لیے جایا جاتا ہے تو ذرا سی تاخیر پر مرد حضرات یوں غصے کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر کھانا نہ ملا تو نہ جانے کیا قیامت برپا ہوجائے گی۔ جب پارہ زیادہ ہائی ہوجاتا ہے تو گالی گلوچ پر بھی اتر آتے ہیں۔ حرم پاک سے باہر پاکستانی مرد گروپس کی شکل میں بیٹھ کر خوب اسموکنگ کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایسی ایسی گپیں ہانک رہے ہوتے ہیں کہ سن کر حیرانی ہوتی ہے۔

الغرض بدتہذیبی اور بدنظمی کا ایسا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ پاکستانی قوم کا شمار سب سے نچلے درجے کی قوم میں ہوتا ہے۔ جس کا کوئی اخلاق نہیں اور جن میں کوئی مینرز نہیں، یہ بھی نہیں کہ سب پاکستانی لوگ ہی ایسے ہیں، بہت اچھے لوگ بھی ملتے

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہیں جیسے کہ کراچی کی بہن شاہدہ اسلام، امریکا سے آئی تھیں۔ بہت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا اور ان سے مل کر بہت خوشی بھی ہوئی مگر اکثریت نے مایوس کیا۔ میں بھی پاکستانی ہوں اور جہاں پاکستانی قوم کا وقار بلند ہوتا ہے تو سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ اس لیے اپنے لوگوں سے التماس کرتی ہوں کہ جہاں بھی جائیں تو یہ ضرور سوچیں کہ آپ اپنے ملک کے نمائندے ہیں، اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کے ہاں مہمان بن کر جارہے ہیں۔ ایسے مہمان بنیں کہ میزبان بھی خوش ہوجائیں اور آپ پر رحمتیں اور برکتیں نازل کریں۔ وہ تو بہت وسیع القلب ہستیاں ہیں، آپ بھی اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیجیے اور ان کے دامنِ وسعت میں سمانے کی کوشش کریں۔ ایسے مہمان بن کر جائیں جن کے آنے کی میزبان بھی بار بار خواہش کریں اور محبت سے ان کا استقبال کریں۔ ایسے اخلاق اور نظم وضبط کا مظاہرہ کریں کہ دوسری اقوام کے لوگ آپ سے مصافحہ کرنے میں فخر محسوس کریں۔ ضرورت اپنے اخلاق اور تربیت کو سنوارنے کی ہے، ہم سب جب اپنی اپنی جگہ بہتری کی کوشش کریں گے تو ایک اچھی تبدیلی ضرور آئے گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو بدلیں اور بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

★★★



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا نشاں ہے لامحدود
اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا ہر شے میں ہے وجود
کھلتے ہوئے گلابوں میں، سرسبز شادابوں میں
مہکتی ہواؤں میں، پنچھی کی اڑانوں میں
گل کلیوں کی خوشبو میں پُرکشش نظاروں میں
گلشن کی بہاروں میں شبنم کے ستاروں میں
اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا نشاں ہے لامحدود
اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا ہر شے میں ہے وجود
پنکھڑی لالہ میں خوشبو کی صداؤں میں
صبح نور کی زریں و شوخ اداؤں میں
شام شفق کی سنہری رنگین رداؤں میں
چاند کے جوبن میں چاندنی کی چھاؤں میں

مرسلہ: تحریم فاطمہ، بورے والا

نعت رسول مقبول ﷺ

میں آنکھ بند کروں تو مدینہ دکھائی دے
کھولوں جو آنکھ پھر سے مدینہ دکھائی دے
بے تابیوں کی تجھ کو خبر ہے مرے خدا
جب حاجیوں کا مجھ کو سفینہ دکھائی دے
ہوں قافلے کے ساتھ پیادہ رواں دواں
چھالے بھی پھول ہوں جو مدینہ دکھائی دے
چاروں طرف ہیں شہر کے پُرنور نظارے
پر گنبد سبز مثل نگینہ دکھائی دے
میں اپنی تہی دامنی ان کو بھی دکھاؤں
کملی میں چھپا گر وہ خزینہ دکھائی دے

مرسلہ: فریدہ افتخار، پشاور

ہم کون ہیں

ہمارے متعلق ملک شام اور اس کے باغات سے پوچھو...... پوچھو یوگوسلاویہ اور رومانیہ کے پانیوں سے بلکہ ربع مسکون کے ہر ٹکڑے سے پوچھو...... ان سب کے پاس ہماری شجاعت، ایثار اور عدالت و شرافت کی خبریں ہیں۔ ہم مسلمان...... ہیں۔ ہمارے سوا کون تھا جس نے شرافت کے باغوں کو اپنے خون سے سینچا ہو، ہم نے کوفہ، بصرہ اور بغداد کو بنایا۔ ہم میں ابوبکرؓ اور عمر فاروقؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے حکمران پیدا ہوئے۔ ہماری قوت، ایمان سے ہے۔ ہماری عزت دین سے ہے۔ ہمارا توکل رب پر ہے۔ ہمارا قانون قرآن ہے۔ ہمارے امام سیدالانبیاؐ ہیں۔ ہم تقویٰ کی سلک میں پروئے ہوئے ہیں۔ وہ زمین ہماری ہے جہاں قرآن پڑھا جاتا ہے اور میناروں سے اذان آتی ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ کاش ہم صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو فتح و کامرانی اور جہاں بانی ہمارا مقدر بن جائے...... ہم مسلمان ہیں۔

مرسلہ: شبنم میر، سیالکوٹ

افکار

☆ تقویٰ یہ ہے کہ قیامت میں کوئی تمہارا گریبان نہ پکڑے اور مروت یہ کہ تم کسی کا گریبان نہ پکڑو۔

☆ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت کا دامن داغدار ہو جائے۔

☆ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کرنے کے لیے الفاظ نہیں اعمال ہوتے ہیں۔

☆ اپنے کاموں کی بنیاد قہر و غضب کے بجائے محبت و آشتی پر رکھو۔

☆ عورت ایک ایسی چیز ہے جس کو پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

☆ جو فرض وقت پر ادا نہ ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی لذت حرام کر دیتا ہے یعنی قضا ادا کرنے میں وہ لذت نہیں ملتی۔

☆ جو شخص سب کی بھلائی مانگتا ہے، اللہ اس کا بھلا کرتا ہے۔

☆ اگر زندگی بچانے کی قیمت پوری زندگی بھی مانگی جائے تو انکار نہ کرنا۔

مرسلہ: تسنیم چوہدری، آکسفورڈ، یوکے

بے شمار مغموم

حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں۔ میں قبرستان میں داخل ہوا جب وہاں سے جانے لگا تو بلند آواز سے کسی نے کہا اے ثابت ان قبر والوں کی خاموشی سے دھوکا نہ کھانا ان میں بے شمار لوگ مغموم ہیں۔

(احیاء العلوم ۲۳)

حضرت حسن بن صالح جب قبرستان سے گزرتے تو فرماتے اے قبرو! تمہارا ظاہر تو بہت اچھا ہے لیکن مصیبت تمہارے پیٹ میں ہے۔

(احیاء العلوم ۱۰)

مرسلہ: بتول فاطمہ، منچن آباد

بہترین انسان

☆ بہترین انسان وہ ہے جو مشکل ترین حالات میں بھی اللہ کی ذات سے ناامید نہ ہو۔

☆ بہترین انسان وہ ہے جو زندگی میں غم ملیں پھر بھی ہنس کر جیے۔

☆ بہترین انسان وہ ہے جو جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر سچ بول کر سولی چڑھنا پسند کرے۔

☆ بہترین انسان وہ ہے جو پھول کی طرح رہے کہ پھول کو پاؤں تلے روندا بھی جائے تو پھر بھی وہ نرمی و تازگی کا احساس دیتے ہیں۔

مرسلہ: عاصمہ محمد شاہد، کراچی

انمول موتی

☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔

☆ اپنا بوجھ دوسروں پر مت ڈالو خواہ کم ہو یا زیادہ۔

☆ زبان درست ہو جائے تو دل خود ہی درست ہو جاتا ہے۔

☆ تین چیزیں اپنے بھیجنے والے کا پتا دیتی ہیں۔ قاصد، خط اور تحفہ۔

☆ دانا ہے وہ شخص جو وقت کو دیکھ کر کام کرتا ہے۔

☆ مصیبتوں کا مقابلہ صبر سے کرو اور نعمتوں کا شکر حفاظت سے کرو۔

مرسلہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

ماں کا حق

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی ماں کی بہت خدمت کی۔ اس کی بیماری کا علاج کروایا، اسے سہولتیں مہیا کیں۔ اس کے پاؤں دبائے اور جو کچھ کر سکتے تھے کیا ہے۔ اس طرح ہم نے ماں کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تمہاری عمر ریت کے ذروں

بارش کے قطروں اور درخت کے پتوں جتنی ہو اور تم اس ساری زندگی میں اپنی ماں کی خدمت کرتے رہو تو تب بھی تم اپنی ماں کا صرف ایک حق بھی ادا نہیں کرسکتے۔ جو اس نے تمہیں نو ماہ تک اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ اس سے سمجھ لیں کہ ماں کی کتنی عظمت اور فضیلت ہے۔ ماں انسان کے لیے رحمت کی چھتری ہے۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ جن کی مائیں زندہ ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کریں۔ آپ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں، زکوٰۃ دیں لیکن یاد رکھیں اگر آپ کی ماں آپ سے ناراض ہے تو آپ کا کوئی بھی عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

میں تمہارے کتنا قریب ہوں
سرخ سِلوں پر گرتی بارش
یوں پھلجھڑیوں میں ڈھل جاتی ہے
جیسے تمہاری کھلتی ہنسی کے تازہ پھول
جب میں خواب آلود سمندر کے
خاموش پل میں جاگتا ہوں
تمہاری یاد کا چاند
میری آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے
لہروں کی آواز
مرے خاموش بدن میں بہتی ہے
جاگ اٹھتے ہیں میرے ساتھ
رنگ، محبت، ریت
اور تمہاری سانس کا لمس

مرسلہ: صابرہ سلطانہ، کراچی

ہری مرچیں

ڈاکٹر پاگل سے۔ ''تم چھت سے کیوں لٹک رہے ہو؟''
پاگل: ''میں ایک بلب ہوں۔''
ڈاکٹر: ''تو پھر تم جل کیوں نہیں رہے؟''
پاگل: ''ابے یہ پاکستان ہے، لائٹ گئی ہوئی ہے۔''

وجہ

بیوی: ''اتنی سلو آواز میں کس سے بات کررہے ہو؟''
شوہر: ''بہن سے۔''
بیوی: ''بہن سے اتنی سلو آواز میں بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''
شوہر: ''تمہاری جو ہے۔''

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

پیاسا دشت

میری وحشتوں کو قرار دے
میں ہوں بے قرار مجھے پیار دے
میری روح کے پیاسے دشت میں
اتنا برس کہ مجھے نکھار دے
میری زلفِ پریشاں کو دیکھ تو
کبھی آکے اس کو سنوار دے
میں گم رہوں تیری ذات میں
تو ایسا مجھ کو خمار دے
میری خواہشوں کے بھنور میں آ
مجھے بے خودی میں اتار دے
میری تنہائیاں بھی مہک اٹھیں
مجھے ایسا قرب و جوار دے

شاعرہ: ریحانہ ملک روحی

مرسلہ: نکیہ اکبر خان، بہاول پور

بارش

ہم دونوں کو بارش اچھی لگتی ہے
بھیگتا جنگل
سبز گھنے پتوں پر
ٹپ ٹپ گرتی بوندیں
اچھی لگتی ہیں

شاعر: حسن عباسی

مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

آنکھیں

اس کی آنکھیں کتنی
نظر شناس تھیں
اِک نظر میں سب کچھ
جان جاتی تھیں
بس اِک میرا حالِ دل
ہی نہ جان سکیں

شاعرہ: شبانہ شیخ، لاہور

نمی ہے بہت

میری زندگی میں تیری کمی ہے بہت
اور میری آنکھوں میں ان دنوں نمی ہے بہت
وہ زخم دے کہ ہمیں پھر دعائیں دیتے ہیں
ایسی سیاست بھی ہم نے دیکھی ہے بہت
تمام شب اشکوں سے جھلملاتی رہی
اور سحر ہوتے ہی یہ آنکھیں ہنسی ہیں بہت
یہ الگ بات کہ کبھی تجھ پہ ظاہر نہ کیا مہک
پر ہم نے تجھ سے محبت بھی تو کی ہے بہت

شاعرہ: مہک خان، کراچی

بہت دنوں سے
وہی ہے دھرتی، فلک وہی ہے
یہ دل سمندر بھنور سے نیناں
یقیں وہی ہے، گماں وہی ہے
یہ چاند اور کہکشاں وہی ہے
تمہاری صورت، تمہاری مورت
تمہاری باتیں وہی ہیں لیکن
بہت دنوں سے یوں لگ رہا ہے
سماعتوں میں اتر کے سورج پگھل رہا ہے

شاعرہ: فاخرہ بتول

مرسلہ: فرزانہ سہیل، میاں چنوں

غزل

میرے گھر میں نہ دیواریں نہ در ہیں
میرے گھر کی فصیلیں مختصر ہیں
لٹا ہوں اس لیے یارو میں اکثر
محافظ کی دعائیں بے اثر ہیں
نہیں جن کا کوئی بھی اعتبار اب
وہی کچھ لوگ ہیں جو معتبر ہیں
دلوں میں دوریاں ہی دوریاں ہیں
بظاہر قربتوں میں اپنے گھر ہیں
غلط فہمی کی بنیادوں پہ اکبر
جدائی کے حوالے بیشتر ہیں

مرسلہ: افتخار شوق، میاں چنوں

خاموش

ہر چیز خاموش
تیرے جانے کے بعد
اپنا آپ فراموش
تیرے جانے کے بعد
کیسے رہے ہوش
تیرے جانے کے بعد
تنہائی اور سناٹا ہم آغوش
تیرے جانے کے بعد

شاعرہ: رضوانہ بدر، بہاول پور

اِک کہانی

ہے تم کو آج سنانی
اپنے
پوشیدہ جذبوں کی کہانی

ہمارے آنسو جو
دیکھتے ہو تم
گرتے ہیں دل پہ
سامنے تمہارے ہم پی نہیں سکتے
یہ لب جو تھے آج تک خاموش
اب اور زیادہ سی نہیں سکتے
یہی کہنا ہے فقط تم سے
بن تمہارے
ہم مر تو سکتے ہیں
بن تمہارے
ہم جی نہیں سکتے

مرسلہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

پاگل

بیوی نے شوہر سے پوچھا۔ ''آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟''

شوہر نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''پھر یہ بتائیں کہ اگر میں مرگئی تو آپ کیا کریں گے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''مجنوں بن جاؤں گا، پاگل ہو جاؤں گا۔'' شوہر نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''دوسری شادی تو نہیں کریں گے؟'' بیوی نے بے یقینی سے پوچھا۔

''دیکھو بیگم، پاگل کا کیا بھروسا وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' شوہر نے جواب دیا۔

مرسلہ: منی بیگم، گوجر خان

کچھ لفظ لکھے ہیں دل سے

☆ رشتے اور سودے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رشتے قائم کیے جاتے ہیں جبکہ سودے طے کیے جاتے ہیں۔

☆ حق جتانے سے حق ثابت نہیں ہو جاتا۔

☆ کسی کی مجبوری سے اتنا فائدہ مت اٹھاؤ کہ اسے مزید مجبور ہونا پڑے۔

☆ وہ انسان ہمیشہ خزاں کی قدر کرتا ہے جس نے بہار میں زخم کھائے ہوں۔

☆ موت سے بڑھ کر کوئی سچی چیز نہیں اور امید سے بڑھ کر کوئی چیز جھوٹی نہیں۔

☆ محبت اعتبار کے بغیر کچھ نہیں جبکہ اعتبار بغیر محبت کے بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

ممکن نہیں کہ

☆ جیسی صحبت میں بیٹھے ویسا نہ بنے۔

☆ ہر کام میں جلدی کرے اور نقصان نہ اٹھائے۔

☆ دنیا سے دل لگائے اور پشیمان نہ ہو۔

☆ ہمت و استقلال کو شعار بنائے اور مراد کو نہ پہنچے۔

☆ سچی لگن اور محبت ہو اور منزل کو نہ پائے۔

☆ پکے یقین اور بے لوث چاہت سے دوستی ہو اور وہ ٹوٹ جائے۔

☆ اللہ تعالیٰ پر توکل ہو اور وہ مایوس کر دے۔

مرسلہ: فرحت گل، ڈی آئی خان

مہکتی کلیاں

☆ غریب آدمی کی تصویریں اس وقت چھپتی ہیں جب وہ قانون توڑتا ہے۔

(سقراط)

☆ عقل مند اپنے عیب خود دیکھتا ہے جبکہ بے وقوف کے عیب دنیا دیکھتی ہے۔

(سعدی)

☆ انسان اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کا ضمیر زندہ رہتا ہے۔

☆ کسی کو وجدان بلاوجہ نہیں ملتا اپنے ادراک کا مقصد تلاش کیجیے۔

(جبران)

مرسلہ: صائمہ بخش، کوہاٹ

ذرا غور کریں

اپنے ووٹر کو بتائیں کہ کس دسمبر میں
لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کی عنایت ہو گی
اپنے وعدوں ارادوں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

مرسلہ: سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم

بارش اور تم

کبھی بارش برستی ہے
کبھی کونپل چٹکتی ہے
کبھی ساحل کی ٹھنڈی ریت
قدموں سے لپٹتی ہے
ہمیں تم یاد آتی ہو
کہیں معصوم سی بچی
مسلسل مسکراتی ہو
اندھیری رات میں
جب بھی کبھی بجلی چمکتی ہے
کسی ویران آنگن میں
کوئی بدلی برستی ہو
کسی کو تھام لینے کے لیے
چوڑی کھنکتی ہو
کرن کوئی ہمارے
دل کے شیشے پر چمکتی ہو
نیا سورج نکل آئے
نئی خوشبو بکھرتی ہو
کچن سے تازہ چائے کی مہک
دل میں اترتی ہو
ہمیں تم یاد آتی ہو

مرسلہ: اینہ عندلیب، سلانوالی

سن تو سہی

بیٹا: ''پاپا سب لوگ شادی کر کے پریشان رہتے ہیں تو پھر شادی کرتے کیوں ہیں؟''

باپ: ''بیٹا عقل بادام کھانے سے نہیں آتی ٹھوکر کھانے سے آتی ہے۔''

بیوی کی دعا

''یا اللہ پاک، میرے شوہر کو بہت ساری دولت دے۔ شہرت دے...... تو یہ سب میرے شوہر کو دے' اس سے لینا میرا کام ہے۔''

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

بنیاد

چلو محبت کی نئی بنیاد رکھتے ہیں
خود پابند رہتے ہیں اسے آزاد رکھتے ہیں
ہمارے خون میں رب نے یہی تاثیر رکھی ہے
برائی بھول جاتے ہیں اچھائی یاد رکھتے ہیں

سہارا

کوئی سہارا نہیں دعا کے سوا
کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا
میں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے
مشکلوں میں کوئی ساتھ نہیں اللہ کے سوا

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

تحفہ

''اس عورت نے اپنے شوہر کو سالگرہ کا کون سا تحفہ پیش کیا تھا؟''

''اس نے چاندی کا ایک سگریٹ کیس دیا جس کے اندر اس عورت کی تصویر تھی۔''

''شوہر کو پسند آگیا تھا؟''

''تم پسند کی بات کرتے ہو، اس نے تو اس

دن سے سگریٹ پینا ہی چھوڑ دی ہے۔''
مرسلہ: صبا نور، لیہ

غزل

کتنے خانوں میں تقسیم ہم ہوگئے
اور جدائی کے دریا میں ہم کھو گئے
ملا نہ جو ہم کو کاندھا تیرا
اداسی کے شانوں پہ ہم سوگئے
ان کا تماشا بھی بن ہی گیا
نشانہ بنا کے ہمیں جو گئے
سنبھلتا نہیں ہے دلِ مضطرب
جو ماں باپ ملکِ عدم کو گئے
مجھ سے تو لوگوں نے اتنا کہا
شگفتہ کے اشعار دل موہ گئے

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

ماں

ایک بوڑھی عورت اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، ایک کوا پاس بیٹھا تھا ماں نے پوچھا۔ ''بیٹا یہ کون ہے؟''
بیٹا: ''یہ کوا ہے۔'' ماں نے کچھ دیر بعد پھر پوچھا۔
''یہ کیا ہے؟''
بیٹا: ''یہ کوا ہے۔'' ماں نے پھر پوچھا۔
''یہ کیا ہے؟'' بیٹا غصے سے بولا۔
''کتنی بار بتاؤں کہ یہ کوا ہے۔''
ماں ہنس دی اور بولی کہ ''بیٹا جب تو تین سال کا تھا تو یہی جگہ تھی اور ایسا ہی کوا پاس بیٹھا تھا میں نے دس بار تیرا ماتھا چوم کر بتایا تھا کہ یہ کوا ہے۔''
یہ ہوتی ہے پیاری ماں۔
مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

غزل

تم دل کے پاس رہنا
میرے ساتھ ساتھ رہنا
جتنی ہوں من کی باتیں
ہر بات مجھ سے کہنا
پڑے کوئی جو مشکل
اکیلے تم نہ سہنا
تم خون کی طرح سے
میری رگوں میں بہنا
جب ہو میری ضرورت
مجھ کو پکار لینا
میرے آنسوؤں کو چھوڑو
بس تم کبھی نہ رونا
کانٹے ہیں سارے میرے
تم بس گلاب لینا
کہنا ہے تم سے یہ ہی
تم دل کے پاس رہنا

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

خالی پن

میری زندگی ہنستی ہے
لبوں پہ مسکان بھی رہتی ہے
ہر چیز کھلی کھلی سی بھی لگتی ہے
پہاڑ دن اجلا اجلا
اجاڑ رات ڈھلی ڈھلی سی بھی
میں اس کی نہ مانوں
پھر بھی میری مانتا ہے وہ
دکھوں کے سنگ سکھ کا موسم بھی ہے
سب کچھ ٹھیک لگتا ہے

لیکن
کہیں کوئی خالی پن ہے
میری مکمل ذات
کچھ ادھوری بھی ہے
دور کہیں دل میں سناٹا ہے
دل بھر بھر آتا ہے

مرسلہ: رضوانہ بدر، بہاول پور

قسمت ہی خراب ہے

جی ٹی روڈ پر رات کو ٹرک چلاتے ہوئے ٹرک کی لائٹس ایک درخت پر پڑیں تو ڈرائیور نے بریک لگا کر دیکھا کہ اس درخت کے ساتھ ایک شخص بندھا ہوا ہے۔ ڈرائیور اس کے پاس گیا اور پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟'' اس شخص نے روتے ہوئے کہا۔ ''بھائی صاحب میرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ میں اپنے گاؤں جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے مجھے پکڑ لیا۔ انہوں نے میرا بٹوا اور موبائل چھین کر مجھے یہاں باندھ دیا اور فرار ہوگئے۔ صرف یہ میری گھڑی بچی ہے جس پر ان کی نظر نہیں پڑی۔'' یہ سن کر ٹرک ڈرائیور آگے بڑھا اس کی کلائی سے گھڑی اتاری اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ ''میرے پیارے دوست آج تمہاری قسمت ہی خراب ہے۔''
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

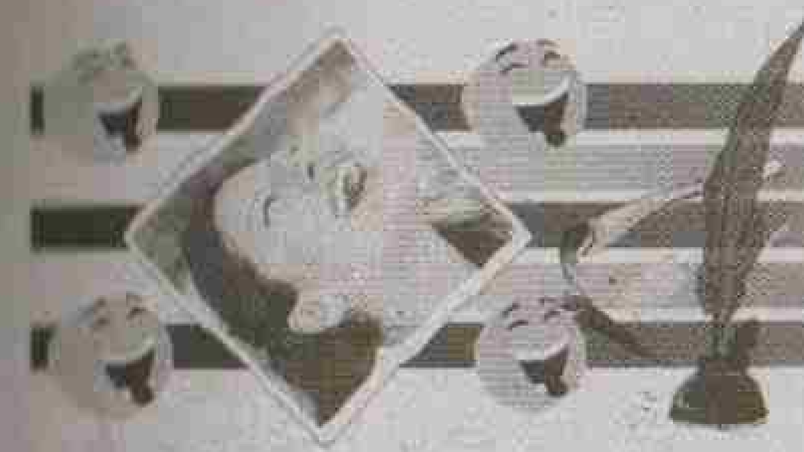
یارو کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مجھ کو بد دعا کہ اسے بھول جاؤں میں
سنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں
اِک شب بھی وصل کی نہ میرا ساتھ دے سکی
عہدِ فراق آ کہ تجھے آزماؤں میں
دل تو جلا گیا ہے وہ شعلہ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں
اترا ہے بام سے کوئی الہام کی طرح
جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں
اس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
ہنس کر اسے قتیل گلے سے لگاؤں میں

شاعر: قتیل شفائی
مرسلہ: حاجرہ غفور، لیہ

آس کا جگنو

معراجِ فہم انساں کی
ونڈوز کھولی ہیں کتنی
سرگوشیاں ستاروں سے
سمجھیں نہ من کا بھید کبھی
اتنی گرمی اتنی سردی
موسم کا حال بتاتے ہیں
ساگر میں طوفان اٹھا ہے
ساحل ہے لہروں کی زد میں
رُت بدلے گی پرسوں شاید
خشک رہے گا موسم کل تک
گوری کے نیناں کیوں چھلکے
اشکوں کی برسات ہے کب تک
ہجر کا موسم کتنا لمبا
گھڑیاں گنے ملن کی کب تک
طوفاں میں آشا و نراشا کے
اُس کا دل گھرا ہے کب تک
کبھی بتا دیں تو پھر جانیں
باتیں ستاروں سے چھوڑو
اِک آس کا جگنو اس کو دے دو
نوید صبح ستارہ دے دو

شاعرہ: خالدہ نسیم، یو کے



جلترنگ

انجم انصار

اندازے

''میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ لڑکے کی دوسری شادی تھی۔'' بڑی آپا جب سے رات کو سلمٰی کی شادی سے ہو کر آئی تھیں بس رٹ لگائے ہوئے تھیں۔

''آپا ایسا تو بھابی نے نہیں بتایا تھا کہ دوسری شادی والے سے سلمٰی کی شادی ہو رہی ہے۔'' میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے آپا کو یاد دلایا۔

''بھئی ایسی باتیں کوئی کسی کو بتاتا ہے کیا؟'' بڑی آپا بھی اپنی جگہ بضد تھیں۔

''وہ ٹھیک ہے کہ سلمٰی بڑی عمر کی کنواری تھی، منہ پر بچپن کے چیچک کے نشان بھی تھے، رنگ دبتا ہوا اور قد کی چھوٹی تھی مگر تھی تو امیروں کی اکلوتی بیٹی۔ شادی ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوگا کہ بھابی دوسری شادی والے سے سلمٰی کو بیاہیں گی۔'' میں نے دلیل پیش کی۔

''منہ دکھائی میں گاڑی کی چابی دی ہے۔'' اماں نے بھی لقمہ دیا۔

''ساس، نندیں بھی سلمٰی کی بڑی خوش تھیں۔ کوئی پریشانی شکلوں سے تو ظاہر نہیں ہو رہی تھی کہ پہلی بیوی بچوں سمیت آ کر ہنگامہ نہ کرے۔'' میں آپا کو یاد دلا رہی تھی۔

''بھئی میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ میں نے کہا تھا کہ پڑوسن جمیلہ کے ہاں لڑکا ہوگا، بڑی خالہ کی بیٹی لو میرج کرے گی، پاکستان ورلڈ کپ کرکٹ ہار جائے گا، بھائی کے بچے سالانہ امتحانوں میں فیل ہوں گے، اس سال نجمہ میٹرک کر ہی لے گی، نجمہ کا کہیں چکر چل رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''ہاں یہ بات تو ہے، بڑی جب کبھی کسی کے بارے میں اندازہ کرتی ہے وہ درست ہی ہوتا ہے۔'' اماں بھی تائید میں سر ہلا رہی تھیں۔

''آپ کو کیسے اندازہ ہوا آپا کہ لڑکے کی یہ دوسری شادی ہے؟'' میں نے آپا سے پوچھا۔

''دیکھو، پہلی شادی والے دولھا گاڑی سے ایسے اترتے ہیں جیسے قربانی کے بکرے کو گاڑی سے اتارا جاتا ہے یعنی کافی نازنخرے دکھاتے ہیں۔ اترنے کے بعد بھی کبھی اماں کا ہاتھ تھامتے ہیں تو کبھی بہن کے آنچل میں منہ چھپاتے ہیں۔ اسی طرح گرتے پڑتے انہیں کسی طرح اسٹیج پر بٹھا دیا جاتا ہے جبکہ سلمٰی کا دولھا ایسے کود کر گاڑی سے اترا جیسے کوئی گائے گاڑی میں سے چھلانگ لگاتے ہوئے اترتی ہے اور پھر جس تیزی سے اماں، بہن، ابا، دوست سب کو پیچھے چھوڑتا ہوا اکیلا اسٹیج پر جا کر بیٹھا تھا۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ان راہوں کا سفر اس کے لیے نیا ہے۔ وہ تو ان سب راستوں سے واقف تھا بے چارہ خالی کیمرا مین اس کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ استقبال کرنے والی عورتیں تو کافی دیر تک دروازے پر ہی کھڑی رہیں، سب یہ سمجھ رہی تھیں کہ دولھا آیا ہی نہیں۔ وہ تو جب نکاح شروع ہونے لگا تو سب وہیں پھول وول پھینک کر گھبرا گھبرا کر اندر آ رہی تھیں۔''

''ارے واقعی آپا، ایسا تو ہم نے سوچا ہی نہیں۔''

''تبھی تو میرے اندازے بالکل ٹھیک ہوتے ہیں پگلی۔'' آپا فخریہ انداز سے کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

دعوت نامہ

''پیاری بڑی آپا!

السلام علیکم!

کیسی ہیں؟ سنا ہے خسرہ نکل آئی تھی پچھلے دنوں۔ بھئی فون وغیرہ اس لیے نہیں کیا کہ کیا پتا جراثیم فون سے ہی نہ لگ جائیں۔ لگنے والی بیماری کا کیا بھروسا۔

خیر خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ سلمٰی کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے مہینے کی دس کو شادی ہے۔ اب آپ کہیں گی کہ نہ بتایا، نہ چلایا شادی کی تاریخ بتا رہی ہو۔ کیا کریں آج کل اچھے رشتے بھاگتے دوڑتے ہی آتے ہیں۔ لڑکا باہر جا رہا تھا ورنہ دو سال بعد آتا۔ اب وہ دور نہیں کہ لڑکی کے رشتے کے لیے جوتیاں گھس جائیں۔

آپ کی ساری بہنوں کو فون پر بتایا تو ایسی جلیں کہ کیا بتاؤں۔ مبارک باد دینے آئیں تو سب کالے اور براؤن سوٹ پہن کر۔ اسی سے جلنے کا اندازہ لگالیں۔ ارے بھتیجی کی شادی ہے، آپ بڑی پھپھو ہیں۔ ارمان تو دکھانے کا آپ کا دل کتنا چاہ رہا ہوگا۔ میں بالکل بھی منع نہیں کروں گی آپ کو دل کھول کر ارمان دکھائیں۔ ہاں وہ ملتانی کڑھائی کے چھ جوڑے، میچنگ جوتیاں، پرس، چوڑیاں، چادریں اور دو کمبل ضرور جلدی بھجوا دیجیے گا۔

عارف کہہ رہے تھے کہ آپ تو وقت کے وقت ہی آئیں گی۔ بھئی گھر چھوڑ کر آنا کوئی مذاق ہے ویسے تو خسرہ کے بعد تین مہینے کا بیڈ ریسٹ ہوتا ہے۔ ابھی تو ایک مہینہ باقی ہے۔

سب سے پہلے اپنے آپ کو دیکھیے گا آپا۔ دیکھیں میں آپ سے کتنا پیار کرتی ہوں کوئی ہوگی بھابی اتنا پیار کرنے والی۔ ہاں وہ چیزیں یاد سے بھجوا دیجیے گا۔

اچھا خدا حافظ

فقط آپ کی رشو۔''

☆☆☆

شاباش

''احمد کے ولیمے میں کھانا اس بری طرح کم پڑا کہ عورتوں میں جھوٹا کھانا چلا دیا گیا۔''

''اور مجھے تو اس وقت احساس ہوا کہ بریانی اتاری تو معلوم ہوا کہ اس میں از خود رائتہ بھی ملا ہوا ہے اور قورمہ تو بنا ڈالے اس میں موجود ہے۔''

''ہڈیاں چبا کر ملائی ہوتی ہیں کہ کھانے والے کو ذرا بھی زحمت نہ کرنی پڑے۔''

''مجھے تو اس قدر کراہیت سی آئی کہ توبہ بھلی چوٹی تک بھری ہوئی پلیٹ میز پر رکھ دی۔ گھر آ کر بھی میں مارے غصے کے پھنکارتی رہی۔ کس قدر جاہل لوگ ہوتے ہیں کہ تقریب کرنا تو جانتے ہیں مگر انتظام کرنے کا سلیقہ بالکل بھی نہیں جانتے۔''

''آج بھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہمارے جیٹھ کی دوسری شادی پر کھانا اچھا خاصا کم ہو گیا تھا۔ ولیمے پر جو مہمان نہیں آنے تھے وہ بھی دوسری شادی کا تماشا دیکھنے کے سبب آ گئے تھے۔ کسی نے سہمے ہوئے بچوں سے لاڈ دکھانا تھا، کسی نے عمر رسیدہ دلہن کا مذاق اڑانا تھا مگر بھئی شاباش ہے ہمارے میاں پر انہوں نے جھوٹا کھانا اس خوبی،

اس مہارت اور اس محنت سے چلایا کہ مجال ہے کہ کسی کو پتا چلا ہو یا ابکائی آئی ہو۔"

☆☆☆

لڑکی کی عمر

خدا سمجھے فیروزہ آپا کو میرا ناک میں دم کر رکھا تھا، پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھیں یوں تو وہ تھیں ہمارے میکے کی دور پرے کی رشتے دار مگر ان کی ہماری نند کے گھرانے سے خاصی دوستی تھی شاید اسی لیے ان کے گُن بھی زہریلی نندوں کے سے ہو گئے تھے۔ موقع بے موقع ڈنک مارے بنا نہیں رہتی تھیں۔ کوئی ایسا موقع نہیں چھوڑتی تھیں کہ وہ مجھے ذلیل نہ کرتیں۔ گو کہ یہ معمولی بات تھی کہ میرا بیٹا میٹرک میں ڈی گریڈ میں پاس ہوا اور ان کا بیٹا اے گریڈ میں پاس ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان کے میاں محکمۂ تعلیم میں افسر ہوں گے تو کیا ایسا بھی نہ ہوتا۔ وہ تو ٹاپ بھی کر سکتا تھا کہ لڑکے کی تمام خالائیں امتحانوں کی کاپیاں جانچنے والیاں تھیں۔ تب ان کا لڑکا فرسٹ آ گیا تو ایسا تیر تو اس نے نہیں مارا تھا جس کی انی چبھونے فیروزہ آپا ہمارے گھر چلی آئیں۔

"اے ہے صنوبر تمہارے بیٹے کو ڈھنگ کے کالج میں ایڈمشین تو ملنے سے رہا، تم یہ کرو کہ اسے ری پیٹ کرا دو۔" ہنستے ہوئے لہجے اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ یہ مشورے کا کوڑا ہماری کمر پر مارا۔

"ارے واہ، اچھے خاصے کالجوں میں ایڈمیشن مل رہا ہے۔ تین پرنسپل تو میرے گھر خود چل کر آئے۔ دس گیارہ پروفیسروں نے رابطہ کیا ہے کہ اس بچے کی کلاس صرف ہم لیں گے صرف ہم...... ماشاءاللہ بڑا بھاگوان بچہ ہے جہاں جاتا ہے سب نکل جاتے ہیں۔ اس کی ایک ٹیوشن کی مس کی عرصے سے انگریزی میں کمپارٹ آ رہی تھی جب میرے بچے نے ان سے پرائیوٹ ٹیوشن لینی شروع کی مس کا ٹوٹی جانے والا مل گیا اور ان کی کمپارٹ نکل گئی کہ وہ خود کہہ رہی تھیں کہ یہ اس صدی کا معجزہ ہے کہ انہوں نے پیپر پر سوائے اپنا رول نمبر لکھنے کے کچھ بھی نہیں لکھا تھا مگر ان کا اے گریڈ آ گیا۔ اس کی وجہ میرا بچہ ہی تو ہے، ہمارے گھر تک مٹھائی بھیجی اس بے چاری نے۔"

"آپ چھوڑیں یہ باتیں، اپنے بچے کو آرٹس دلوا دیں، سائنس میں یہ نہیں چل سکتا۔"

"میں اسے آرٹس دلواؤں یا اسے کسی مسجد کا مولوی بناؤں آپ کو اس سے کیا۔" میرا غصہ دیدنی تھا۔

"ارے واہ، برا ماننے کی کیا بات ہے جب بچہ ہی بدشوق ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟"

اسی طرح جب میری سلمیٰ خاتون کا رشتہ ان کی بھتیجوں سے پہلے طے ہوا تب وہ مجھے کلسانے آ گئیں۔

"اللہ صنوبر کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، اپنی بچی کیسے کالے بھجنگ کو دے رہی ہو، میری تو تو یہ رشتہ ہی ختم کر دو۔ ایسی بھی کیا جلدی۔ سلمیٰ بے چاری ابھی تیس ہی کی تو ہوگی۔"

"فیروزہ آپا تمہیں خدا ہی سمجھے رائی کا پہاڑ بنانا تم سے سیکھے۔ میں ابھی پینتیس کی ہوئی نہیں اور تم نے سلمیٰ کی عمر تیس کر دی۔ بھئی اگر وہ انٹر میں کئی سال پڑھی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کی عمر چھلانگیں لگاتی ہوئی مہنگائی کی طرح تیزی سے بڑھ جائے۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ لڑکی کی عمر شریف آدمی کی تنخواہ کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔"

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی



☆ عنبر وسیم ...... گوجرانوالہ

تیز بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
ایک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم تھے مگر
تیرا ہی چہرہ فقط میری نگاہوں میں رہا

☆ فصیحہ آصف خان ...... ملتان

نہ آنکھوں میں آنسو ہیں نہ ہونٹوں پہ فغاں ہے
بے نور ہوتی جاتی ہیں ساون کی نگاہیں

☆ بشریٰ باجوہ ...... اوکاڑہ

کئی ستاروں کو میں جانتا ہوں بچپن سے
کہیں بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
وہ ایک پیڑ ہے آ، اس سے مل کے رولیں ہم
یہاں سے تیرے، میرے راستے بدلتے ہیں

☆ صائمہ امین ...... لاہور

تم سے ملے بھی ہم تو جدائی کے موڑ پر
کشتی ہوئی نصیب تو دریا نہیں رہا

☆ نازیہ ...... کراچی

سکھ کا موسم ہاتھ نہ آئے
دکھ کا سورج چڑھتا جائے
آئے جب بھی یاد کسی کی
انکھیوں سے ساون بہتا جائے

☆ رابعہ انجم ...... پتوکی

جانے والے ہماری محفل سے
چاند تاروں کو ساتھ لیتا جا
ہم خزاں سے نباہ کر لیں گے
تو بہاروں کو ساتھ لیتا جا

☆ راحت امین ...... کراچی

میں تو کانٹا ہوں خزاؤں میں بھی رہ سکتا ہوں
تو مگر اک پھول ہے بہاروں کی ضرورت ہے تجھے
میرا جیون تو اندھیرے میں بھی کٹ جائے گا
تو مگر اک چاند ہے تاروں کی ضرورت ہے تجھے

☆ شمع فرید ...... کراچی

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
بدل جائے گی یہ رُت بھی حوصلہ رکھنا

☆ فائزہ شہزاد ...... حیات آباد

زندگی کو زندگی تو ہم نے سمجھا ہی نہ تھا
ہم تو سمجھے تھے ہنسی کا کھیل ہے یہ زندگی
ٹھوکریں دنیا کی کھائیں تو ہمیں آئی سمجھ
زندگی کہتے ہیں کس کو اور کیا ہے زندگی

☆ مینا خان ...... پشاور

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے
بادلوں کو کیا خبر کہ بارش کی چاہ میں
کتنے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

☆ رخسانہ امجد ...... ملکوال

ٹوٹ جاتے ہیں بکھر جاتے ہیں

کانچ کے گھر میں مقدر اپنے
اجنبی پیار سے ملتے ہیں سدا
بھول جاتے ہیں تو اکثر اپنے
☆رضوانہ سمیع......کراچی

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجیب طرز کا موسم میرے وطن میں رہا
☆ہما انصار......حیدرآباد

رہ کر قفس میں ذکر کریں آشیاں کا کیا
مانوس ہوگئے ہیں اسی زندگی سے ہم
☆نزہت فہیم عطاری......پنجاب

دو دو بوند کو اپنی کھیتی ترسی ہے اور ترسے گی
کہنے کو تو دوست ہمارے بھادوں بھی اور ساون بھی
☆عالیہ......ملتان

جو بارش کی دعا کرنا تو یہ مت بھول جانا
ہمارے خواب دیواروں پہ مٹی سے لکھے ہیں
☆ماہین حنیف......کراچی

بہلے جو آنکھ سے کاجل تو یہ سوال ہوا
وہ شخص کون تھا جس کا مجھے ملال ہوا
☆آصفہ برکت......راولپنڈی

کھل گئیں جب انگلیاں کتنی پشیمانی ہوئی
میں سمجھ بیٹھا تھا اک صحرا میری مٹھی میں ہے
انگلیوں پر رنگ چھوڑے اور تڑپ کر مر گئی
زندگی کا حسن تو اڑتی ہوئی تتلی میں ہے
☆فریال افتخار......کراچی

پھر اس کے بعد تمہیں اور کچھ نہ بھائے گا
ہمارے چہرے کے بعد تمہیں اور کچھ نہ بھائے گا
☆میراں خان......گوجرانوالہ

چبھتی ہے قلب و جاں کو ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے
☆ماریہ جبیں......سیالکوٹ

کل رات میں نے گزرے دنوں کے ورق گنے
ہر باب سرگزشت کا، کاسہ گدا کا تھا

☆غزالہ یاسمین......میاں چنوں

کہیں کوئی غم کوئی سلگتا خیال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
عجیب رت ہے کسی کی یادیں سنبھال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
اسے یہ کہنا وہ مجھ سے ملنے بھی نہ آئے کہ اس نگر میں
دلوں کو آباد بستیوں کی مثال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
☆عطیہ سرور......جہلم

رنگ دھنک نے بکھرائے ہیں موسم اچھا ہے
گئے زمانے یاد آئے ہیں موسم اچھا ہے
☆نازیہ شبیر......لاہور

آنکھ کی شبنم تو برسے بادلوں کی اوس سے
کتنا گہرا ہے دل و جاں کا سمندر دیکھیے
زرد پتوں کی طرح کب سے ہوا کی زد پہ ہیں
اک ذرا آندھی جو تھمتی تجھ کو مڑ کر دیکھتے
☆میمونہ ضیا......کراچی

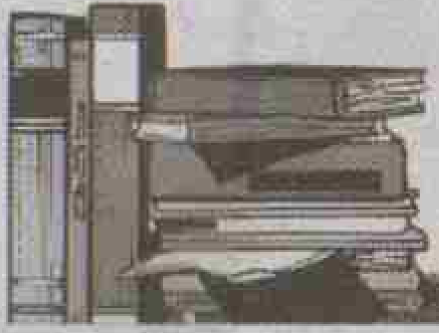
تم نے کہا تھا عشق میں اکثر ایک سا موسم ہوتا ہے
کہاں گئیں وہ ساون آنکھیں کہاں گئے وہ جل تھل لوگ
☆عشا خاور......لاہور

یہ بوند بوند سی بارش کسی کی یادوں کی
مرے یقین کا کچا مکاں گرائے گی
☆راحیلہ......کراچی

حیات اب بھی کھڑی ہے اسی دوراہے پر
وہی ہے جبر وہی اختیار کا موسم
ہم اپنے آپ کو محسن بدل کے دیکھیں گے
بدل سکے نہ اگر کوئے یار کا موسم
☆ثمینہ کوثر......حیدرآباد

وقت نے دھندلا دیے کیسے شناسائی کے رنگ
جس طرح یہ خواب ہو پہلے کبھی دیکھا ہوا
☆یاسمین آزاد......کشمیر

ہجوم غم میں کسی کا خیال آتے ہی
دھنک سی پھیل گئی زیست کے اندھیروں میں



میرا انتخاب
آمنہ حماد

بیتے ہوئے وقت کی باتیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں......تنہائی ملتے ہی اپنی تمام شدتوں کے ساتھ آنکھوں میں بسیرا کر لیتی ہیں......اور پھر رات کا حسن ان یادوں کو اور بڑھا دیتا ہے......چاہتوں کے پل جونہی آنکھوں میں جاگتے ہیں تو نیند روٹھ کر دور کھڑی ہو جاتی ہے......میٹھی یادوں اور خوب صورت لمحوں کو اجاگر کرتی میرا جی کی نظم بھی آپ کو ضرور محظوظ کرے گی۔اس کا انتخاب فرحانہ شفیق نے سیالکوٹ سے کیا ہے۔

رات پھر سے جاگ اٹھی

رات پھر سے جاگ اٹھی
میٹھی اذیت چاہت کی
رات پھر سے جاگ اٹھی
پل پل آنسو بہاتے بیتا
آنکھوں میں رات کٹی
دھندلی نگاہوں نے چاند تو دیکھا
چھائی رہی بدلی
دور ہیں سکھیاں
دور پیا ہیں
میں ہوں ابھی بالی
دھیان کی لہروں کے جھولے میں
جی بھر کر جھولی
آیا سویرا دن بیتا
لو پھر سے شفق پھولی
نیلے رنگ میں لال بھی ابھرا
دونوں میں جنگ چھڑی
پھر نہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھیں
موجیں من ساگر کی
پھر سے کنارے ڈول نہ جائیں
پھر نہ امڈ آئے ندی
رات آئی چھایا اندھیارا
سونی شام مٹی
نیند آئے گی دکھ بھولیں گے
نیند مری دردی
بات نہیں اب ڈر کی کوئی
بات نہیں ڈر کی



دوری اگر طویل ہو جائے تو جذبوں کی رنگت ماند پڑنے لگتی ہے۔ان میں وہ نکھار نہیں رہتا......کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو کبھی ٹوٹتے نہیں چاہے ان کے درمیان کتنے ہی فاصلے حائل ہوں......دوریاں فاصلوں کی محتاج نہیں ہوتیں......ذہن و دل پلک جھپکتے ہی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ظریف احسن بھی ایسے ہی دوریوں اور فاصلوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتے نظر آرہے ہیں۔جس کو صائمہ امین نے لاہور سے منتخب کیا ہے۔

کیا تم کو کچھ یاد نہیں

سبز دنوں کی کچھ یادوں میں

آؤ تم کو لے کے چلیں ہم
دن وہ سنہرے
سرمئی شامیں
چاندنی راتیں
اور بچپن کا اجلا موسم
بارش کے دن
ہم تم دونوں بھیگ رہے تھے
اِک منظر میں
ساون بھادوں کی رم جھم میں
بانہوں کو بانہوں میں ڈالے
ہم تم دونوں جھول رہے تھے
اِک جھولے میں
بھیگے لمس نے کی سرگوشی
دھیرے دھیرے
جاگ اٹھیں خوابیدہ جذبے اس سے پہلے
ایک مکمل مدہوشی چھانے سے پہلے
بھیگے لبوں نے عہد کیا تھا
ان بانہوں سے کسی بھی لمحے جدا نہ ہوں گے
یاد ہے مجھ کو سارا منظر
کیا تم کو کچھ بھی یاد نہیں ہے

ہر موسم اپنے ساتھ ایک نیا رنگ لے کر آتا ہے لیکن بارش کے دنوں میں قوسِ قزح کے رنگ ہر طرف بکھر جاتے ہیں...... جذبات و احساسات میں بھی ایک نیا رنگ اور آہنگ نظر آتا ہے...... بارش کے ساتھ ہی یادوں کے در وا ہو جاتے ہیں اور تمام یادگار لمحے ایسے نظروں کے سامنے آٹھہرتے ہیں جیسے وہ اس پل میں ہی گزر رہے ہوں...... کچھ ایسے ہی کھوئے ہوئے لمحوں میں شکیل الدین شکیل گرفتار نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا انتخاب حنا عزیز نے کراچی سے کیا ہے۔

کھوئے ہوئے لمحے

اب کے برسات ہے لائی جو پرانی یادیں
دل میں اتری ہے دھنک
رنگ تمہارے لے کر
کھوئے لمحوں نے
جو دی ہے درِ دل پہ دستک
رات آئی ہے یہ پلکوں پہ ستارے لے کر
ایسے تارے کہ
جنہیں تم تو نہ دیکھو گی کبھی
ایسے لمحے کہ
جنہیں تم تو نہ سوچو گی کبھی
بیتے لمحات میں جو تم کو تکا کرتا تھا
پھر نظر ملتے ہی نظروں کو جھکا لیتا تھا
اپنے خوابوں کو بھی کہہ نہ سکا تھا تم سے
ان کو چپ چاپ نگاہوں میں چھپا لیتا تھا
عمر بھر جو بھی آباد بھی نہ ہو شاید
اب وہ لڑکا تو تمہیں یاد بھی نہ ہو شاید

کچھ نامکمل اور ادھوری خواہشیں، یادوں کے رنگ لیے ہر لمحے ہمارے ساتھ ہوتی ہیں...... بارش ان دبی خواہشوں کو بھی اِک نئی زندگی عطا کر دیتی ہے۔ کچھ یہی تاثر ارشد محمود ارشد کی نظم میں نظر آرہا ہے اس نظم کو ملیحہ نعیم نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

بارش

ساون کی پہلی بارش نے
برسوں کی پیاسی دھرتی کو
جیسے آج سیراب کیا ہے
کاش
ایسا بھی ہو جائے
تیرے پیار کی ننھی بوندیں
دل کے تپتے صحرا پر
ٹوٹ کے برسیں
پیاس بجھائیں

زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک سرسری سی ملاقات ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ رات کے عمیق سناٹے میں کسی کی کی گئی سرگوشی یا کسی کا پکارنا...... ہمیں ایک ایسی خوشی...... اور سرشاری کی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے اس ایک شوخ سی سرگوشی کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کا اظہار پروین شاکر اپنی نظم ردِعمل میں کرتی نظر آرہی ہیں۔ جس کا انتخاب فائزہ رضا نے راول پنڈی سے کیا ہے۔

ردِعمل

گئے موسم کے کسی لمحے میں
تونے اس طرح پکارا تھا مجھے
جیسے مدھم کا بہت میٹھا سُر
روح کا کوئی سرا چھو جائے
جیسے شبنم کا اکیلا موتی
عارضِ برگِ حنا چھو جائے
جیسے اِک موج ہوا کی صورت
رات کی رانی سے کچھ راز کہے
جیسے بچپن کی سہیلی میری
شوخ لہجے میں تری بات کہے

فراوانی مال و زر کی ہو...... جذبات و احساسات کی...... یا پھر غم و خوشی کی...... کسی بھی شے کی کثرت معمولات میں شامل ہو کر اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ خصوصاً نشاط و غم کی زیادتی...... انسان کو رفتہ رفتہ ہر احساس سے بالاتر کر دیتی ہے۔ یاسیت کا یہی رنگ سید شکیل دسنوی کی اس غزل میں نظر آتا ہے۔ اس کا انتخاب کیا ہے شبیہہ صغریٰ نے کراچی سے۔

غزل

سایہ کہیں نہ کوئی شجر مجھ کو اس سے کیا
بے چین ہے یہ دھوپ اگر مجھ کو اس سے کیا
وہ جو حصارِ ذات سے نکلا نہیں کبھی
کرلے وہ آسماں کا سفر مجھ کو اس سے کیا
وہ سر میرا اتار کر قامت میں بڑھ گیا
دیکھے وہ ایسے خواب اگر مجھ کو اس سے کیا
پہلی سی بات جذبِ محبت میں اب کہاں
وہ پھیر لے جو اپنی نظر مجھ کو اس سے کیا
آیا میرے قریب تو منظر بدل گیا
رکھتا ہے بے وفا یہ ہنر مجھ کو اس سے کیا
میں بھی بدل کے دیکھ لوں اپنا مکاں کہیں
بدلے اگر وہ راہ گزر مجھ کو اس سے کیا
پامال منزلوں کو میں کرتا رہا شکیل
پھر بھی ملا نہ اذنِ سفر مجھ کو اس سے کیا

سندیسے

پاکیزہ بہنیں

فائدہ

ان میرڈ ہونے کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہے بھلا......؟ سوچیں ذرا...... چلیں میں ہی آپ کو بتا دیتی ہوں۔ آپ بیڈ کے دونوں طرف سے چڑھ اور اتر سکتے ہیں۔

مرسلہ: میمونہ گل، سکھر

جیلسی

یہ ضروری تو نہیں کہ آگ سے جل جائے انساں اے فراز
کچھ لوگ تو میرا اسٹائل دیکھ کر ہی جل جاتے ہیں

مرسلہ: صبا نور، لیہ

پاگل

بجلی + بادل = ساون آیا۔
دولھا + باجا + برات = شامت آئی۔
گرمی + لوڈ شیڈنگ + مہنگائی = قیامت آئی۔
پھول + نظارے + بارش = بہار آئی۔
آپ + آپ کے رشتے دار + آپ کی ہنسی = نسو نسو پاگل آیا۔

مرسلہ: قمر شمس الحق، جھنگ صدر

آنکھ

جب یہ کھلتی ہے تو دنیا کی ہر شے اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ جب یہ دیکھتی ہے، سمندر کی تہ سے موتی نکال لیتی ہے۔ جب یہ روتی ہے تو عرش ہلا دیتی ہے اور جب یہ بند ہوتی ہے تو دنیا کو رلا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ ساون کو بھی ہرا دیتی ہے۔

مرسلہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

وجہ

سب دوست بے وفا ہو گئے
ہم آپ سے خفا ہو گئے
خط اس لیے لکھ رہے ہیں ظالمو!
کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم دنیا سے دفع ہو گئے

مرسلہ: مسز قمر، جھنگ

وعدہ

وعدہ بھی ایک امانت ہے۔ لفظوں کی شکل میں دی گئی ایک امانت۔ وعدہ پورا نہ کرنا امانت میں خیانت کرنا ہے۔ وعدہ ایک ایسی امانت ہے جسے لینے والے کے بجائے دینے والے کو واپس کرنا ہوتا ہے۔ کل کا وعدہ ایک جھوٹا وعدہ ہوتا ہے کیونکہ کل کبھی نہیں آتی۔ آج کی درخواست پر آج ہی عمل درآمد ضروری ہوتا ہے کیونکہ آج ہر روز آتا ہے...... ہے ناں پتے کی بات۔

مرسلہ: مسز فرح امجد، لاہور

میری خواہش

میری خواہش ہے کہ ہر دکھی چہرے پر تبسم بھر دوں
میری خواہش ہے کہ ہر مسلماں کو دنیا میں معتبر کر دوں
میری خواہش ہے کہ ظلم کو نگاہوں سے اوجھل کر دوں
میری خواہش ہے کہ بے حیائی پہ حیا کا آنچل کر دوں

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

چلو اِک کام کرتے ہیں

سنو جاناں!
چلو اِک کام کرتے ہیں
ہم اپنے دل کے سب جذبے
تمہارے نام کرتے ہیں
ملے پچھلے برس تھے جب
تو اپنے دل کے سب حصے
محبت کے حسیں قصے
زباں زدِ عام کرتے ہیں
دکھوں سے زندگی کو اب چلو آزاد کرتے ہیں
خنک سرد موسم کو
غزاں کی سب رُتوں کو
چلو رخصت کریں مل کر
سنو جاناں!
نیا پھر سے پیاں باندھیں ہم
تم ویسے پھر سے بن جاؤ
میں ویسی پھر سے بن جاؤں
پرندے بدگمانی کے اڑ کر دل کی شاخوں سے
وفاداری نبھاؤ تم
وفاداری نبھائیں ہم
نومبر کے مہینے میں
ہم اپنے دل کے سب جذبے
تمہارے نام کرتے ہیں
محبت عام کرتے ہیں
محبت عام کرتے ہیں

شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ

ایجادات

☆ ریزر بلیڈ 2 دسمبر 1901ء میں کنگ جیلٹ، امریکا نے ایجاد کیا۔

☆ تابکاری کے قوانین میکس پلانک جرمنی نے بنائے۔

☆ واشنگ مشین 1901ء میں امریکی سائنس داں فشر نے بنائی۔

☆ ائر کنڈیشن 1902ء میں امریکا نے ایجاد کیا۔

☆ فوٹو اسٹیٹ مشین 1903ء میں امریکا میں وان بیڈلر نے بنائی۔

☆ ٹریکٹر 1904ء میں امریکا کے کرالر ہالٹ نے بنایا۔

☆ شاپر بیگ جس سے بنتے ہیں 1908ء میں سوئزرلینڈ کے برینڈن برگر نے ایجاد کیا۔

مرسلہ: فریدہ فری، لاہور

اے ابن آدم

ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے پر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔ پس تو نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا اس کے جو میری چاہت ہے تو میں بخش دوں گا تجھ کو وہ بھی جو تیری چاہت ہے اگر تو نے نافرمانی کی اس کی جو میری چاہت ہے تو میں تجھ کو تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے...... پھر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔

حدیث قدسی

مرسلہ: رخسانہ امجد، ملکوال

یاد

ستارے آج پھر آنکھوں میں جھلملائے ہیں
مجھے بھولے ہوئے کچھ لوگ یاد آئے ہیں
انجام دیکھیے ہوتا ہے کیا وفاؤں کا
ہوا کے دوش پہ ہم نے دیئے جلائے ہیں
اسے بھلانے کی کوشش ہزار کر دیکھی
مگر وہ پہلے سے بھی اور یاد آئے ہیں

مرسلہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

روحانی مشورے

ادارہ

رمضان المبارک

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ماہِ رمضان بہت ہی بابرکت اور فضیلت والا مہینہ ہے۔ یہ صبر و شکر اور عبادت کا مہینہ ہے اور اس ماہِ مبارک کی عبادت کا ثواب ستر درجے عطا ہوتا ہے اور جو کوئی اپنے پروردگار کی عبادت کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرے گا اس کی بہت بڑی جزا اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمائے گا۔

☆ ماہ رمضان کی پہلی شب بعد نمازِ عشا تین مرتبہ سورۂ فتح پڑھنا بہت افضل ہے۔

☆ ماہِ رمضان کی پہلی شب بعد نمازِ تہجد آسمان کی طرف منہ کر کے بارہ مرتبہ یہ دعا پڑھنا بہت افضل ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الْقَائِمُ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ

اس کے پڑھنے والے کو بے شمار نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جائیں گی۔

☆ ماہِ رمضان المبارک میں روزانہ ہر نماز کے بعد اس دعائے مغفرت کو تین مرتبہ پڑھنا بہت افضل ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اِلَیْہِ تَوْبَۃَ عَبْدٍ ظَالِمٍ لَا یَمْلِکُ نَفْسَہٗ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا ط

☆ رمضان المبارک میں ہر نمازِ عشا تراویح کے بعد روزانہ تین مرتبہ کلمۂ طیبہ پڑھنے کی بہت فضیلت ہے۔ پہلی مرتبہ پڑھنے سے گناہوں کی مغفرت ہوگی۔ دوسری مرتبہ پڑھنے سے دوزخ سے آزاد ہونا۔ تیسری مرتبہ پڑھنے سے جنت کا مستحق ہوگا۔

☆ قارئینِ کرام رمضان المبارک کی ہر ساعت کا ثواب لوٹنے کی بھرپور کوشش کیجیے۔ ہم جیسے گناہ گاروں کو کثرت سے تیسرا کلمہ، استغفار اور کلمۂ طیبہ پڑھنا چاہیے اور ان لوگوں کی ضرور مدد کریں جو مستحق ہیں اور ایسے لوگ آپ کے آس پاس، قرب و جوار میں آپ کے خاندان میں ضرور ہوں گے۔

رمضان میں دعا کی قبولیت کا وقت

قبولیتِ دعا کی خصوصی گھڑی تو رمضان المبارک کی ہر شب آتی ہے لیکن شبِ قدر میں اس گھڑی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی شان اور تاثیر ہی جدا ہو جاتی ہے۔ وہ گھڑی نہ معلوم کون سی ہو اس لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو ایک مختصر مگر بہت جامع دعا سکھائی جو اس رات میں آپ بھی کثرت سے پڑھتے تھے اس لیے آپ لوگ بھی کثرت سے پڑھیں۔

اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی (ترمذی)

ترجمہ: میرے اللہ تو بہت معاف کرنے والا، معاف کرنے کو محبوب رکھتا ہے بس مجھے معاف کر دے۔

روزہ کھولنے میں جلدی کرنا

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

''لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔ (بخاری)

سفر میں روزہ رکھنا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

''تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ (رمضان کے علاوہ) دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔'' (البقرہ)

جس طرح سفر میں نماز قصر کرنا جائز ہے اسی طرح مسافر کے لیے روزہ چھوڑنا بھی جائز ہے۔ البتہ اگر روزہ رکھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی روزہ رکھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اگر تکلیف ہو تو پھر روزہ رکھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت حمزہ بن عمرو اسلمیؓ نے رسول اکرم ﷺ سے سوال کیا اور کہا۔

''میں (نفلی) روزے رکھا کرتا ہوں، کیا سفر میں بھی روزہ رکھ لیا کروں؟''

رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ''اگر تو چاہے تو روزہ رکھ لے چاہے تو چھوڑ دے۔''

روزے کا کفارہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔

''جس نے بغیر عذر کے رمضان کا ایک بھی روزہ چھوڑ دیا اس کے بدلے زمانے بھر کے روزے بھی کافی نہیں ہوں گے۔''

صلوٰۃ التسبیح کی فضیلت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو یہ نماز پڑھتا ہے اس کے اگلے پچھلے، ظاہر پوشیدہ، پرانے نئے، عمداً سہواً، چھوٹے بڑے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں۔ یہ نماز آپ روزانہ پڑھیں یا ہر جمعے کو یا سال میں ایک مرتبہ یا کم از کم تمام عمر میں ایک مرتبہ تو ضرور پڑھیں۔

نوٹ ﴿ کوشش کریں کہ رمضان میں کم از کم ہر جمعے کو ظہر کی نماز سے قبل یہ نماز پڑھی جائے۔ اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ چار رکعت صلوٰۃ التسبیح کی نیت باندھیں۔ تکبیر تحریمہ اور ثنا کے بعد پندرہ بار تیسرا کلمہ پڑھیں۔

سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر

اگر اس کے ساتھ ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم ۵ بھی پڑھیں تو زیادہ بہتر ہے۔ (گویا آپ نے اس نماز میں تیسرا کلمہ پڑھنا ہے)

پھر اعوذ باللّٰہ، بسم اللّٰہ اور سورۂ فاتحہ اور دوسری سورہ پڑھ کر دس بار پھر تیسرا کلمہ پڑھیں۔ (آپ کو خیال رہے کہ بیننے پر آپ نے ٹوٹل 25 مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھا ہے۔ پہلے پندرہ پھر دس مرتبہ یعنی پچیس مرتبہ پڑھا گیا ہے اور آپ کو یہ بات یاد رکھنی ہے)

پھر رکوع میں سبحان ربی العظیم کے بعد دس بار پھر رکوع سے اٹھ کر سمع اللّٰہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کے بعد دس بار پھر سجدے میں سبحان ربی الاعلی کے بعد دس بار پھر سجدے سے اٹھ کر جلسے میں دس بار پھر دوسرے سجدے میں سبحان ربی الاعلی کے بعد دس بار پھر کھڑے ہو کر بسم اللہ سے پہلے پندرہ بار پھر اسی ترتیب سے چاروں رکعتیں پڑھیں۔ یہ نماز پڑھنے سے پہلے آپ پہلے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہر رکعت میں پچھتر بار اور چاروں رکعات میں تین سو بار یہ تسبیح پڑھی جائے گی۔

پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد الھاکم التکاثر دوسری میں سورۂ العصر تیسری میں قل یا ایھا الکفرون اور چوتھی رکعت میں قل ھو اللّٰہ ھو احد پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

نوٹ ﴿ اگر کسی کو یہ سورتیں یاد نہ ہوں تو وہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سی بھی سورہ پڑھ سکتے ہیں اس سے آپ کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

☆☆☆

نوٹ ﴿ دس اور پندرہ کی گنتی کے لیے آپ ہاتھ کی انگلیوں سے مدد لے سکتی ہیں۔ ایک چھوٹی تسبیح بھی اپنے ہاتھ میں رکھ سکتی ہیں۔ میں تو جائے نماز پر بنے ہوئے پھولوں کو اپنی نظر میں رکھ کر اپنی گنتی کا حساب رکھتی ہوں۔

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



کیری کی چٹنی

اشیا: آم، ڈیڑھ کلو۔ چینی، ایک کلو۔ پسا ہوا نمک، ایک چھٹانک۔ گرم مسالا، آدھا چھٹانک۔ سرخ مرچ، ایک تولہ۔ سرکہ، ایک پاؤ۔

ترکیب: چٹنی کے لیے کیری ایسی ہونی چاہیے جو کہ زیادہ پکی نہ ہو اور نہ ہی زیادہ کچی۔ ان کو اچھی طرح دھو کر صاف اور خشک کرلیں پھر تیز چاقو سے چھیل کر باریک پھانکیں کاٹ لیں۔ ان کی گٹھلی نکال دیں۔ تراشی ہوئی پھانکوں میں چینی اور نمک اچھی طرح سے ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس طرح یہ پھانکیں کافی پانی چھوڑ دیں گی اور چینی اور نمک بالکل ان میں مل جائے گا۔ اب ان کو ہلکی آنچ پر رکھ کر پکنے دیں۔ تمام مسالے اور مرچیں ململ کی پوٹلی میں باندھ کر پکتی ہوئی آم کی پھانکوں میں ڈال دیں تا کہ ان کا اثر قوام میں چلا جائے۔ مسالا اور مرچ براہِ راست قوام میں ہرگز نہ ڈالیں کیونکہ ایسا کرنے سے چٹنی کی رنگت بدنما ہو جائے گی۔ جب آم کی پھانکیں اچھی طرح گل جائیں اور قوام گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ مسالے کی پوٹلی نکال دیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ٹھنڈی ہونے پر یہ چٹنی کسی چینی یا شیشے کے مرتبان میں ڈال کر رکھ دیں اور جب جی چاہے استعمال کریں۔ یہ چٹنی تین چار ماہ تک خراب نہیں ہوتی۔

صائمہ امین.....لاہور

خستہ کچوری

اشیا: میدہ، دو کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سوڈا، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ تیل، دو کھانے کے چمچ۔ فرائی کے لیے۔ پانی، نصف کپ۔ ادرک، ایک انچ کا ٹکڑا۔ ہری مرچیں، دو سے تین عدد۔ اردکی دال، ایک تہائی کپ۔ ہینگ، ایک چٹکی۔ پسا ہوا دھنیا، ایک چٹکی۔ پسا ہوا زیرہ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ پسی ہوئی لال مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ پسی ہوئی سونف، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ چینی، نصف چائے کا چمچ۔ گھی، چار کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: آٹا، نمک اور بیکنگ سوڈے کو اکٹھا چھان لیں۔ دو کھانے کے چمچ گھی ڈالیں اور اپنی ہتھیلیوں سے انہیں مسل دیں۔ پانی کے ساتھ نرم گوندھیں، گیلے کپڑے سے ڈھانپ کر الگ رکھ دیں۔ ادرک اور ہری مرچیں باریک کاٹ لیں۔ اردکی دال کو ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر تھوڑا سا پانی ڈال کر موٹا پیس لیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ ادرک کٹی ہوئی، ہری مرچیں، کٹی ہوئی۔ ہینگ اور تمام پسے ہوئے مسالے ڈال دیں۔ اچھی طرح ملائیں اور پسی ہوئی دال ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ تمام پانی تقریباً خشک ہو جائے۔ چینی اور نمک ڈال کر اچھی طرح ملائیں چولہے سے اتار دیں۔

مکسچر کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ گندھے ہوئے آٹے کے بارہ گولے بنائیں ہر گولے کو اپنی ہتھیلیوں میں چپٹا کریں تا کہ وہ کناروں پر پتلے اور درمیان میں موٹے ہو جائیں۔ درمیان میں تھوڑی سی بھرائی کریں اور گولہ بنانے کے لیے کناروں کو ملائیں۔ تھوڑا چپٹا کریں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں کم آنچ پر کچوریاں فرائی کریں یہاں تک کہ سنہری اور خستہ ہو جائیں۔ املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

عائشہ نعیم......کراچی

آم گوشت

اشیا: بغیر ہڈی کا گوشت، چھ سو گرام۔ دہی، تین چوتھائی کپ۔ اچور، ایک چائے کا چمچ۔ پسی ہوئی ہلدی، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، چار کھانے کے چمچ۔ رائی، ایک چائے کا چمچ۔ کڑی پتے، آٹھ سے دس عدد۔ لونگ، چار سے پانچ عدد۔ دار چینی، ایک انچ کا ٹکڑا۔ کش کی ہوئی پیاز، ایک کپ۔ ادرک کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ پسا ہوا دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ پسی ہوئی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ کچے آم کے ٹکڑے (بغیر چھلکے کے)، نصف کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: گوشت کو صاف کر کے دھو لیں اور ایک انچ کے برابر ٹکڑے کرلیں۔ دہی، اچور اور ہلدی کے آمیزے میں ڈبو دیں۔ موٹے پیندے کی دیگچی میں تیل گرم کریں۔ رائی، کڑی پتے، لونگ اور دار چینی ڈالیں۔ رائی کو تڑخنے دیں پھر کش کی ہوئی پیاز ڈالیں۔ اس وقت تک پکائیں کہ پیاز نرم ہو جائے۔ بھگوئے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور ادرک کا پیسٹ ڈالیں۔ تیز آنچ پر پکائیں اور برابر ہلاتے رہیں۔ دھنیا (پسا ہوا)، لال مرچ (پسی ہوئی) اور کچے آم کے ٹکڑے ڈالیں اور آدھے منٹ تک پکائیں۔ دو کپ پانی ڈال کر ابالیں۔ ڈھکن کو ڈھانپ دیں اور پکائیں یہاں تک کہ گوشت گل جائے۔ نمک ملائیں اور کم آنچ پر پھر پکائیں یہاں تک کہ شوربا گاڑھا ہو جائے۔ گرم گرم پیش کریں۔

فریحہ ناز......راولپنڈی

مونگ کی دال کا حلوہ

اشیا: مونگ کی دال دھلی ہوئی، ایک کپ۔ چینی، ایک کپ۔ زعفران، ایک چٹکی۔ گھی، ایک کپ۔ دودھ، نصف کپ۔ کھویا، تین چوتھائی کپ۔ بادام، دس تا بارہ عدد۔

ترکیب: مونگ کی دال کو دھو کر چھ گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ بہت کم پانی ڈال کر اسے موٹا پیس لیں۔ چینی اور ڈیڑھ کپ پانی سے شیرہ تیار کریں۔ گرم دودھ میں زعفران ڈالیں۔ کھوئے کے چھوٹے چھوٹے دانے بنالیں۔ ابلتے گرم پانی میں پانچ منٹ تک بادام ڈالے رکھیں۔ ٹھنڈا کر کے انہیں چھیلیں پھر ان کو باریک کاٹ لیں۔ موٹے پیندے کے پین میں گھی کو گرم کریں اور پسی ہوئی مونگ کی دال ڈالیں۔ ہلکی آنچ پر ہلاتے رہیں یہاں تک کہ دال کا رنگ سنہری ہو جائے۔ چینی کا شیرہ اور زعفران والا دودھ ڈالیں۔ انہیں ہلاتے رہیں یہاں تک کہ یک جان ہو جائیں اور حلوہ کڑاہی سے الگ ہونے لگے پھر کھویا ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ گھل جائے۔ باریک کٹے ہوئے باداموں کے ساتھ سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

نوٹ: پسی ہوئی مونگ کی دال ڈالنے سے قبل پگھلے ہوئے گھی میں ایک چائے کا چمچ بیسن ڈالیں۔ اس کے نتیجے میں پسی ہوئی مونگ کی دال کے پکانے کے دوران گٹھلیاں نہیں بنیں گی۔

حنا عزیز......کراچی

کھٹے چنے

اشیا:۔ کابلی چنے، ایک پاؤ۔ دال مسور اور دال مونگ، ایک، ایک چھٹانک۔ پیاز، ایک عدد درمیانی۔ گھی، چار بڑے چمچے۔ نمک، مرچ، ہلدی، سبز مرچیں، گرم مسالا، حسبِ ضرورت۔ لیموں کا رس یا املی کا پانی، آدھی پیالی۔ میٹھا سوڈا، آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب:۔ کابلی چنے دھو کر رات کے وقت بھگو کر رکھ دیجیے یعنی چنے کم از کم آٹھ گھنٹے ضرور بھگوئے جائیں۔ بعد میں چھلنی میں ڈال کر تمام پانی نکال دیں۔ ان چنوں میں میٹھا سوڈا چائے کا آدھا چمچ ڈال کر چنوں کو خوب ہلائیں پھر پندرہ منٹ اسی طرح چھلنی میں ہی پڑے رہنے دیجیے۔ اب چنوں میں اتنا پانی ڈالیے جس میں ہلکی آنچ پر پکانے سے چنے گل جائیں۔ چنوں پر جو جھاگ آئے وہ چمچے سے نکالتی جائیں۔ جب چنے نرم ہو جائیں تو دال مسور اور دال مونگ اور سارا مسالا ان کے ساتھ ہی پکنے کے لیے ڈال دیں۔ گل جانے پر آگ سے اتار لیں۔

عائشہ، حیدر آباد

قیمہ بھری پوریاں

اشیا:۔ میدہ، ایک کلو۔ قیمہ، ایک کلو۔ گھی، ایک کلو۔ الائچی، لونگ، دو، دو ماشے۔ سرخ مرچ و سیاہ مرچ، تین تین ماشہ۔ پیاز، ایک پاؤ۔ ادرک، دھنیا، دو، دو تولے۔ لہسن، نصف چھٹانک۔ دہی، آدھا پاؤ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ لیموں کاغذی، پانچ عدد۔ پنیر، ایک پاؤ۔ زعفران، تین ماشہ۔

ترکیب:۔ برتن میں دہی، ادرک، پاؤ بھر گھی اور پیاز ملا کر خوب بھونیں اور الگ رکھ لیجیے۔ اس کے بعد دار چینی، لونگ، الائچی، مرچ سرخ و سیاہ، دھنیا، لہسن خوب باریک پیس کر نمک شامل کر کے گھی میں بھونیں۔ پھر قیمہ ڈال کر اچھی طرح بھونیے، بھوننے کے بعد پانی کا چھینٹا دے کر پکائیں۔ اچھی طرح گل جانے پر جب پانی بالکل خشک ہو جائے تو پیاز جسے بھون کر الگ رکھ لیا تھا، عرقِ لیموں، زعفران اور پنیر میں ملا کر ڈال دیجیے۔ دوسری طرف میدے میں آدھا پاؤ گھی شامل کر کے اور نمک ملا کر پانی یا دودھ سے گوندھ کر پوریاں بنا لیجیے اور پوریوں میں قیمہ بھر کر تل لیجیے۔ بعض عورتیں قیمے کے بجائے میتھی کا ساگ شامل کرتی ہیں۔

روحا علی، میر پور خاص

چنے کی دال کی پوریاں

اشیا:۔ میدہ، آدھا کلو۔ چنے کی دال، ڈیڑھ پاؤ۔ سفید زیرہ، تین ماشہ۔ سیاہ مرچ، چار ماشہ۔ پیاز، ایک گٹھی۔ دھنیا، ایک تولہ۔

ترکیب۔ سب سے پہلے میدے میں مناسب نمک اور پانی ملا کر اس کو آٹے کی طرح گوندھ لیں اور سیاہ مرچ اور سفید زیرے کو باریک پیس لیں اور اس مرکب کو چنے کی دال کے ساتھ ملا کر اس دال کو ابالیں جب دال گل جائے اور اس کا پانی خشک ہو جائے تو چولھے سے اتار لیں اور باریک پیس لیں پھر سیاہ مرچ اور سفید زیرے کا یہ آمیزہ اس پر چھڑک دیں اس کے بعد میدے کے پیڑے بنا لیں اور ان میں یہ پسی ہوئی دال بھر کر پوریاں بنا لیں۔ (بعض دفعہ پوریوں کو مزید خستہ کرنے کے لیے میدہ گوندھتے وقت اس میں ذرا سا گھی بھی ملایا جاتا ہے) گھی میں تل لیں۔ کھٹی میٹھی چٹنی، اچار، آلو یا پھر چنے کی ترکاری سے مزے اڑائیں۔

نور، کوٹ غلام محمد

کون کیا کر رہا ہے

مہتاب خان

بول سے پہلے خاموش رہو

ہدایت کار شعیب منصور کی فلم بول سے پہلے ہدایت کار الطاف حسین کی فلم خاموش رہو ریلیز کر دی گئی۔ فلم خاموش رہو 2011ء کی پہلی اردو فلم ہے یہ فلم اس سال کی پہلی پاکستانی فلم ہے جو سینما میں نمائش پزیر ہوئی۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کی دگرگوں صورتِ حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اس سال کی پہلی اردو فلم ہے۔ ہدایت کارہ سنگیتا کا اس فلم کے بارے میں کہنا ہے کہ انڈسٹری میں رونقیں آنے والی ہیں اور ہماری دعا ہے کہ یہ فلم کامیاب ہو، اس فلم کی کامیابی دراصل انڈسٹری کی کامیابی ہوگی۔ سنگیتا بھارت اپنا میڈیکل چیک اپ کروانے جا رہی ہیں وہ ہر سال بھارت جاتی ہیں، سنگیتا کو انفیکشن ہے۔

میرا



بھارتی اداکارہ راکھی ساونت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پاکستانی اداکارہ میرا نے بھی ٹی وی ریلیٹی شو کون بنے گا میرا پتی کے ذریعے اپنے جیون ساتھی کی تلاش شروع کر دی ہے۔ میرا کا کہنا ہے کہ چھبیسویں ہفتے وہ دلہن کا سرخ جوڑا پہن ہی لیں گی۔ جیو ٹی وی کے اس ریلیٹی شو کی کئی قسطیں آن ائر ہو چکی ہیں جس میں نوجوان میرا کا دل جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک ایسا نوجوان ہو گا جس سے میرا شو میں ہی شادی کریں گی۔ میرا کی عمر 25 سال ہو گئی ہے۔ میرا نے اپنی سوشل ویب سائٹ پر لکھا ہے کہ میرے پاس ہزاروں آفرز ہیں لیکن میں شادی اسی نوجوان سے کروں گی جو میرا ہر طرح خیال رکھے گا۔ یہ نوجوان کون ہو گا اس کا فیصلہ تو شو کی آخری قسط میں ہی ہو گا۔ شو کی ایک قسط میں میرا نے ایک لمبے بالوں والے نوجوان سے پوچھا کہ کیا وہ ان کی خاطر اپنے بال منڈوا سکتے ہیں؟ اس پر نوجوان نے نہایت جذباتی ہو کر کہا کہ اگر میرا کہیں تو وہ اپنی ناک کٹوا دے، بالوں کی بات تو معمولی ہے یہ کہتے ہی اس نوجوان نے رونا شروع کر دیا۔ شو میں میرا نے بھارت کی لیجنڈ اداکارہ مینا کماری کی طرح خود کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ایک نوجوان سے جب انہوں نے پوچھا کہ وہ کیسی لگتی ہیں تو نوجوان کا جواب تھا مینا کماری۔ ایک نوجوان نے میرا کو تاج محل کا ماڈل تحفہ میں دیتے ہوئے کہا کہ وہ محبت کی نشانی تاج محل سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت ہیں۔ کچھ نوجوانوں نے اپنی آواز میں گانے گا کر میرا کے حسن کی تعریف کی جسے سن کر میرا شرما گئیں۔ کچھ نوجوانوں کے سامنے میرا نے یہ شرط رکھی کہ انہیں سگریٹ پینے والے لوگ پسند نہیں لہٰذا ان کا

منگوا سکتی ہیں، رابطہ کیجیے 021-36981952 پر)

کشور زیدی، لاہور سے۔ ”عذرا رسول کو مبارک باد دے دیں اور بتا دیں کہ ان کی شخصیت ان خواتین کے لیے مثال ہے جو اپنے بیمار شوہر کی خدمت کے بجائے سیر سپاٹوں میں اپنا وقت گزارتی ہیں.... ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ان دنوں بہت تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ پڑھنے کو بتائیں۔“ (کشور بہن! اس محفل میں خوش آمدید، پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد آپ اچھی اچھی کتابیں پڑھیں۔ کتاب بہترین دوست ہوتی ہے۔ ہم نئی نئی کتابوں کا ذکر اسی لیے تو اس محفل میں کرتے ہیں کہ آپ سب کو آگہی رہے۔ اب جیسے ڈاکٹر قدیر خان کے بارے میں جو کتاب عروضہ شائع ہوئی ہے اس کتاب کی تمام آمدن رفاہی کاموں پر خرچ کی جائے گی۔ جو بھی یہ کتاب خریدے گا نیک کام میں اس کا حصہ بھی شامل ہو جائے گا۔ اسی طرح قیصرہ حیات کا ناول بے حد مختلف ہے۔ اللہ اور انسان کا کیا تعلق ہے یہ اس کا موضوع ہے)

شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ”دلہن نمبر بے حد پسند آیا وجہ اس کی یہ تھی کہ ہر لحاظ سے منفرد رہا۔ چاہے وہ دلہنوں کی تصاویر ہوں یا سروے کے سوالات۔ افسانے بھی بے حد اچھے سلیکٹ کیے گئے تھے۔ اگر ملنا نہیں ہمدم کا اختتام ہوا، ناول کا انجام بے حد اچھا رہا۔ میں چاندی اور قربتوں کی دوری دونوں کی قسطیں پسند آئیں۔ فصیحہ تمہیں دلہن بنا دیکھ کر بے حد اچھا لگا۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اس دفعہ عظمیٰ آفاق کا سروے بہترین رہا۔ تیکھے سوال اور مزے دار جواب اس کا خاصہ تھے اور وہ جو آپ نے دلہنوں کی تصاویر کے نیچے کیپشن لگائے ہیں وہ بھی اچھے لگے۔ تصاویر اگر رنگین ہوتی تو اور اچھی لگتیں۔ شادی کا ایک ایک پل پڑھ کے لگا ہم بھی ندا کی شادی میں شریک ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو ندا کو، آپ کی ساری فیملی کو یہ شادی۔ پاکیزہ ڈائری اور مستقل سلسلے بھی حسبِ معمول اچھے تھے۔ پاکیزہ ڈائری میں شبانہ حیات نے جو اچھی بیوی بننے کے رموز لکھے ہیں بالکل ٹھیک ہیں بہت پسند آئے۔ اس کے علاوہ ساس کو خوش رکھنے کے سات طریقے بھی بہت اچھے ہیں۔ روحانی مشورے بہترین لگے۔ ہماری نسیم نیازی خوشبوؤں کے سفر پر روانہ ہو گئی ہیں۔ میری طرف سے وہ عمرے کی دلی مبارک باد قبول کریں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ”پاکیزہ ہماری فیملی میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ہم لوگ سب سے پہلے جلترنگ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کو سناتے بھی ہیں۔ ذکیہ بلگرامی کا ناول بے حد شوق سے پڑھا...... ہم چاہتے ہیں کہ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کا سلسلہ پھر جاری ہو کیونکہ اس میں انہوں نے اپنی فیملی کے بارے میں تفصیلی نہیں لکھا تھا۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

ایک بہن، پنجاب سے۔ ”باجی آپ نے میرا نام نہیں شائع کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرا مسئلہ خاص نہ لگے مگر یہ مسئلہ میرے لیے بہت بڑا ہے۔ میری تین ماہ پہلے شادی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں رواج ہے کہ ساس جب سونے کے لیے بستر پر لیٹے بیٹا، بہو اس کو دباتے ہیں پھر وہ سونے کے لیے جاتے ہیں مگر میری ساس رات کو دیر تک ٹی وی پر کیبل کے پروگرام دیکھتی رہتی ہیں۔ سونے کے لیے لیٹتی نہیں ہیں، اس کی وجہ سے ہمیں ان کے پاس بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ ٹی وی کے پروگرام سے فارغ ہو کر وہ عشا کی نماز پڑھتی ہیں اس وقت تک ہماری تو آدھی رات گزر چکی ہوتی ہے۔“ (اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے گھر سے کیبل نکلوا دیں)

فرزانہ سعید، راول پنڈی سے۔ ”دلہن نمبر دیکھا۔ ٹائٹل بکواس سا لگا۔ ویسے تو خوب زیور لاد رکھا ہے مگر ہاتھ میں ایک انگوٹھی تک نہیں۔ شیریں حیدر کا ناول بکواس۔ راحت وفا کا ناول بکواس ترین ...... کیوں لگا دیا۔ دلہنوں کی تصاویر بکواس، پھیکی، مدھم مدھم سی تصاویر بالکل اچھی نہیں لگیں۔ جلترنگ پڑھا تو وہ بکواس مجھے معلوم ہے کہ میرا خط آپ شائع نہیں کریں گی۔“ (پیاری فرزانہ! اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کو ہر تحریر اور ہر تصویر بکواس لگی پسند ناپسند ہر شخص کی الگ ہوا کرتی ہے مگر ہمیں آپ کا خط ہرگز بکواس نہیں لگا دوسرے خط کا انتظار رہے گا)

شکیلہ رقیہ، اوچ شریف۔ گڑیا رمضان المبارک میں کثرت سے پہلا کلمہ اور تیسرا کلمہ پڑھیں۔ توبہ کے نفل اور شکرانے کی نفل روزانہ پڑھنے کی کوشش کریں۔ ہاں اپنی دعاؤں میں اپنی انجم باجی، میرے اہلِ خانہ، میرے ادارے کے تمام لوگ، میری تمام مصنفات اور تمام بہنوں کو یاد رکھیں۔

بنت پاکستان، بھکر سے۔ ”پاکیزہ میرا پسندیدہ ماہنامہ ہے اور بہنوں کی محفل میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ جس میں شریک ہوئے بغیر بھی شریک رہتی ہوں۔ عمیرہ احمد میری فیورٹ رائٹر ہیں ان کا ناول شروع ہو رہا ہے میری جانب سے انہیں پیشگی مبارک باد پہنچا دیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ”ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ پاکیزہ ہمہ وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ اس میں شامل تحریریں پڑھ کر اچھا لگتا ہے اور سچ بتاؤں سب سے زیادہ مزہ بہنوں کی محفل پڑھ کر آتا ہے۔ میں تو بار بار پڑھتی ہوں اس کو۔“ (میں بھی سچ سچ بتاؤں، مجھے بھی آپ لوگوں کے خط پڑھ کر سواد آیا کرتا ہے۔ ہاں نیا گھر مبارک ہو)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”جولائی کا دلہن نمبر بے حد پسند آیا۔ ذکیہ بلگرامی کے ناول کی آخری قسط بہت اچھی رہی، اس ناول کو پڑھ کر از حد لطف آیا تھا۔ شیریں حیدر میری پسندیدہ مصنفہ ہیں مگر ان کا طرزِ تحریر بہت بولڈ ہے وہ ہتھ ہولا کر کے لکھیں۔ رضوانہ پرنس بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ راحت وفا کا ناول بس ٹھیک ہے کے زمرے میں آتا ہے۔ اس ماہ عطیہ عمر کا افسانہ زیادہ اچھا لگا۔ عظمیٰ آفاق کے سروے نے تو طرح طرح کے جوابات بلکہ طرح طرح کی کہانیوں کا مزہ دیا۔ بے حد بھرپور سروے تھا۔ کارنر کی تصویریں اور نظمیں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ جلترنگ کا کیا کہنا اس ماہ اداریہ بہت زیادہ پسند آیا کہ آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بہنوں کی محفل تمام سلسلوں میں ٹاپ پر تھی۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

ہما، سیالکوٹ۔ آپ پریشان مت ہوں۔ جب آپ کی دوست کو معلوم ہوگا کہ آپ مخلص ہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس از خود ہوگا اور وہ آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ پھر بڑھا دے گی۔ انشاء اللہ۔

انیلہ سعید، لیہ سے۔ ”انجم باجی آپ کے ناول کی کمی ہر ماہ شدت سے ہو رہی ہے۔ اگر آپ فوری طور پر اپنا ناول نہیں دے سکتیں تو گاہے بہ گاہے اپنا افسانہ تو دے سکتی ہیں۔ دراصل آپ کی تحریر پڑھنے کی عادت جو ہو گئی ہے۔ ہاں شیریں حیدر کا ناول اس وقت ٹاپ پر جا رہا ہے۔ میری مبارک باد ان تک پہنچا دیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ”باجی میں مرتے مرتے بچی ہوں۔ پندرہ دن اسپتال میں بھی ایڈمٹ رہی مگر پاکیزہ سے ناتا نہیں ٹوٹا۔ یہ میرا پسندیدہ ترین ماہنامہ ہے، اب یہ جلدی مل جاتا ہے۔ میں اس کی سطر سطر بہت

منگوا سکتی ہیں، رابطہ کیجیے 021-36981952 پر)

کشور زیدی، لاہور سے۔ ”عذرا رسول کو مبارک باد دے دیں اور بتا دیں کہ ان کی شخصیت ان خواتین کے لیے مثال ہے جو اپنے بیمار شوہر کی خدمت کے بجائے سیر سپاٹوں میں اپنا وقت گزارتی ہیں.... ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ان دنوں بہت تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ پڑھنے کو بتائیں۔“ (کشور بہن! اس محفل میں خوش آمدید، پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد آپ اچھی اچھی کتابیں پڑھیں۔ کتاب بہترین دوست ہوتی ہے۔ ہم نئی نئی کتابوں کا ذکر اسی لیے تو اس محفل میں کرتے ہیں کہ آپ سب کو آگہی رہے۔ اب جیسے ڈاکٹر قدیر خان کے بارے میں جو کتاب عروضہ شائع ہوئی ہے اس کتاب کی تمام آمدن رفاہی کاموں پر خرچ کی جائے گی۔ جو بھی یہ کتاب خریدے گا نیک کام میں اس کا حصہ بھی شامل ہو جائے گا۔ اسی طرح قیصرہ حیات کا ناول بے حد مختلف ہے۔ اللہ اور انسان کا کیا تعلق ہے یہ اس کا موضوع ہے)

شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ”دلہن نمبر بے حد پسند آیا وجہ اس کی یہ تھی کہ ہر لحاظ سے منفرد رہا۔ چاہے وہ دلہنوں کی تصاویر ہوں یا سروے کے سوالات۔ افسانے بھی بے حد اچھے سلیکٹ کیے گئے تھے۔ اگر ملنا نہیں ہمدم کا اختتام ہوا، ناول کا انجام بے حد اچھا رہا۔ میں چاندنی اور قربتوں کی دوری دونوں کی قسطیں پسند آئیں۔ فصیحہ تمہیں دلہن بنا دیکھ کر بے حد اچھا لگا۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اس دفعہ عظمیٰ آفاق کا سروے بہترین رہا۔ تیکھے سوال اور مزے دار جواب اس کا خاصہ تھے اور وہ جو آپ نے دلہنوں کی تصاویر کے نیچے کیپشن لگائے ہیں وہ بھی اچھے لگے۔ تصاویر اگر رنگین ہوتی تو اور اچھی لگتیں۔ شادی کا ایک ایک پل پڑھ کے لگا ہم بھی ندا کی شادی میں شریک ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو ندا کو، آپ کی ساری فیملی کو یہ شادی۔ پاکیزہ ڈائری اور مستقل سلسلے بھی حسب معمول اچھے تھے۔ پاکیزہ ڈائری میں شبانہ حیات نے جو اچھی بیوی بننے کے رموز لکھے ہیں بالکل ٹھیک ہیں بہت پسند آئے۔ اس کے علاوہ ساس کو خوش رکھنے کے سات طریقے بھی بہت اچھے ہیں۔ روحانی مشورے بہترین لگے۔ ہماری نسیم نیازی خوشبوؤں کے سفر پر روانہ ہوگئی ہیں۔ میری طرف سے وہ عمرے کی دلی مبارک باد قبول کریں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ”پاکیزہ ہماری فیملی میں بڑے ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ہم لوگ سب سے پہلے جلترنگ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کو سناتے بھی ہیں۔ ذکیہ بلگرامی کا ناول بے حد شوق سے پڑھا...... ہم چاہتے ہیں کہ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کا سلسلہ پھر جاری ہو کیونکہ اس میں انہوں نے اپنی فیملی کے بارے میں تفصیلی نہیں لکھا تھا۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

ایک بہن، پنجاب سے۔ ”باجی آپ نے میرا نام نہیں شائع کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو میرا مسئلہ خاص نہ لگے مگر یہ مسئلہ میرے لیے بہت بڑا ہے۔ میری تین ماہ پہلے شادی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں رواج ہے کہ ساس جب سونے کے لیے بستر پر لیٹے بیٹا، بہو اس کو دباتے ہیں پھر وہ سونے کے لیے جاتے ہیں مگر میری ساس رات کو دیر تک ٹی وی پر کیبل کے پروگرام دیکھتی رہتی ہیں۔ سونے کے لیے لیٹتی نہیں ہیں، اس کی وجہ سے ہمیں ان کے پاس بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ ٹی وی کے پروگرام سے فارغ ہو کر وہ عشا کی نماز پڑھتی ہیں اس وقت تک ہماری تو آدھی رات گزر چکی ہوتی ہے۔“ (اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے گھر سے کیبل نکلوا دیں)

فرزانہ سعید، راول پنڈی سے۔ ”دلہن نمبر دیکھا۔ ٹائٹل بکواس سا لگا۔ ویسے تو خوب زیور لاد رکھا ہے مگر ہاتھ میں ایک انگوٹھی تک نہیں۔ شیریں حیدر کا ناول بکواس۔ راحت وفا کا ناول بکواس ترین ...... کیوں لگا دیا۔ دلہنوں کی تصاویر بکواس، پھیکی، مدھم مدھم سی تصاویر بالکل اچھی نہیں لگیں۔ جلترنگ پڑھا تو وہ بکواس مجھے معلوم ہے کہ میرا خط آپ شائع نہیں کریں گی۔“ (پیاری فرزانہ! اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کو ہر تحریر اور ہر تصویر بکواس لگی پسند ناپسند ہر شخص کی الگ ہوا کرتی ہے مگر ہمیں آپ کا خط ہرگز بکواس نہیں لگا دوسرے خط کا انتظار رہے گا)

شکیلہ رقیہ، اوچ شریف۔ گڑیا رمضان المبارک میں کثرت سے پہلا کلمہ اور تیسرا کلمہ پڑھیں۔ توبہ کے نفل اور شکرانے کی نفل روزانہ پڑھنے کی کوشش کریں۔ ہاں اپنی دعاؤں میں اپنی انجم باجی، میرے اہلِ خانہ، میرے ادارے کے تمام لوگ، میری تمام مصنفات اور تمام بہنوں کو یاد رکھیں۔

بنت پاکستان، بھکر سے۔ ”پاکیزہ میرا پسندیدہ ماہنامہ ہے اور بہنوں کی محفل میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ جس میں شریک ہوئے بغیر بھی شریک رہتی ہوں۔ عمیرہ احمد میری فیورٹ رائٹر ہیں ان کا ناول شروع ہو رہا ہے میری جانب سے انہیں پیشگی مبارک باد پہنچا دیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ”ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ پاکیزہ ہمہ وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ اس میں شامل تحریریں پڑھ کر اچھا لگتا ہے اور سچ بتاؤں سب سے زیادہ مزہ بہنوں کی محفل پڑھ کر آتا ہے۔ میں تو بار بار پڑھتی ہوں اس کو۔“ (میں بھی سچ سچ بتاؤں، مجھے بھی آپ لوگوں کے خط پڑھ کر سواد آیا کرتا ہے۔ ہاں نیا گھر مبارک ہو)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”جولائی کا دلہن نمبر بے حد پسند آیا۔ ذکیہ بلگرامی کے ناول کی آخری قسط بہت اچھی رہی، اس ناول کو پڑھ کر از حد لطف آیا تھا۔ شیریں حیدر میری پسندیدہ مصنفہ ہیں مگر ان کا طرزِ تحریر بہت بولڈ ہے وہ ہتھ ہولا کر کے لکھیں۔ رضوانہ پرنس بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ راحت وفا کا ناول بس ٹھیک ہے کے زمرے میں آتا ہے۔ اس ماہ عطیہ عمر کا افسانہ زیادہ اچھا لگا۔ عظمیٰ آفاق کے سروے نے تو طرح طرح کے جوابات بلکہ طرح طرح کی کہانیوں کا مزہ دیا۔ بے حد بھرپور سروے تھا۔ کارنر کی تصویریں اور نظمیں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ جلترنگ کا کیا کہنا اس ماہ اداریہ بہت زیادہ پسند آیا کہ آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بہنوں کی محفل تمام سلسلوں میں ٹاپ پر تھی۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

ہما، سیالکوٹ۔ آپ پریشان مت ہوں۔ جب آپ کی دوست کو معلوم ہوگا کہ آپ مخلص ہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس از خود ہوگا اور وہ آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ پھر بڑھا دے گی۔ انشاء اللہ۔

انیلہ سعید، لیہ سے۔ ”انجم باجی آپ کے ناول کی کمی ہر ماہ شدت سے ہو رہی ہے۔ اگر آپ فوری طور پر اپنا ناول نہیں دے سکتیں تو گاہے بہ گاہے اپنا افسانہ تو دے سکتی ہیں۔ دراصل آپ کی تحریر پڑھنے کی عادت جو ہوگئی ہے۔ ہاں شیریں حیدر کا ناول اس وقت ٹاپ پر جا رہا ہے۔ میری مبارک باد ان تک پہنچا دیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ”باجی میں مرتے مرتے بچی ہوں۔ پندرہ دن اسپتال میں بھی ایڈمٹ رہی مگر پاکیزہ سے ناتا نہیں ٹوٹا۔ یہ میرا پسندیدہ ترین ماہنامہ ہے، اب یہ جلدی مل جاتا ہے۔ میں اس کی سطر سطر بہت

شوق سے پڑھتی ہوں۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا فرمائے، آمین)

✍ نسرین لغاری، ٹنڈو باگو سے۔ "نایاب عروج کی شادی کا حال بہت اچھا لگا، وہ خود بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ زاہدہ عاصم کی شادی کا احوال پڑھ کر ہنسی بھی آئی کہ دلہن خود کہہ رہی ہے کہ شادی میں مزہ نہیں آیا۔ عظمیٰ آفاق کی دلہن بنی تصویر ان کے سروے میں شامل ہونی چاہیے تھی آپ ہماری شکایت ان تک پہنچادیں۔" (عظمیٰ کہتی ہیں کہ ان کی تصویر دو مرتبہ پاکیزہ کے ٹائٹل پر شائع ہو چکی ہے۔ اب دوسری بہنوں کا حق زیادہ ہے کہ ان کی تصاویر شائع ہوں)

✍ صاعقہ ریاض، حیدرآباد سے۔ "دلہن نمبر میں میری شرکت نہیں ہوئی۔ اس لیے مجھے بالکل مزہ نہیں آیا۔ انجم باجی میں ناراض ہوں۔ فصیحہ آصف خان جب اپنی نظم میں یہ لکھتی ہیں کہ زندگی ایک بار ملتی ہے تو انہوں نے یہ کیوں لکھا کہ میں ہر جنم میں تیری دلہن بنوں، یہ تو غلط بات ہے بھئی۔ ساری دلہنیں بہت پیاری لگیں مگر آپ نے انہیں رونمائی میں کیا دیا؟" (پیاری صاعقہ! مجھے معلوم ہے کہ تم ناراض ہو جب ہی تو تمہیں منا رہے ہیں اور بھئی دلہنوں کو ہم نے خوب ڈھیر ساری دعائیں دی ہیں۔ اگر کسی کے لفافے دینے پڑتے تو اس کے لیے تو کوئی لون وغیرہ لینا پڑتا)

✉ خاکِ مدینہ، پنجاب۔ کہاں ہو بھئی۔ تمہارے موبائل پر کئی مرتبہ فون بھی کر چکی ہوں شاید بند پڑا ہے، رابطہ کرو۔

✍ فرخ وسیم فری، ملتان سے۔ "شیریں حیدر صاحبہ کا ناول زبردست ہے۔ ہمیشہ کی طرح ان کی تحریر دل کو چھو لینے والی ہے، گاؤں کی زندگی کا زبردست نقشہ کھینچا ہے۔ قربتوں کی دوری بھی اچھا لگا۔ اس میں چندا کا ایک دم باغی ہو جانا دکھ ہوا۔ اکثر کام کرنے والی ماسیوں کے بچوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید وہ ان کی تربیت صحیح نہیں کر پاتیں پھر تعلیم کا فقدان...... شازیہ چوہدری کا افسانہ عکاسی کر رہا تھا ان گھرانوں کی جن کے پاس نئی نئی دولت آتی ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے بار بار شازیہ چوہدری کی یاد آتی رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ اگر ملنا نہیں ہمدم میں بڑا انتظار تھا کہ رافع کب ارسلہ سے ملے گا اب اگر ملاقات ہو ہی گئی ہے تو شادی کرنا تو بنتا ہی ہے۔ لبنیٰ عروج کا ناولٹ کیا خوب تھا۔ پریشے نے بہت اچھا کیا جو علی رضا کو چھوڑ کر چلی گئی خیر اینڈ اچھا ہو گیا مگر پسند کی شادی کرنے پر اس قدر سزا تو نہیں دینی چاہیے تھی۔ اس کی اجازت تو ہمارا اسلام بھی دیتا ہے۔ دین کی باتیں، پاکیزہ ڈائری اور باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔" (شکریہ)

✍ ہما شاہ، ہارون آباد سے۔ "فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ، رضوانہ بہت خوب' واہ تصاویر کا انتخاب لاجواب تھا خاص طور پر یہ سب سے پہلی اور بڑے بھائی کے گھر دعوت میں لی گئی تصویر بہت ہی پسند آئی۔ ذیشان کا واقعی بچپن سے لڑکپن تک اسٹڈی اسٹائل ایک ہے۔ ان کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا اور رضوانہ نے بھی جس طرح ہر ہر پہلو کو اجاگر کیا، قابلِ ستائش ہے بہت مبارک ہو۔ کبھی کبھی عطیہ عمر کے افسانے کا اینڈ کچھ اچھا نہیں لگا نہ ہی آخری لفظ اچھے لگے۔ انسان کو نیکی کرتے دیکھ کر اور دوسروں کو نیکی کے راستے پر دیکھ کر تو انسان کا ضمیر اسے ضرور اس راہ پر چلنے کے لیے اکساتا ہے مگر شاید ناگن عورت کا ایک گھناؤنا روپ ہر جگہ اپنی من مانی اور من چاہی شے کے حصول کے لیے دوسروں کی زندگی تک داؤ پر لگا دینا پڑھ کر عجیب سا احساس ہوا شاید عورت کی

اصل یہ نہیں' عورت تو محبت اور چاہت کا بدل ہے، وفا کی دیوی ہے اور اگر کوئی ایک آدھ کردار ایسا آتا ہے تو وہ قابلِ نفرین ہے۔ ایسی کی تیسی وفادار بیویوں کی ایک مثال...... بہت خوب صورت تحریر ہے۔ گھر واقعی اسی وقت جنت بنتا ہے جب مرد کا کنٹرول ہو اور عورت پر واقعی اسلامی لحاظ سے بھی اس بات کی پابندی ہے کہ وہ شوہر کی منشا کے بغیر کبھی بھی کوئی کام نہ کرے اور جس بات کی شوہر ہنسی خوشی اجازت دے وہ کام کرے۔ بہت شاندار تحریر تھی۔ ہیپی برتھ ڈے سالگرہ نمبر کے حوالے سے اچھی تحریر رہی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں مل کر گھر کے آنگن کو مہکاتی ہیں دلوں کو فرحت و تازگی کے مشکبک خرام جھونکوں سے نوازتی ہیں۔ چاند ہرجائی ہے اچھی تحریر رہی۔ ایک ننھی نیناں نہ جانے کیوں خاص متاثر نہیں کر رہی خوشبو کا سفر بہترین ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ خالدہ نسیم، یو کے سے۔ "سب سے پہلے رضوانہ کا بیان اور عذرا رسول کی زندگی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ جب رسالہ کھولتی تھی اسی کو پڑھنا شروع کر دیتی تھی۔ ہر بار آخر تک آتے آنکھ میں پانی بھر جاتا تھا۔ دونوں کے لیے دل سے دعا نکلتی تھی۔ عذرا رسول کے لیے اور معراج رسول صاحب کے لیے اور عذرا رسول کے لیے ایک شعر۔ محبت کے اِک لمحے میں، بتادی زندگی ہم نے...... عظمیٰ نے بھی کمال کا لکھا ہے مگر سبق خطرناک ہے۔ ایک بات اور کہنی ہے جو کہانیاں سلسلے وار چھپیں تو باقی آئندہ زیادہ آئندہ ہو جاتا ہے۔ ایک کو روک کر دوسری کو پورا کر دیں۔ انتظار میں کمی ہو جائے گی۔" (بہت بہتر)

✍ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی سے۔ "اس مہینے میں چھپنے والی اپنی نظم کو دیکھ کر تو یقین کریں میرا سیروں کے حساب سے خون بڑھ گیا۔ عظمیٰ کی اصلاح نے میری نظم میں چار چاند لگا دیے۔ نظم کے چھپنے سے ایک ہفتے قبل ہی اسکول کی میٹرک کی فیرول میں لڑکیوں نے اس پر خاکہ تیار کیا تھا۔ مجھے بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ اب آتے ہیں ماہنامے کی طرف تمام لگاتار ناولز بہت اچھے جا رہے ہیں۔ خاص طور سے شیریں حیدر جو روز بروز ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اللہ انہیں اور زورِ قلم عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ عالیہ بخاری اب طوالت کے باعث کچھ مزہ نہیں آرہا ہے جلد از جلد روما کو سمعیہ کا اصل چہرہ کروا ہی دینا چاہیے۔ بے چاری زارا خوامخواہ میں پس رہی ہے۔ اب آتے ہیں شاندار لو اسٹوری کی طرف جس کے ہیرو اور ہیروئن نے واقعی اپنی محبت کو امر کر دیا۔ جی ہاں، عذرا رسول اور معراج صاحب...... اللہ تعالیٰ ان دونوں کی جوڑی کو یونہی سلامت رکھے اور معراج صاحب کو صحت عطا فرمائے۔ واقعی محبتوں کا بار بے حد بھاری ہوتا ہے مگر عذرا صاحبہ نے واقعی محبتوں کا حق ادا کر دیا۔ خدا عذرا کے سر کے سائیں کو سلامت رکھے اور انہیں بھی ایسی ہی بہو عطا فرمائے جو اُن کے باغیچے کا پھول ثابت ہو۔ بہنوں کی محفل پڑھ کر سب کی خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ اس دفعہ عظمیٰ صاحبہ کا مختصر افسانہ پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ عظمیٰ کو میری طرف سے بے حد مبارک باد۔ باقی تمام سلسلے بھی حسبِ روایت شاندار تھے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ یاسمین چوہدری، سیالکوٹ سے۔ "سرورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ باقی مستقل سلسلے اپنی مثال آپ تھے۔ جن میں سے جلترنگ ہمارا موسٹ فیورٹ ہے۔ انجم آنٹی محبت ہم سفر میری کا اختتام دل خوش کر گیا۔ پلیز آنٹی جی یہ جملہ لکھنے کو ہم بہت ہی بے تاب ہو رہے ہیں۔ عالیہ جی کو سمیعہ کی اصلیت جلد ہی ہارون اور روما کے سامنے لے آنی چاہیے۔ شہوار کو تو تنویر کی اصلیت جان کر جو صدمہ ہوا اسے پڑھ کر ہمیں در شہوار سے بہت ہمدردی ہوتی ہے۔ تہمینہ کی نیا کو بھی پار لگا دیجیے۔ ایک ننھی نیناں میں ہمیں سب سے زیادہ متاثر یہ راجا صاحب،

ڈاکٹر اور سکھاں کے کردار کر رہے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ ہی نیناں کی دادی مرحومہ ہیں۔ باقی رائٹر صاحبہ ہی بہتر جانتی ہیں۔ شیریں آنٹی کا ناول تو ہمیں لگتا ہے کہ امر بیل کا ریکارڈ توڑ دے گا، انشاء اللہ۔ آنٹی جی نوخیز انجم صاحبہ تو لندن جانے کے بعد ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔ عظمیٰ آفاق سعید کا ایسی کی تیسی اچھا لگا۔ آنٹی عذرا رسول صاحبہ کے انٹرویو کے تو کیا ہی کہنے۔ رضوانہ آنٹی نے تو گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ عذرا جی کی گلابی رنگت کا راز بادام اور دودھ اور اس سے بھی زیادہ معراج انکل صاحب کی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی جوڑی کو سلامت رکھے۔ آنٹی جی آپ کی دعاؤں میں اب ہماری بھی دعائیں شامل ہیں۔ ذیشان تو بالکل ہمارے بھائی محمد قاسم جیسا ہے۔ ماشاء اللہ ویسا ہی قد کاٹھ، ویسا ہی بالوں کا ہیر اسٹائل۔ ہمارا بھائی دو ماہ قبل ہی پڑھائی کے سلسلے میں انگلینڈ گیا ہے اور ہم اسے بہت مس کرتے ہیں۔ اس لیے ہم عذرا آنٹی کی اداسی کو محسوس کرسکتے ہیں۔" (ہاں پردیس جانے والے تو یاد آتے ہی ہیں اور آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہے)

جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ "دعائیں کتنی جلدی قبول ہوتی ہیں۔ یہ اگر ملنا نہیں ہمدم کو پڑھ کر معلوم ہوا۔ یہی تو چاہ رہے تھے کہ اب رافع کی ارسلہ سے ملاقات ہو جانی چاہیے سو اس قسط میں ہو گئی مطلب دونوں کے ملنے کے چانس بن گئے۔ دل بے تاب پڑھ کر تو دل بہت اداس ہو گیا۔ اپنی اولاد کسی کے حوالے کرنا بہت مشکل ہے جی۔ محبت میں واقعی تڑپ ہی ملتی ہے۔ ناول اچھا تھا باقی ناول، افسانے سب ہی زبردست تھے سب رائٹرز تعریف کے قابل ہیں۔ جلترنگ میں چھوٹے بڑے خواب نے ڈیڑھ پاؤ خون بڑھا دیا۔ جب انجم آپی کے پاس جاتے ہیں تو ایک دم فریش ہو جاتے ہیں۔ فرح غفار کی غزل پسند آئی۔ سندیسے میں صبا نور کا سندیسہ پسند آیا۔" (شکریہ)

رفعت مبین رفی، کراچی سے۔ "مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب ہیں۔ ثنا منظر کا افسانہ غرورِ حسن کے غرور میں چور لڑکیوں کے لیے بہت اچھا سبق ہے۔ خوشبو کا سفر بہت اچھا جا رہا ہے۔ سمیعہ اور شہوار دونوں کو سزا ملنی چاہیے۔ اسما علی سید کا افسانہ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ میں چاندنی بہت مزیدار ہے پڑھ کر مزہ آ رہا ہے اور اختتام کا انتظار ہے۔ شیریں حیدر کیا خوب لکھتی ہیں۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ قربتوں کی دوری پڑھ کر دل کانپ گیا اور یہی تو رائٹر کا کمال ہے۔ اگر ملنا نہیں ہمدم کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی ایک قسط پڑھ کر اگلی کا بے چینی سے انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ لبنیٰ عروج کا ناولٹ ایک منفرد تحریر لگی، گھنٹوں اس کے حصار سے باہر نہیں آسکی۔" (پسندیدگی کا شکریہ۔ ہاں اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟)

طاہرہ پروین آرائیں، فیصل آباد سے۔ "سب سے پہلے معذرت خواہ ہوں کہ میں چند ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے آپ کو خط لکھنے کی باقاعدگی کے عزم پر قائم نہ رہ سکی لیکن میں پاکیزہ کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتی رہی۔ تازہ شمارے میں آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح جاندار اور بے حد اہم ہے۔ آپ نے انسانی زندگی میں کام کی اہمیت کو بڑے اچھوتے پیرائے میں مختصر آرا، جامع الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ یہ مختصر تحریر بار بار پڑھنے اور پھر عمل کرنے کے لائق ہے۔ محترمہ عذرا کے انٹرویو کی دونوں قسطیں غور و توجہ سے پڑھیں۔ عذرا صاحبہ جس صبر و تحمل اور اخلاص و محبت سے اپنے میاں معراج رسول صاحب کی حسین و دلآویز یادوں کو قلب و نظر میں بسا کر ان کی خدمت کر رہی ہیں وہ دنیاوی لحاظ سے لائقِ تحسین اور حیاتِ اُخروی کے لحاظ سے مستحق اجرِ کریم ہے۔ جو انشاء اللہ بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پا کر ان کو فائز المرام ٹھہرائے گا۔ انہوں نے بذلہ سنجی، متانت اور حوصلے سے اپنی ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کا تذکرہ کیا اور خوب کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے جذبۂ ایثار کو قائم و دائم رکھے۔ ایک اور بات جس سے جی خوش ہوا وہ محترمہ مدیرہ انجم انصار صاحبہ کی ادارے کے لیے خدمات کو محترمہ عذرا صاحبہ کا بھرپور انداز سے خراجِ تحسین پیش کرنا ہے۔ جو اُن کی گوہر شناسی کی عمدہ صفت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ ان کی وسعتِ قلبی اور بالغ نظری قابلِ داد ہے۔ مجموعی طور پر پاکیزہ خوب سے خوب تر کی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور ہم اس کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔" (شکریہ)

عارفہ مسعود، لاہور کینٹ سے۔ "جون کے پاکیزہ میں اتنے خلوص سے خوش آمدید کہا گیا کہ میں پشیمان ہو گئی کہ مجھے تو لگا تھا شاید میرا خط پڑھا بھی نہ ہو مگر آپ کے خلوص نے قریب آنے کا موقع فراہم کیا۔ جون کا شمارہ حسبِ معمول دلکشی سمیٹے ہوئے تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ناگن بلقیس جہاں کی کاوش نے مجھے حقیقت میں ایسا کردار یاد دلا دیا۔ یہ امریکا کی خواتین پر ہی صادق نہیں، ہمارے ارد گرد بھی بہت ساری ناگنیں ہیں۔ عطیہ عمر کا کبھی کبھی شدت سے پختگی دلا گیا کہ قسمت اور نصیب اوپر والے کے ہاتھ میں ہے صرف نیت اچھی ہونی چاہیے۔ سلسلے وار ناول بہت اچھے ہیں ان کے کردار زندگی کے دائرے میں جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ عظمیٰ آفاق سعید کی کہانی پڑھ کر دل نے بے اختیار کہا ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات یا پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ انجم جی یہ ضرور بتایئے گا کہ دکھوں، غموں، تکلیفوں سے بھری زندگی میں آپ ان کو مزاح کا روپ کیسے دے دیتی ہیں۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے کیا چیز بہت ضروری ہے؟ (درگزر اور برداشت) عذرا رسول کی بے حد دلچسپ کہانی پڑھی اور دلکش تصاویر دیکھیں۔ میں کسی زمانے میں جذبۂ محبت کو نہیں مانتی تھی مگر یہ جذبہ پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا میں موجود ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ تو اللہ کی خاص رحمت ہے۔ اگر میں نے خود اس جذبے کی حقیقت کو نہ جانا ہوتا تو شاید مجھے گپ بازی لگتی مگر عذرا بے حد خوش قسمت ہیں اور میرے دل سے دعا نکلی کہ اللہ آپ کو صبر، حوصلہ، ہمت دے، باغباں اپنی کیاری کو محبت سے سینچتا رہا اور وہی چمک اُن کے چہرے کو انوکھا روپ دے رہی تھی۔" (بے شک)

رقیہ مہر اعوان، راول پنڈی سے۔ "سالگرہ نمبر 3 میں عذرا رسول صاحبہ کی خوب صورت یادگار تصویروں اور دلچسپ باتوں کے ساتھ جون کا پاکیزہ دلکش لگا۔ وہاں ان کی خوب صورت یادوں نے موڑ پلٹا اور گردشِ ایام نے چاند سے جوڑے کو آزمائش میں ڈال دیا۔ وہاں دکھ ہوا لیکن ہمت اور بہادری نے دعاؤں کا سہارا لیے عذرا رسول صاحبہ کو پہلے کی طرح ہی چاق و چوبند کر دیا اور انہی دعاؤں کا ثمر ہے کہ محبتوں کے بے لوث ثمر نے خلوص کی تمام حدیں عبور کیں۔ معراج رسول صاحب کو تندرستی عطا فرمائی۔ وہاں ہی ایک بات یاد آئی کہ خاردار راستوں سے گزر کے ہی چہرے گلاب بنتے ہیں۔ ناول اور ناولٹ سارے ہی اچھے ہیں۔ میں چاندنی اچھا لگا اور عظمیٰ آفاق کا افسانہ بھی عمدہ لگا۔" (شکریہ، ہاں ابھی آپ کا افسانہ پڑھا نہیں گیا ہے)

سیدہ صائمہ، کراچی سے۔ "انجم آنٹی معذرت کے ساتھ میں نے پاکیزہ کے ہی کسی شمارے میں ایک بات پڑھی تھی کہ کسی بھی تحریر کا اختصار اس کی خوبی ہوتا ہے، یہ بات عالیہ بخاری جی کو سمجھنی چاہیے...... خوشبو کا سفر اور اس کی طوالت اب دونوں ہی بور کر رہے ہیں۔ ہاں شیریں آنٹی کو مبارک یا دوہ اپنے ناول کو بالکل اسی طرح

لے کر چل رہی ہیں جس طرح تیزی کے ساتھ آپ نے اپنا ناول محبت ہم سفر میری لکھا تھا نہ تو کہیں بوریت محسوس ہوئی اور نہ ہی ناول غیر ضروری طوالت کا شکار ہوا باقی راحت وفا اور رضوانہ پرنس بھی کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں ہاں مگر میمونہ خورشید کا میں چاندی واقعی ہٹ جا رہا ہے۔ آنٹی آپ اپنے جلترنگ کے خاکے ٹی وی پر کیوں نہیں دیتیں جس طرح پرانا پروگرام آتا ہے پی ٹی وی سے ففٹی ففٹی نام ہے اس کا اس میں صرف مزاحیہ خاکے دکھائے جاتے ہیں۔ آنٹی ایک بات تو بتائیں اگر بے تحاشا دعاؤں وظیفوں کے باوجود بھی اگر آپ کی کوئی جائز مراد پوری ہونے میں نہیں آ رہی تو اس کا کیا مطلب ہے، کیا دعا کرنے والا بے حد گناہ گار ہے یا پھر ہمارے مانگنے میں ہی کوئی کمی رہ گئی ہے؟" (اگر ہماری کوئی دعا پوری نہیں ہوتی تو اس میں یقیناً اللہ کی کوئی مصلحت ہے مگر ہمیں اللہ کی ذات سے ہرگز مایوس نہیں ہونا چاہیے اور اس سے مسلسل مانگتے رہنا چاہیے کہ وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے)

زینت عبدالصمد، میر پور ساکرو سے۔ "سب سے پہلے تو بات ہو جائے سرورق کی...... خوب صورت نینوں والی دوشیزہ بھی شاید گرمی سے بیزار تھیں جو نیکلس تو ندارد جھمکوں کے سہارے بھی لٹک کے پھر رہے تھے۔ ہاں میک اپ غضب کا تھا۔ آخر سالگرہ نمبر 3 کا شمارہ تھا کوئی ایویں شیویں تو نہیں۔ خیر بے تابی سے اندرونی صفحات پلٹے اور فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ تک پہنچے۔ پہلے حصے میں عذرا رسول کی داستان تو واقعی شہزادیوں کی سی محسوس ہو رہی تھی مگر اس حصے میں جب انہوں نے اپنی تکلیف دہ یادوں کا تذکرہ کیا تو آنکھ نم ہو گئی۔ ثنا کی دائمی جدائی، معراج صاحب کی علالت اور عذرا کی ثابت قدمی بے شک اللہ پاک انسان کی آزمائش اسی طرح کرتا ہے اور یہ حوصلہ بھی کسی کسی میں ہوتا ہے کہ آزمائش سے گزر سکے۔ اللہ پاک عذرا کو سرخرو کرے اور معراج صاحب کو شفائے کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ عالیہ بخاری کا خوشبو کا سفر میک روی سے اختتام کی جانب گامزن ہے وہ بڑی تسلی سے تمام کرداروں کو سمیٹ رہی ہیں۔ سمیعہ کی شدت پسندی، زارا کی اعلیٰ ظرفی، شہوار کی پشیمانی، روما کی تشویش، تہمینہ کی پیش بندی ان سب نے مل کر اس ناول کو معاشرے میں پائے جانے والے ہر طبقے کے احساسات و جذبات سے مزین کر دیا ہے۔ مینا کی پیش قدمی اور تہمینہ سے کیے گئے مکالمے نے ثابت کیا کہ ہر گزرا لمحہ ماضی ہے اور ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ روما کے لیے بھی راہیں روشن ہوتی نظر آ رہی ہیں آخر سیف کا زارا سے ٹکرانا یقیناً کہانی میں ٹوئسٹ آ رہا ہے۔ شیریں حیدر نے ایک دفعہ پھر شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں میں اپنی تیکھی اور تند تحریر کے ذریعے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ تانا بانا عمدگی سے بنا ہے اس دفعہ چوہدرانی کے ظالمانہ فیصلے نے دل و دماغ کو ہلا ڈالا۔ کیا انسان اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ بے شک مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ ناگن بلقیس جہاں نے عورت کے ایک کریہہ روپ کی منظر کشی کی۔ راحت وفا کی ایک تھی نیناں کے سب ہی کردار کچھ الجھے الجھے سے نظر آ رہے ہیں۔ ابھی تو آغاز ہے آگے چل کر یہ گتھیاں سلجھنے لگیں گی۔ میمونہ خورشید..... میں چاندی میں ارسہ کا کردار تو یوں لگتا ہے جیسے اسٹار پلس کی کوئی ہیروئن ہو کیونکہ ہر مسئلے اور مشکل کو شاطرانہ انداز میں اس طرح حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔"
(تبصرے کا شکریہ میمونہ علی کے اس ناولٹ کو سب بہنیں پسند کر رہی ہیں)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیا الدین اسپتال کراچی سے۔ "جولائی کا پاکیزہ اتنی جلد پڑھ لیا اب کیا کریں؟ شمارہ ماہ میں دو مرتبہ شائع کیا کرو۔ پچھلے ماہ ملاقات تو ہوئی مگر بات نہ ہو سکی سو کچھ جون کے شمارے کے بارے میں۔ عذرا کا انٹرویو رسالے کی جان تھا دل تو چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ ابھی اور چلتا مگر ان حالات میں جو عذرا کو درپیش ہیں ان کا اتنا وقت نکالنا ہی بہت ہے۔ جس طرح سے انہوں نے پاکیزہ سے وابستہ افراد کو اپنا جان کر کھلے دل سے اپنی خوشیاں اور دکھ شیئر کیے وہ بہت اچھا لگا اور انٹرویو کو چار چاند لگا گیا۔ دل سے دعائیں نکلی ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ (آمین) عظمیٰ کا ایسی کی تیسی ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر تھی مجموعی طور پر شمارہ اچھا تھا، اب باتیں کریں جولائی کے شمارے کی۔ دین کی باتیں ایمان افروز ہیں۔ ذکیہ نے اپنے ناول کا صحیح وقت پر اختتام کر دیا اور ارسلہ نے شہاب کے حق میں فیصلہ بہت مناسب کیا۔ اس سے بہتر اختتام نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی گمان بھی نہیں میں تحسین اختر نے بے سہارا عورتوں کی مجبوریوں ...... اور ان کے احساسات کی بہت خوب صورت انداز میں ترجمانی کی ہے۔ میمونہ خورشید کی میں چاندی دلچسپ اور سبق آموز ہے ارسہ اور ان کی والدہ نے تو اسٹار پلس کے خواتین کرداروں کو مات دے دی۔ شیریں حیدر کی شیشوں کا مسیحا اور بھی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ تجسس بھی بڑھ رہا ہے۔ راحت راجپوت کی شادی کی مووی اچھی تحریر ہے بعض دفعہ فضول سے شوق بھی کتنے کارآمد ہوتے ہیں۔ قربتوں کی دوری، رضوانہ پرنس کی بھی اچھا رنگ جما رہی ہے۔ رومی اب کیا کرتی ہے انتظار ہے جاننے کا۔ عالیہ حرا کی دستِ آئینہ گر اچھی لگی۔ ایک تھی نیناں تو ایسا لگتا ہے یادداشت اور عقل کا امتحان ہو رہا ہے۔ پیاری انجم تم نے صحیح کہا نئی مصنفات کو پہلے مختصر تحریروں کے ذریعے قدم جمانے چاہئیں۔ عطیہ عمر کی رابطہ، سلمیٰ غزل کی موسم کی دستک بھی اچھی تحریریں ہیں۔ خوشبو کا سفر طوالت کے باوجود پڑھتے وقت اپنے میں جذب کر لیتی ہے بہرحال اگر اختتام ہو جائے تو ناول زیادہ اچھا اثر چھوڑے گا...... بہنوں کی محفل حسبِ معمول خوب بجی ہے، تمہیں پوتا اور بھتیجی کی شادی مبارک...... بہنوں کو تم نے تحریروں کے موضوعات کے بارے میں بہت معقول رائے دی ہے۔ جن بہنوں کو خوشیاں ملیں انہیں بہت مبارک ہو اور جو لوگ پریشان یا بیمار ہیں ان کے لیے بہتری کی دعائیں۔ سیما بنت عاصم نے اپنے بارہ سالہ دور میں پہلی بار تنقید کا سامنا کیا اور اس قدر بھرپور وضاحت کی ضرورت محسوس کی یہ ہی کہہ سکتے ہیں...... خیال اپنا اپنا۔ عظمیٰ نے سر و بے دلہن بنتی ہیں نصیبوں والیاں بہت محنت اور لگن سے سجایا ہے۔ تمام تجربے کار دلہنوں نے اچھے مشورے ہی دیے ہیں۔"

آصفہ سحر، لاہور سے۔ "سرورق بہت خوب صورت لگا فلمی ہیروئن سی نازک سی لڑکی بہت اچھی لگی۔ اب نئے ناول شروع ہو گئے ہیں مگر اب جو تین سال سے چل رہا ہے اسے بند کریں ... پہیلی لفظ سے نفرت سی ہونے لگی ہے پڑھ کر۔ عذرا رسول سے ملاقات اچھی لگی۔ جلترنگ نے حسبِ معمول مزہ دیا۔ آپ اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہیں میں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

آئندہ شمارہ عید کے حوالے سے ہوگا عید کی مناسبت سے اپنی تحریریں جلد از جلد ارسال کر دیں اور اب اجازت دیجیے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی و سماوی آفات، تمام پریشانیوں اور شیطانوں کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے، آمین ثم آمین۔

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

اللہ کے مہمانوں کی ذمے داریاں

قیصرہ حیات

مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور ہر میزبان اپنی بساط کے مطابق اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اس کے گھر سے خوشگوار یادوں اور اچھے احساس سے واپس جائے۔ اس کے دل میں میزبان کی قدر و منزلت بڑھے اور اس کے اندر تشکر کا احساس پیدا ہو۔ جہاں میزبان پر یہ ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں وہیں مہمان کو بھی اپنے فرائض سے بری الذمہ نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کے گھر مہمان بن کر جانے سے پہلے وہ اپنے لباس کا خاص اہتمام کرتا ہے سوچتا ہے کہ ایسا لباس پہن کر جائے کہ میزبان اسے دیکھ کر خوش ہو جائے۔ اسے احساس ہو کہ مہمان اس کے گھر بہت محبت اور شوق سے آیا ہے۔ مہمان کی دوسری ذمّے داری یہی ہے کہ وہ میزبان کے لیے واقعی رحمت ثابت ہو نہ کہ زحمت...... اس کے گھر کو صاف ستھرا رکھے اور اتنا شور شرابہ نہ کرے کہ میزبان یہ خواہش کرنے لگے کہ ایسا مہمان جلد از جلد واپس چلا جائے تو بہتر ہے۔

اس دنیا میں اللہ رب العزت اور اس کے حبیب ﷺ سے بڑھ کر عظیم المرتبت میزبان اور مہمان نواز کوئی نہیں اور ان کی اس عظمت کا مشاہدہ تمام زائرینِ عمرہ و حج کرتے ہیں کہ دنیا کے ہر ہر کونے سے دن اور رات کے ہر پہر میں قافلوں کے قافلے اللہ کے گھر مہمان بن کر آتے ہیں۔ ایسی ایسی اقوام اور رنگ و نسل کے لوگ دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں کو اپنی محبت سے کیسے سرشار کر رکھا ہے کہ وہ اس کی خاطر دور دراز سفر طے کر کے آنکھوں میں اشکوں کے جام لیے لبوں پر اس کی حمد و ثنا اور لبیک اللھمہ لبیک پڑھتے اس کے دربار میں پورے خلوص اور عقیدت سے حاضری دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا روح پرور منظر کسی معجزے سے کم دکھائی نہیں دیتا اور انسان حیران رہ جاتا ہے کہ پروردگار کے دامن میں کتنی وسعت ہے کہ ہر آنے والے کو وہ ان کی خواہشات کے مطابق خوش کر کے بھیجتا ہے اور ہر کوئی وہاں سے لوٹنے والا بہت پُرکیف اور اپنائیت کے احساس سے لوٹتا ہے۔ یہ اللہ رب العزت کا کرمِ خاص ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کو وہ اپنے گھر بلاتا ہے اور انہیں اپنا مہمان بناتا ہے۔ مجھ گنہگار کو بھی عمرے کی سعادت نصیب ہوئی اور میں یہ مضمون اس لیے نہیں لکھ رہی کہ ان مقدس مقامات کے بارے میں تفصیلات بتاؤں بلکہ بہت افسوس اور دکھ سے لکھ رہی ہوں کہ وہاں پاکستانی قوم اور خصوصی طور پر پاکستانی خواتین کے رویّوں کے بارے میں لکھوں کہ اقوامِ عالم میں پاکستانیوں کا کیا مقام ہے اور پاکستانی اپنے وقار کو کس طرح خود داغدار کرتے ہیں۔ ان لمحات میں اس قدر شرمندگی ہوتی ہے کہ ہمارے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اکثریت کو اخلاق و ادب اور مینرز کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اس لیے سوچا ہے کہ لوگوں کو اس بارے میں آگہی دے کر میں تو اپنا فرض پورا کر دوں۔ ممکن ہے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کر سکوں۔

سب سے پہلے میں لباس کے بارے میں ذکر کروں گی، پاکستان سے جانے والی خواتین و مرد کی اکثریت عمر رسیدہ لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس عمر کی خواتین اپنے لباس کے پردے کا نہ تو یہاں اتنا خیال کرتی ہیں اور نہ ہی بیت اللہ شریف میں اور مسجد نبوی ﷺ میں۔ یہاں سے خصوصی طور پر لان اور چکن کے سوٹ سلوائے جاتے ہیں اور چکن کے آف وہائٹ اور لائٹ کلرز کے۔ جن کے نیچے شمیزیں پہننے کی زحمت بھی نہیں کی جاتی اور ویسے ہی لان کے چر مر دوپٹے، جو نہ تو سینوں کو اچھے طریقے سے ڈھانپتے ہیں نہ جسموں کو۔ تمام عرب خواتین کے علاوہ امریکا، انڈونیشیا اور تقریباً دور دراز ممالک کی خواتین نے اپنے اپنے انداز سے اپنے لباسوں کے اوپر عبائے، کوٹ، اسکارف اور رومال اس خوب صورت انداز سے لیے ہوتے ہیں کہ ذرا سی بے پردگی دکھائی نہیں دیتی اور وہ اس متبرک ماحول کے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے ملک کی بھی کچھ خواتین نے برقع اور عبائے پہنے ہوتے ہیں مگر ایک نوجوان لڑکی پر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ عمرے سے واپسی کے بعد ہوٹل میں آ کر کھلے بالوں اور گلے میں دوپٹے کے ساتھ وہ بنگالی ملازم کے ساتھ کسی مسئلے پر بحث کر رہی اور اسے ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس کے دربار سے لوٹی ہے.... اور کیا وہاں کا اثر اتنا تھوڑا ہوتا ہے کہ انسان فوراً بدل جاتا ہے۔ بات صرف محسوس کرنے کی ہے کہ ہم کہاں آئے ہیں اور ہماری ذمّے داری کیا ہے۔ روضہ رسول ﷺ کی زیارت کے لیے تمام ممالک کی خواتین کے گروپ بنائے جاتے ہیں۔ پاکستانی اور انڈین خواتین کا علیحدہ گروپ ہوتا ہے اور ایک نقاب پوش معلّمہ (گائیڈ) بتاتی ہے کہ کس طرح حاضری دینی چاہیے اور تمام ضروری ہدایات دیتی ہے۔ اس معلّمہ نے پاکستانی خواتین کے بارے میں جو کہا۔ وہ قارئین کی نذر ہے۔

”تمام ممالک کی خواتین میں سب سے زیادہ برا لباس پاکستانی خواتین کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ باریک لباس پہنتی ہیں اور دوسرے پردے کا کوئی خیال نہیں رکھتیں۔ روضۂ اقدس پر صرف حاضری ہی ضروری نہیں، ادب و احترام اور اخلاقیات بھی بہت ضروری ہیں اور پاکستانی خواتین کی اکثریت ان باتوں کا بالکل خیال نہیں رکھتی۔“

اس کے بعد جب روضۂ اقدس پر حاضری کے لیے دروازے کھلتے ہیں تو میں نے خود ایک دراز قد دیہاتی عورت کو دوسری کا بازو کھینچ کر اچھلتے ہوئے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ ”چل چل جلدی کر، جگہ نہیں ملتی۔“ اور ریاض الجنہ میں وہ دھکم پیل ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ..... ظاہر ہے ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں نوافل ادا کرے مگر وہاں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں ملتی جس جس کو جگہ ملتی ہے وہ نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری خواتین بنا نیچے دیکھے اوپر سے پھلانگنے کی کوشش کرتی ہیں جبکہ دوسرے ممالک کی خواتین (خصوصاً ترک، شام وغیرہ) جب نوافل ادا کرتی ہیں تو ان کی ہم قوم ہاتھوں سے ان کے گرد حلقہ باندھ کر ہجوم کو روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ مسجد نبوی ﷺ سے باہر صحن میں دیواروں کے ساتھ اکثریت پاکستانی مرد و خواتین کی ہوتی ہے۔ جو نمازوں کے اوقات میں فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہو کر خوش گپیوں اور کھانے پینے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور کھانا کھا کر وہیں کچرا پھینک دیتے ہیں۔ بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی ﷺ میں صفائی ستھرائی کا

قابلِ رشک انتظام ہے۔ وہاں زیادہ دیر تک کچرا اور گندگی دکھائی نہیں دے سکتی مگر بحیثیت مہمان ہم اپنی ذمّے داریاں پوری نہیں کرتے۔ یہاں پر عقیدت اور جوش و خروش سے نعتیں پڑھی جاتی ہیں جن میں دعا کی جاتی ہے کہ اللہ انہیں اپنے اور اپنے حبیب کے در پر بلائے اور جب وہاں جاتے ہیں تو عملی طور پر سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے یوں لگتا ہے جیسے پکنک منائی جا رہی ہو۔

ایک اور بات جو بہت شرمندہ کرتی ہے وہ یہ کہ جیسے ہی کوئی کھجوریں، ٹافیاں اور کھانے پینے کی چیزیں بانٹی جاتی ہیں پاکستانی خواتین دھکے دے کر نبی ﷺ کے در کا لنگر لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کہ انہیں ایک ٹافی یا کھجور ملے۔ اپنے ہمراہ وہ بہت سی دوسری خواتین کے حصے مانگتی ہیں۔ یہ فرق میں نے خود دیکھا ہے۔ دوسرے ملک کی خواتین کو جیسے ہی کوئی چیز دی جاتی تھی وہ مشکوراً، جزاک اللہ، بالخیر وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ مسکرا کر شکریہ ادا کر کے جاتی تھیں اور ہماری خواتین اپنا حصہ لینے کے بعد میری بہن اور اس کے بچوں کا بھی حصہ دیں۔ بانٹنے والا تو بانٹنے آیا ہے مگر لینے والا بھی اپنے اخلاق کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں اپنی جگہ بنا رہا ہوتا ہے اور ایک سب سے افسوسناک بات جو میں نے وہاں دیکھی اور میرا سر شرم سے جھک گیا، وہ میں قارئین کے گوش گزار کرنا چاہوں گی ترک، مصر، شام اور دوسرے عرب ممالک کی خواتین پاکستانی تعارف سن کر اکثر خوش ہوتی ہیں۔

میں مسجد نبوی ﷺ کے صحن میں ایک ستون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مجھ سے اگلی صف میں کچھ ترک خواتین نماز پڑھ رہی تھیں، وہ نماز سے فارغ ہوئیں تو کراچی کی ایک دبلی پتلی، قدرے ادھیڑ عمر عورت ہاتھ میں ایک کارڈ جس پر درود لکھا تھا وہ لے کر ان ترکی خواتین کے پاس بیٹھی۔ ان کو کارڈ دکھا کر اپنا تعارف پاکستانی کہہ کر کرایا تو ترک خواتین نے مسکرا کر اس کو دیکھا۔ اس کے بعد اس نے ان سے کچھ کہا تو اُن کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے جیسے ہی اپنا بیگ کھولا تو یہ ندیدوں کی طرح بیگ کے اندر جھانکنے لگی اور ترک خاتون نے پاکستانی عورت کو دس ریال دیے اور وہ پھر منہ بناتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ میں نے اس پاکستانی عورت کو بلایا اور پوچھا کہ اس نے ان سے پیسے کیوں لیے ہیں اور اس نے جو جواب دیا وہ بالکل جھوٹ پر مبنی تھا اور اس کو ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا کہ وہ کس ہستی کے دربار میں کھڑی ہے۔ کہنے لگی۔ ”ان ترک خواتین نے مجھے یہ ریال اس لیے دیے ہیں کہ میں اندر ڈال دوں۔“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا روضۂ پاک پر؟“ وہ بوکھلا گئی ہاتھ میں پکڑا کارڈ دکھا کر کہنے لگی۔ ”انہوں نے کہا تھا۔ ہمیں بھی یہ لا دو۔“ میں نے کہا۔ ”کیا وہ خود آپ کے پاس یہ دیکھنے گئی تھیں۔ جبکہ میں نے تو دیکھا ہے کہ آپ خود چل کر ان کے پاس آئی ہیں۔ آپ کیوں ایسی حرکتیں کر کے پاکستان کو بدنام کر رہی ہیں۔“ اس پر وہ عورت کہنے لگی۔ ”اللہ نے اپنے کو بھی بہت دیا ہے۔ ان اپنے کو بھی دیا ہے۔“ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ یہ صرف ایک مثال ہے ایسی بہت سی مثالیں وہاں آپ کو ملیں گی جو بحیثیت پاکستانی آپ کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

حرم پاک اور مسجد نبوی ﷺ میں نماز کی جگہ کے بارے میں سب لوگ پوزیسو ہوتے ہیں مگر دوسرے ممالک کی خواتین پھر بھی دوسروں کو نماز کے لیے جگہ دے دیتی ہیں مگر ہماری پاکستانی خواتین خود اپنی پاکستانی خواتین کو جگہ نہیں دیتیں۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ ہم سب ان ہستیوں کے دربار.... میں کھڑے ہیں جو کمزوروں، دھتکارے ہوؤں کو گلے سے لگاتے ہیں، یہ کیا معلوم کہ صف میں کھڑے ہونے والے کی نماز قبول بھی ہوتی ہوگی یا نہیں۔

ہوٹلز میں جب ایک روم چار پانچ لوگوں میں شیئر کیا جاتا ہے تو ہر کوئی اتنا پوزیسو ہوتا ہے کہ دوسرے کے آرام کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ کوئی رات گئے تک ٹی وی بلند آواز میں دیکھ رہا ہے کوئی واش روم اتنا استعمال کرتا ہے کہ دوسرے کی باری نہیں آتی۔ میں نے اکثر لوگوں کو یہ شکایت کرتے سنا ہے۔ ہوٹلز میں جب کھانا کھانے کے لیے جایا جاتا ہے تو ذرا سی تاخیر پر مرد حضرات یوں غصے کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر کھانا نہ ملا تو نہ جانے کیا قیامت برپا ہوجائے گی۔ جب پارہ زیادہ ہائی ہوجاتا ہے تو گالی گلوچ پر بھی اتر آتے ہیں۔ حرم پاک سے باہر پاکستانی مرد گروپس کی شکل میں بیٹھ کر خوب اسموکنگ کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایسی ایسی گپیں ہانک رہے ہوتے ہیں کہ سن کر حیرانی ہوتی ہے۔

الغرض بدتہذیبی اور بدنظمی کا ایسا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ پاکستانی قوم کا شمار سب سے نچلے درجے کی قوم میں ہوتا ہے۔ جس کا کوئی اخلاق نہیں اور جن میں کوئی مینرز نہیں، یہ بھی نہیں کہ سب پاکستانی لوگ ہی ایسے ہیں، بہت اچھے لوگ بھی ملتے ہیں جیسے کہ کراچی کی بہن شاہدہ اسلام، امریکا سے آئی تھیں۔ بہت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا اور ان سے مل کر بہت خوشی بھی ہوئی مگر اکثریت نے مایوس کیا۔ میں بھی پاکستانی ہوں اور جہاں پاکستانی قوم کا وقار بلند ہوتا ہے تو سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ اس لیے اپنے لوگوں سے التماس کرتی ہوں کہ جہاں بھی جائیں تو یہ ضرور سوچیں کہ آپ اپنے ملک کے نمائندے ہیں، اللہ اور اس کے حبیب ﷺ کے ہاں مہمان بن کر جا رہے ہیں۔ ایسے مہمان بنیں کہ میزبان بھی خوش ہوجائیں اور آپ پر رحمتیں اور برکتیں نازل کریں۔ وہ تو بہت وسیع القلب ہستیاں ہیں، آپ بھی اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیجیے اور ان کے دامنِ وسعت میں سمانے کی کوشش کریں۔ ایسے مہمان بن کر جائیں جن کے آنے کی میزبان بھی بار بار خواہش کریں اور محبت سے ان کا استقبال کریں۔ ایسے اخلاق اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کریں کہ دوسری اقوام کے لوگ آپ سے مصافحہ کرنے میں فخر محسوس کریں۔ ضرورت اپنے اخلاق اور تربیت کو سنوارنے کی ہے، ہم سب جب اپنی اپنی جگہ بہتری کی کوشش کریں گے تو ایک اچھی تبدیلی ضرور آئے گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو بدلیں اور بہتر بنانے کی کوشش کریں۔

★★★

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا نشاں ہے لامحدود
اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا ہر شے میں ہے وجود
کھلتے ہوئے گلابوں میں، سرسبز شادابوں میں
مہکتی ہواؤں میں، پنچھی کی اڑانوں میں
گل کلیوں کی خوشبو میں پُرکشش نظاروں میں
گلشن کی بہاروں میں شبنم کے ستاروں میں
اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا نشاں ہے لامحدود
اے اللہ تو سب میں ہے موجود تیرا ہر شے میں ہے وجود
پنکھڑیِ لالہ میں خوشبو کی صداؤں میں
صبح نور کی زریں و شوخ اداؤں میں
شام شفق کی سنہری رنگین رداؤں میں
چاند کے جوبن میں چاندنی کی چھاؤں میں

مرسلہ: تحریم فاطمہ، بورے والا

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

میں آنکھ بند کروں تو مدینہ دکھائی دے
کھولوں جو آنکھ پھر سے مدینہ دکھائی دے
بے تابیوں کی تجھ کو خبر ہے مرے خدا
جب حاجیوں کا مجھ کو سفینہ دکھائی دے
ہوں قافلے کے ساتھ پیادہ رواں دواں
چھالے بھی پھول ہوں جو مدینہ دکھائی دے
چاروں طرف ہیں شہر کے پُرنور نظارے
پر گنبدِ سبز مثلِ نگینہ دکھائی دے
میں اپنی تہی دامنی ان کو بھی دکھاؤں
کملی میں چھپا گر وہ خزینہ دکھائی دے

مرسلہ: فریدہ افتخار، پشاور

ہم کون ہیں

ہمارے متعلق ملکِ شام اور اس کے باغات سے پوچھو...... پوچھو یوگوسلاویہ اور رومانیہ کے پانیوں سے بلکہ ربع مسکون کے ہر ٹکڑے سے پوچھو...... ان سب کے پاس ہماری شجاعت، ایثار اور عدالت و شرافت کی خبریں ہیں۔ ہم مسلمان...... ہیں۔ ہمارے سوا کون تھا جس نے شرافت کے باغوں کو اپنے خون سے سینچا ہو، ہم نے کوفہ، بصرہ اور بغداد بنایا۔ ہم میں ابوبکرؓ اور عمر فاروقؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے حکمران پیدا ہوئے۔ ہماری قوت، ایمان سے ہے۔ ہماری عزت دین سے ہے۔ ہمارا توکل رب پر ہے۔ ہمارا قانون قرآن ہے۔ ہمارے امام سیدالانبیاؐ ہیں۔ ہم تقویٰ کی سلک میں پروئے ہوئے ہیں۔ وہ زمین ہماری ہے جہاں قرآن پڑھا جاتا ہے اور مناروں سے اذان آتی ہے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ کاش ہم صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو فتح و کامرانی اور جہاں بانی ہمارا مقدر بن جائے...... ہم مسلمان ہیں۔

مرسلہ: شبنم میر، سیالکوٹ

افکار

☆ تقویٰ یہ ہے کہ قیامت میں کوئی تمہارا گریبان نہ پکڑے اور مروت یہ کہ تم کسی کا گریبان نہ پکڑو۔

☆ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت کا دامن داغدار ہو جائے۔
☆ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کرنے کے لیے الفاظ نہیں اعمال ہوتے ہیں۔
☆ اپنے کاموں کی بنیاد قہر و غضب کے بجائے محبت و آشتی پر رکھو۔
☆ عورت ایک ایسی چیز ہے جس کو پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔
☆ جو فرض وقت پر ادا نہ ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی لذت حرام کر دیتا ہے یعنی قضا ادا کرنے میں وہ لذت نہیں ملتی۔
☆ جو شخص سب کی بھلائی مانگتا ہے، اللہ اس کا بھلا کرتا ہے۔
☆ اگر زندگی بچانے کی قیمت پوری زندگی بھی مانگی جائے تو انکار نہ کرنا۔

مرسلہ: تسنیم چوہدری، آکسفورڈ، یوکے

بے شمار مغموم

حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں۔ میں قبرستان میں داخل ہوا جب وہاں سے جانے لگا تو بلند آواز سے کسی نے کہا اے ثابت ان قبر والوں کی خاموشی سے دھوکا نہ کھانا ان میں بے شمار لوگ مغموم ہیں۔

(احیاء العلوم ۲۳)

حضرت حسن بن صالحؒ جب قبرستان سے گزرتے تو فرماتے اے قبرو! تمہارا ظاہر تو بہت اچھا ہے لیکن مصیبت تمہارے پیٹ میں ہے۔

(احیاء العلوم ۱۰)

مرسلہ: بتول فاطمہ، منچن آباد

بہترین انسان

☆ بہترین انسان وہ ہے جو مشکل ترین حالات میں بھی اللہ کی ذات سے ناامید نہ ہو۔
☆ بہترین انسان وہ ہے جو زندگی میں غم ملیں پھر بھی ہنس کر جیے۔
☆ بہترین انسان وہ ہے جو جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر سچ بول کر سولی چڑھنا پسند کرے۔
☆ بہترین انسان وہ ہے جو پھول کی طرح رہے کہ پھول کو پاؤں تلے روندا بھی جائے تو پھر بھی وہ نرمی و تازگی کا احساس دیتے ہیں۔

مرسلہ: عاصمہ محمد شاہد، کراچی

انمول موتی

☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
☆ اپنا بوجھ دوسروں پر مت ڈالو خواہ کم ہو یا زیادہ۔
☆ زبان درست ہو جائے تو دل خود ہی درست ہو جاتا ہے۔
☆ تین چیزیں اپنے بھیجنے والے کا پتا دیتی ہیں۔ قاصد، خط اور تحفہ۔
☆ دانا ہے وہ شخص جو وقت کو دیکھ کر کام کرتا ہے۔
☆ مصیبتوں کا مقابلہ صبر سے کرو اور نعمتوں کا شکر حفاظت سے کرو۔

مرسلہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

ماں کا حق

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی ماں کی بہت خدمت کی۔ اس کی بیماری کا علاج کروایا، اسے سہولتیں مہیا کیں۔ اس کے پاؤں دبائے اور جو کچھ کر سکتے تھے کیا ہے۔ اس طرح ہم نے ماں کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تمہاری عمر ریت کے ذروں

بارش کے قطروں اور درخت کے پتوں جتنی ہو اور تم اس ساری زندگی میں اپنی ماں کی خدمت کرتے رہو تو تب بھی تم اپنی ماں کا صرف ایک حق بھی ادا نہیں کرسکتے۔ جو اس نے تمہیں نو ماہ تک اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ اس سے سمجھ لیں کہ ماں کی کتنی عظمت اور فضیلت ہے۔ ماں انسان کے لیے رحمت کی چھتری ہے۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ جن کی مائیں زندہ ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کریں۔ آپ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں، زکوٰۃ دیں لیکن یاد رکھیں اگر آپ کی ماں آپ سے ناراض ہے تو آپ کا کوئی بھی عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

میں تمہارے کتنا قریب ہوں
سرخ سِلوں پر گرتی بارش
یوں پھلجھڑیوں میں ڈھل جاتی ہے
جیسے تمہاری کھلتی ہنسی کے تازہ پھول
جب میں خواب آلود سمندر کے
خاموش پل میں جاگتا ہوں
تمہاری یاد کا چاند
میری آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے
لہروں کی آواز
مرے خاموش بدن میں بہتی ہے
جاگ اٹھتے ہیں میرے ساتھ
رنگ، محبت، ریت
اور تمہاری سانس کا لمس

مرسلہ: صابرہ سلطانہ، کراچی

ہری مرچیں

ڈاکٹر پاگل سے۔ ''تم چھت سے کیوں لٹک رہے ہو؟''
پاگل: ''میں ایک بلب ہوں۔''
ڈاکٹر: ''تو پھر تم جل کیوں نہیں رہے؟''
پاگل: ''ابے یہ پاکستان ہے، لائٹ گئی ہوئی ہے۔''

وجہ

بیوی: ''اتنی سلو آواز میں کس سے بات کر رہے ہو؟''
شوہر: ''بہن سے۔''
بیوی: ''بہن سے اتنی سلو آواز میں بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''
شوہر: ''تمہاری جو ہے۔''

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

پیاسا دشت

میری وحشتوں کو قرار دے
میں ہوں بے قرار مجھے پیار دے
میری روح کے پیاسے دشت میں
اتنا برس کہ مجھے نکھار دے
میری زلفِ پریشاں کو دیکھ تو
کبھی آ کے اس کو سنوار دے
میں گم رہوں تیری ذات میں
تو ایسا مجھ کو خمار دے
میری خواہشوں کے بھنور میں آ
مجھے بے خودی میں اتار دے
میری تنہائیاں بھی مہک اٹھیں
مجھے ایسا قرب و جوار دے

شاعرہ: ریحانہ ملک روحی
مرسلہ: نکیہ اکبر خان، بہاول پور

بارش

ہم دونوں کو بارش اچھی لگتی ہے
بھیگتا جنگل
سبز گھنے پتوں پر
ٹپ ٹپ گرتی بوندیں
اچھی لگتی ہیں

شاعر: حسن عباسی
مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

آنکھیں

اس کی آنکھیں کتنی
نظر شناس تھیں
اِک نظر میں سب کچھ
جان جاتی تھیں
بس اِک میرا حالِ دل
ہی نہ جان سکیں

شاعرہ: شبانہ شیخ، لاہور

نمی ہے بہت

میری زندگی میں تیری کمی ہے بہت
اور میری آنکھوں میں ان دنوں نمی ہے بہت
وہ زخم دے کہ ہمیں پھر دعائیں دیتے ہیں
ایسی سیاست بھی ہم نے دیکھی ہے بہت
تمام شب اشکوں سے جھلملاتی رہی
اور سحر ہوتے ہی یہ آنکھیں ہنسی ہیں بہت
یہ الگ بات کہ کبھی تجھ پہ ظاہر نہ کیا مہک
پر ہم نے تجھ سے محبت بھی تو کی ہے بہت

شاعرہ: مہک خان، کراچی

بہت دنوں سے

وہی ہے دھرتی، فلک وہی ہے
یہ دل سمندر بھنور سے نیناں
یقیں وہی ہے، گماں وہی ہے
یہ چاند اور کہکشاں وہی ہے
تمہاری صورت، تمہاری مورت
تمہاری باتیں وہی ہیں لیکن
بہت دنوں سے یوں لگ رہا ہے
ساعتوں میں اتر کے سورج پگھل رہا ہے

شاعرہ: فاخرہ بتول
مرسلہ: فرزانہ سہیل، میاں چنوں

غزل

میرے گھر میں نہ دیواریں نہ در ہیں
میرے گھر کی فصیلیں مختصر ہیں
لٹا ہوں اس لیے یارو میں اکثر
محافظ کی دعائیں بے اثر ہیں
نہیں جن کا کوئی بھی اعتبار اب
وہی کچھ لوگ ہیں جو معتبر ہیں
دلوں میں دوریاں ہی دوریاں ہیں
بظاہر قربتوں میں اپنے گھر ہیں
غلط فہمی کی بنیادوں پہ اکبر
جدائی کے حوالے بیشتر ہیں

مرسلہ: افتخار شوق، میاں چنوں

خاموش

ہر چیز خاموش
تیرے جانے کے بعد
اپنا آپ فراموش
تیرے جانے کے بعد
کیسے رہے ہوش
تیرے جانے کے بعد
تنہائی اور سناٹا ہم آغوش
تیرے جانے کے بعد

شاعرہ: رضوانہ بدر، بہاول پور

اِک کہانی

ہے تم کو آج سنانی
اپنے
پوشیدہ جذبوں کی کہانی

ہمارے آنسو جو
دیکھتے ہو تم
گرتے ہیں دل پہ
سامنے تمہارے ہم پی نہیں سکتے
یہ لب جو تھے آج تک خاموش
اب اور زیادہ سی نہیں سکتے
یہی کہنا ہے فقط تم سے
بن تمہارے
ہم مر تو سکتے ہیں
بن تمہارے
ہم جی نہیں سکتے

مرسلہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

پاگل

بیوی نے شوہر سے پوچھا۔ ''آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟''

شوہر نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''پھر یہ بتائیں کہ اگر میں مر گئی تو آپ کیا کریں گے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''مجنوں بن جاؤں گا، پاگل ہو جاؤں گا۔'' شوہر نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''دوسری شادی تو نہیں کریں گے؟'' بیوی نے بےیقینی سے پوچھا۔

''دیکھو بیگم، پاگل کا کیا بھروسا وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' شوہر نے جواب دیا۔

مرسلہ: منی بیگم، گوجر خان

کچھ لفظ لکھے ہیں دل سے

☆ رشتے اور سودے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رشتے قائم کیے جاتے ہیں جبکہ سودے طے کیے جاتے ہیں۔

☆ حق جتانے سے حق ثابت نہیں ہو جاتا۔

☆ کسی کی مجبوری سے اتنا فائدہ مت اٹھاؤ کہ اسے مزید مجبور ہونا پڑے۔

☆ وہ انسان ہمیشہ خزاں کی قدر کرتا ہے جس نے بہار میں زخم کھائے ہوں۔

☆ موت سے بڑھ کر کوئی سچی چیز نہیں اور امید سے بڑھ کر کوئی چیز جھوٹی نہیں۔

☆ محبت اعتبار کے بغیر کچھ نہیں جبکہ اعتبار بغیر محبت کے بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

ممکن نہیں کہ

☆ جیسی صحبت میں بیٹھے ویسا نہ بنے۔

☆ ہر کام میں جلدی کرے اور نقصان نہ اٹھائے۔

☆ دنیا سے دل لگائے اور پشیمان نہ ہو۔

☆ ہمت و استقلال کو شعار بنائے اور مراد کو نہ پہنچے۔

☆ سچی لگن اور محبت ہو اور منزل کو نہ پائے۔

☆ پکے یقین اور بے لوث چاہت سے دوستی ہو اور وہ ٹوٹ جائے۔

☆ اللہ تعالیٰ پر توکل ہو اور وہ مایوس کر دے۔

مرسلہ: فرحت گل، ڈی آئی خان

مہکتی کلیاں

☆ غریب آدمی کی تصویریں اس وقت چھپتی ہیں جب وہ قانون توڑتا ہے۔

(سقراط)

☆ عقل مند اپنے عیب خود دیکھتا ہے جبکہ بے وقوف کے عیب دنیا دیکھتی ہے۔

(سعدی)

☆ انسان اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کا ضمیر زندہ رہتا ہے۔

☆ کسی کو وجدان بلاوجہ نہیں ملتا اپنے ادراک کا مقصد تلاش کیجیے۔

(جبران)

مرسلہ: صائمہ بنگش، کوہاٹ

ذرا غور کریں

اپنے ووٹر کو بتائیں کہ کس دسمبر میں
لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کی عنایت ہوگی
اپنے وعدوں ارادوں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

مرسلہ: سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم

بارش اور تم

کبھی بارش برستی ہے
کبھی کونپل چٹکتی ہے
کبھی ساحل کی ٹھنڈی ریت
قدموں سے لپٹتی ہے
ہمیں تم یاد آتی ہو
کہیں معصوم سی بچی
مسلسل مسکراتی ہو

اندھیری رات میں
جب بھی کبھی بجلی چمکتی ہے
کسی ویران آنگن میں
کوئی بدلی برستی ہو
کسی کو تھام لینے کے لیے
چوڑی کھنکتی ہو
کرن کوئی ہمارے
دل کے شیشے پر چمکتی ہو
نیا سورج نکل آئے
نئی خوشبو بکھرتی ہو
کچن سے تازہ چائے کی مہک
دل میں اترتی ہو
ہمیں تم یاد آتی ہو

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

سن تو سہی

بیٹا: ''پاپا سب لوگ شادی کر کے پریشان رہتے ہیں تو پھر شادی کرتے کیوں ہیں؟''

باپ: ''بیٹا عقل بادام کھانے سے نہیں آتی ٹھوکر کھانے سے آتی ہے۔''

بیوی کی دعا

''یا اللہ پاک، میرے شوہر کو بہت ساری دولت دے۔ شہرت دے...... تو یہ سب میرے شوہر کو دے اُس سے لینا میرا کام ہے۔''

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

بنیاد

چلو محبت کی نئی بنیاد رکھتے ہیں
خود پابند رہتے ہیں اسے آزاد رکھتے ہیں
ہمارے خون میں رب نے یہی تاثیر رکھی ہے
برائی بھول جاتے ہیں اچھائی یاد رکھتے ہیں

سہارا

کوئی سہارا نہیں دعا کے سوا
کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا
میں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے
مشکلوں میں کوئی ساتھ نہیں اللہ کے سوا

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

تحفہ

''اس عورت نے اپنے شوہر کو سالگرہ کا کون سا تحفہ پیش کیا تھا؟''

''اس نے چاندی کا ایک سگریٹ کیس دیا جس کے اندر اس عورت کی تصویر تھی۔''

''شوہر کو پسند آ گیا تھا؟''

''تم پسند کی بات کرتے ہو، اس نے تو اس

دن سے سگریٹ پینا ہی چھوڑ دی ہے۔"

مرسلہ: صبا نور، لیہ

غزل

کتنے خانوں میں تقسیم ہم ہوگئے
اور جدائی کے دریا میں ہم کھو گئے
ملا نہ جو ہم کو کاندھا تیرا
اداسی کے شانوں پہ ہم سوگئے
ان کا تماشا بھی بن ہی گیا
نشانہ بنا کے ہمیں جو گئے
سنبھلتا نہیں ہے دلِ مضطرب
جو ماں باپ ملکِ عدم کو گئے
مجھ سے تو لوگوں نے اتنا کہا
شگفتہ کے اشعار دل موہ گئے

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

ماں

ایک بوڑھی عورت اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، ایک کوا پاس بیٹھا تھا ماں نے پوچھا۔ "بیٹا یہ کون ہے؟"

بیٹا: "یہ کوّا ہے۔" ماں نے کچھ دیر بعد پھر پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

بیٹا: "یہ کوّا ہے۔" ماں نے پھر پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟" بیٹا غصے سے بولا۔

"کتنی بار بتاؤں کہ یہ کوّا ہے۔"

ماں ہنس دی اور بولی کہ "بیٹا جب تو تین سال کا تھا تو یہی جگہ تھی اور ایسا ہی کوّا پاس بیٹھا تھا میں نے دس بار تیرا ماتھا چوم کر بتایا تھا کہ یہ کوّا ہے۔"

یہ ہوتی ہے پیاری ماں۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

غزل

تم دل کے پاس رہنا
میرے ساتھ ساتھ رہنا
جتنی ہوں من کی باتیں
ہر بات مجھ سے کہنا
پڑے کوئی جو مشکل
اکیلے تم نہ سہنا
تم خون کی طرح سے
میری رگوں میں بہنا
جب ہو میری ضرورت
مجھ کو پکار لینا
میرے آنسوؤں کو چھوڑو
بس تم کبھی نہ رونا
کانٹے ہیں سارے میرے
تم بس گلاب لینا
کہنا ہے تم سے یہ ہی
تم دل کے پاس رہنا

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

خالی پن

میری زندگی ہنستی ہے
لبوں پہ مسکان بھی رہتی ہے
ہر چیز کھلی کھلی سی بھی لگتی ہے
پہاڑ دن اجلا اجلا
اجاڑ رات ڈھلی ڈھلی سی بھی
میں اس کی نہ مانوں
پھر بھی میری مانتا ہے وہ
دکھوں کے سنگ سکھ کا موسم بھی ہے
سب کچھ ٹھیک لگتا ہے

لیکن
کہیں کوئی خالی پن ہے
میری مکمل ذات
کچھ ادھوری بھی ہے
دور کہیں دل میں سناٹا ہے
دل بھر بھر آتا ہے

مرسلہ: رضوانہ بدر، بہاول پور

قسمت ہی خراب ہے

جی ٹی روڈ پر رات کو ٹرک چلاتے ہوئے ٹرک کی لائٹس ایک درخت پر پڑیں تو ڈرائیور نے بریک لگا کر دیکھا کہ اس درخت کے ساتھ ایک شخص بندھا ہوا ہے۔ ڈرائیور اس کے پاس گیا اور پوچھا۔ "کیا معاملہ ہے؟" اس شخص نے روتے ہوئے کہا۔ "بھائی صاحب میرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ میں اپنے گاؤں جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے مجھے پکڑ لیا۔ انہوں نے میرا بٹوا اور موبائل چھین کر مجھے یہاں باندھ دیا اور فرار ہوگئے۔ صرف یہ میری گھڑی بچی ہے جس پر ان کی نظر نہیں پڑی۔" یہ سن کر ٹرک ڈرائیور آگے بڑھا اس کی کلائی سے گھڑی اتاری اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "میرے پیارے دوست آج تمہاری قسمت ہی خراب ہے۔"

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

یارو کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مجھ کو بد دعا کہ اسے بھول جاؤں میں
سنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں
اِک شب بھی وصل کی نہ میرا ساتھ دے سکی
عہدِ فراق آ کہ تجھے آزماؤں میں
دل تو جلا گیا ہے وہ شعلہ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں
اترا ہے بام سے کوئی الہام کی طرح
جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں
اس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
ہنس کر اسے قتیل گلے سے لگاؤں میں

شاعر: قتیل شفائی

مرسلہ: حاجرہ غفور، لیہ

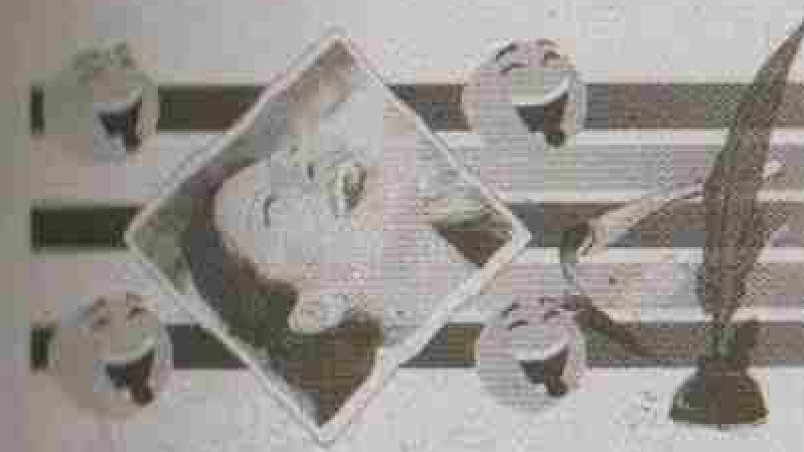
آس کا جگنو

معراجِ فہم انساں کی
ونڈوز کھولی ہیں کتنی
سرگوشیاں ستاروں سے
سمجھیں نہ من کا بھید کبھی
اتنی گرمی اتنی سردی
موسم کا حال بتاتے ہیں
ساگر میں طوفان اٹھا ہے
ساحل ہے لہروں کی زد میں
رُت بدلے گی برسوں شاید
خشک رہے گا موسم کل تک
گوری کے نیناں کیوں چھلکے
اشکوں کی برسات ہے کب تک
ہجر کا موسم کتنا لمبا
گھڑیاں گنے ملن کی کب تک
طوفاں میں آشا و نراشا کے
اُس کا دل گھرا ہے کب تک
کبھی بتادیں تو پھر جانیں
باتیں ستاروں سے چھوڑ دو
اِک آس کا جگنو اس کو دے دو
نویدِ صبح ستارہ دے دو

شاعرہ: خالدہ نسیم، یوکے

جلترنگ

انجم انصار



اندازے

"میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ لڑکے کی دوسری شادی تھی۔" بڑی آپا جب سے رات کو سلمٰی کی شادی سے ہو کر آئی تھیں بس رٹ لگائے ہوئے تھیں۔

"آپا ایسا تو بھابی نے نہیں بتایا تھا کہ دوسری شادی والے سے سلمٰی کی شادی ہو رہی ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے آپا کو یاد دلایا۔

"بھئی ایسی باتیں کوئی کسی کو بتاتا ہے کیا؟" بڑی آپا بھی اپنی جگہ بضد تھیں۔

"وہ ٹھیک ہے کہ سلمٰی بڑی عمر کی کنواری تھی، منہ پر بچپن کے چیچک کے نشان بھی تھے، رنگ دبتا ہوا اور قد کی چھوٹی تھی مگر تھی تو امیروں کی اکلوتی بیٹی۔ شادی ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوگا کہ بھابی دوسری شادی والے سے سلمٰی کو بیاہیں گی۔" میں نے دلیل پیش کی۔

"منہ دکھائی میں گاڑی کی چابی دی ہے۔" اماں نے بھی لقمہ دیا۔

"ساس، نندیں بھی سلمٰی کی بڑی خوش تھیں۔ کوئی پریشانی شکلوں سے تو ظاہر نہیں ہو رہی تھی کہ پہلی بیوی بچوں سمیت آ کر ہنگامہ نہ کرے۔" میں آپا کو یاد دلا رہی تھی۔

"بھئی میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ میں نے کہا تھا کہ پڑوسن جمیلہ کے ہاں لڑکا ہوگا، بڑی خالہ کی بیٹی لو میرج کرے گی، پاکستان ورلڈ کپ کرکٹ ہار جائے گا، بھائی کے بچے سالانہ امتحانوں میں فیل ہوں گے، اس سال نجمہ میٹرک کر ہی لے گی، نجمہ کا کہیں چکر چل رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"ہاں یہ بات تو ہے، بڑی جب کبھی کسی کے بارے میں اندازہ کرتی ہے وہ درست ہی ہوتا ہے۔" اماں بھی تائید میں سر ہلا رہی تھیں۔

"آپ کو کیسے اندازہ ہوا آپا کہ لڑکے کی یہ دوسری شادی ہے؟" میں نے آپا سے پوچھا۔

"دیکھو، پہلی شادی والے دولہا گاڑی سے ایسے اترتے ہیں جیسے قربانی کے بکرے کو گاڑی سے اتارا جاتا ہے یعنی کافی ناز نخرے دکھاتے ہیں۔ اترنے کے بعد بھی کبھی اماں کا ہاتھ تھامتے ہیں تو کبھی بہن کے آنچل میں منہ چھپاتے ہیں۔ اسی طرح گرتے پڑتے انہیں کسی طرح اسٹیج پر بٹھا دیا جاتا ہے جبکہ سلمٰی کا دولہا ایسے کود کر گاڑی سے اترا جیسے کوئی گائے گاڑی میں سے چھلانگ لگاتے ہوئے اترتی ہے اور پھر جس تیزی سے اماں، بہن، ابا، دوست سب کو پیچھے چھوڑتا ہوا اکیلا اسٹیج پر جا کر بیٹھا تھا۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ان راہوں کا سفر اس کے لیے نیا ہے۔ وہ تو ان سب راستوں سے واقف تھا بے چارہ خالی کیمرا مین اس کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ استقبال کرنے والی عورتیں تو کافی دیر تک دروازے پر ہی کھڑی رہیں، سب یہ سمجھ رہی تھیں کہ دولھا آیا ہی نہیں۔ وہ تو جب نکاح شروع ہونے لگا تو سب وہیں پھول وول پھینک کر گھبرا گھبرا کر اندر آ رہی تھیں۔"

"ارے واقعی آپا، ایسا تو ہم نے سوچا ہی نہیں۔"

"تبھی تو میرے اندازے بالکل ٹھیک ہوتے ہیں پگلی۔" آپا فخریہ انداز سے کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

دعوت نامہ

"پیاری بڑی آپا!

السلام علیکم!

کیسی ہیں؟ سنا ہے خسرہ نکل آئی تھی پچھلے دنوں۔ بھئی فون وغیرہ اس لیے نہیں کیا کہ کیا پتا جراثیم فون سے ہی نہ لگ جائیں۔ لگنے والی بیماری کا کیا بھروسا۔

خیر خط لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ سلمٰی کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے مہینے کی دس کو شادی ہے۔ اب آپ کہیں گی کہ نہ بتایا، نہ چلایا شادی کی تاریخ بتا رہی ہو۔ کیا کریں آج کل اچھے رشتے بھاگتے دوڑتے ہی آتے ہیں۔ لڑکا باہر جا رہا تھا ورنہ دو سال بعد آتا۔ اب وہ دور نہیں کہ لڑکی کے رشتے کے لیے جوتیاں گھس جائیں۔

آپ کی ساری بہنوں کو فون پر بتایا تو ایسی جلیں کہ کیا بتاؤں۔ مبارک باد دینے آئیں تو سب کالے اور براؤن سوٹ پہن کر۔ اسی سے جلنے کا اندازہ لگا لیں۔ ارے بھتیجی کی شادی ہے، آپ بڑی پھپو ہیں۔ ارمان تو دکھانے کا آپ کا دل کتنا چاہ رہا ہوگا۔ میں بالکل بھی منع نہیں کروں گی آپ کو دل کھول کر ارمان دکھائیں۔ ہاں وہ ملتانی کڑھائی کے چھ جوڑے، میچنگ جوتیاں، پرس، چوڑیاں، چادریں اور دو کمبل ضرور جلدی بھجوا دیجیے گا۔

عارف کہہ رہے تھے کہ آپ تو وقت کے وقت ہی آئیں گی۔ بھئی گھر چھوڑ کر آنا کوئی مذاق ہے ویسے تو خسرہ کے بعد تین مہینے کا بیڈ ریسٹ ہوتا ہے۔ ابھی تو ایک مہینہ باقی ہے۔

سب سے پہلے اپنے آپ کو دیکھیے گا آپا۔ دیکھیں میں آپ سے کتنا پیار کرتی ہوں کوئی ہوگی بھابی اتنا پیار کرنے والی۔ ہاں وہ چیزیں یاد سے بھجوا دیجیے گا۔

اچھا خدا حافظ

فقط آپ کی رشو۔"

☆☆☆

شاباش

"احمد کے ولیمے میں کھانا اس بری طرح کم پڑا کہ عورتوں میں جھوٹا کھانا چلا دیا گیا۔"

"اور مجھے تو اس وقت احساس ہوا کہ بریانی اتاری تو معلوم ہوا کہ اس میں از خود رائتہ بھی ملا ہوا ہے اور قورمہ تو بنا ڈالے اس میں موجود ہے۔"

"ہڈیاں چبا کر ملائی ہوتی ہیں کہ کھانے والے کو ذرا بھی زحمت نہ کرنی پڑے۔"

"مجھے تو اس قدر کراہیت سی آئی کہ توبہ بھلی چوٹی تک بھری ہوئی پلیٹ میز پر رکھ دی۔ گھر آ کر بھی میں مارے غصے کے پھنکارتی رہی۔ کس قدر جاہل لوگ ہوتے ہیں کہ تقریب کرنا تو جانتے ہیں مگر انتظام کرنے کا سلیقہ بالکل بھی نہیں جانتے۔"

"آج بھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہمارے جیٹھ کی دوسری شادی پر کھانا اچھا خاصا کم ہو گیا تھا۔ ولیمے پر جو مہمان نہیں آنے تھے وہ بھی دوسری شادی کا تماشا دیکھنے کے سبب آ گئے تھے۔ کسی نے سہمے ہوئے بچوں سے لاڈ دکھانا تھا، کسی نے عمر رسیدہ دلہن کا مذاق اڑانا تھا مگر بھئی شاباش ہے ہمارے میاں پر انہوں نے جھوٹا کھانا اس خوبی،

اس مہارت اور اس محنت سے چلایا کہ مجال ہے کہ کسی کو پتا چلا ہو یا ابکائی آئی ہو۔"

☆☆☆

لڑکی کی عمر

خدا سمجھے فیروزہ آپا کو میرا ناک میں دم کر رکھا تھا، پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھیں یوں تو وہ تھیں ہمارے میکے کی دور پرے کی رشتے دار مگر ان کی ہماری نند کے گھرانے سے خاصی دوستی تھی شاید اسی لیے ان کے گُن بھی زہریلی نندوں کے سے ہوگئے تھے۔ موقع بے موقع ڈنک مارے بنا نہیں رہتی تھیں۔ کوئی ایسا موقع نہیں چھوڑتی تھیں کہ وہ مجھے ذلیل نہ کرتیں۔ گو کہ یہ معمولی بات تھی کہ میرا بیٹا میٹرک میں ڈی گریڈ میں پاس ہوا اور ان کا بیٹا اے گریڈ میں پاس ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان کے میاں محکمۂ تعلیم میں افسر ہوں گے تو کیا ایسا بھی نہ ہوتا۔ وہ تو ٹاپ بھی کرسکتا تھا کہ لڑکے کی تمام خالائیں امتحانوں کی کاپیاں جانچنے والیاں تھیں۔ تب ان کا لڑکا فرسٹ آگیا تو ایسا تیر تو اس نے نہیں مارا تھا جس کی انی چبھونے فیروزہ آپا ہمارے گھر چلی آئیں۔

"اے ہے صنوبر تمہارے بیٹے کو ڈھنگ کے کالج میں ایڈمیشن تو ملنے سے رہا، تم یہ کرو کہ اسے ری پیٹ کرادو۔" ہنستے ہوئے لہجے اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ یہ مشورے کا کوڑا ہماری کمر پر مارا۔

"ارے واہ، اچھے خاصے کالجوں میں ایڈمیشن مل رہا ہے۔ تین پرنسپل تو میرے گھر خود چل کر آئے۔ دس گیارہ پروفیسروں نے رابطہ کیا ہے کہ اس بچے کی کلاس صرف ہم لیں گے صرف ہم...... ماشاء اللہ بڑا بھاگوان بچہ ہے جہاں جاتا ہے سب نکل جاتے ہیں۔ اس کی ایک ٹیوشن کی مس کی عرصے سے انگریزی میں کمپارٹ آرہی تھی جب میرے بچے نے ان سے پرائیوٹ ٹیوشن لینی شروع کی مس کا ٹوٹی جانے والا ال گیا اور ان کی کمپارٹ نکل گئی کہ وہ خود کہہ رہی تھیں کہ یہ اس صدی کا معجزہ ہے کہ انہوں نے پیپر پر سوائے اپنا رول نمبر لکھنے کے کچھ بھی نہیں لکھا تھا مگر ان کا اے گریڈ آگیا۔ اس کی وجہ میرا بچہ ہی تو ہے، ہمارے گھر تک مٹھائی بھیجی اس بے چاری نے۔"

"آپ چھوڑیں یہ باتیں، اپنے بچے کو آرٹس دلوادیں، سائنس میں یہ نہیں چل سکتا۔"

"میں اسے آرٹس دلواؤں یا اسے کسی مسجد کا مولوی بناؤں آپ کو اس سے کیا۔" میرا غصہ دیدنی تھا۔

"ارے واہ، برا ماننے کی کیا بات ہے جب بچہ ہی بدشوق ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟"

اسی طرح جب میری سلمیٰ خاتون کا رشتہ ان کی بچیوں سے پہلے طے ہوا تب وہ مجھے کلسانے آگئیں۔

"اللہ صنوبر کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے، اپنی بچی کیسے کالے بھجنگ کو دے رہی ہو، میری تو تو یہ رشتہ ہی ختم کردو۔ ایسی بھی کیا جلدی۔ سلمیٰ بے چاری ابھی تیس ہی کی تو ہوگی۔"

"فیروزہ آپا تمہیں خدا ہی سمجھے رائی کا پہاڑ بنانا تم سے سیکھے۔ میں ابھی پینتیس کی ہوئی نہیں اور تم نے سلمیٰ کی عمر تیس کردی۔ بھئی اگر وہ انٹر میں کئی سال پڑھی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کی عمر چھلانگیں لگاتی ہوئی مہنگائی کی طرح تیزی سے بڑھ جائے۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ لڑکی کی عمر شریف آدمی کی تنخواہ کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔"

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی



☆عنبر وسیم...... گوجرانوالہ

تیز بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
ایک تیرا ذکر تھا جو میری صداؤں میں رہا
کتنے لوگوں سے میرے گہرے مراسم تھے مگر
تیرا ہی چہرہ فقط میری نگاہوں میں رہا

☆فصیحہ آصف خان...... ملتان

نہ آنکھوں میں آنسو ہیں نہ ہونٹوں پہ فغاں ہے
بے نور ہوتی جاتی ہیں ساون کی نگاہیں

☆بشریٰ باجوہ...... اوکاڑہ

کئی ستاروں کو میں جانتا ہوں بچپن سے
کہیں بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
وہ ایک پیڑ ہے آ، اس سے مل کے رولیں ہم
یہاں سے تیرے، میرے راستے بدلتے ہیں

☆صائمہ امین...... لاہور

تم سے ملے بھی ہم تو جدائی کے موڑ پر
کشتی ہوئی نصیب تو دریا نہیں رہا

☆نازیہ...... کراچی

سکھ کا موسم ہاتھ نہ آئے
دکھ کا سورج چڑھتا جائے
آئے جب بھی یاد کسی کی
انکھیوں سے ساون بہتا جائے

☆رابعہ انجم...... پتوکی

جانے والے ہماری محفل سے
چاند تاروں کو ساتھ لیتا جا
ہم خزاں سے نباہ کرلیں گے
تو بہاروں کو ساتھ لیتا جا

☆راحت امین...... کراچی

میں تو کانٹا ہوں خزاؤں میں بھی رہ سکتا ہوں
تو مگر اک پھول ہے بہاروں کی ضرورت ہے تجھے
میرا جیون تو اندھیرے میں بھی کٹ جائے گا
تو مگر اک چاند ہے تاروں کی ضرورت ہے تجھے

☆شمع فرید...... کراچی

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
بدل جائے گی یہ رُت بھی حوصلہ رکھنا

☆فائزہ شہزاد...... حیات آباد

زندگی کو زندگی تو ہم نے سمجھا ہی نہ تھا
ہم تو سمجھے تھے ہنسی کا کھیل ہے یہ زندگی
ٹھوکریں دنیا کی کھائیں تو ہمیں آئی سمجھ
زندگی کہتے ہیں کس کو اور کیا ہے زندگی

☆مینا خان...... پشاور

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہوگئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہوگئے
بادلوں کو کیا خبر کہ بارش کی چاہ میں
کتنے بلند و بالا شجر خاک ہوگئے

☆رخسانہ امجد...... ملکوال

ٹوٹ جاتے ہیں بکھر جاتے ہیں

کانچ کے گھر میں مقدر اپنے
اجنبی پیار سے ملتے ہیں سدا
بھول جاتے ہیں تو اکثر اپنے

☆رضوانہ سمیع......کراچی

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجیب طرز کا موسم میرے وطن میں رہا

☆ہما انصار......حیدر آبا

رہ کر قفس میں ذکر کریں آشیاں کا کیا
مانوس ہوگئے ہیں اسی زندگی سے ہم

☆نزہت فہیم عطاری......پنجاب

دو دو بوند کو اپنی کھیتی ترسی ہے اور ترسے گی
کہنے کو تو دوست ہمارے بھادوں بھی اور ساون بھی

☆عالیہ......ملتان

جو بارش کی دعا کرنا تو یہ مت بھول جانا
ہمارے خواب دیواروں پہ مٹی سے لکھے ہیں

☆ماہین حنیف......کراچی

بہا جو آنکھ سے کاجل تو یہ سوال ہوا
وہ شخص کون تھا جس کا تجھے ملال ہوا

☆آصفہ برکت......راول پنڈی

کھل گئیں جب انگلیاں کتنی پشیمانی ہوئی
میں سمجھ بیٹھا تھا اِک صحرا میری مٹھی میں ہے
انگلیوں پر رنگ چھوڑے اور تڑپ کر مر گئی
زندگی کا حسن تو اڑتی ہوئی تتلی میں ہے

☆فریال افتخار......کراچی

پھر اس کے بعد تمہیں اور کچھ نہ بھائے گا
ہمارے چہرے کے بعد تمہیں اور کچھ نہ بھائے گا

☆میراں خان......گوجرانوالہ

چبھتی ہے قلب و جاں کو ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے

☆ماریہ جبیں......سیالکوٹ

کل رات میں نے گزرے دنوں کے ورق گنے
ہر باب سرگزشت کا، کاسہ گدا کا تھا

☆غزالہ یاسمین......میاں چنوں

کہیں کوئی غم کوئی سلگتا خیال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
عجیب رُت ہے کسی کی یادیں سنبھال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
اسے یہ کہنا وہ مجھ سے ملنے کبھی نہ آئے کہ اس نگر میں
دلوں کو آباد بستیوں کی مثال رکھنا بھی جرم ٹھہرا

☆عطیہ سرور......جہلم

رنگ دھنک نے بکھرائے ہیں موسم اچھا ہے
گئے زمانے یاد آئے ہیں موسم اچھا ہے

☆نازیہ شبیر......لاہور

آنکھ کی شبنم تو برسے بادلوں کی اوس سے
کتنا گہرا ہے دل و جاں کا سمندر دیکھتے
زرد پتوں کی طرح کب سے ہوا کی زد پہ ہیں
اِک ذرا آندھی جو تھمتی تجھ کو مڑ کر دیکھتے

☆میمونہ ضیا......کراچی

تم نے کہا تھا عشق میں اکثر ایک سا موسم ہوتا ہے
کہاں گئیں وہ ساون آنکھیں کہاں گئے وہ جل تھل لوگ

☆عشا خاور......لاہور

یہ بوند بوند سی بارش کسی کی یادوں کی
مرے یقین کا کچا مکان گرائے گی

☆راحیلہ......کراچی

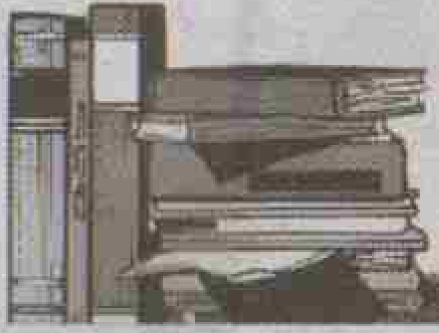
حیات اب بھی کھڑی ہے اسی دوراہے پر
وہی ہے جبر وہی اختیار کا موسم
ہم اپنے آپ کو محسن بدل کے دیکھیں گے
بدل سکے نہ اگر کوئے یار کا موسم

☆ثمینہ کوثر......حیدر آباد

وقت نے دھندلا دیے کیسے شناسائی کے رنگ
جس طرح یہ خواب ہو پہلے کبھی دیکھا ہوا

☆یاسمین آزاد......کشمیر

ہجوم غم میں کسی کا خیال آتے ہی
دھنک سی پھیل گئی زیست کے اندھیروں میں



میرا انتخاب

آمنہ حماد

بیتے ہوئے وقت کی باتیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں...... تنہائی ملتے ہی اپنی تمام شدتوں کے ساتھ آنکھوں میں بسیرا کر لیتی ہیں...... اور پھر رات کا حسن ان یادوں کو اور بڑھا دیتا ہے...... چاہتوں کے پل جونہی آنکھوں میں جاگتے ہیں تو نیند روٹھ کر دور کھڑی ہو جاتی ہے...... میٹھی یادوں اور خوب صورت لمحوں کو اجاگر کرتی میرا جی کی نظم بھی آپ کو ضرور محظوظ کرے گی۔ اس کا انتخاب فرحانہ شفیق نے سیالکوٹ سے کیا ہے۔

رات پھر سے جاگ اٹھی

رات پھر سے جاگ اٹھی
میٹھی اذیت چاہت کی
رات پھر سے جاگ اٹھی
پل پل آنسو بہاتے بیتا
آنکھوں میں رات کٹی
دھندلی نگاہوں نے چاند تو دیکھا
چھائی رہی بدلی
دور ہیں سکھیاں
دور پیا ہیں
میں ہوں ابھی بالی
دھیان کی لہروں کے جھولے میں
جی بھر کر جھولی
آیا سویرا دن بیتا
لو پھر سے شفق پھولی
نیلے رنگ میں لال بھی ابھرا
دونوں میں جنگ چھڑی
پھر نہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھیں
موجیں من ساگر کی
پھر سے کنارے ڈول نہ جائیں
پھر نہ امڈ آئے ندی
رات آئی چھایا اندھیارا
سونی شام مٹی
نیند آئے گی دکھ بھولیں گے
نیند مری دردی
بات نہیں اب ڈر کی کوئی
بات نہیں ڈر کی

دوری اگر طویل ہو جائے تو جذبوں کی رنگت ماند پڑنے لگتی ہے۔ ان میں وہ نکھار نہیں رہتا...... کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو کبھی ٹوٹتے نہیں، چاہے ان کے درمیان کتنے ہی فاصلے حائل ہوں...... دوریاں فاصلوں کی محتاج نہیں ہوتیں...... ذہن و دل پلک جھپکتے ہی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ظریف احسن بھی ایسے ہی دوریوں اور فاصلوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتے نظر آ رہے ہیں۔ جس کو صائمہ امین نے لاہور سے منتخب کیا ہے۔

کیا تم کو کچھ یاد نہیں

سبز دنوں کی کچھ یادوں میں

آؤ تم کو لے کے چلیں ہم
دن وہ سنہرے
سرمئی شامیں
چاندنی راتیں
اور بچپن کا اجلا موسم
بارش کے دن
ہم تم دونوں بھیگ رہے تھے
اِک منظر میں
ساون بھادوں کی رم جھم میں
بانہوں کو بانہوں میں ڈالے
ہم تم دونوں جھول رہے تھے
اِک جھولے میں
بھیگے لمس نے کی سرگوشی
دھیرے دھیرے
جاگ اٹھیں خوابیدہ جذبے اس سے پہلے
ایک مکمل مدہوشی چھانے سے پہلے
بھیگے لبوں نے عہد کیا تھا
ان بانہوں سے کسی بھی لمحے جدا نہ ہوں گے
یاد ہے مجھ کو سارا منظر
کیا تم کو کچھ بھی یاد نہیں ہے

ہر موسم اپنے ساتھ ایک نیا رنگ لے کر آتا ہے لیکن بارش کے دنوں میں قوسِ قزح کے رنگ ہر طرف بکھر جاتے ہیں...... جذبات و احساسات میں بھی ایک نیا رنگ اور آہنگ نظر آتا ہے...... بارش کے ساتھ ہی یادوں کے در وا ہو جاتے ہیں اور تمام یادگار لمحے ایسے نظروں کے سامنے آٹھہرتے ہیں جیسے وہ اس پل میں ہی گزر رہے ہوں...... کچھ ایسے ہی کھوئے ہوئے لمحوں میں شکیل الدین شکیل گرفتار نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا انتخاب حنا عزیز نے کراچی سے کیا ہے۔

کھوئے ہوئے لمحے

اب کے برسات ہے لائی جو پرانی یادیں
دل میں اتری ہے دھنک
رنگ تمہارے لے کر
کھوئے لمحوں نے
جو دی ہے درِ دل پہ دستک
رات آئی ہے یہ پلکوں پہ ستارے لے کر
ایسے تارے کہ
جنہیں تم تو نہ دیکھو گی کبھی
ایسے لمحے کہ
جنہیں تم تو نہ سوچو گی کبھی
بیتے لمحات میں جو تم کو تکا کرتا تھا
پھر نظر ملتے ہی نظروں کو جھکا لیتا تھا
اپنے خوابوں کو کبھی کہہ نہ سکا تھا تم سے
ان کو چپ چاپ نگاہوں میں چھپا لیتا تھا
عمر بھر جو کبھی آباد بھی نہ ہو شاید
اب وہ لڑکا تو تمہیں یاد بھی نہ ہو شاید

کچھ نامکمل اور ادھوری خواہشیں، یادوں کے رنگ لیے ہر لمحے ہمارے ساتھ ہوتی ہیں...... بارش ان دبی خواہشوں کو بھی اِک نئی زندگی عطا کر دیتی ہے۔ کچھ یہی تاثر ارشد محمود ارشد کی نظم میں نظر آرہا ہے اس نظم کو ملیحہ نعیم نے کراچی سے منتخب کیا ہے۔

بارش

ساون کی پہلی بارش نے
برسوں کی پیاسی دھرتی کو
جیسے آج سیراب کیا ہے
کاش
ایسا بھی ہو جائے
تیرے پیار کی ننھی بوندیں
دل کے تپتے صحرا پر
ٹوٹ کے برسیں
پیاس بجھائیں

زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک سرسری سی ملاقات ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ رات کے عمیق سناٹے میں کسی کی کی گئی سرگوشی یا کسی کا پکارنا...... ہمیں ایک ایسی خوشی...... اور سرشاری کی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے اس ایک شوخ سی سرگوشی کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کا اظہار پروین شاکر اپنی نظم ردِ عمل میں کرتی نظر آرہی ہیں۔ جس کا انتخاب فائزہ رضا نے راولپنڈی سے کیا ہے۔

ردِ عمل

گئے موسم کے کسی لمحے میں
تو نے اس طرح پکارا تھا مجھے
جیسے مدھم کا بہت میٹھا سُر
روح کا کوئی سرا چھو جائے
جیسے شبنم کا اکیلا موتی
عارضِ برگِ حنا چھو جائے
جیسے اِک موج ہوا کی صورت
رات کی رانی سے کچھ راز کہے
جیسے بچپن کی کیلی میری
شوخ لہجے میں تری بات کہے

فراوانی مال و زر کی ہو...... جذبات و احساسات کی...... یا پھر غم و خوشی کی...... کسی بھی شے کی کثرت معمولات میں شامل ہو کر اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ خصوصاً نشاط و غم کی زیادتی...... انسان کو رفتہ رفتہ ہر احساس سے بالاتر کر دیتی ہے۔ یا سیت کا یہی رنگ سید شکیل دسنوی کی اس غزل میں نظر آتا ہے۔ اس کا انتخاب کیا ہے شبیہہ صغریٰ نے کراچی سے۔

غزل

سایہ کہیں نہ کوئی شجر مجھ کو اس سے کیا
بے چین ہے یہ دھوپ اگر مجھ کو اس سے کیا
وہ جو حصارِ ذات سے نکلا نہیں کبھی
گر لے وہ آسماں کا سفر مجھ کو اس سے کیا
وہ سر میرا اتار کر قامت میں بڑھ گیا
دیکھے وہ ایسے خواب اگر مجھ کو اس سے کیا
پہلی سی بات جذبِ محبت میں اب کہاں
وہ پھیر لے جو اپنی نظر مجھ کو اس سے کیا
آیا میرے قریب تو منظر بدل گیا
رکھتا ہے بے وفا یہ ہنر مجھ کو اس سے کیا
میں بھی بدل کے دیکھ لوں اپنا مکاں کہیں
بدلے اگر وہ راہ گزر مجھ کو اس سے کیا
پامال منزلوں کو میں کرتا رہا شکیل
پھر بھی ملا نہ اذنِ سفر مجھ کو اس سے کیا

سندیسے

پاکیزہ بہنیں

فائدہ

ان میرڈ ہونے کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہے بھلا......؟ سوچیں ذرا...... چلیں میں ہی آپ کو بتا دیتی ہوں۔ آپ بیڈ کے دونوں طرف سے چڑھ اور اتر سکتے ہیں۔

مرسلہ: میمونہ گل، سکھر

جیلسی

یہ ضروری تو نہیں کہ آگ سے جل جائے انساں اے فراز
کچھ لوگ تو میرا اسٹائل دیکھ کر ہی جل جاتے ہیں

مرسلہ: صبا نور، لیہ

پاگل

بجلی + بادل = ساون آیا۔
دولھا + باجا + برات = شامت آئی۔
گرمی + لوڈ شیڈنگ + مہنگائی = قیامت آئی۔
پھول + نظارے + بارش = بہار آئی۔
آپ + آپ کے رشتے دار + آپ کی ہنسی = نسونسو پاگل آیا۔

مرسلہ: قمر شمس الحق، جھنگ صدر

آنکھ

جب یہ کھلتی ہے تو دنیا کی ہر شے اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ جب یہ دیکھتی ہے، سمندر کی تہ سے موتی نکال لیتی ہے۔ جب یہ روتی ہے تو عرش ہلا دیتی ہے اور جب یہ بند ہوتی ہے تو دنیا کو رلا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ ساون کو بھی ہرا دیتی ہے۔

مرسلہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

وجہ

سب دوست بے وفا ہوگئے
ہم آپ سے خفا ہوگئے
خط اس لیے لکھ رہے ہیں ظالمو!
کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم دنیا سے دفع ہوگئے

مرسلہ: مسز قمر، جھنگ

وعدہ

وعدہ بھی ایک امانت ہے۔ لفظوں کی شکل میں دی گئی ایک امانت۔ وعدہ پورا نہ کرنا امانت میں خیانت کرنا ہے۔ وعدہ ایک ایسی امانت ہے جسے لینے والے کے بجائے دینے والے کو واپس کرنا ہوتا ہے۔ کل کا وعدہ ایک جھوٹا وعدہ ہوتا ہے کیونکہ کل کبھی نہیں آتی۔ آج کی درخواست پر آج ہی عمل درآمد ضروری ہوتا ہے کیونکہ آج ہر روز آتا ہے...... ہے ناں پتے کی بات۔

مرسلہ: مسز فرح امجد، لاہور

میری خواہش

میری خواہش ہے کہ ہر دکھی چہرے پر تبسم بھر دوں
میری خواہش ہے کہ ہر مسلماں کو دنیا میں معتبر کر دوں
میری خواہش ہے کہ ظلم کو نگاہوں سے اوجھل کر دوں
میری خواہش ہے کہ بے حیائی پہ حیا کا آنچل کر دوں

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

چلو اِک کام کرتے ہیں

سنو جاناں!
چلو اِک کام کرتے ہیں
ہم اپنے دل کے سب جذبے
تمہارے نام کرتے ہیں
ملے پچھلے برس تھے جب
تو اپنے دل کے سب حصے
محبت کے حسیں قصے
زباں زد عام کرتے ہیں
دکھوں سے زندگی کو اب چلو آزاد کرتے ہیں
خنک سرد موسم کو
خزاں کی سب رُتوں کو
چلو رخصت کریں مل کر
سنو جاناں!
نیا پھر سے پیاں باندھیں ہم
تم ویسے پھر سے بن جاؤ
میں ویسی پھر سے بن جاؤں
پرندے بدگمانی کے اڑ کر دل کی شاخوں سے
وفاداری نبھاؤ تم
وفاداری نبھائیں ہم
نومبر کے مہینے میں
ہم اپنے دل کے سب جذبے
تمہارے نام کرتے ہیں
محبت عام کرتے ہیں
محبت عام کرتے ہیں

شاعرہ: غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ

ایجادات

☆ریزر بلیڈ 2 دسمبر 1901ء میں کنگ جیلٹ، امریکا نے ایجاد کیا۔
☆تابکاری کے قوانین میکس پلانک جرمنی نے بنائے۔
☆واشنگ مشین 1901ء میں امریکی سائنس داں فشر نے بنائی۔
☆ائر کنڈیشن 1902ء میں امریکا نے ایجاد کیا۔
☆فوٹو اسٹیٹ مشین 1903ء میں امریکا میں وان بیڈلر نے بنائی۔
☆ٹریکٹر 1904ء میں امریکا کے کرالر ہالٹ نے بنایا۔
☆شار پر بیگ جس سے بنتے ہیں 1908ء میں سوئزرلینڈ کے برینڈن برگر نے ایجاد کیا۔

مرسلہ: فریدہ فری، لاہور

اے ابن آدم

ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے پر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔ پس تو نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا اس کے جو میری چاہت ہے تو میں بخش دوں گا تجھ کو وہ بھی جو تیری چاہت ہے اگر تو نے نافرمانی کی اس کی جو میری چاہت ہے تو میں تجھ کو تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے...... پھر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔

حدیث قدسی

مرسلہ: رخسانہ امجد، ملکوال

یاد

ستارے آج پھر آنکھوں میں جھلملائے ہیں
مجھے بھولے ہوئے کچھ لوگ یاد آئے ہیں
انجام دیکھیے ہوتا ہے کیا وفاؤں کا
ہوا کے دوش پہ ہم نے دیے جلائے ہیں
اسے بھلانے کی کوشش ہزار کر دیکھی
مگر وہ پہلے سے بھی اور یاد آئے ہیں

مرسلہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

روحانی مشورے

ادارہ

رمضان المبارک

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ماہِ رمضان بہت ہی بابرکت اور فضیلت والا مہینہ ہے۔ یہ صبر وشکر اور عبادت کا مہینہ ہے اور اس ماہِ مبارک کی عبادت کا ثواب ستر درجے عطا ہوتا ہے اور جو کوئی اپنے پروردگار کی عبادت کرکے اس کی خوشنودی حاصل کرے گا اس کی بہت بڑی جزا اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمائے گا۔

☆ ماہ رمضان کی پہلی شب بعد نمازِ عشا تین مرتبہ سورۂ فتح پڑھنا بہت افضل ہے۔

☆ ماہِ رمضان کی پہلی شب بعد نمازِ تہجد آسمان کی طرف منہ کرکے بارہ مرتبہ یہ دعا پڑھنا بہت افضل ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ الْقَائِمُ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ ط

اس کے پڑھنے والے کو بے شمار نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جائیں گی۔

☆ ماہِ رمضان المبارک میں روزانہ ہر نماز کے بعد اس دعائے مغفرت کو تین مرتبہ پڑھنا بہت افضل ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَظِیْمَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اِلَیْهِ تَوْبَةَ عَبْدٍ ظَالِمٍ لَا یَمْلِكُ نَفْسَهٗ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ط

☆ رمضان المبارک میں ہر نمازِ عشا تراویح کے بعد روزانہ تین مرتبہ کلمۂ طیبہ پڑھنے کی بہت فضیلت ہے۔ پہلی مرتبہ پڑھنے سے گناہوں کی مغفرت ہوگی۔ دوسری مرتبہ پڑھنے سے دوزخ سے آزاد ہونا۔ تیسری مرتبہ پڑھنے سے جنت کا مستحق ہوگا۔

☆ قارئینِ کرام رمضان المبارک کی ہر ساعت کا ثواب لوٹنے کی بھرپور کوشش کیجیے۔ ہم جیسے گناہ گاروں کو کثرت سے تیسرا کلمہ، استغفار و کلمۂ طیبہ پڑھنا چاہیے اور ان لوگوں کی ضرور مدد کریں جو مستحق ہیں اور ایسے لوگ آپ کے آس پاس، قرب و جوار میں آپ کے نازاں میں ضرور ہوں گے۔

رمضان میں دعا کی قبولیت کا وقت

قبولیتِ دعا کی خصوصی گھڑی تو رمضان المبارک کی ہر شب آتی ہے لیکن شبِ قدر میں اس گھڑی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی شان اور تاثیر ہی جدا ہو جاتی ہے۔ وہ گھڑی نہ معلوم کون سی ہو اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو ایک مختصر مگر بہت جامع دعا سکھائی تھی جو اس رات میں آپ بھی کثرت سے پڑھتے تھے اس لیے آپ لوگ بھی کثرت سے پڑھیں۔

اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی (ترمذی)

ترجمہ: میرے اللہ تو بہت معاف کرنے والا معاف کرنے کو محبوب رکھتا ہے بس مجھے معاف کردے۔

روزہ کھولنے میں جلدی کرنا

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔'' (بخاری)

سفر میں روزہ رکھنا

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

''تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ (رمضان کے علاوہ) دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلے۔'' (البقرہ)

جس طرح سفر میں نماز قصر کرنا جائز ہے اسی طرح مسافر کے لیے روزہ چھوڑنا بھی جائز ہے۔ البتہ اگر روزہ رکھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی روزہ رکھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اگر تکلیف ہو تو پھر روزہ رکھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت حمزہ بن عمرو اسلمیؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا۔

''میں (نفلی) روزے رکھا کرتا ہوں، کیا سفر میں بھی روزہ رکھ لیا کروں؟''

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اگر تو چاہے تو روزہ رکھ لے چاہے تو چھوڑ دے۔''

روزے کا کفارہ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جس نے بغیر عذر کے رمضان کا ایک بھی روزہ چھوڑ دیا اس کے بدلے زمانے بھر کے روزے بھی کافی نہیں ہوں گے۔''

صلوٰۃ التسبیح کی فضیلت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو یہ نماز پڑھتا ہے اس کے اگلے پچھلے، ظاہر پوشیدہ، پرانے نئے، عمداً سہواً، چھوٹے بڑے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں۔ یہ نماز آپ روزانہ پڑھیں یا ہر جمعے کو یا سال میں ایک مرتبہ یا کم از کم تمام عمر میں ایک مرتبہ تو ضرور پڑھیں۔

نوٹ: کوشش کریں کہ رمضان میں کم از کم ہر جمعے کو ظہر کی نماز سے قبل یہ نماز پڑھی جائے۔ اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ چار رکعت صلوٰۃ التسبیح کی نیت باندھیں۔ تکبیر تحریمہ اور ثنا کے بعد پندرہ بار تیسرا کلمہ پڑھیں۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَر

اگر اس کے ساتھ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ o بھی پڑھیں تو زیادہ بہتر ہے۔ (گویا آپ نے اس نماز میں تیسرا کلمہ پڑھنا ہے۔) پھر اعوذ باللہ، بسم اللہ اور سورۂ فاتحہ اور دوسری سورہ پڑھ کر دس بار پھر تیسرا کلمہ پڑھیں۔ (آپ کو خیال رہے کہ بیٹھنے پر آپ نے ٹوٹل 25 مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھا ہے۔ پہلے پندرہ پھر دس مرتبہ یعنی پچیس مرتبہ پڑھا گیا ہے اور آپ کو یہ بات یاد رکھنی ہے)

پھر رکوع میں سبحان ربی العظیم کے بعد دس بار پھر رکوع سے اٹھ کر سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کے بعد دس بار پھر سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد دس بار پھر سجدے سے اٹھ کر جلسے میں دس بار پھر دوسرے سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد دس بار پھر کھڑے ہوکر بسم اللہ سے پہلے پندرہ بار پھر اسی ترتیب سے چاروں رکعتیں پڑھیں۔ یہ نماز پڑھنے سے پہلے آپ پہلے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہر رکعت میں پچھتر بار اور چاروں رکعات میں تین سو بار یہ تسبیح پڑھی جائے گی۔

پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد الھاکم التکاثر دوسری میں سورۂ العصر تیسری میں قل یا ایھا الکفرون اور چوتھی رکعت میں قل ھو اللہ ھو احد پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

نوٹ: اگر کسی کو یہ سورتیں یاد نہ ہوں تو وہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سی بھی سورہ پڑھ سکتے ہیں اس سے آپ کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

☆☆☆

نوٹ: دس اور پندرہ کی گنتی کے لیے آپ ہاتھ کی انگلیوں سے مدد لے سکتی ہیں۔ ایک چھوٹی تسبیح بھی اپنے ہاتھ میں رکھ سکتی ہیں۔ میں تو جائے نماز پر بنے ہوئے پھولوں کو اپنی نظر میں رکھ کر اپنی گنتی کا حساب رکھتی ہوں۔

☆☆☆



کیری کی چٹنی

اشیا: آم، ڈیڑھ کلو۔ چینی، ایک کلو۔ پسا ہوا نمک، ایک چھٹانک۔ گرم مسالا، آدھا چھٹانک۔ سرخ مرچ، ایک تولہ۔ سرکہ، ایک پاؤ۔

ترکیب: چٹنی کے لیے کیری ایسی ہونی چاہیے جو کہ زیادہ پکی نہ ہو اور نہ ہی زیادہ کچی۔ ان کو اچھی طرح دھو کر صاف اور خشک کرلیں پھر تیز چاقو سے چھیل کر باریک پھانکیں کاٹ لیں۔ ان کی گٹھلی نکال دیں۔ تراشی ہوئی پھانکوں میں چینی اور نمک اچھی طرح سے ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس طرح یہ پھانکیں کافی پانی چھوڑ دیں گی اور چینی اور نمک بالکل ان میں مل جائے گا۔ اب ان کو ہلکی آنچ پر رکھ کر پکنے دیں۔ تمام مسالے اور مرچیں ململ کی پوٹلی میں باندھ کر پکتی ہوئی آم کی پھانکوں میں ڈال دیں تاکہ ان کا اثر قوام میں چلا جائے۔ مسالا اور مرچ براہِ راست قوام میں ہرگز نہ ڈالیں کیونکہ ایسا کرنے سے چٹنی کی رنگت بدنما ہوجائے گی۔ جب آم کی پھانکیں اچھی طرح گل جائیں اور قوام گاڑھا ہوجائے تو اتار لیں۔ مسالے کی پوٹلی نکال دیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ٹھنڈی ہونے پر یہ چٹنی کسی چینی یا شیشے کے مرتبان میں ڈال کر رکھ دیں اور جب جی چاہے استعمال کریں۔ یہ چٹنی تین چار ماہ تک خراب نہیں ہوتی۔

صائمہ امین ...... لاہور

خستہ کچوری

اشیا: میدہ، دو کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سوڈا، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ تیل، دو کھانے کے چمچ، فرائی کے لیے۔ پانی، نصف کپ۔ ادرک، ایک انچ کا ٹکڑا۔ ہری مرچیں، دو سے تین عدد۔ اردکی دال، ایک تہائی کپ۔ ہینگ، ایک چٹکی۔ پسا ہوا دھنیا، ایک چٹکی۔ پسا ہوا زیرہ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ پسی ہوئی لال مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ پسی ہوئی سونف، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ چینی، نصف چائے کا چمچ۔ گھی، چار کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: آٹا، نمک اور بیکنگ سوڈے کو اکٹھا چھان لیں۔ دو کھانے کے چمچ گھی ڈالیں اور اپنی ہتھیلیوں سے انہیں مسل دیں۔ پانی کے ساتھ نرم گوندھیں، گیلے کپڑے سے ڈھانپ کر الگ رکھ دیں۔ ادرک اور ہری مرچیں باریک کاٹ لیں۔ اردکی دال کو ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر تھوڑا سا پانی ڈال کر موٹا پیس لیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ ادرک کٹی ہوئی، ہری مرچیں، کٹی ہوئی۔ ہینگ اور تمام پسے ہوئے مسالے ڈال دیں۔ اچھی طرح ملائیں اور پسی ہوئی دال ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ تمام پانی تقریباً خشک ہوجائے۔ چینی اور نمک ڈال کر اچھی طرح ملائیں چولھے سے اتار دیں۔

مکسچر کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ گندھے ہوئے آٹے کے بارہ گولے بنائیں ہر گولے کو اپنی ہتھیلیوں میں چپٹا کریں تاکہ وہ کناروں پر پتلے اور درمیان میں موٹے ہوجائیں۔ درمیان میں تھوڑی سی بھرائی کریں اور گولہ بنانے کے لیے کناروں کو ملائیں۔ تھوڑا چپٹا کریں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں کم آنچ پر کچوریاں فرائی کریں یہاں تک کہ سنہری اور خستہ ہوجائیں۔ املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

عائشہ نعیم ...... کراچی

آم گوشت

اشیا: بغیر ہڈی کا گوشت، چھ سو گرام۔ دہی، تین چوتھائی کپ۔ اچور، ایک چائے کا چمچ۔ پسی ہوئی ہلدی، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، چار کھانے کے چمچ۔ رائی، ایک چائے کا چمچ۔ کڑی پتے، آٹھ سے دس عدد۔ لونگ، چار سے پانچ عدد۔ دار چینی، ایک انچ کا ٹکڑا۔ کش کی ہوئی پیاز، ایک کپ۔ ادرک کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ پسا ہوا دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ پسی ہوئی لال مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔ کچے آم کے ٹکڑے (بغیر چھلکے کے)، نصف کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: گوشت کو صاف کرکے دھو لیں اور ایک انچ کے برابر ٹکڑے کرلیں۔ دہی، اچور اور ہلدی کے آمیزے میں ڈبو دیں۔ موٹے پیندے کی دیگچی میں تیل گرم کریں۔ رائی، کڑی پتے، لونگ اور دار چینی ڈالیں۔ رائی کو تڑخنے دیں پھر کش کی ہوئی پیاز ڈالیں۔ اس وقت تک پکائیں کہ پیاز نرم ہوجائے۔ بھگوئے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور ادرک کا پیسٹ ڈالیں۔ تیز آنچ پر پکائیں اور برابر ہلاتے رہیں۔ دھنیا (پسا ہوا)، لال مرچ (پسی ہوئی) اور کچے آم کے ٹکڑے ڈالیں اور آدھے منٹ تک پکائیں۔ دو کپ پانی ڈال کر ابالیں۔ ڈھکن کو ڈھانپ دیں اور پکائیں یہاں تک کہ گوشت گل جائے۔ نمک ملائیں اور کم آنچ پر پھر پکائیں یہاں تک کہ شوربا گاڑھا ہوجائے۔ گرم گرم پیش کریں۔

فریحہ ناز ...... راولپنڈی

مونگ کی دال کا حلوہ

اشیا: مونگ کی دال دھلی ہوئی، ایک کپ۔ چینی، ایک کپ۔ زعفران، ایک چٹکی۔ گھی، ایک کپ۔ دودھ، نصف کپ۔ کھویا، تین چوتھائی کپ۔ بادام، دس تا بارہ عدد۔

ترکیب: مونگ کی دال کو دھو کر چھ گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ بہت کم پانی ڈال کر اسے موٹا پیس لیں۔ چینی اور ڈیڑھ کپ پانی سے شیرہ تیار کریں۔ گرم دودھ میں زعفران ڈالیں۔ کھوئے کے چھوٹے چھوٹے دانے بنالیں۔ ابلتے گرم پانی میں پانچ منٹ تک بادام ڈالے رکھیں۔ ٹھنڈا کرکے انہیں چھیلیں پھر ان کو باریک کاٹ لیں۔ موٹے پیندے کے پین میں گھی کو گرم کریں اور پسی ہوئی مونگ کی دال ڈالیں۔ ہلکی آنچ پر ہلاتے رہیں یہاں تک کہ دال کا رنگ سنہری ہوجائے۔ چینی کا شیرہ اور زعفران والا دودھ ڈالیں۔ انہیں ہلاتے رہیں یہاں تک کہ یک جان ہوجائیں اور حلوہ کڑاہی سے الگ ہونے لگے پھر کھویا ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ گھل جائے۔ باریک کٹے ہوئے باداموں کے ساتھ سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

نوٹ: پسی ہوئی مونگ کی دال ڈالنے سے قبل پگھلے ہوئے گھی میں ایک چائے کا چمچ بیسن ڈالیں۔ اس کے نتیجے میں پسی ہوئی مونگ کی دال کے پکانے کے دوران گٹھلیاں نہیں بنیں گی۔

حنا عزیز ...... کراچی

کھٹے چنے

اشیا:۔ کابلی چنے، ایک پاؤ۔ دال مسور اور دال مونگ، ایک، ایک چھٹانک۔ پیاز، ایک عدد درمیانی۔ گھی، چار بڑے چمچے۔ نمک، مرچ، ہلدی، سبز مرچیں، گرم مسالا، حسبِ ضرورت۔ لیموں کا رس یا املی کا پانی، آدھی پیالی۔ میٹھا سوڈا، آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب:۔ کابلی چنے دھو کر رات کے وقت بھگو کر رکھ دیجیے یعنی چنے کم از کم آٹھ گھنٹے ضرور بھگوئے جائیں۔ بعد میں چھلنی میں ڈال کر تمام پانی نکال دیں۔ ان چنوں میں میٹھا سوڈا چائے کا آدھا چمچ ڈال کر چنوں کو خوب ہلائیں پھر پندرہ منٹ اسی طرح چھلنی میں ہی پڑے رہنے دیجیے۔ اب چنوں میں اتنا پانی ڈالیے جس میں ہلکی آنچ پر پکانے سے چنے گل جائیں۔ چنوں پر جو جھاگ آئے وہ چمچے سے نکالتی جائیں۔ جب چنے نرم ہو جائیں تو دال مسور اور دال مونگ اور سارا مسالا ان کے ساتھ ہی پکنے کے لیے ڈال دیں۔ گل جانے پر آگ سے اتار لیں۔

عائشہ، حیدر آباد

قیمہ بھری پوریاں

اشیا:۔ میدہ، ایک کلو۔ قیمہ، ایک کلو۔ گھی، ایک کلو۔ الائچی، لونگ، دو، دو ماشے۔ سرخ مرچ و سیاہ مرچ، تین تین ماشہ۔ پیاز، ایک پاؤ۔ ادرک، دھنیا، دو، دو تولے۔ لہسن، نصف چھٹانک۔ دہی، آدھا پاؤ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ لیموں کاغذی، پانچ عدد۔ پنیر، ایک پاؤ۔ زعفران، تین ماشہ۔

ترکیب:۔ برتن میں دہی، ادرک، پاؤ بھر گھی اور پیاز ملا کر خوب بھونیں اور الگ رکھ لیجیے۔ اس کے بعد دار چینی، لونگ، الائچی، مرچ سرخ و سیاہ، دھنیا، لہسن خوب باریک پیس کر نمک شامل کر کے گھی میں بھونیں۔ پھر قیمہ ڈال کر اچھی طرح بھونیے، بھوننے کے بعد پانی کا چھینٹا دے کر پکائیں۔ اچھی طرح گل جانے پر جب پانی بالکل خشک ہو جائے تو پیاز جسے بھون کر الگ رکھ لیا تھا، عرقِ لیموں، زعفران اور پنیر میں ملا کر ڈال دیجیے۔ دوسری طرف میدے میں آدھا پاؤ گھی شامل کر کے اور نمک ملا کر پانی یا دودھ سے گوندھ کر پوریاں بنا لیجیے اور پوریوں میں قیمہ بھر کر تل لیجیے۔ بعض عورتیں قیمے کے بجائے میتھی کا ساگ شامل کرتی ہیں۔

روحا علی، میر پور خاص

چنے کی دال کی پوریاں

اشیا:۔ میدہ، آدھا کلو۔ چنے کی دال، ڈیڑھ پاؤ۔ سفید زیرہ، تین ماشہ۔ سیاہ مرچ، چار ماشہ۔ پیاز، ایک گٹھی۔ دھنیا، ایک تولہ۔

ترکیب۔ سب سے پہلے میدے میں مناسب نمک اور پانی ملا کر اس کو آٹے کی طرح گوندھ لیں اور سیاہ مرچ اور سفید زیرے کو باریک پیس لیں اور اس مرکب کو چنے کی دال کے ساتھ ملا کر اس دال کو ابالیں جب دال گل جائے اور اس کا پانی خشک ہو جائے تو چولھے سے اتار لیں اور باریک پیس لیں پھر سیاہ مرچ اور سفید زیرے کا یہ آمیزہ اس پر چھڑک دیں اس کے بعد میدے کے پیڑے بنا لیں اور ان میں یہ پسی ہوئی دال بھر کر پوریاں بنا لیں۔ (بعض دفعہ پوریوں کو مزید خستہ کرنے کے لیے میدہ گوندھتے وقت اس میں ذرا سا گھی بھی ملایا جاتا ہے) گھی میں تل لیں۔ کھٹی میٹھی چٹنی، اچار، آلو یا پھر چنے کی ترکاری سے مزے اڑائیں۔

نور، کوٹ غلام محمد

کون کیا کر رہا ہے

مہتاب خان

بول سے پہلے خاموش رہو

ہدایت کار شعیب منصور کی فلم بول سے پہلے ہدایت کار الطاف حسین کی فلم خاموش رہو ریلیز کر دی گئی۔ فلم خاموش رہو 2011ء کی پہلی اردو فلم ہے یہ فلم اس سال کی پہلی پاکستانی فلم ہے جو سینما میں نمائش پزیر ہوئی۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کی دگرگوں صورتِ حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اس سال کی پہلی اردو فلم ہے۔ ہدایت کارہ سنگیتا کا اس فلم کے بارے میں کہنا ہے کہ انڈسٹری میں رونقیں آنے والی ہیں اور ہماری دعا ہے کہ یہ فلم کامیاب ہو اس فلم کی کامیابی دراصل انڈسٹری کی کامیابی ہوگی۔ سنگیتا بھارت اپنا میڈیکل چیک اپ کروانے جا رہی ہیں وہ ہر سال بھارت جاتی ہیں، سنگیتا کو انفیکشن ہے۔

میرا



بھارتی اداکارہ راکھی ساونت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پاکستانی اداکارہ میرا نے بھی ٹی وی ریئلٹی شو کون بنے گا میرا پتی کے ذریعے اپنے جیون ساتھی کی تلاش شروع کر دی ہے۔ میرا کا کہنا ہے کہ چھبیسویں ہفتے وہ دلہن کا سرخ جوڑا پہن ہی لیں گی۔ جیو ٹی وی کے اس ریئلٹی شو کی کئی قسطیں آن ائر ہو چکی ہیں جس میں نوجوان میرا کا دل جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک ایسا نوجوان ہوگا جس سے میرا شو میں ہی شادی کریں گی۔ میرا کی عمر 25 سال ہو گئی ہے۔ میرا نے اپنی سوشل ویب سائٹ پر لکھا ہے کہ میرے پاس ہزاروں آفرز ہیں لیکن میں شادی اسی نوجوان سے کروں گی جو میرا ہر طرح خیال رکھے گا۔ یہ نوجوان کون ہوگا اس کا فیصلہ تو شو کی آخری قسط میں ہی ہو گا۔ شو کی ایک قسط میں میرا نے ایک لمبے بالوں والے نوجوان سے پوچھا کہ کیا وہ ان کی خاطر اپنے بال منڈوا سکتے ہیں؟ اس پر نوجوان نے نہایت جذباتی ہو کر کہا کہ اگر میرا کہیں تو وہ اپنی ناک کٹوا دے، بالوں کی بات تو معمولی ہے یہ کہتے ہی اس نوجوان نے رونا شروع کر دیا۔ شو میں میرا نے بھارت کی لیجنڈ اداکارہ مینا کماری کی طرح خود کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ایک نوجوان سے جب انہوں نے پوچھا کہ وہ کیسی لگتی ہیں تو نوجوان کا جواب تھا مینا کماری۔ ایک نوجوان نے میرا کو تاج محل کا ماڈل تحفہ میں دیتے ہوئے کہا کہ وہ محبت کی نشانی تاج محل سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت ہیں۔ کچھ نوجوانوں نے اپنی آواز میں گانے گا کر میرا کے حسن کی تعریف کی جسے سن کر میرا شرما گئیں۔ کچھ نوجوانوں کے سامنے میرا نے یہ شرط رکھی کہ انہیں سگریٹ پینے والے لوگ پسند نہیں لہٰذا ان کا

دل جیتنے کے لیے سگریٹ چھوڑنی ہوگی۔

جمیل فخری

پاکستان کے لیجنڈ اداکار جمیل فخری انتقال کر گئے وہ نوجون جمعرات کی شب انتقال کر گئے تھے، انہیں لاہور میں میانی صاحب قبرستان میں ان کے بیٹے ایاز کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔



مرحوم کی نمازِ جنازہ قلعہ لکشمن سنگھ میں ان کی رہائش گاہ کے قریب ادا گئی...... نمازِ جنازہ میں ملک بھر سے معروف فنکاروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ جمیل فخری کو اکتیس مئی کی رات فالج کا شدید حملہ ہوا تھا جس کے بعد انہیں اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ ان کی حالت انتہائی تشویش ناک تھی اور انہیں وینٹیلیٹر پر رکھا گیا تھا۔ اپنے بیٹے علی ایاز فخری کی نیویارک میں بائیس ماہ کی گمشدگی کے بعد موت کی اطلاع ملنے پر وہ انتہائی غمزدہ تھے۔ جمیل فخری نے پی ٹی وی کے ڈرامے اندھیرا اجالا سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔

ملیکہ شراوت

ملیکہ کے آئٹم سونگ تو سب کو پسند آتے ہیں لیکن ان کا باپ بننے کے لیے کوئی تیار نہیں ملیکہ شراوت جن کی اداؤں نے امریکی صدر بارک اوباما کو بھی اپنا اسیر بنا لیا مگر اداکاری کی دنیا میں ایسا کوئی نہیں جو اُن کے والد کا کردار ادا کرے۔ فلم ڈبل دھمال میں مشکل اس وقت پیش آئی جب ایک سین شوٹ کروانے کے لیے ملیکہ کو روایتی فلمی انداز میں اپنے والد کے آگے رونا دھونا



ہے۔ رونے کا سین تو ملیکہ آسانی سے کر لیتیں مگر مشکل یہ ہوئی کہ سین شوٹ کروانے کے لیے باپ کا کردار کون کرے۔ اس وقت کوئی دستیاب نہیں تھا۔ آخر کار سنجے دت نے اپنے ڈرائیور کی منت کی کہ وہ ملیکہ کا باپ بنے جس کے بعد ملیکہ کا وہ سین تو مکمل ہوا ساتھ ساتھ برسوں پرانے ڈرائیور کی اداکارانہ صلاحیت بھی سامنے آ گئی۔

عابدہ پروین

پاکستان کی نامور گلوکارہ اور صوفیانہ کلام گانے میں مہارت رکھنے والی عابدہ پروین نے کہا ہے کہ انہیں بالی وڈ کی فلموں میں گانے کی ایک نہیں متعدد



پیشکشیں وصول ہو چکی ہیں مگر وہ صوفیانہ کلام کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یش چوپڑا، سبھاش گھئی اور ایسے ہی کئی بڑے ناموں نے انہیں اپنی اپنی

فلموں میں گانے کی پیشکش کی مگر ابھی وہ صوفیانہ کلام کو دنیا بھر میں پھیلانا چاہتی ہیں اس لیے فی الحال وہ صوفیانہ کلام سے وابستہ رہنا چاہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صوفیانہ کلام کو عام کرنے کے لیے انہیں بہت سا وقت چاہیے۔ ایسے میں وہ فلموں کے لیے وقت نہیں نکال پائیں گی۔ عابدہ پروین کا کہنا ہے کہ انڈین فلم انڈسٹری میں صوفیانہ کلام کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اب بہت سی فلمیں ایسی ہیں جن کا کم از کم ایک گانا صوفیانہ کلام پر مبنی ضرور ہوتا ہے۔ عابدہ پروین کا کہنا ہے کہ ان کے گانے تھیاں تھیاں پر مبنی گیت چھیاں چھیاں سے بالی وڈ میں صوفیانہ کلام کی شروعات ہوئی تھی۔ اس گانے کا مشہور ہونا تھا کہ فلموں میں صوفیانہ کلام کی ڈیمانڈ بڑھتی چلی گئی اور آج صوفیانہ کلام بالی وڈ میں بہت مشہور ہے۔ دراصل اس طرح کے گانے انسانیت اور پیار و محبت کو پروان چڑھاتے ہیں اور صوفیانہ کلام کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ روح سے اٹوٹ رشتہ جوڑ لیتا ہے۔

عاطف اسلم



عاطف اسلم کا کہنا ہے کہ گلوکاری میرا پہلا جنون ہے جبکہ فلم بول میں کام کی پیشکش ذاتی شوق کی خاطر قبول کی، ایک انٹرویو کے دوران ان کا کہنا تھا کہ فلم کا تجربہ بہت الگ تجربہ رہا انہیں کوئی ایکسپیرینس نہیں تھا یہ تجربہ ان کے لیے بہت چیلنجنگ تھا ان کا کہنا تھا کہ فلم کا کیریئر میں پاکستان سے شروع کرنا چاہتا تھا کیونکہ گائیکی کا کیریئر بھی انہوں نے پاکستان ہی سے شروع کیا تھا۔ فلم بول میں کافی حساس ٹاپک کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اس میں عورتوں کے حقوق کا احساس دلایا گیا ہے، یہ شعیب منصور کی ایک دلیرانہ کوشش ہے۔ شعیب منصور کا کہنا ہے کہ پاکستان میں عورتوں کے لیے عوام کا رویہ دیکھتے ہوئے وہ خود کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ ایک مرد ہیں، فلم بہت جرأت مندانہ اور چونکا دینے والی فلم ہے۔ کسی دور میں فنکار شوبز میں کامیابیوں کے لیے صرف ایک شعبے تک محدود رہتے تھے لیکن اب ہر فنکار ہمہ جہت صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا نظر آتا ہے۔ عاطف اسلم بھی ان میں سے ایک ہیں اب وہ اداکاری میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے کمر بستہ ہیں۔ عاطف اسلم ملکی گلوکاروں میں مقبولیت میں کہیں آگے ہیں ان کے کئی گانے بھارتی فلموں کی کامیابی کی ضمانت بن چکے ہیں۔ وہ انتہائی نفیس قسم کے انسان ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ ان کی فلم بول سے لگایا جا سکتا ہے اس فلم میں ان کی ہیروئن کا کردار ماریہ خان ادا کر رہی ہیں۔ بول کا اسکرپٹ پڑھتے ہی انہوں نے اس میں کام کرنے کی پیشکش قبول کر لی تھی۔ عاطف اسلم کا کہنا ہے کہ اس فلم کا کردار میری سوچ سے قریب تر ہے میں نے کبھی چاکلیٹ، بوائے ٹائپ کردار کی خواہش نہیں کی۔ یہ کردار ادا کرنا میرے لیے بڑا چیلنج تھا۔ اداکاری، گلوکاری سے بالکل الگ تجربہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ شعیب منصور کے ساتھ کام کرنا ایک خوشگوار تجربہ رہا وہ انتہائی پروفیشنل انسان ہیں ان سے فلم کی عکس بندی کے دوران بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا وہ جتنے بڑے پروڈیوسر ہیں اتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں۔

پاکستانی ڈرامے ناظرین میں مقبول

پاکستانی چینلز کے ڈرامے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے جا رہے ہیں۔ گھریلو خواتین، دفاتر کے لوگ اور کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں سب اب ان ڈراموں کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں کہیں تنقید ہوتی ہے تو کہیں تعریف جو لوگوں کی پاکستانی ڈراموں میں دلچسپی ظاہر کرتی ہے۔ اگرچہ ابھی پاکستانی ڈراما مقبولیت کے اس مقام پر نہیں پہنچا جہاں کبھی پی ٹی وی ڈراما تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈراموں کی مقبولیت میں پرائیویٹ چینل پی ٹی وی پر سبقت لے گئے ہیں۔ انڈین ڈراموں کا سحر توڑنے کے لیے پاکستانی ڈراموں میں بھی گلیمر کا تڑکا لگایا گیا ہے اور سب سے اہم بات کہ کہانیوں پر توجہ دی گئی ہے زندگی سے قریب کہانیاں ہمارے ڈراموں کی شناخت رہی ہیں۔ ہمارے ہاں باصلاحیت لوگوں کی کمی نہیں، پاکستانی ڈرامے اس وقت نئے اور سینئر فنکاروں کا خوب صورت امتزاج لیے ہوئے ہیں منی اسکرین پر جہاں بشریٰ انصاری، ثمینہ پیرزادہ، سکینہ سموں صبا حمید، روبینہ اشرف، شگفتہ اعجاز جیسی منجھی ہوئی فنکارائیں اپنی پختہ اداکاری کا مظاہرہ کر رہی ہیں وہاں سعدیہ امام، ماریہ واسطی، ناہید شبیر، جویریہ عباسی، عائشہ خان، جویریہ جلیل، جاناں ملک وغیرہ اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں اسی طرح اداکاروں میں بھی تین نسلوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ عابد علی، محمود اختر، شکیل، ہمایوں سعید، شبیر جان، عدنان صدیقی، اعجاز اسلم، نبیل وغیرہ چھائے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی نئے اداکار ٹی وی پر نئے کرداروں سے دیکھنے والوں کو متوجہ کیے ہوئے ہیں۔ ٹی وی ڈراموں میں کشش کی وجہ فلمی اداکاروں کا منی اسکرین پر کام کرنا بھی ہے ان فنکاروں میں شان، بابر علی، سعد علی، افضل، معمر رانا، احسن خان شامل ہیں جبکہ اداکاراؤں میں صائمہ، ریشم، نور، میرا سب نے ڈراموں اور مختلف شوز کے ذریعے مقبولیت حاصل کی ہے۔ میڈیا کے ذریعے بھارتی کلچر کی یلغار سے نمٹنے کے لیے ہمارے ڈرامے وقت کی ضرورت ہیں۔ جو ہماری معاشرتی اقدار اور ثقافت کا آئینہ دار ہوں نیز ان میں اصلاح کا پہلو بھی ہو۔

ملائیکہ اروڑہ خان



خوبصورت اداکارہ ملائیکہ اروڑہ خان جن پر فلم دبنگ کا مشہور گانا منی بدنام ہوئی فلمایا گیا تھا کا کہنا ہے کہ اب دبنگ ٹو میں بھی اسی گیت جیسے ایک اور گانے پر وہ زوردار رقص کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دبنگ فلم میں گانا منی بدنام ہوئی بہت کامیاب رہا تھا اور اس میں ملائیکہ کے رقص نے خوب داد وصول کی تھی ملائیکہ نے کہا کہ منی گانا زبردست ہٹ رہا اور اب ہم سب پر دباؤ ہے کہ اس سے بھی بہتر گانا تیار کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایسے چیلنجوں سے گھبراتی نہیں اور وہ اور جم کر کام کریں گی، یہ گانا منی سے بھی اچھا ہوگا۔ منی کی زبردست کامیابی کے بعد بالی وڈ میں آئٹم سانگز کی بھرمار ہوگئی ہے فلم تیس مار خان میں شیلا نے بھی کافی دھوم مچائی تھی۔ ملائیکہ نے کہا کہ ارباز ہمیشہ سے ہی ہدایت کاری کرنا چاہتے تھے اور اب ان کی تمنا پوری ہونے جا رہی ہے۔

ملائیکہ خان نے زیادہ تر فلموں میں آئٹم سانگز ہی کیے ہیں ان کا کہنا تھا کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا کہ مجھے اداکاری کی خواہش نہیں ہے لیکن مستقبل میں ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ میں اداکاری بھی کروں۔ ملائیکہ کے مطابق وہ خود کو فٹ رکھنے کے لیے بھرپور ورزش اور ڈانس کرتی ہیں۔

عامر خان



کئی منفرد اور انوکھے موضوعات پر فلم بنانے والے مسٹر پرفیکٹ عامر خان نے مزاحیہ انداز میں کہا ہے کہ انہیں لگتا ہے کہ ان کی آنے والی فلم دہلی بیلی بنانے پر لوگ انہیں جوتے ماریں گے۔ عامر خان کا کہنا ہے کہ دہلی بیلی ان کی گزشتہ فلموں سے بالکل مختلف فلم ہے اور یہ فیملی فلم نہیں ہے بلکہ یہ نوجوانوں کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ اکثر لوگ انہیں یہ فلم بنانے پر تنقید کا نشانہ بنائیں۔ دہلی بیلی کے گانوں کو پہلے ہی فلمی حلقوں میں تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور مشہور موسیقار شنکر احسان نے اس کے بولوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ کبھی بھی اس قسم کے گانے کی موسیقی ترتیب نہیں دیں گے۔ عامر خان نے امید ظاہر کی ہے کہ دہلی بیلی باکس آفس لوٹ لے گی۔

سلمان خان پرفیکٹ فادر



اداکار سلمان خان نے ابھی تک شادی نہیں کی مگر پرفیکٹ فادر کا ٹائٹل ضرور حاصل کرلیا ہے۔ فادر ڈے کے حوالے سے بھارت میں ایک انٹرنیٹ میں سروے ہوا جس میں بالی وڈ اداکاروں کے حوالے سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کون بہترین باپ ہے۔ سروے میں شاہ رخ خان، ارباز خان، ریتھک روشن اور سلمان خان سمیت کئی اداکار شامل تھے۔ لیکن سروے کے نتیجے میں نو ہزار ساڑھے آٹھ سو ووٹ کے ساتھ پرفیکٹ فادر کا ٹائٹل سلمان خان کو ملا تو سب حیران رہ گئے۔ سلمان کو نہ صرف لڑکیوں نے بلکہ بچوں نے بھی ان کی زندہ دلی کی وجہ سے ووٹ دیے۔

ابھیشک بچن

اداکار ابھیشک بچن کا کہنا ہے کہ میں اپنے والدین کی ہر بات مانتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میرے نزدیک میرے والدین دنیا کے عظیم ترین انسان ہیں۔ انہوں نے میری پرورش بہت اچھی طرح کی ہے، میں نے ان کی بات کا کبھی برا نہیں



منایا۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ میرے والد کو انڈسٹری میں لیجنڈ کا درجہ بہت محنت کے بعد ملا ہے میں دوسروں کے خلاف باتیں کرنے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دیتا ہوں اگر کوئی کردار اچھا نہیں کرتا تو

میرے والد باقاعدہ مجھے ڈانٹتے ہیں اور میری غلطیاں مجھے بتاتے ہیں۔ میرے لیے ایشوریا اور میرے والد کا مشورہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں انٹرنیٹ کے استعمال سے بہت ڈرتا ہوں لیکن ایشوریا نے میرا یہ خوف ختم کیا ہے اور اس کی وجہ سے میں نے انٹرنیٹ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

خواجہ پرویز



پاکستان کے معروف شاعر اور نغمہ نگار خواجہ پرویز مختصر علالت کے بعد 20 جون بروز اتوار اسی برس کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے۔ انہوں نے بطور نغمہ نگار سات سو سے زیادہ فلمی گیت لکھے جو ملکہ ترنم نور جہاں، نصرت فتح علی خان، مہدی حسن، سائرہ نسیم اور درجنوں گلوکاروں کے لبوں پر سجے۔ خواجہ پرویز پاکستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ میں واحد کمرشل ویلیو کے شاعر تھے۔ ان کا ہر گیت شائقین موسیقی کو سحر زدہ کر دیتا۔ خواجہ پرویز نے اپنے چالیس سالہ فلمی کیریئر کے دوران اردو اور پنجابی کے سیکڑوں ایسے گیت لکھے جو سامعین کے دلوں کی دھڑکن بنے۔ خواجہ پرویز نے اردو اور پنجابی گیتوں کے علاوہ بے شمار قوالیاں اور صوفیانہ گیت بھی لکھے۔ ان کی مقبول زمانہ قوالی انکھیاں اڈیکھدیاں جھولے جھولے لال اور ساری ساری رات شامل ہیں۔ وہ سن انیس سو بتیس میں ہندوستان کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے اور قیام پاکستان کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور میں آ بسے۔ ان کا اصل نام خواجہ غلام محی الدین تھا اور پرویز تخلص کیا کرتے تھے بعد میں فلمی دنیا میں خواجہ پرویز کے نام سے مشہور ہوئے۔ سب سے پہلے ہدایت کار دلجیت مرزا نے اپنی فلم رواج کے گیت ان سے لکھوائے اس فلم میں مالا کی آواز میں گایا گیا ان کا تحریر کردہ گیت کہتا ہے زمانہ کہیں دل نہ لگانا بہت مقبول ہوا۔ اس گانے کی دھن ماسٹر عنایت نے بنائی۔ انہیں پیر کی شام لاہور کے میانی صاحب قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

سنجے دت



سنجے دت اور ارشد وارثی منا بھائی ایم بی بی ایس میں کامیڈی پرفارمنس دینے کے بعد کافی مدت سے ایک ساتھ نظر نہیں آئے۔ لیکن اب فلم ڈبل دھمال کے سیکوئیل میں گھنٹہ سنگھ کے کردار میں جلوہ گر ہوں گے ارشد وارثی، سنجے دت کے ساتھ۔ ارشد وارثی نے سردار کا کتنا کردار نبھایا ہے یہ تو فلم دیکھ کر ہی پتا چلے گا، اس فلم میں ملیکہ شراوت اور جاوید جعفری بھی ہوں گے۔ جاوید جعفری اپنی مزاحیہ اداکاری سے پہلے ہی عوامی مقبولیت میں کافی آگے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ بازی کس کے سر رہتی ہے اور عوام کو کس کی کامیڈی پسند آتی ہے۔

لیلیٰ

اداکارہ لیلیٰ کی والدہ روبینہ بیگم لاہور میں پچپن برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ لیلیٰ کی والدہ کو دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اس وقت لیلیٰ کراچی میں تھیں۔ لیلیٰ سے افسوس کرنے والوں میں شوبز شخصیات نے ان کے گھر جا کر تعزیت کی ان میں ریشم، عندلیب، دردانہ رحمان، شیبا



بٹ، میرا کی والدہ، شفقت اور جرار رضوی شامل تھے۔ جب تعزیت کر کے ریشم جانے لگیں تو ان کے پرس سے کسی نے رقم نکال لی، ریشم نے شور مچا دیا کہ ان کے پرس سے کسی نے پچیس ہزار روپے نکال لیے ہیں۔ وہ سب کی تلاشی لیں گی۔ ریشم کے یہ کہنے پر سب نے اپنے اپنے پرس دکھا دیے۔ یہ ایسا لمحہ تھا کہ ہر شخص اس حرکت پر سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ لیلیٰ کے چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ لیلیٰ گھر میں سب سے بڑی ہیں۔ اداکارہ لیلیٰ نے اس موقع پر روتے ہوئے بتایا کہ ہماری تو والدہ فوت ہو گئی ہیں اور ہم پر چوری کی تہمت لگائی جا رہی ہے۔ میں ریشم کے بارے میں دعا ہی کر سکتی ہوں کہ وہ خوش رہے۔ لیلیٰ کے گھر میں موجود بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ ریشم نے اچھا نہیں کیا۔ ریشم نے پبلسٹی کے لیے یہ ڈراما کیا ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ریشم کی اس حرکت سے پرسے کے لیے آنے والے مہمان خود کو مجرم سمجھ رہے تھے جو وہاں موجود نہیں تھے یا دیر سے آئے تھے انہوں نے شکر کیا کہ وہ ریشم کی الزام تراشیوں سے بچ گئے۔

چھٹی چاہیے

''تو تمہیں چھٹی چاہیے؟'' باس نے نوجوان ایمپلائی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تمہاری چھٹی پر فیصلہ کرنے سے پہلے تم مجھے یہ بتا دو... کہ تم چاہ کیا رہے ہو۔ سال میں کام کے لیے 365 دن ہوتے ہیں جس میں 52 ہفتے ہوتے ہیں اور ہر ہفتے میں تمہیں 2 چھٹیاں ملتی ہیں یوں کام کے لیے 261 دن بچتے ہیں چونکہ روزانہ تم 8 گھنٹے کام کرتے اور 16 گھنٹے نہیں کرتے اس طرح مزید 170 دن ضائع ہو جاتے ہیں اور صرف 91 دن باقی بچتے ہیں۔ روز کا ایک گھنٹا لنچ اور 30 منٹ کافی بریک کا حساب لگایا جائے تو بالترتیب 46 اور 23 دن سالانہ مزید صرف ہو جاتے ہیں اور اس طرح کل 22 دن بچتے ہیں۔ ان 22 دنوں میں 2 دن تم بیماری کے باعث غیر حاضر ہوتے ہو 5 ہماری آفس تعطیلات جبکہ ہم ہر ایمپلائی کو 14 دن سالانہ چھٹیاں دیتے ہیں۔ کل ملا کر یہ 21 دن بن جاتے ہیں اور کام کے لیے ایک دن ہی بچتا ہے..... اب اس ایک دن کی بھی تمہیں چھٹی چاہیے.....؟''

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

اس بات کی ضرورت کافی عرصہ سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

(مٹاپا گزشتہ سے پیوستہ)

موٹے لوگوں کے لیے

(1) ہدایات نمبر 1 سے 8 پر عمل کریں۔

(2) بازاری اور اشتہاری ادویات سے علاج کرنا انتہائی رسک ہے کیونکہ ان ادویات کے بہت زیادہ (Side Effects) ناموافق اثرات ہوتے ہیں، دوم یہ آپ کے مٹاپے کے سبب کے مطابق نہیں ہوتیں۔

(3) ماہر تجربہ کار معالج کی سرپرستی میں وزن کم کرنے کے پروگرام پر عمل کریں۔

(4) نبض، دل کی رفتار، بلڈ پریشر، خون کی کمی اور کیلشیم، کولسٹرول، شوگر کو چیک کراتے رہیں۔

(5) مٹاپے کا علاج مشکل ہے اگر احتیاط برقرار نہ رکھی جائیں تو کم کیا ہوا وزن دوبارہ اپنی حالت پر آ سکتا ہے بلکہ بڑھ بھی سکتا ہے۔

(6) مناسب غذائی احتیاط، جسمانی سرگرمی اور باقاعدہ ورزش کے پروگرام پر زندگی بھر عمل کرنا چاہیے۔

(7) وزن کم کرنے کا مقصد صحت مند وزن حاصل کرنا اور اسے برقرار رکھنا ہونا چاہیے۔

(8) ہومیو پیتھک ادویات کا استعمال ڈاکٹر کے مشورے سے کریں تاکہ وہ آپ کو آپ کی کیفیات و وجوہات کے مطابق دوا تجویز کرے۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

ستمبر 2011ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتا:

ورزش

سب سے پہلے اس بات کا جائزہ لیں کہ آپ کا وزن کتنا زیادہ ہے۔ پھر آپ کو روزمرہ کاموں کے لیے کتنی کیلوریز کی ضرورت ہے اور پھر آپ کن کاموں کے لیے کتنی کیلوریز کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو آپ کی ضرورت سے کم کیلوریز کی ڈائٹ اور ورزش آپ کی جسمانی ضرورت اور مسائل کو دیکھ کر تجویز کی جائے گی جو یقیناً ایک ماہر معالج یا ماہرِ غذا ہی کر سکتا ہے۔

ورزش معالج کی ہدایت کے مطابق کریں۔ ابتدائی طور پر اتنی ورزش کریں جس میں آپ تھکن محسوس نہ کریں۔ پیدل چلنا بہترین ہلکی ورزش ہے جو سب کر سکتے ہیں باقی تیز چلنا، بھاگنا، رسی کودنا، سائیکل چلانا، سیڑھیاں چڑھنا، اترنا، تیرنا، وغیرہ ورزش ڈاکٹر کے مشورے سے کی جا سکتی ہے۔ یاد رکھیں 15 منٹ پیدل چلنے سے 50 کیلوریز استعمال ہوتی ہیں جبکہ 15 منٹ دوڑنے سے 210 کیلوریز استعمال میں آتی ہیں، باقاعدہ ورزش کرنے سے جسم میں جمع شدہ چربی توانائی میں تبدیل ہوتی ہے جس کو ورزش کے دوران ہم استعمال کرتے ہے جو وزن کی کمی کا سبب بنتی ہے۔

ڈائٹنگ

ایک صحت مند مرد کو 2400 سے 3000 کیلوریز اور ایک صحت مند عورت کو 1800 سے 2410 کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے اپنے روزمرہ کے کاموں کے لیے، جسمانی مشقت کا کام کرنے والوں جیسے کے مزدور کو اس سے زیادہ کیلوریز کی ضرورت پڑے گی۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ ڈائٹنگ کا مطلب فاقہ یا کھانا چھوڑنا نہیں ہے بلکہ ایسی غذا کا انتخاب ہے جو آپ کی موجودہ ضرورت کے مطابق ہوتا کہ وہ آپ کی صحت کے ساتھ آپ کے وزن کو کم کرنے میں معاون ہو۔ یاد رکھیں کہ جسم کو کم خوراک دینے سے جسم اپنے آپ کو اسی خوراک کا عادی بنا لیتا ہے اور آپ کا وزن کم ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ کم کھانے سے ذہن پر بھی اثر پڑتا ہے جس سے بھولنے کی شکایت، بیزاری اور کند ذہنی پیدا ہو سکتی ہے۔ نیز خون میں کولسٹرول (160 ملی گرام) سے کم ہو تو شدید افسردگی کی علامات ظاہر ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے کولسٹرول کی مقدار کو نارمل پر رکھنا بھی ضروری ہے۔

اب ان ہدایات پر غور کریں

۱۔ کھانا وقت پر کھائیں۔ یقیناً جسمانی ضرورت سے کم کیلوریز کی غذا لینے سے بھوک باقی رہتی ہے اور طبیعت بار بار چاہتی ہے کہ کچھ نہ کچھ کھاتے رہیں اس پر کنٹرول کریں۔

۲۔ کھانے سے پہلے پانی کا استعمال کریں۔

۳۔ دو کھانوں کے درمیان جب بہت بھوک لگے تو پانی پئیں یا تازہ پھلوں کا جوس لیں یا کوئی پھل لیں یا کوئی میٹھی چیز لیں۔

۴۔ سوپ پیجیے۔ کھانا کھانے سے پہلے ایک پیالہ ٹماٹر یا سبزیوں کا سوپ پئیں تو کھانا کھانے کی چاہت 25 فیصد کم ہو جائے گی۔

۵۔ چاول اور نوڈلز کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

۶۔ ریشہ دار غذائیں استعمال کریں مثلاً بھوسی، بھوسی والا آٹا، سبزیاں (کھیرا) پھل، اس سے بھوک بھی کم ہوتی ہے اور دیر تک پیٹ بھی بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل غذاؤں سے پرہیز کریں

کیونکہ اس میں چکنائی یا میٹھا زیادہ ہے:

(۱) انڈا تلا ہوا یا اس کا آملیٹ (۲) تلی ہوئی، بھنی ہوئی، گھی، مکھن، کریم میں یا اس سے بنی ہوئیں غذائیں (۳) مکھن، گھی، پام آئل، ناریل کا تیل (۴) سفید آٹے یا میدے سے بنی ہوئی روٹی، بسکٹ، پاپے، کیک، پیسٹری، تافتان، شیرمال، پراٹھا، باقرخانی وغیرہ (۵) بالائی اور بالائی والا دودھ یا اس کی چائے (۶) شہد، شکر، جام، جیلی، مارملیڈ، مایونیز یا کریم، روغنی سیلیڈز (۷) لسی، تمام مشروبات، آئس کریم (۸) دہی، پنیر (۹) تمام مٹھائیاں (۱۰) لال گوشت بڑا چھوٹا (۱۱) مغز، گردے، کپورے، کلیجی، تکہ کباب، برگر، پیزا (۱۲) نمکو (۱۳) ڈرائی فروٹ۔

مندرجہ ذیل غذائیں بہ آسانی استعمال کرسکتے ہیں

(۱) ابلی ہوئی، بھاپ (اسٹیم) مائیکروویو کے ذریعے بنی ہوئی غذائیں (۲) انڈا ابلا ہوا صرف اس کی سفیدی (۳) مارجرین کا آدھا چمچہ، سویابین، سورج مکھی، کارن، کینولا تھوڑی مقدار میں (۴) بغیر بالائی کا دودھ ایک کپ، یا اس کی چائے (۵) جو، مکئی، بیسن، یا گیہوں کے آٹے کی بھوسی کے ساتھ بنی ہوئی روٹی، بھوسی کی ڈبل روٹی، پاپے، بسکٹ (۶) شوگر فری، جام، جیلی، مارملیڈ (۷) کبھی کبھی شوگر فری مشروبات (۸) گھر کا بنا ہوا پنیر اور دہی کیونکہ اس میں چکنائی نہیں ہوتی (۹) تمام پھل سوائے آم، کیلے کے، تمام سبزیاں علاوہ آلو کے (۱۰) مچھلی، مرغی (۱۱) تمام قسم کی دالیں، چاول، نوڈلز۔

آپ کی مزید آسانی کے لیے ہم ذیل میں ناشتہ، دوپہر اور رات کے کھانے کے مینو دے رہے ہیں تاکہ آپ کو اس کا آئیڈیا ہو جائے۔

ناشتا

(۱) انڈا ابلا ہوا ایک عدد اور سلائس (براؤن بریڈ کے) ۲ عدد یا (۲) سینڈوچ ٹماٹر، سلاد، لیموں، نمک، کالی مرچ کے ۲ عدد (۳) سیب یا اس کا جوس ایک گلاس یا (۴) دودھ آدھا کپ بغیر بالائی کا یا (۵) چائے بغیر بالائی والے دودھ کی اور بغیر چینی کے ایک کپ۔

دوپہر کا کھانا:

(۱) مرغی کا گوشت ابلا ہوا ۱۲۰ گرام یا (۲) مچھلی معمولی سے تیل میں پکی ہوئی ۷۵ گرام یا (۳) ابلا ہوا انڈا ایک عدد یا (۴) ہر قسم کے پھل سوائے کیلے کے + گریپ فروٹ حسب خواہش یا (۵) گاجر، ٹماٹر، مولی، چقندر، ککڑی، پالک یا ملکو کا ساگ، سلاد (۶) سبز چائے تھوڑے سے لیموں کے ساتھ (۷) براؤن بریڈ کے سلائس کا سینڈوچ، ابلا ہوا گوشت،

رات کا کھانا:

(۱) انڈا ابلا ہوا ایک عدد یا (۲) مرغی کا گوشت 120 گرام یا (۳) بکرے کا گوشت ابلا ہوا ایک بوٹی (۴) سبزی کچی یا اُبلی ہوئی سوائے آلو کے حسبِ ضرورت یا ایک پیالی (۵) فروٹ سوائے کیلے کے حسبِ خواہش (۶) ۲ سلائس براؤن بریڈ کے یا (۷) بھوسی کی روٹی ایک عدد اور ہری مرچ، لہسن، ہرا دھنیا کی چٹنی (۸) گرین ٹی لیموں کے ساتھ ایک کپ۔

دواؤں سے علاج

چند ریسرچ شدہ اور کامیاب ہربل ادویات جو مٹاپے کی بیماری میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان عرقیات کے کوئی مضر اثرات نہیں ہیں۔ مٹاپے کی شدت اور درجہ بندی کے مطابق دوا کا انتخاب ضروری ہے۔

۱۔ پہلے درجے کے مٹاپے (Over Weight) کے لیے Phytolacca e bacis کا مدر ٹنکچر 10,10 قطرے دن میں تین دفعہ پانی کے ساتھ۔

۲۔ دوسرے درجے کے مٹاپے (High Obesity) کے لیے Phytolacca e baccis اور Fucus ves کے مدر ٹنکچر دونوں 10,10 قطرے ملا کر دن میں تین دفعہ پانی کے ساتھ۔

۳۔ تیسرے درجے کے مٹاپے (Extreme Obesity) کے لیے Phytolacca-e-baccis اور Fucus ves کے مدر ٹنکچر کے علاوہ Phytolacca Amercana 3x کے ٹیبلٹس ایک ایک دن میں تین دفعہ استعمال کریں۔

رمضان المبارک سے متعلق پوچھے گئے سوالات

بہت سارے خطوط میں سوالات پوچھے گئے ہیں کہ

۱) کیا رمضان میں وزن کم کیا جاسکتا ہے؟ (ایمن، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی)

۲) شوگر کے مریض روزہ رکھ سکتے ہیں؟ (فاریہ، ناتھ ناظم آباد، کراچی)

۳) دل کے مریض روزہ کس طرح رکھیں؟ (رخسانہ، گلبرگ متاحل ممن آباد کراچی)

۴) روزہ میں سانس ہو جائے تو کیا کریں؟ (ریحانہ اورنگی کالونی، کراچی)

۵) میرے گردے میں پتھری اور پیشاب میں انفیکشن ہے کیا میں روزہ رکھ سکتی ہوں؟ (فریدہ، حیدر آباد کالونی، کراچی)



۶) لیکوریا کی شکایت میں کیا روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ (کراچی)

۷) بلڈ پریشر بڑھا رہتا ہے تو رمضان میں دوائی کیسے استعمال ہوگی؟ (ثمن علی، پی آئی بی کالونی کراچی)

۸) آپ اور عموماً ڈاکٹر حضرات دن میں 3 سے 4 مرتبہ دوائی کا استعمال بتاتے ہیں تو یہ روزے میں کس طرح ممکن ہے؟ (غزالہ، پی ای سی ایچ ایس، کراچی)

۹) میرا بچہ 8 ماہ کا ہے میں اس کو دودھ پلا رہی ہوں، کمر کی تکلیف ہے کیا کروں؟ (کراچی)

ان سب سوالوں کا فرداً فرداً جواب دینے سے پہلے میں ایک جنرل اصول بیان کروں گا جس سے بہت ساری چیزیں ہمارے ذہن میں صاف ہو جائیں گی۔ رمضان المبارک کا مہینہ سال میں ایک بار آتا ہے جس کا مقصد ہماری روح کی پاکیزگی ہے۔ یعنی اس کے اندر جو خرابیاں ہیں اس کو ختم کرنا اور اس کے اندر موجود کمزوریوں کو دور کرنا۔ روح اور جسم کا ایک بڑا گہرا تعلق ہے۔ جسم روح کے بغیر کسی کام کا نہیں ہے۔ اس لیے روح جتنی طاقتور ہوگی جسم بھی اتنا ہی اچھا ہوگا۔ روزہ ہمیں کچھ درس دیتا ہے، کچھ احساس دلاتا ہے، کچھ چیزوں سے روکتا ہے، نظم و ضبط سکھاتا ہے۔ اللہ کی موجودگی کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ غصے کو روکتا اور غیبت سے بچاتا ہے۔ اوقاتِ مقررہ پر کھانا پینا، تقریباً 24 گھنٹے حالتِ عبادت میں گزرتے ہیں اور یوں روح طاقتور ہو جاتی ہے۔ فکر، غم، غصہ، غیبت، بد نیتی، حرص، طمع، حسد، کینہ، روح کو کمزور کرتے ہیں۔ ہر وقت کھاتے پیتے رہنے یا افطار و سحر میں مرغن غذاؤں کا استعمال روح اور جسم دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس تمام گفتگو کا مقصد آپ کو یہ باور کرانا ہے کہ اپنے عمل کی وجہ سے ہم رمضان کے مہینے کو بامقصد، بارحمت و برکت

...لا بھی بنا سکتے ہیں اور بے مقصد و مصیبت و تکالیف والا ...ی۔ اس لیے اس بابرکت و رحمت والے مہینے میں

(جواب:۱) ایسی غذا کا استعمال کریں جو زیادہ ...غن نہ ہوں اگر عام روٹی سالن کا استعمال یا چاول کا ...ستعمال کریں تو یہ صحت کے لیے انتہائی مفید ہے۔ ...بادات کے لیے وقت زیادہ نکالیں پھر آرام کے لیے ...ر اس کے بعد کچھ وقت کھانے پینے کے لیے جبکہ عملاً ...یا نہیں ہوتا کھانے پکانے میں وقت بہت زیادہ لگایا ...تا ہے۔ پھر کھانے میں وقت گزرتا ہے اس کے بعد ...رام میں اور معمولی وقت عبادت میں، یوں وزن ...ھتا ہے، کولسٹرول بڑھتا ہے، بلڈ پریشر بڑھتا ہے، ...ں کے دورے وغیرہ ہوتے ہیں۔ پھر دہراتا ہوں کہ کم ...نڈے پانی کا استعمال کریں اور زیادہ مقدار میں ...یں، گردے کی پتھری اور انفیکشن سے محفوظ رہیں گے ...ر علاج میں معاون بھی بنے گا۔

سادہ غذا کا استعمال کریں یہ شوگر، بلڈ پریشر، ... لسٹرول اور وزن کو کنٹرول کرنے کے ساتھ دل کے ...ائل سے محفوظ کرے گا۔ واک کا اہتمام کریں۔ یہ ...ر، بلڈ پریشر کولسٹرول اور وزن کے لیے مفید ہے۔ ...د کا ذکر و عبادت (نماز) ڈپریشن کے لیے انتہائی مفید ...ے۔

(جواب:۲) شوگر کے وہ مریض جو غذائی پرہیز ...یں ان کے لیے روزہ انتہائی مفید ہے۔ شوگر کے وہ ...یض جو ادویاتی علاج پر ہیں وہ بھی روزہ رکھ سکتے ...ں۔ شوگر کے وہ مریض جو انسولین پر ہیں اگر وہ صبح و ...م لیتے ہیں تو وہ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت ...مطابق انسولین کی مقدار کو شام کو زیادہ [illegible] صبح کر لیں۔ ...شوگر کے وہ مریض جو ہومیو پیتھک دوا پر ہیں ان کے ...بھی کوئی مسئلہ نہیں۔

(جواب:۳ اور ۷) دل کے مریض اور بلڈ پریشر کے مریض اپنے دل کی کیفیت معالج سے مشورہ کر کے اور دوائیوں کی مقدار کو ایڈجسٹ کرا کر روزہ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن معالج سے ضرور مشورہ کریں۔

(جواب:۴) سانس کے مریض روزہ کی حالت میں دوا کو سونگھ سکتے ہیں کیونکہ ہومیو پیتھک دوا کو سونگھ کر یا جلد پر لگا کر مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

(جواب:۵) معمولی انفیکشن اور پتھری میں کوئی قباحت نہیں لیکن بہتر ہے کہ اپنے معالج سے مشورہ ضرور کریں۔

(جواب:۶) لیکوریا کا بہترین علاج ہومیو پیتھی میں ہے اس کا علاج کریں، علامات کی تفصیل لکھیں، نسخہ تجویز کر دیا جائے گا البتہ اس سے روزے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(جواب:۸) یقیناً دن میں روزہ ہوتا ہے اور روزہ میں دوا کا استعمال ممنوع ہے اس لیے ہر دوا کو افطار کے بعد، تراویح کے بعد، سوتے وقت اور سحری میں استعمال کرتے رہیں۔

(جواب:۹) اللہ تعالیٰ نے جہاں روزہ فرض کیا ہے وہاں ان لوگوں کو رعایت دی ہے جو بیمار ہیں یا رضاعی مائیں یا وہ کمزور لوگ جن کو روزہ رکھنے کے بعد کمزوری بڑھنے کا خدشہ یا بیمار پڑنے کا ڈر ہو۔ ایسے لوگ (یعنی آپ بھی) روزہ چھوڑیں، ٹھیک ہونے کے بعد قضا روزہ رکھیں۔

اپنی کمر کے درد کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Calc.Carb-30 استعمال کریں۔ 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Alfalfa-Q کے 10 قطرے 1/4 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ کھانے پینے کا خیال [illegible] احتیاط کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم [illegible] فرمائے۔ آمین!